آزاد رہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل

آزاد

مشتہر بشن سُکھا آزاد

نمبر ۱	جنوری سنہ ۱۹۰۸ع	جلد ۳

فہرست مضامین

تصاویر ۔ مسٹر کھاپرڈے ۔ مسٹر پریم ؟

قیمت سالانہ قسم اول ہے قسم دوم عاً قسم سوم (بلا تصویر) عہ معہ محصولڈاک

آزاد پریس لاہور میں چھپکر مالک کے اہتمام سے شائع ہوا

پولیٹکل لٹریچر

ہندوستان میں آثار بیداری کے ساتھ یہ ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ ایسا پولیٹکل لٹریچر جو ملک میں صحیح جذبات اور جائز خواہشات پیدا کرنے والا ہو ملک کے روبرو پیش کیا جائے بہی خواہان ملک محسوس کر رہے ہیں۔ کہ محض اسی لٹریچر کی کمی ہے کہ بعض اوقات ناتجربہ کار رہروِ منزل سیاست کی دشواریوں سے ناواقف لوگ ملک کے لئے مصائب لاتے اور ہندوستان کی ترقی میں زیادہ اُلجھن ڈال دیتے ہیں۔ آزاد کی اشاعت کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ ہم سمجھتے ہیں کہ ملک کو اس قسم کی تصنیفات کی ذاتی لائبریری کی ضرورت ہے۔ انگریزی میں تو ایسی بہت سی کتابیں ملیں گی مگر اردو علم ادب ابھی تک ان سے محروم ہے اس اہم ضرورت کو محسوس کر کے ہم نے ایسی تصنیفات جو با مذاق محبان وطن کی الماریوں کی زینت اور ان کی خدمت میں باریاب ہونے کے لائق ہوں۔ اردو میں شایع کرنے کا ارادہ کیا ہے اس سلسلہ میں انگریزی تصانیف کے تراجم کے علاوہ ملک کے نامور زمانہ شناس اہل قلم کی تصانیف بھی شایع کی جائیں گی اور ان کی اشاعت کا انتظام اچھے کاغذ صحت اور خوبصورتی کے ساتھ ہوگا۔

اس سلسلہ کا آغاز مشہور محب ہند سر ہنری کوٹن کی لاجواب تصنیف

نیو انڈیا

کے ترجمہ سے ہوگا۔ اور آیندہ سہ ماہی کم از کم سو صفحہ کی ایسی ہی تصنیف ملک کے روبرو پیش کی جائے گی۔ مگر اس سلسلہ کی کامیابی کے لئے پانچ سو ایسے محبان وطن کی ضرورت ہے جو اس سلسلہ کی مستقل خریداری منظور کریں۔ ہم پیشگی قیمت نہیں مانگتے صرف عہ روپیہ بذریعہ منی آرڈر بھیجکر نام درج کرا لیجئے اور ہر ایک تصنیف آپ کی خدمت میں بصیغہ ویلیو پی ایبل بھیجی جائیگی کوشش کی جائیگی کہ سال کی چاروں تصانیف کی قیمت کسی صورت میں للعہ سے زیادہ نہ ہو خاص ارادہ کی تکمیل کیلئے محبان وطن کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔ نیاز مند لیش سہائے آزاد مالک وا...

G. S. Khaparde.

Mr. Bradla.

چولی دامن

از حضرت "کفر و اسلام گمنام" بی - اے

ہمارے عنایت فرما "حضرت کفر و اسلام گمنام" جو کسی خاص مصلحت سے اپنا اصل نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے - ایک ریاست میں ایک معزز عہدہ پر مقرر ہیں اور نامور مضامین نگاروں میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں - کثرت مشاغل اس عرصہ تک آزاد کی قلمی اعانت سے مانع رہی - مگر باوجود کارمنصبی کی کثرت کے آزاد کو نہ بھولے - اب یہ مضمون عنایت فرماتے ہیں اور لکھتے ہیں - "مدت کا وعدہ باوجود عدیم الفرصتی پورا کیا جاتا ہے" ہندو مسلمانوں کے اتحاد کے لئے جو کوششیں کی جا رہی ہیں - وہ یقیناً مفید نتائج پیدا کریں گی کیونکہ ایک محب وطن بھی بہت کچھ کر سکتا ہے چہ جائیکہ اب ہمارے بہت سے مسلمان بھائی اس مبارک مشن میں حصہ لے رہے ہیں - ہم مضمون دلی شکریہ کے ساتھ درج کرتے ہیں - ایڈیٹر

ہم ایک بن باسی سیلانی آدمی ہیں - دنیا کے غل غپاڑے سے تنگ آ کر

ہمالیہ کے دامن عاطفت میں آرام سے بسر کر رہے ہیں۔یہاں نہ طاعون کا گزر ہے نہ پالٹیکس کا۔ہم ایک اونچے پہاڑ کی چوٹی پر متمکن ہیں۔اور عالم سفلی کی خوش چہلیوں کا تماشا کر رہے ہیں۔یوں معلوم ہوتا ہے کہ ٹھگنے ٹھگنے آدمیوں کا ایک ہجوم ہے۔کبھی وہ ایک دوسرے سے گلے ملتے دکھائی دیتے ہیں۔اور کبھی جوتی اُچھلنے لگتی ہے۔کبھی وم بخود نظر آتے ہیں اور کبھی چیختے چلاتے سُنائی دیتے ہیں اور مولانا روم کا مصرعہ یاد آتا ہے۔کہ ع

برخیالے صلح شان وجنگ شان

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے۔کہ وطن کا مطلع کبھی صاف اور کبھی مکدّر نظر آتا ہے ہندو اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات کو ہمیشہ چولی دامن سے تعبیر کیا جاتا ہے مگر افسوس ہے۔کہ اگر چولی دامن میں یہی کشمکش رہی۔تو دونوں کی دھجیاں اُڑتی نظر آئیں گی۔تاریخ اقوام سے پایا جاتا ہے۔کہ جب کبھی پولیٹکل مطلع مکدر ہوتا ہے تو قوموں کی قومیں بلکہ حکومتیں بھی خلل دماغ کے ایک عالمگیر مرض میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔اور غیظ وغضب کے بخارات دماغوں پر مسلط ہو جاتے ہیں۔یہی حال آج کل ہندوستان کا ہے +

ابھی کل کی بات ہے۔کہ امیر کابل نے اپنی کابلی فارسی میں دو چار دل پذیر باتیں کہدیں جس کا نتیجہ یہ ہؤا۔کہ تمام ہندوستان میں اور خصوصاً پنجاب میں ایک عالمگیر تحریک مصالحت کی ہو گئی۔اور مختلف شہروں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے متفقہ جلسے ہو کر انجمنیں اور یادگاریں قایم ہونے لگیں۔مگر اتنے میں پالٹیکس اور ایجیٹیشن کا ایک سیلاب بنگال کی طرف سے اُٹھا۔اور بڑے بڑے پالیٹیشن اور محب الوطن اُس میں ڈبکیاں لینے لگے۔یہ طوفان امیر کابل کی یادگاروں کو بہا کر لے گیا۔اور چولی دامن میں پھر کھینچا تانی شروع ہوئی۔اب قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا

ہے۔ کہ آیا امیر کابل نے اپنے افغانی لشکر کے رعب سے یہ فوری اثر دلوں میں پیدا کر لیا تھا؟ اس کا جواب ظاہر ہے۔ کہ صرف امیر کی نیک دلی اور حسن تدبیر سے یہ نتیجہ مترتب ہؤا۔ دوسرا سوال یہ ہوگا۔ کہ آیا تیس کروڑ کی آبادی میں کوئی شخص ایسے دل ودماغ کا نہیں ہے۔ جو اِن دونوں قوموں کے خیالات اعتدال اور باہمی محبت کی طرف مایل کرے۔ اگر اِس کا جواب نفی میں ہے تو ہندوستان کی تعلیم اور ترقی کا نتیجہ قابلِ افسوس ہے +

یہ امر مسلم ہے کہ چولی دامن کی پھوٹ دونوں کے لئے یکساں مضر ہے۔ اور جب تک یہ دونوں قومیں یکدل نہ ہوں ترقی تمدن ناممکن ہے۔ میری رائے میں اس باہمی اختلاف کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ پولٹیکل ایجیٹیشن میں مسلمان اہل ہنود کے ہم آواز نہیں ہوتے۔ اور اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانا چاہتے ہیں۔ مگر مجھ کو یقین ہے۔ کہ مسلمانوں کا ایجیٹیشن میں شریک ہونا کبھی مفید ثابت نہیں ہؤا۔ اور نہ آیندہ ہوگا۔ سید احمد خان صاحب مرحوم مسلمانوں کو کانگرس کی شراکت سے صرف اِسی وجہ سے روکتے تھے کہ مسلمان کانگرس کو بھی لے ڈوبینگے چنانچہ اس بات کا پورا تجربہ پنجاب کی ایجیٹیشن سے ہوگیا۔ جن قوموں میں جنگی سپرٹ زیادہ اور تعلیم کم ہے۔ اُن کو شریک ایجیٹیشن کرنے سے مصالحہ تیز ہو جاتا ہے۔ اور ہنڈیا پھٹ جاتی ہے۔ اس لئے مسلمانوں کی علیحدگی سے کانگرس کو مشکور ہونا چاہیئے نہ شاکی! مگر اس پولٹیکل اختلاف کی وجہ سے دونوں قوموں میں غیظ وغضب کی آگ بھڑکنا قابلِ افسوس ہے۔ انگلستان میں جہاں کہ بنیاد حکومت پولٹیکل اختلاف پر رکھی گئی ہے۔ مخالف پارٹیوں کے سوشل تعلقات اور تمدنی معاملات میں فرق نہیں آتا۔ مگر ہندوستان میں جہاں کہ پالٹیکس ایک مجذوب کی بڑسے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ پولٹیکل خیالات کی بناپر دونوں

قوموں میں ایسی منافرت پیدا ہونا تعجب کا مقام ہے +

بعض ہندوستان کے ریفارمر اس بات کی ضرور کوشش کر رہے ہیں۔ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں پولیٹکل اتحاد پیدا ہو۔ مگر اس امر کا خیال نہیں کرتے۔ کہ

سوشیل اتحاد کے سوا پولیٹکل اتحاد ناممکن ہے

سب بہی خواہانِ ہندوستان کو سوشیل اتحاد کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے اور اُسکے موانعات کو دور کرنیکی کوشش کرنی چاہیئے انگریزی تعلیم اور نئی روشنی سے یہ توقع ہونی چاہیئے تھی کہ پُرانے تعصبات کو دور کر کے ہندو مسلمانوں میں قومیت کی روح پھونک دینی مگر بتیجہ بدقسمتی سے اس کے بالکل برعکس پیدا ہوا۔ میرے خیال میں دونوں قوموں کے لیڈروں کو اُن اسباب کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ جن سے یہ بے لطفی پیدا ہوئی۔ سوشیل اتحاد کے بہت سے موانعات ہیں۔ مگر میں صرف چند ضروری امور کی طرف توجہ دلاتا ہوں +

مذہبی اختلاف مانع اتحاد نہیں ہو سکتا۔ مہذب ممالک کی پولیٹکل پارٹیوں میں اختلاف عقاید ہارج نہیں ہوتا۔ اور زمانۂ حال کی تعلیم کا عام میلان بھی اسی طرف ہے۔ کہ اختلاف عقاید کی وجہ سے ایک شخص دوسرے سے نفرت نہیں کرتا۔ پرانے ایشیائی ہندوستان میں ہندو ویدانتیوں اور مسلمان صوفیوں کا خیال تھا۔ کہ ع

کعبہ اور بتخانہ میں سب جلوہ ہے وجہ اللہ کا

ہندو اور مسلمانوں کے تصوّف کا لٹریچر ایسا شاندار اور پاکیزہ ہے۔ کہ دونوں قومیں اُس پر فخر کر سکتی ہیں۔ موجودہ زمانہ کی آزادانہ تعلیم نے سب

جزوی اختلاف عقاید کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اور مذہبی منافرت درحقیقت بہت کم ہے +

بیس پچیس سال پیشتر بعض آریا اور مسلمان مصنفین میں چھیڑ چھاڑ شروع ہو گئی تھی۔ جس سے ہر دو فریق کی دل آزاری ہوتی تھی۔ مگر اب فیشن بہت کچھ بدل گیا ہے۔ اِس چھیڑ چھاڑ سے نہ کچھ اسلام کو فائدہ پہنچا ہے نہ آریہ مذہب کو اور یہ طریق مباحثہ خود بخود اجل طبعی سے مر رہا ہے۔ ہر ایک شایستہ خیال مذہبی پیش رو کا یہ فرض ہے۔ کہ وہ اپنے مذہب کے فضایل بغیر دوسرے مذاہب کی توہین و دل آزاری کے بیان کرے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایک فراخ دل وسیع النظر شخص کو ہر مذہب میں کوئی نہ کوئی خوبی نظر آئے گی۔ بہت بہتر ہو۔ کہ مذہبی محقق بجائے عیب جوئی کے دیگر مذاہب کی خوبیاں تلاش کریں۔ اب شیعہ۔ سُنی اور ہندو مسلمان کے مقابلہ کے دن نہیں رہے۔ بلکہ خدا پرستی اور الحاد کا مقابلہ ہے۔ اور مذہب اور سائینس کی جنگ ہے۔ اور ہندو مسلمان مذہبی پیشواؤں کا فرض ہے۔ کہ وہ باہمی کشمکش بالائے طاق رکھ کر اس نئے غنیم کا مقابلہ کریں۔ ورنہ یہ سمجھا جائیگا۔ کہ وہ پورانے دقیانوسی آدمی ہیں۔ جو وقت کی ضرورتوں سے محض بے خبر ہیں۔ خلاصہ مطلب یہ ہے۔ کہ اہل ہنود و اہل اسلام کی موجودہ منافرت مذہبی عقاید کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اسکے اور اسباب ہیں۔ میرے خیال میں ان اسباب میں اول نمبر موجودہ طرز تعلیم کا ہے۔ بچپن ہی میں تاریخ ہندوستان تفرقہ کی تعلیم شروع کرتی ہے اور ہندو بچے مسلمانوں کو راکشسوں کی اولاد محمود غزنوی کے وارث اور تیمور کے جانشین تصور کرنے لگتے ہیں۔ اور اس بھونڈی تصویر کو پرجوش قومی مصنف اور بھی ہیبتناک کر دیتے ہیں۔ اور اوایل عمر میں ہندو طالبعلم ملیچھوں کو آریہ ورت سے نکال دینے کے خواب دیکھنے لگتا ہے دوسری طرف مسلمان طالبعلم

رخصت اے ہندوستاں اے بوستان بیخزاں

کا وِرد کرتا ہے۔ اور گنگا جمنا کے گھاٹوں پر بیٹھکر دجلہ اور فرات کے تصور میں غوطہ زنی کرتا ہے۔ یہ خبر نہیں کہ محمود کی اولاد غزنی کی پہاڑیوں میں کھیتی باڑی کر رہی ہے۔ اور تیمور کا جانشین رنگوں میں سو رہا ہے۔ اور جو مسلمان اب ہندوستان میں موجود ہیں وہ اسی تیرہ خاک ہند کی پیداوار ہیں۔ بلکہ نوے فی صدی سے زیادہ ہندو بزرگوں کی اولاد میں سے ہیں۔ سررشتہ تعلیم کو کم از کم تاریخی کورس کی اصلاح کی طرف جلد توجہ کرنی چاہیئے۔ یہ کورس معصوم بچوں کے لیئے زہر کے گھونٹ کا کام دیتا ہے۔ اور تنگ نظر اور متعصب ابتدائی مدرس اس جام زہر کے ساقی بنتے ہیں۔ اور بچوں کے دماغوں میں منافرت کے خیالات کوٹ کوٹ کر بھرتے ہیں۔ ہر ایک شریف اور نیک دل معلم کا یہ فرض ہے۔ کہ اپنے شاگردوں کو وسیع انسانی ہمدردی کی تعلیم دے اور ان زرخیز کھیتوں میں حنظل کی کاشت نہ کرے۔ نیز پولیٹکس کی بھول بھلیوں میں بچوں کا دماغ پریشان کرنا سخت مضر نتائج پیدا کرتا ہے۔ سیاسی حقوق کی بحث پختہ مغزوں اور بڑے بوڑھوں پر چھوڑنی چاہیئے۔ چونکہ ہندوستان میں کوئی پارلیمنٹ اور پارٹی گورنمنٹ کا قاعدہ نہیں بچوں کے دماغ میں پالٹیکس ٹھونسنا محض بے سود ہے۔

طرز تعلیم کے بعد دوسرا نمبر اور شاید سب سے خاص نمبر دیسی اور خصوصاً قومی اخبارات کا ہے۔ ایک بڑے عالی دماغ مصنف سے کسی نے پوچھا تھا۔ کہ تمام دنیا میں امن قائم رکھنے کی بہترین تدبیر کیا ہے۔ اُس نے جواب دیا۔ کہ تمام اخبارات کو جلا کر خاک سیاہ کر دو۔ خود بخود امن قائم ہو جائیگا۔ میرا عقیدہ یہ ہے۔ کہ اگر ہندوستان میں کم از کم یہ تجربہ کیا جاوے۔ تو ہندو مسلمانوں میں ضرور امن قائم ہو جائیگا۔ یہ اخبارات رائی کا پہاڑ اور بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں تیس کروڑ

آبادی میں کوئی نہ کوئی جھگڑا تنازعہ ہوتے رہنا ناگزیر ہے۔ مگر خفیف سے
خفیف واقعات کو بھی یہ اخبار تعصب کا رنگ دیکر تمام ہندوستان میں ڈھنڈورا
پیٹ دیتے ہیں۔ اور غیظ و غضب کی آگ سلگاتے رہتے ہیں۔ اور ان غضبی جذبات
کی دلّالی سے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ کوئی دیسی عہدہ دار یا سربرآوردہ شخص اِنکے
متعصبانہ حملوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اور کسی دیسی کا اعتبار ان کی عنایات
سے قایم نہیں ہوسکتا۔ مجھے یاد ہے کہ دو تین دیسی اخباروں نے صُلح کل
کی پالیسی اختیار کرنی چاہی۔ مگر اس میں ان کو کامیابی نہ ہوئی۔ اور اخبار
چلانے کے لئے تعصب کا ٹیکا ان کو لگانا پڑا۔ میری رائے میں ملک کے اصلی
بہی خواہوں کا فرض ہے۔ کہ وہ دو تین ایسے اخبار پیدا کریں جن کی پالیسی معتدل
اور مایل بہ اتحاد ہو اور جن کے چلانے میں ہندو مسلمان مشترکہ طور پر شریک
ہوں۔ اِن امور کے علاوہ سوشیل میل جول میں متفقہ کوشش ہونی لازم ہے
اور چھوت کی بندشوں کو حتے الامکان ڈھیلا کرنا چاہیئے۔ ہندو مسلمانوں کا
ایک دوسرے کی دعوتوں اور تقریبوں میں شامل ہونا وہ نتائج خود بخود پیدا
کر دیگا جس کے لئے پولٹیکل ریفارمر عرصہ سے رائگان کوشش کر رہے ہیں۔
بلکہ فریقین کو ایک دوسرے کی قومی مجالس میں شریک ہونا لازم ہے۔ اِس سے
قومی جلسوں کی کارروائی بھی اعتدال پر آجائیگی۔ اور فریقین کو ایک دوسرے
کی ضروریات و مساعی سے ہمدردی پیدا ہوگی۔ فریقین کے بارسوخ اور نیک
دل لیڈروں کا فرض ہے کہ وہ عوام کی تنگ ظرفی کو نظرانداز کریں اور اتحاد کی
تحریک کریں۔ اِس غرض کے لئے اگر ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں
ہندو محمڈن سوشیل کلب اور سوسائٹیاں قایم کی جاویں۔ تو چند سال کے عرصہ
میں یہ تعصب اور بغض کی طاعون ملک سے دور ہوسکتی ہے۔ مبارک ہیں

وہ عالی ہمت بزرگ جو اس تعمیر اتحاد کا بنیادی پتھر رکھیں۔ فراخ حوصلہ ہندو ریفارمروں کو یہ امر ناگوار نہ گزرنا چاہیئے کہ مسلمان اپنے حقوق کی پیروی کسی دوسرے طریق سے کیوں کرتے ہیں مختلف راستوں پر چلنے سے کوئی نہ کوئی سبیل منزل مقصود کی نکل آتی ہے۔ اور ایک ہی راستہ پر چلنے میں یہ خوف رہتا ہے۔ کہ ع

اگر ناؤ ڈوبی تو ڈوبیں گے سارے

یوروپین ممالک میں بھی مختلف پولٹیکل پارٹیاں مختلف راستوں پر چلتی ہیں۔ مگر اہل ملک کے سوشیل اور تمدنی تعلقات میں اُس سے فرق نہیں آتا۔ اسی طرح پولٹیکل اختلافات کی وجہ سے ہماری برادرانہ زندگی اور باہمی اعتماد میں فرق نہ آنا چاہیئے۔ اور جن امور میں اتحاد اور یک جہتی ہمارے لئے صریحاً باعث نجات ہے۔ اُن کو موہوم پولٹیکل خیالات پر قربان نہ کرنا چاہیئے۔ مثلاً ترقی تجارت توسیع زراعت ترقی تعلیم وغیرہ صدہا امور میں ہم شراکت کر سکتے ہیں۔ جو باہمی بے اعتباری اور منافرت کی صورت میں خاطر خواہ طور پر انجام نہیں پا سکتے۔ فی زمانہ ترقی کا راز اہل ملک کی شراکت اور متفقہ کوشش ہے۔ اور مجموعی کوشش کا انفرادی کوشش کبھی مقابلہ نہیں کر سکتی +

یہی وجہ ہے۔ کہ ہمارا قدیم لٹریچر ہماری حیرت انگیز ہندی صنعت و حرفت اور ہماری وسیع زراعت سب کس مپرسی کی حالت میں ہیں۔ غنیمت ہے کہ گذشتہ چند سالوں میں دو تین علمی رسالے ایسے نکلے ہیں۔ جن میں ہندو مسلمان اہل قلم ایک دوسرے کے ہم زبان اور ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ اور اُن کی طرز تحریر سے بوئے آشنائی آتی ہے۔ خدا کو منظور ہے۔ تو کیا تعجب ہے۔ کہ ع

ہمیں بیضہ بر آرد پر و بال

ہم صدق دل سے اِس سرمنزل اتحاد کے چند مسافروں کا خیر مقدم کرتے ہیں - اور اُن کی کامیابی کی دعا کرتے ہیں - اور اس مضمون کو چولی دامن کے گیت پر ختم کرتے ہیں +

چولی دامن کا گیت

کہا دامن نے یہ چولی سے کہ بھولی چولی
آؤ اب صلح کریں جنگ تو ہولی چولی

آؤ گلشن کی کریں سیر کہ آتی ہے بہار
آنکھ غنچوں نے ہے گلزار میں کھولی چولی

جاگ اے بھاگ میرے کب کا زمانہ جاگا
نیند میں عمر گراں مایہ تو کھولی چولی

خار و خاشاک سے تو مجھ کو بچا کر جو چلے
گُلِ شاداب سے بھر دوں تیری جھولی چولی

مثلِ زنجیر میں لپٹا ہوں قدم سے جب تک
اُڑ کے جائے گی کہاں میری ممولی چولی

تو مجھے کرتی ہے ہر راہگذر میں پامال
میں لئے پھرتا ہوں سر پر تیری ڈولی چولی

دل نہ ہوں صاف تو ہیں پیار کی باتیں بے سود
پھول پھینکو تو ہے بندوق کی گولی چولی

لطف جب ہے کہ تیرا وِرد ہو دامن دامن
اور شب و روز میں جپتا رہوں چولی چولی

برہمن وعظ کہے شیخ بھجن گاتا ہو
عید کے روز رہیں کھیلتے ہولی چولی

کہیں دامن نے یہ اخلاص کی باتیں جس وقت
ایک انداز دل آویز سے بولی چولی

اے میرے پیارے سہانے میرے دامن دامن
تیری باتوں سے گئی دل کی سب اُلجھن دامن

برگ و بار ایک ہی ہیں نخل تمنا کے ہم
میں جو ہوں خوشہ تو تو اُسکا ہی خرمن دامن

رنج و راحت میں میرا ساتھ اگر تم دوگے
میں نہ چھوڑوں گی تمہارا کبھی دامن دامن

اک فقط پردۂ دیوار تھا حائل ہم میں
پردہ اٹھی تیرے روزن کی یہ چلمن دامن

راہِ الفت سے خراماں جو کبھی تو آ جائے
تیرے چرنوں سے ہو روشن میرا آنگن دامن

منزلِ شوق میں ثابت جو رہے تیرا قدم
میں محبت میں لگا دوں تری زن من دامن

یا ریکیل ہوں تو جنگل میں بھی منگل ہو جائے
ورنہ بدتر ہے بیاباں سے بھی گلشن دامن

راہِ الفت میں اگر چاک بھی ہو پیراہن
خارِ صحرا ہو رفو کے لئے سوزن دامن

گرچہ ہے سینہ امنگوں کا دفینہ میرا
تیرے قدموں سے ہی چلتا ہی یہ انجن دامن

سچ تو یہ ہے کہ ہے دامن کی بھی چولی سے بہار
اور چولی کا بھی گمنام ہے جوبن دامن

کسی جانیوالے سے خطاب

او جانیوالے! دیکھ! نہ یوں ٹھوکریں لگا!
کچھ دل میں سوچ! خاک غریبوں کی مت اُڑا!
پچھتائیگا! نہ ناز سے چل! تو سنبھل کے جا!
ہم کو بھی اپنی چال پہ ایسا ہی ناز تھا!
اب ڈھیر اگر خرابۂ دنیا میں ہیں تو کیا!
پہلے تو ہم بھی خاک بہت کچھ اُڑا چکے!

صبا سے شکایت

صبا جو خاک اُڑاتی ہوئی چلی آئے
کسی کیواسطے کچھ بھی نہ مژدہ تو لائے

کسی کو میری طرف سے بھی یہ نہ کہہ آئے
چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائے

بیاد آر حریفانِ بادہ پیما را

(جہانگیر)

سلسلۂ تعلیم ہندوستان

از مولانا حکیم برہم ایڈیٹر مشرق

نہایت اہم مسئلہ جو ہندوستان کی جملہ اقوام کے لئے بغیر کسی تفریق کے حد درجہ ضروری اور قابل غور ہے وہ تعلیم ہے ۔ موجودہ طریق تعلیم ناقص اور شدت سے قابل اصلاح ہے ۔ انگلستان کی دو مشہور اور سر برآوردہ یونیورسٹیاں آکسفورڈ اور کیمبرج ہیں ۔ جنہیں مذہبی خیال کے فیض رسان اشخاص نے قایم کیا ۔ اور گورنمنٹ سے ان کا کوئی تعلق نہیں ۔ اسی طرح ہندوستان میں بھی ضرورت ہے ۔ کہ ہر قوم کی علحدہ اور خود اپنے انتظام کے تابع یونیورسٹی ہو ۔ ہندو مسلمانوں کو اس کی ضرورت اس لئے زیادہ ہے کہ ان کے روایات اور عقاید خاص ہیں ۔ ایسی یونیورسٹی صرف امتحان لینے والی یونیورسٹی نہ ہونی چاہیئے بلکہ مذہبی تعلیم بھی بطور ضروری جزو کے شامل کی جائے ۔ اور خصایل حمیدہ پیدا کرنے کا خاص خیال رہے ۔ اور اس وسیع سلطنت میں قومی تعلیم کی ترقی اور اخلاقی تربیت کا وہ ذریعہ بنایا جائے ۔ یہ ماننا پڑے گا ۔ کہ کسی تعلیم میں کامل خوبی نہیں پیدا ہو سکتی ۔ جب تک اس کی مستحکم بنیاد مذہب پر نہ ہو ۔

اسی ذریعہ سے سائینس اور صنعت و حرفت کو بھی ترقی دی جاوے ۔ مالی دشواریاں پیدا ہوں گی ۔ مگر والیان ملک اور صاحب ثروت اشخاص انہیں توجہ سے اسے پورا کر سکتے ہیں ۔ یہ کوئی نیا یا نامانوس خیال نہیں ہے بلکہ علیگڈھ کالج قایم کرنے سے سرسید خلد آشیانی کا اصلی مقصود محمڈن یونیورسٹی بنانیکا تھا اور یونیورسٹی کمیشن میں جو کہ ذکر اس کالج کا کیا گیا ہے وہ اسی حالت اسی اسکیم

کی ہے جو سر سید کے مد نظر تھیں ÷

اس عہد حکومت میں تمام فرقوں کو کامل آزادی حاصل ہے کہ اپنی جماعت کے مختصر حصول مقصد میں ہر ایک جایز سعی کریں۔ اُن پر مباحثہ اور غور کریں۔ اس وقت اندرونی اور بیرونی حملوں سے امن حاصل ہے۔ اپنی تدبیر کے انجام دینے میں اگر غفلت کی گئی۔ تو اپنا قصور ہوگا۔ اور اس کی تلافی نہ ہو سکیگی۔ ہم لوگ برٹش تاج کے زیر سایہ اپنے خیالات کے موافق ترقی کے تمام ذرائع رکھتے ہیں۔ جب خیال ہوتا ہے۔ کہ ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سے تک تمام مدارس میں کس قدر طالب علم ہیں۔ اور ان کو برعایت اُن کے مذہبی عقائد کے کس طرح کی تعلیم دی جاتی ہے تو سخت شرم محسوس ہوتی ہے۔ بطور ایک قاعدہ کے ہم کو یہ نصب العین رکھنا چاہیئے۔ کہ دماغی تربیت مذہبی اور جسمانی تربیت کے ساتھ ساتھ چلے۔ اور اس کی تکمیل کے بعد پولٹیکل مطالعہ۔ مگر پالٹیکس کے پہلے صنعت وحرفت اور سائینس کی ضروری شاخوں میں کافی دسترس پیدا کرنی چاہیئے۔ حالت یہ ہے کہ صنعت و تجارت سے ہم اب بھی پہلو تہی کر رہے ہیں ÷

یونیورسٹی کے انتظام میں یہ ضروری ہے۔ کہ جب تک اپنی علیحدہ یونیورسٹی قائم نہیں ہوتی ہے۔ ہر ایک کوشش کرکے سرکاری یونیورسٹیوں کے سینٹ اور سنڈیکیٹ میں اپنی اپنی جانب سے کافی قائم مقام داخل کرائیں اور جہاں تک ممکن ہو فیلوز میں مختلف علوم کے جاننے والوں کو شرکت کا موقع دینا چاہیئے۔ کالجوں کی تعلیم میں عام رعایا کی طاقت برداشت کا خیال ملحوظ رہے۔ دوم درجہ کے کالجوں کو یونیورسٹی سے علیحدہ کر دینے میں ملک کی تعلیم پر برا اثر پڑیگا۔ یونیورسٹی کو اپنی حدود کے اندر اس امر کا قطعی اختیار رہنا چاہیئے۔ کہ لوکل ضرورتوں

کے مطابق تعلیمی نصاب قرار دے۔ امتحانات آرٹس میں تاریخ اور سیاست مدن کی شاخ مضبوط اور وسیع کی جائے۔ اس سے آیندہ عمدہ اور قابل اطمینان سیاسی روشنضمیری پیدا ہوگی۔ سیکنڈری اسکولوں میں ابتدائی سائینس کافی وسعت کے ساتھ بڑھایا جائے۔ تاکہ آیندہ کالج کی تعلیم میں اُلجھن نہ پیدا ہو۔ ایک یونیورسٹی سے اسکول فائنل پاس کرنے پر دوسرے یونیورسٹی کے امتحانات میں شرکت کی آزادی دیجائے اور اس بارہ میں میٹریکیولیشن کی نسبت عمر پر سختی سے اصرار نہ کیا جائے۔ بالخصوص اعلےٰ تعلیم میں کوئی صورت کمی یا غیر ضروری قیود کے ساتھ پیدا نہ کی جائے جو ملک کے لئے سراسر مضر ہوگی +

تعلیم میں ترقی اس وقت تک نہیں ہوسکتی۔ جب تک عمدہ پروفیسر اور مدرس نہ ہوں۔ اس لئے کہ ٹیچروں کی عمدگی ہی یونیورسٹی کی روح رواں ہے۔ ایک ماہر تعلیم کا قول ہے۔ کہ "تعلیم زندہ انسان کے ذریعہ سے زندہ انسان تک پہنچانے کے عمل کا نام ہے"۔ لیکن ہندوستان کی نسبت کہا جاسکتا ہے۔ کہ یہاں بہتیرے پروفیسر اور مدرس ایسے ہیں۔ کہ جن میں خود کسی طرح کی جان نہیں ہے نہ ان میں صداقت و آزادی کا جوش ہے جس سے دوسرے کو فائدہ پہنچا سکیں۔ اور جو لوگ اُن کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتے ہیں اُنہیں دماغی اور اخلاقی زندگی کے متعلق بہت کم فائدہ پہنچتا ہے +

درس و تدریس سے زیادہ معزز اور شریف کوئی مشغلہ نہیں ہے۔ استادوں کے اختیار میں ہے۔ کہ چاہے ملک کی قسمت کو بنائیں یا بگاڑدیں۔ لیکن کتنے استاد ہیں جو اس اعلےٰ ذمہ واری کو محسوس کرتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے۔ کہ معلموں کے درجہ کو ترقی دی جائے۔ جب ایسا ہوگا تو نہ یونیورسٹی کمیشن کی ضرورت

ہوگی نہ کمیٹیوں اور ریزولیوشنوں کی +

ابتدائی عہد حکومت برطانیہ میں جب مدارس قایم کیئے گئے تو اُس وقت ٹریننگ اسکول یا کالج نہ تھے جہاں اُستاد تیار کیئے جاتے - ایک عرصہ دراز کے بعد ایک حد تک یہ کمی پوری کی گئی مگر اب بھی بہت بڑی گنجایش ہے - یہ بھی ایک وجہ ہے کہ سر رشتہ تعلیم کی ملازمت میں تنخواہیں قلیل اور آیندہ ترقی کی امیدیں کم ہیں اس لیئے لایق اور مناسب اشخاص اس صیغہ میں بہت کم داخل ہوتے ہیں - ماتحت مدرسوں کی حالت ابتر ہے - پہلے جس شرح سے اُن کی تنخواہیں قرار دی گئی تھیں وہ حالت بدل گئی اور اب اُس تعداد میں کسی طرح ادنے درجہ کی عزت کے ساتھ بھی بسر کرنا ناممکن ہے - نرخ اجناس روز بروز اس قدر چڑھتا جاتا ہے - کہ ایک مستقل گرانی موجود رہتی ہے - تاوقتیکہ ان کی تنخواہوں میں ترقی کر کے بیدلی کا انسداد نہ کیا جائیگا - غرض مطلوبہ کا پورا ہونا معلوم - اس صوبہ میں یہ ضرورت محسوس کی گئی ہے - اور یقین ہے - کہ اس سے عمدہ نتایج حاصل ہونگے - قلیل تنخواہ پر تعلیم ایسی عظیم ذمہ واری کا پورا ہونا امر محال ہے - اور سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے - کہ تعلیم محدود نہیں - بلکہ اور وسیع کی جائے +

یہ تحریک ہر طرح سے سرکاری ہمدردی کی مستحق اور یونیورسٹیوں کے لیئے قابل توجہ ہے - کہ طالب علموں سے محض رٹنے کی عادت چھڑوا دی جائے لیکن یہ اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ یونیورسٹیوں کے بنیادی انتظام میں انقلاب عظیم نہ پیدا کیا جائے - یعنی یونیورسٹیاں صرف امتحان لینے والی نہ ہوں بلکہ تعلیم دینے والی ہوں +

ناقص علم کا آدمی ایک جانب سوسائٹی کا ناکارہ جزو ہوتا ہے اور دوسری طرف

غلط فہمیاں اُسے آسانی سے شکار کرسکتی ہیں۔ دل کی تربیت کے ساتھ حافظہ کی ترقی فراموش نہیں ہوسکتی۔ قوت حافظہ فہم کی خادمہ ہے اور بعض اوقات اور طرح کے سامان جمع کردیتی ہے۔ لیکن فہم وفراست انسان میں شاہانہ طور پر عمل وتصرف کرتی ہے۔ اور ایک ماتحت قوت کے لئے اس کا خون کرنا صحیح نہیں ہے۔ سب سے بہتر طریقہ یہ ہوگا۔ کہ فضولیات کو نکالکر کتابوں کا شمار کم کیا جائے۔ اور ضروری وکارآمد مضامین درس کے علاوہ حشو وزوائد چھانٹ دیئے جائیں۔ عام معلومات کی باتیں جو بطور خود سوسائیٹی کی شرکت یا ذاتی مطالعہ سے حاصل ہوسکتی ہیں۔ اُن کے لئے طالب علمی کے ایام کا ضایع کرنا ایک طرح کا ظلم ہے اس طرح درس دینے والے اور طالب علم کے دماغ میں سکون پیدا ہوگا اور ناحق کی پراگندگی وانتشار خیال سے نجات ہوجائے گی۔ یہی عمدہ نتائج پیدا کرنے کا طریقہ ہے۔ تب استادوں کی محبت اور فیضان علم طلبا میں اسپرٹ کا کام دے گا +

یونیورسٹی کمیشن نے انگریزی زبان کی تعلیم پر زیادہ زور دیا ہے اور اس خیال سے کہ اس زبان کے حاصل کرنے سے مغربی علوم کی کلید ہاتھ آجاتی ہے ہم اسے پسند کرتے ہیں کہ مردہ زبانوں کی تحصیل یا اُسکے جاننے کی کوشش کو زمانہ طالب علمی گوارا نہیں کرتا۔ مگر اس کے ساتھ ہماری رائے ہے کہ سیکینڈری اسکولوں کا معیار نصاب کم از کم کلکتہ یونیورسٹی کے مطابق بلند کردیا جائے۔ اسکول فائنل یا انٹرنس کا جو کورس اس وقت ان صوبجات میں رایج ہے وہ بالکل ناقص اور ادنٰے پیمانہ کا ہے۔ صرف انٹرنس پاس کرنے سے ایک آدمی درستی کے ساتھ دنیاوی کاروبار کو انجام دینے کی پوری قابلیت نہیں حاصل کرسکتا +

اب اس کا وقت بھی آگیا ہے کہ ہر یونیورسٹی کے صدر مقام پر ایک ایک

مرکزی درس گاہ اعلےٰ تعلیم اور تحقیقات علوم کے لئے سرکاری طور پر قایم کی جائے۔ ابھی رعایا نہ اس ضرورت کو سمجھ سکتی ہے نہ ایسا بار اُٹھانے کے قابل ہے۔ اور چونکہ گورنمنٹ خود اعلےٰ تعلیم اور تحقیقات علوم کی حامی ہے۔ اس لئے خزانہ سرکاری سے اس کا خرچ ادا کیا جانا نامناسب نہ ہوگا۔ جاپان میں فارغ التحصیل اور ڈگری یافتہ شائقین علوم کے لئے اس طرح کی لیبورٹیریاں اور وسعت تحقیقات کی درس گاہیں موجود ہیں۔ ایسی حالت میں برٹش گورنمنٹ تعلیمی ذمہ واریوں کی نسبت جاپان سے ہرگز کم نہیں ہے۔ یقین ہے کہ اس مسئلہ کو آنجہانی مسٹر جے این ٹاٹا کی اسکیم ریسرچ یونیورسٹی سے زیادہ مدد ملے گی *

چونکہ ہندوستانیوں میں ایک طرح کی عادت ہوگئی ہے کہ ہر معاملہ میں سرکاری رہبری و اعانت کا انتظار کرتے ہیں۔ اس لئے گورنمنٹ ہی کو سبقت کرنی چاہئے۔ اور ایک ایک انسٹیٹیوٹ اس قسم کا صوبجات کے صدر مقام میں سرکاری طور پر قائم کیا جائے۔ اس کے بعد پرئیویٹ اولوالعزمیاں خود ہی نمودار ہوں گی۔ اس طرح ہندوستان کی علمی وعملی ترقیات کا میدان بیحد وسیع ہوجائیگا۔ اگر گورنمنٹ اس امر پر فیاضانہ کارروائی کرنا چاہے تو کوئی ایسا زیادہ خرچ نہیں پڑے گا۔ جس سے بجٹ کی ضروری مدوں میں بہت بڑا یا خاص تغیر کرنا پڑے *

آخرکار گورنمنٹ کبھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوگی کہ یونیورسٹیاں سرکاری محکمہ نہ رہیں۔ مگر نظر بحالات ابھی اسے ایک زمانہ درکار ہوگا۔ معاملات تعلیم میں پبلک کا زیادہ اقتدار ہونا چاہئے۔ اور اس کے نظم ونسق ہمیشہ رعایا کی ضرورت اور خواہش کے مطابق ہونا قرین مصلحت ہے۔ اگر ضرورت

ہو تو اس کی اصلاح یوں ممکن ہے کہ قطعی اور آخری فیصلہ گورنمنٹ کے ہاتھ میں ہو اور تمام معاملات میں پبلک رائے کی کثرت ملحوظ رہے۔ اس طرح کام بھی عمدگی سے چلیگا۔ اور گورنمنٹ سے اعلے اختیارات نگرانی بھی قائم رہیں گے۔ ہماری صرف یہ غرض ہے کہ زیادہ تر انتظامی تعلق پبلک سے ہو تاکہ گورنمنٹ کو بھی سبکدوشی ہو جائے +

پانسو سال گذرے کہ براعظم امریکہ میں نہ کوئی پڑھنے والا تھا۔ نہ پڑھانے والا [illegible] تعلیم پر خرچ ہوتا تھا۔ لیکن آج معاملات تعلیم میں امریکہ کا [illegible] بیس ہزار استاد ہیں۔ اکرو ڑ طلبا اور [illegible] روپیہ کے برابر رقم سالانہ مد تعلیم میں خرچ کرتی ہے۔ اور [illegible] و سائنس کی مناسبت سے ساتھ ہی ساتھ صنعت و حرفت کی تعلیم بھی دی جاتی ہے +

ایک امریکن ریفارمر تعلیم کا قول ہے کہ سلطنت کی بنیاد دو چیزوں سے مستحکم ہوتی ہے۔ اولاً پبلک کا اتفاق۔ دوسرے پبلک کی عقل و فرزانگی۔ پہلی تربیت تعلیم مذہب سے اور دوسری مدارس سے پیدا ہوتی ہے +

امریکن تعلیم کی نسبت یہاں کے ملکی نوجوان ویسا ہی اشتیاق ظاہر کرتے ہیں جیسا ایشیائی حصہ جاپان کی بابت۔ اس لئے یہ امر قابل غور ہے کہ امریکن تعلیم کا سسٹم کیا ہے۔ اس سے آیندہ تعلیم ہندوستان کا نظام و انضباط قایم کرنے میں بہت مدد ملیگی۔ منجملہ اور امور کے چار خاص باتیں امریکن انتظام تعلیم کی بہت کچھ مستحق فکر و توجہ ہیں +

اول۔ یہ کہ وہاں تعلیم لازمی اور عالمگیر ہے۔ ہر جگہ درس گاہیں موجود ہیں۔ وہاں یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ راجاؤں اور امرا کے لڑکے چیفس کالج میں

تعلیم پائیں محض اسی وجہ سے کہ محلات میں پیدا ہوئے ہیں۔ بلکہ یہ قاعدہ ہے کہ مدارس میں ہر فرقہ اور حیثیت کے لڑکے بلا کسی امتیاز کے داخل ہو جاتے ہیں۔ جہاں صنعتی تعلیم بھی ملتی ہے۔ اور ساتھ ہی تربیت کا بھی لحاظ رہتا ہے۔ واشنگٹن میں پریسیڈنٹ روز ولٹ کے لڑکے اُسی مدرسہ میں پڑھتے ہیں۔ جہاں عام مزدوروں کے لڑکے تعلیم پاتے ہیں +

دوسرے۔ یہ کہ وہاں عام تعلیم مفت ہے۔ ۵ سال سے ۱۶ سال تک کی عمر تک لڑکے اور لڑکیاں بغیر فیس کے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اور تمام مصارف گورنمنٹ ادا کرتی ہے۔ یہ حالت ہندوستان کی نہیں ہے۔ لیکن ضرورت ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو۔ یہ کمی پوری کی جائے۔ اور اگر ہر لڑکی نہیں تو ہر ایک لڑکا جس کی عمر اسکول جانے کے قابل ہو۔ مفت اور لازمی تعلیم حاصل کرے۔ اس بارے میں تنہا گورنمنٹ کو ذمہ وار بنانا مناسب نہیں ہے۔ بلکہ اہل ملک کو بھی کوشش کی مختلف شاخوں میں ہاتھ بٹانا چاہیئے +

تیسرے۔ یہ کہ لڑکے اور لڑکیاں ایک ہی اسکول میں ساتھ ساتھ تعلیم پاتے ہیں اور زنانہ و مردانہ تعلیم کا جداگانہ انتظام نہیں ہے۔ مگر یہ طریقہ ہمارے ملک کے حسب حال نہیں ہے۔ یہاں ہندو اور مسلمان دونوں میں پردہ سسٹم کی سخت ضرورت ہے۔ اس عمل درآمد کی کوئی اُمید نہیں ہو سکتی۔ کم از کم کئی پشتوں کے بعد ایسا ہونا ممکن ہو تو ہو۔ لیکن مدارس نسوان کی علیحدگی اور پردہ داری کا کافی انتظام کرنے کے بعد ہم اس مشکل کو یوں رفع کر سکتے ہیں کہ لڑکے اور لڑکیوں کے اسکول تو علیحدہ ہوں۔ مگر باقی قاعدے یکساں ہوں۔ بلحاظ جنسیت کے البتہ کسی قدر فرق و امتیاز قایم کرنا پڑے گا۔ اور حالات و ضروریات ملک کا بخوبی اور قابل اطمینان طریقہ سے خیال رکھنا چاہیئے۔ اس خاص امر میں

گورنمنٹ اور مصلحان ملک دونوں کی اخلاقی سرگرمی اور سرفشانی کی ضرورت ہے *

چوتھے - یہ کہ بطور دستور اخلاق کے امریکہ میں جو قاعدے رائج ہیں اُنہیں یہاں بھی قانوناً جاری کرنے کی ضرورت معلوم ہوتی ہے - یعنی مدرسے جانے والے لڑکوں کی عمر کے لحاظ سے اُن کے والدین بطور ایک حکم کے پابند کئے جائیں - کہ لازماً وجبراً ایسے لڑکوں کی تعلیم دلانے پر مجبور ہوں - ہم دیکھتے ہیں کہ حفظان صحت کی غرض سے چیچک کا ٹیکہ جبریہ لگایا جاتا ہے - لوگ اس کی تعمیل پر مجبور ہیں - بصورت انحراف وخلاف ورزی والدین پر بعلت غفلت وبے پرواہی میونسپلٹی کے استغاثہ پر مجسٹریٹ پچاس روپیہ تک جرمانہ کر سکتا ہے - جب یہ حالت ہے تو عوام نے تعلیم کی جس قدر ضرورت محسوس کی ہے - اور جس پر وہ کاربند ہے - اُس کے اعتبار سے جبری تعلیم کا حکم رعایا کو بار خاطر نہ ہونا چاہیئے - آج کل ادنےٰ قوم کے لوگ بھی سرکاری ملازمتوں اور دفاتر میں پائے جاتے ہیں - اس سے اعلےٰ اقوام میں خودبخود تحریص پیدا ہوتی ہے - لیکن اگر جبری اور ایک خاص زمانہ تک مفت تعلیم کا طریقہ جاری کر دیا جائے - تو رعایا اور گورنمنٹ کی خواہشیں بہت کچھ اسی نسل کی موجودگی میں پوری ہو سکتی ہیں - اس کے لئے ضرورت ہو گی - کہ بلحاظ رقبہ یا باعتبار مردم شماری ہر مقام پر چند فری اسکول قائم کئے جائیں - اور ایسے سرکاری مدد دی جائے - اس بارہ میں آنریبل مسٹر گوکھلے کی جو عظیم الشان اور مدلل تجویز ہے اُس کا ذکر کرنا چنداں ضروری نہیں ہے - لیکن اگر اُس کی بنیاد پر کارروائی کی جائے تو ملک اور گورنمنٹ دونوں کے لئے مفید ہو گا *

اگر گورنمنٹ اس پر آمادہ ہو اور یہ عقدہ لاینحل پیش نہ آ جائے - کہ جہلا اکثر

دیکھتے ہیں کہ خزانہ میں گنجایش نہیں ہے - تو ہم اسے پسند کرینگے کہ جیح ناگزیر امور
پر اب کی طرح کوئی خفیف سا ٹیکس عاید کر دیا جائے - یہ اضافہ ہرگز ناگوار نہ
ہوگا - اس سے بھی بہتر یہ صورت ہے - کہ جب انکم ٹیکس عاید کیا گیا تھا - تو جنگ
ایک ضرورت موجود تھی - اور اب باوجود کہ ضرورت نہ رہی - وہ ٹیکس بدستور
قایم ہے - رعایا کے متواتر واویلا سے اتنا تو ضرور ہوا کہ ٹیکس ناچیز شی کی بدولت
پانچ سو سے بڑھا کر ایک ہزار سالانہ آمدنی کے اشخاص مستوجب ٹیکس قرار پائے
ہیں - پس اگر اس ٹیکس کو قایم ہی رکھنا ہے - تو اس کی تمام آمدنی اس مد میں دے
دی جاوے - اس طرح رعایا بجائے شکایت کے احسان مند ہوگی - اور
گورنمنٹ کو کوئی جدید ٹیکس بھی نہ لگانا پڑے گا - جس سے پبلک بیزار ہو - ممکن
ہے آج ایسے کسی ٹیکس یا انکم ٹیکس کو اس جانب منتقل کر دینے پر اختلاف
کیا جائے جو ترقی تعلیم میں خرچ ہوگا - لیکن چند ہی روز کے بعد لوگ اس کا
اعتراف کرینگے کہ تمام مصارف سلطنت میں یہی ایک مد ہے جو صحیح طور پر
خرچ ہو رہی ہے - ایسا کرنے سے والدین مفلسی کے باعث تعلیم نہ دلا سکنے
کا عذر نہ کر سکیں گے - نہ کسی دوسرے طریق پر اپنے لڑکوں کو اسکول میں داخل
کرنے سے گریز کریں گے ؛

یہ ٹھیک ہے کہ تعلیم صرف بڑے بڑے شہروں تک محدود نہ ہونی چاہیئے
بلکہ اس کی روشنی چھوٹے چھوٹے موضعوں اور مزروعوں میں بھی پہنچانے کی
ضرورت ہے - امریکہ کے قصبات میں بھی لیٹن - فرانسیسی - طبعی - تشریح - کیمیا
اور یونانی زبان کی تعلیم دی جاتی ہے - اور وہاں کی دیسی تعلیم کی وہ قیمت ہے
جو یہاں کے بی - اے سے کم نہیں ہے - وہاں تعلیم اس قدر عام ہے - کہ
فی صدی ایک بھی جاہل نہیں ہے - مقام لوئی شانیا میں جو امریکہ کے تابع

حاصل کرنے کے بعد ان تعلیم گاہوں میں داخل ہو کر کسی خاص فن کی تکمیل کرتے ہیں ۔

امریکہ کے اکثر طلبہ ایام تعطیل میں کچھ نہ کچھ کام کر کے اخراجات تعلیم پورے کر لیتے بلکہ کچھ پس انداز بھی کرتے ہیں۔ جیسا کہ مسٹر مہیش چرن سنگھ کے حالات سے ظاہر ہے۔ سلطنت امریکہ کے بے تاج فرماں روا سابق پریسیڈنٹ میکنلے ایام تعطیل میں پڑھائی کر کے اپنا خرچ نکال لیتے تھے اور پریسیڈنٹ گارفیلڈ چھٹی کے دنوں میں لوگوں کے مکانات صاف کیا کرتے تھے۔ اور اس کی اجرت سے مصارف تعلیم بہم پہنچاتے تھے ۔

نہیں معلوم اس طرح کے خوش آیند خواب زریں ہندوستان کے حق میں کب صحیح تعبیر والے ہوں گے ۔

یہ نہایت مناسب ہوگا کہ اس جگہ ہم دنیا کے تعلیم ممالک کے اخراجات تعلیم اعلیٰ کا ایک نقشہ درج کر دیں۔ اس سے حالات پر بہت صاف روشنی پڑے گی۔ اور ظاہر ہو جائے گا۔ کہ بلحاظ مصارف اعلیٰ تعلیم کے بدنصیب ہندوستان کا کیا درجہ ہے ۔

نام ملک	کل مصارف اعلیٰ تعلیم	اوسط خرچ فی کس آبادی پر
آسٹریلیا	۳۴ ۸ لاکھ	۶/
بلجیم	۳۴۲ لاکھ	۱۴/
ڈنمارک	۹ لاکھ	۸/
فرانس	۱ کروڑ ۸۴ لاکھ	۱۴/
جرمنی	۲ کروڑ ۳۰ لاکھ	۷/

نام ملک	کل مصارف اعلےٰ تعلیم	اوسط خرچ فی کس آبادی پر
برطانیہ عظمیٰ وائرلینڈ	۲ کروڑ ۵۵ لاکھ	۱۱/
یونان	۳ لاکھ	۲/
اٹلی	۵۰ لاکھ	۳/
ناروے	۴ لاکھ	۴/
روس	۱ کروڑ ½ ۴۲ لاکھ	۲/
اسپین	۱۵ لاکھ	۱۰/
سویڈن	۱۲ لاکھ	۱۰/
سوئیرزلینڈ	۲۱ لاکھ	۱۱/
امریکہ	۴ کروڑ ۵۰ لاکھ	۱۱/
کناڈا	۵ کروڑ ۲۵ لاکھ	۱۰/
ہندوستان	۲۴ لاکھ	۳ پائی

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ مجموعی تعداد خرچ کرنے میں کناڈا اول نمبر ہے۔ اور فی کس آبادی کی اوسط سے اول درجہ برطانیہ وائرلینڈ کا ہے۔ سوئیرزلینڈ اور امریکہ میں ۱۱/ فی کس اوسط ہے۔ اسی کے ساتھ ملاحظہ ہو۔ ہندوستان کی حالت جس کی آبادی تیس کروڑ ہے۔ کہ یہاں اعلےٰ تعلیم کی شرح فی کس تین پائی ہے ــ بہ بین تفاوت راہ ازکجاست تا بہ کجا۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ باشندگان ہند کی ذہنی و دماغی محسوسات اس حد تک تہیں پہنچی ہیں کہ اپنے نیک و بد کا انجام سمجھ کر خود کوئی انتظام کرنے کے قابل ہوں۔ اس لئے ہر حالت میں سرکاری امداد و اعانت کی ضرورت ہوگی

اور گورنمنٹ ہند یہ منظور کر سکتی ہے۔ [illegible] اور کثیر حاصل ملک سے ایک
معقول رقم رعایا کی سود و بہبود کے لئے اور تعلیم و تربیت کے واسطے علیحدہ
کر دیتی۔ اور حسب ضرورت اس میں اضافہ کرتی رہتی۔ اس کوشش میں
گورنمنٹ کا بدترین نکتہ چین اعتراض کرنے کی جرات نہ کر سکیگا ◆

اگر بالفعل ہم اہل ملک کے ہاتھ [illegible] سکتے ہیں۔ تو یہ
ضرور ہے کہ [illegible] تعلیم [illegible] کر دیا
جائے۔ [illegible] لوگ
ضرورت سے واقف [illegible] کے یہ
امر بخوبی [illegible] ہم لوگ پہلے
سرکاری ہی ذرائع سے [illegible] اس کی تکمیل [illegible] سرکاری ہاتھوں
سے ہونی چاہئے۔ یہ ایسی بات [illegible] گورنمنٹ ہند اور باشندگان ملک
دونوں کو اس پر متفق و شریک ہونا چاہئے کیونکہ دونوں کے حق میں خیر و برکت
کا باعث ہوگا ◆

غزل

تمام عمر یونہی تیرے لئے خراب رہا ۔ کہ جیسے دشت میں تشنہ پئے سراب رہا
خدا کا خوف محبت بتوں کی دل کے ناز ۔ اس ایک جان پہ کیا کیا نہ کچھ عذاب رہا
ہلال ہو گیا اک شب کو بدر بھی تو کیا ۔ ترا تو حسن ازل سے ہی لاجواب رہا
تو اپنے روئے کتابی پہ خال کی مت پوچھ ۔ یہ نکتہ جب سے ملا داخل کتاب رہا
وہ ایک لیلیٰ کہ مجنوں سے روز ملتی تھی ۔ اور ایک تو کہ سدا مجھ سے اجتناب رہا
رہا جہان میں جہانگیر مضطرب احوال ۔ کبھی نہ چین سے وہ خانماں خراب رہا

علیگڈھ پارٹی اور پالٹیکس

از ... فاروقی صاحب

ہم اور گل دونوں ہی باغ جہاں کے پھول ہیں لیکن
وہاں مٹھی میں زر ہے اور یہاں خالی ہتھیلی ہے

انڈین نیشنل کانگرس کے قیام کی اصلی غرض و غایت یہ تھی کہ اُس کے ذریعہ سے تمام ملکی قوتیں ایک خاص مرکز پہ مجتمع کر کے اُن سے ہندوستان کے فواید کی نگہداشت اور یہاں کے باشندوں کی ساری قومی ضرورتیں باہمی میل سے پوری کی جائیں اس قسم کی انجمن جو عام نفع رسانی کے لئے معرض وجود میں لائی گئی ہو اس امر کی جایز طور پر مستحق تھی کہ ہندوستان کے لوگ عام اس سے کہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں اُس کے ساتھ پوری پوری ہمدردی کرتے اور اُس کی کامیابی کے جان و دل سے خواہاں ہوتے *

اول اول تو ہندو مسلمان دونوں نے غیر معمولی جوش و خروش کیساتھ کانگرس کا خیر مقدم ادا کیا اور خود سرسید مرحوم جنہوں نے آخر میں کانگرس کی مخالفت کو اپنا شعار بنا لیا اُس کے ہمدردوں میں تھے۔ ہندو مسلمانوں کی یک جہتی اور میل جول کا دلفریب نظارہ سب سے پہلے کانگرس کے پنڈال میں نظر آیا۔ لیکن افسوس ہے کہ ہندوستان کی بدقسمتی کا باعث اتفاق و اتحاد کی یہ قابل تعریف مثال دیرپا نہ ثابت ہوئی اور بہت جلد اُس میں رخنہ پڑ گیا *

اینگلو انڈین اصحاب کی تاثیر صحبت اور سر آکلینڈ کالون کی فیض تربیت سے جو سبق سر سید احمد خان مرحوم مغفور کو ملا تھا۔ اُس کا نتیجہ بہت جلد ظاہر ہوگیا۔ سید نے کانگرس سے علیحدگی اختیار کی اور صرف اسی پر خاموش نہ ہوئے۔ بلکہ کانگرس کے نقائص وعیوب کا علانیہ وعظ شروع کر دیا۔ لکھنؤ میں مجمع عام کے روبرو ایک معرکتہ الآرا لکچر دیا۔ جو آج کل مخالفت کانگرس کا سنگ بنیادی خیال کیا جاتا ہے۔ اس لکچر نے جو زہریلے خیالات مسلمانوں میں پھیلائے۔ اُن کے لئے اگرچہ پنڈت اجودھیا ناتھ آنجہانی کی جوابی تقریر نے تریاق کا کام کیا۔ لیکن پھر بھی بعض طبیعتیں اُسے قبول نہ کرسکیں۔ اور مسلمانوں کا ایک حصہ جو سید صاحب کا مداح ومقلد تھا۔ کانگرس سے کنارہ کش ہوگیا +

اس طرح مسلمانوں میں کانگرس کی مخالفت کی جڑ قایم ہوئی اور جس قدر کانگرس اپنی کارگذاریوں کی بدولت مشہور ومحسود ہوتی گئی۔ اُسی قدر مخالفین کانگرس کا جوش بڑھتا گیا۔ چنانچہ آج بھی باوجود ترقی علم وفضل کے مسلمانوں کا ایک گروہ جو فطرتاً تقلید پسند واقع ہوا ہے وہی پرانا راگ الاپ رہا ہے +

سید نے اپنے محولہ بالا لکچر میں جس طریقہ استدلال سے کام لیا ہے اور جو بعید از قیاس تاویلات وتوجیہات اپنی تائید میں کی ہیں۔ اُنہیں دیکھ کر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ اس جگہ ہمیں اُن کا اعادہ منظور نہیں۔ مگر مختصراً یہ کہنا چاہتے ہیں۔ کہ اُس لکچر کا خلاصہ مطلب یہ ہے۔ کہ مسلمان ہمیشہ پالٹیکس سے بچیں اور گورنمنٹ سے کوئی پولٹیکل خواہش نہ کریں اور اپنے آپ کو اُس کے رحم وکرم پر چھوڑ دیں۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ سر سید کا یہ خیال

کہاں تک لایق تعریف ہے اور نہ ہم کو یہاں یہ دکھانا منظور ہے۔ کہ اس نصیحت پر عامل ہونے اور اپنی تمام دماغی وذہنی قوتوں کو معطل کرکے حب الوطنی اور ہمدردی قوم کے اعلے اور پاک جذبات کا گلا گھونٹنے کے نتائج کس حد تک قومی اور ملکی ترقی کی سدراہ ہیں۔ بلکہ ہم ایک دم کے لئے فرض کئے لیتے ہیں (اگرچہ ہمارا ضمیر اسے ایک لحظہ کے لئے بھی نہیں مان سکتا) کہ سرسید جو کچھ کہا راست کہا۔ ٹھیک کہا۔ لو فرضاً کہ اُن کا فرمودہ آیات و واخبار کی طرح ذی وقعت تھا۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اُس کا اثر مسلمانوں پر کیا ہوا؟

مسلمانوں کا کثیر حصہ وہ ہے کہ جس کو کانگرس کی موافقت ومخالفت سے بظاہر کوئی واسطہ نہیں وہ اپنے پیٹ کے دھندے میں ہے۔ لیکن غور کیجئے تو اُن کو اصلاً کانگریسی پائیگا کیونکہ وہ اپنی زندگی میں جن ضرورتوں کو محسوس کرتے ہیں اُنہیں کے بہم پہنچانے کے لئے کانگرس کوشاں ہے ✦

ایک گروہ مسلمانوں کا وہ ہے جس نے سرسید کے علے الرغم کانگرس کا ساتھ دیا۔ اس میں جسٹس بدرالدین طیب جی وغیرہ کے اسماء گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ انگریزی تعلیم کی بدولت چونکہ لوگ اپنی حاجات سے واقف ہوتے جاتے ہیں۔ اور اُنہیں کانگرس اپنی اصلی شکل وشباہت میں نظر آتی ہے اس وجہ سے یہ گروہ اب روبترقی ہے۔ اس گروہ میں بعض وہ بزرگ بھی ہیں جو علیگڈھ کالج میں تعلیم پانے کے باوصف بانی کالج کی تقلید سے بچے رہے اور اب کانگرس کے سرگرم حامیوں میں ہیں ✦

ایک تیسری جماعت مسلمانوں کی اور ہے جس پر ان دونوں کے برخلاف سرسید کی تعلیم پوری اُتری۔ اس جماعت میں کچھ تو وہ لوگ ہیں جنھوں نے

علیگڈھ کالج میں تعلیم پائی ہے۔ اور کچھ وہ جو سرسید مرحوم کے دوست اور رفیق رہے ہیں۔ اور بعض ایسے بھی ہیں جو نہ تو علیگڈھ کے تعلیم یافتہ ہیں نہ سرسید کے دوست۔ لیکن کسی نہ کسی طرح وہ علیگڈھ کی آب و ہوا سے متاثر ہو گئے۔

موخر الذکر گروہ سرسید احمد خان کے پورے طور پہ پیرو ہونیکا مدعی ہے اور واقعی اُس کا یہ دعوے ایک حد تک واقعات و تجربہ کے لحاظ سے صحیح ہے لیکن ذرا غایت نظر سے دیکھنے پر یہ باسانی سمجھ میں آسکتا ہے۔ کہ فی الحقیقت سرسید مرحوم کی رائے پر اس نے عمل نہیں کیا۔ کیونکہ رفتار زمانہ اور ضروریات ملکی کی وجہ سے اس جماعت کو بھی سرسید کے بتائے ہوئے راستہ سے ہٹنا پڑا اور اگرچہ اُس نے اپنی تبدیلی پروگرام کی عجیب عجیب توجیہات پیدا کر لیں لیکن اُن کے طریق عمل سے یہ امر کافی طور پہ پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا کہ سرسید کی پالیسی پولیٹکل امور میں محض غیر مناسب بلکہ غلط تھی۔ اور اس کے غیر صحیح ہونے کی اس سے زیادہ زبردست دلیل کیا ہو سکتی ہے کہ خود اُن کے مقلد اور اُن کے ہم خیال لوگ اُن کے مشورہ پر زیادہ عرصہ تک عمل نہ کر سکے اور انہیں بہ مجبوری پالیٹکس میں دخل دینا اور اس طرح اصولاً انڈین نیشنل کانگرس کے ساتھ اتفاق کرنا پڑا۔

ہمارے اس دعوے سے شاید وہ لوگ جو سطحی نظر سے رائے قائم کر لینے کے عادی ہو گئے ہیں متفق نہ ہوں لیکن انصافاً ہمارا خیال درست ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شروع شروع میں اس گروہ نے جس کا مفہوم اب علیگڈھ پارٹی کے اصطلاحی الفاظ میں ادا کیا جاتا ہے سیاسی کوششوں سے دور رہنا چاہا۔ لیکن سرسید مرحوم کے انتقال پر ملال کے بعد ہی

اُنہیں اپنے پولٹیکل حقوق کا اتلاف گوارا نہ ہو اور اُن کے تحفظ کے لیئے اُن کو ایک سیاسی انجمن کی ضرورت معلوم ہوئی - ہم اپنے ایک گذشتہ مضمون میں اس بات کو بہ تفصیل بتا چکے ہیں کہ مسلمانوں کی توجہ کس طرح پالٹیکس پر مبذول ہوئی اور اس بات میں اُن کی جانب سے کیا کیا کارروائیاں عمل میں آئیں اور باآخر کیسے محمڈن ڈیپوٹیشن کو وائسرائے ہند کی بارگاہ میں باریاب ہوئے اور پھر آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کی شکل پیدا ہو گئی - اس جگہ ہم ان باتوں کو بخوف طوالت وضاحت کے ساتھ عرض کرنا نہیں چاہتے مختصر یہ ہے کہ اب آل انڈیا مسلم لیگ علیگڈھ پارٹی کا باقاعدہ آرگنائزیشن ہے جس کا قایم ہونا سید کی رائے کا بہ اسے خود ابطال ہے - اب یا تو لیگ کے وجود سے انکار کرو ورنہ سید احمد خان مرحوم کی پولٹیکل پالیسی کے لغو اور غلط ہونے میں شبہ نہیں ٭

یہ بات بہت کچھ قابل اطمینان ہے کہ علیگڈھ پارٹی نے حیص بیص اور سوچ بچار کے بعد پالٹیکس کے میدان میں قدم رکھا ہے - اور خدا خدا کر کے کفر ٹوٹا ہے - لیکن ابھی یہ بات غور طلب ہے کہ علیگڈھ پارٹی کو کس حد تک پالٹیکس میں تجربہ ہے - اور وہ کہاں تک برعم خود مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کر سکتی ہے ٭

مجھ ایسے بے بضاعت شخص کا شاید یہ کام نہ ہو کہ اُن لوگوں کے علم و فضل پر کوئی رائے قائم کر سکوں جو علیگڈھ پارٹی کے پولٹیکل کاموں میں راہنما ہونے کی عزت حاصل کر چکے ہیں - لیکن جس طریقے پر اُنہوں نے اپنا پروگرام مرتب کیا ہے اور جن تدابیر سے وہ اپنی مقصد برآری چاہتے ہیں - اُسی سے اُن کی کم نظری کا پتہ چلتا ہے ٭

علیگڈھ پارٹی اور اُس کی مسلم لیگ نے اب پولٹیکل میدان میں قدم رکھ کر اپنے اوپر سے اُس پورانے الزام کو مٹانا چاہا ہے جو اُس پر مدت سے چلا آرہا تھا کہ وہ بخیال خود تمام مسلمانوں کے قائم مقام وسرگروہ ہونے کے باوجود اُن کی اصلی اصلی حاجات سے غافل ولاپروا ہے۔ لیکن وہ لوگ جواب تک اظہار رائے میں حقیقی آزادی اور بے نفسی سے کام نہیں لے سکتے۔ کہاں تک اپنے فرایض پورے کر سکتے ہیں قابل غور مسئلہ ہے اور بحالت موجودہ ہمیں اُن کی کارگذاری پر بھروسہ کرنے میں ابھی تامل ہے +

علیگڈھ پارٹی کو ابھی تک پالٹیکس سے بہت کم تعلق رہا ہے اور اس وجہ سے اُس کے لئے مسلم لیگ کی ذمہ واریاں بالکل نئی ہیں اور ابھی تک اس کا تجربہ اس قدر پختہ اور وسیع نہیں کہ وہ اپنی خدمات محسوس کر سکے اور ہندوستان کی عام بہبودی کے ذرایع عمل میں لاسکے اور شاید یہی وجہ ہے کہ ابھی تک اُس نے اپنا پولٹیکل پروگرام نہایت ہی محدود رکھا ہے +

علیگڈھ پارٹی پالٹیکس میں سید احمد خان کے بعد نواب محسن الملک مرحوم کے خیالات و مقالات کی پابند رہی۔ لیکن نواب صاحب وہی تھے جنہوں نے پہلے تو اُردو کی حمایت میں گورنمنٹ صوبجات متحدہ کے خلاف صدا بلند کرنی چاہی۔ لیکن سر انٹونی میکڈانل کی ایک معمولی چشم نمائی کے ساتھ آواز بند ہو گئی۔ جن لوگوں نے نواب صاحب سے اخلاقی جرأت کا سبق حاصل کیا ہو اُن سے سوائے زمانہ سازی کے اور کیا ہو سکتا ہے +

علیگڈھ پارٹی کو پالٹیکس سے اب تک اسی قدر واسطہ ہے کہ اُس نے گورنمنٹ کی ہر ایک کارروائی کے ساتھ عام اس سے کہ وہ ہندوستان کے حق میں مفید ہو یا مضر اتفاق اور اُس پر اظہار اطمینان کیا ہے +

۱۹۰۸ء گورنمنٹ کی جابرانہ طرز عمل کی بدولت ہندوستان کے لئے بہت ہی پُر آشوب گذرا ہے۔ لیکن علیگڈھ پارٹی نے اس زمانہ میں بالکل خود غرضی کی پالیسی برتی اور اس طرح گورنمنٹ کی نظروں میں اپنا وقار بڑھانیکی کوشش کی +

کیسے شرم و افسوس کی بات ہے کہ لالہ لاجپت رائے ایسا محب وطن محض وطن کی خاطر کسی بدگمانی کی وجہ سے جلا وطنی کی مصیبت میں مبتلا ہو۔ ہندوستان میں اس دل شکن واقعہ پر تھلکہ مچ جائے اور سارے ہندو اور رقیق القلب و انصاف پسند مسلمان اس ناگہانی آفت پر اُن کے ساتھ ہمدردی کریں اور علیگڈھ پارٹی آئین اخلاق و احکام شرع مبین کے برخلاف اس سانحہ پر مسرور و مبتہج ہو +

لالہ لاجپت رائے کی جلا وطنی سے پہلے کے واقعات پر اگر غور کیجیے تو معلوم ہو جائے گا۔ کہ علیگڈھ پارٹی نے ہر دفعہ احکام گورنمنٹ پر اٰمنّا وَصَدَّقْنا کہکر اُس کی مزاج شناسی کی داد دی ہے +

تقسیم بنگال سے بنگالی عموماً ناراض ہوئے۔ اور آج تک اُن کی ناراضی بدستور باقی ہے۔ لیکن نواب صاحب ڈھاکہ کی بدولت جن کے وجود سے علیگڈھ پارٹی میں عجیب عنصر کا اضافہ ہوا ہے۔ مسلمانوں نے قابل افسوس رویہ سے کام لیا۔ پہلے بالکل بے تعلقی ظاہر کی۔ پھر نواب صاحب معلوم نہیں کس وجہ سے "تقسیم" سے موافق ہو گئے۔ لیکن یہ امر ہنوز تصفیہ طلب ہے۔ کہ واقعی عامہ مسلمین کا اس بارہ میں کیا خیال ہے۔ کیونکہ گذشتہ سال نواب خواجہ عتیق اللہ صاحب برادر نواب صاحب ڈھاکہ نے اجلاس کانگریس کے موقع پر اس کا اعتراف کیا تھا۔ کہ

اُن کے خاندان میں تمام لوگ سوائے نواب خواجہ سلیم اللہ کے تقسیم کے خلاف ہیں +

تقسیم بنگال کے بعد سر فلر کی گورنمنٹ کے خلاف بنگالیوں کو شکایت پیدا ہوئی - ایک طرف تو پبلک کا "فلر شاہی" کی بدولت ناکوں دم آگیا - اور ادھر علیگڈھ پارٹی اور اُس کے ہم خیال پیروؤں نے صدائے احسنت و مرحبا سے فلر صاحب کا دل بڑھا کر انہیں جبر و تشدد پر اور مایل کیا - لیکن اس کا نتیجہ مسٹر فلر کے حق میں اچھا نہ ہوا - اور اُن کو اپنی خود مختارانہ حکومت سے آخر ش سبکدوش ہونا پڑا - اس پر علیگڈھ پارٹی کو سخت ملال ہوا گویا اُسے یہ ناپسند تھا - کہ مخالفین تقسیم بنگال کی مصیبتوں کا اس قدر جلد خاتمہ غیر متوقع طور پر ہو جائے +

ان دو چار باتوں کے بیان کر دینے سے اس جگہ یہ بتا دینا منظور ہے کہ علیگڈھ پارٹی نے محض گورنمنٹ کی ہاں میں ہاں ملا دینے اور اہل ہنود اور آزادرائے مسلمانوں کی مخالفت کرنے کا نام پالیٹکس سمجھ رکھا ہے - اور دو ایک عہدہ ہائے جی حاصل ہو جانے کی وجہ سے وہ اپنی قایم کردہ پالیسی کو صحیح خیال کر بیٹھی ہے - حالانکہ کانگرس سے علیحدہ ہو کر اور ناپایدار کامیابیوں پر قانع ہنکر وہ ملک و قوم کو رتی برابر فائدہ نہیں پہنچا سکتی +

تعجب نہیں - کہ ہمارے اس خیال کے ساتھ اتفاق نہ کیا جائے لیکن ہم نیک نیتی کے ساتھ عرض کرنا چاہتے ہیں - کہ اگر آج نہیں تو کل علیگڈھ پارٹی اپنی غلطی سے واقف ہو گی - اور جب اُس میں سچی حب الوطنی کی سپرٹ پیدا ہو جائے گی - تو پھر ممکن نہیں - کہ آل انڈیا مسلم لیگ اپنی

ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ بنائے۔ ہمیں اُمید ہے۔ کہ جس طرح سرسید کے فرمودہ سے الگ ہو کر آج علیگڈھ پارٹی کو پالیٹکس میں حصہ لینے کی ضرورت آپڑی ہے۔ اُسی طرح ایک دن وہ آئے گا۔ کہ اُسے اپنی غلطی معلوم ہوگی۔ اور وہ خلوص نیت کے ساتھ انڈین نیشنل کانگرس میں آکر شریک ہوگی اور اپنے دیگر ابنائے وطن کے پہلو بہ پہلو ملک کی بہتری کے وسائل پر غور کرے گی۔ اور اُن پر عمل کرکے ثابت کردے گی۔ کہ بالآخر راستی کی فتح ہے۔ اور سچائی سب پر غالب آجاتی ہے ؎

جدائی عاشق و معشوق میں کب رہنے والی ہے
لگی ہو دل سے تو ہو جائینگے اکدن بہم دونوں

علاج بے دوا۔ ڈاکٹر لوئی جرمن محقق نے چند کتابیں علاج بے دوا کے متعلق تصنیف کی ہیں اور یہ نہ صرف جرمن لوگوں میں بلکہ تمام یوروپین ممالک میں علم دوست حضرات میں قدر کی نگاہوں سے دیکھی گئی ہیں۔ اردو زبان کا ایسی بیش بہا تصانیف سے محروم رہنا واقعی بہت بڑی کمی تھی ایسی کمی کو پورا کرنے کے لئے محمد امیر مرزا صاحب (مالک شفاخانہ علاج بے دوا۔ حمام بازار سرکی والاں دہلی) نے خوبصورت چھپائی کے ساتھ ترجمے شایع کئے ہیں۔ یہ ترجمے ان تصانیف کے ترجمے تو نہیں۔ مگر موٹی موٹی باتیں جنہیں اصل میں فوائد متعلقہ حفظان صحت کہنا چاہئے۔ درج کئے ہیں مثلاً ہمیں کیا کھانا چاہیئے؟ کہاں کھانا چاہیئے؟ کب کھانا چاہیئے؟ انسان کے دانتوں کی قدرتی ساخت وغیرہ وغیرہ۔ اور بھی بہت سی دلچسپ اور مفید ہدایات درج ہیں۔ بہر حال دل کے بہلانے کو مشغلہ اچھا ہے قیمت بھی کچھ بہت نہیں فی کتاب ۳؍ شایقین مرزا صاحب سے درخواست کریں ❖

کلام اختر

مسرت تنہائی

از منشی بشمبر پرشاد اختر

موروثی ملکیت پر جس کا کہ ہے گذارہ / وہ آدمی جہاں میں ہے خوش نصیب دایم
صبح وطن کی راحت جس کو ہے روز حاصل / ایذائے شام غربت کا اس کو پھر ہو کیا غم
گائیں بھی دودھ کو ہیں کھیتوں میں بھی ہے غلہ / بھیڑوں میں اون بھی ہے پوشاک کو فراہم
گرمی میں جس کو سایہ پھولوں کا ہے میسر / سردی میں تاپنے کو آگ اور لکڑی باہم
ہر سال ہر مہینہ ہر روز ہر گھڑی جو / یکساں گذارتا ہے امن و اماں سے پیہم
تن میں ہے جسکے صحت دل کو ہے جسکے راحت / وہ شادماں ہے ہر دم وہ شادماں ہے ہر دم
تفریح جس کو دن بھر پڑھنے سے لیٹنے سے / اور شب کو خواب شیریں جس کو نصیب دائم
قومی ترقیوں میں کوشاں جو سر بسر ہے / کرتا ہے خامشی سے جو یاد ربّ عالم
کاش اس طرح جئیں ہم آرام امن سے یاں / کاش اس طرح مریں ہم بے فکر اور بے غم
سنگِ لحد نہ کچھ بھی اپنا نشاں بتائے
رخصت جہاں سے ہوں خاموش اس طرح ہم

سونے سے کیا اچھا ہے

یہ چیزیں ہیں دنیا میں سونے سے اچھی / بغیر ان کے سب ہیچ ہے شان و شوکت
وہ تن جس میں ہر وقت صحت ہے قایم / وہ دل جس کو ہر دم میسر ہے راحت

زباں وہ کہ جس میں ہے شیریں کلامی — وہ آنکھیں نمایاں ہیں جن میں مروت

وہ سر جس میں حبِّ وطن کا ہے سودا

طبیعت وہ جس میں ہے قومی حمیت

وہ محنت کہ جس سے بشر کو ہو حاصل — فراخیِ رزق اور آرام و راحت

غریبوں کا وہ خواب شیریں کہ جس سے — ملے اُن کو فکر و تردد سے فرصت

بشر کا وہ دل جس کو مدنظر ہے — خیالِ بہی خواہیِ قوم و ملت

جو ہر علم و حکمت سے آگاہ ہو کر

سدا سب کو کرتا ہے پند و ہدایت

وہ گھر جس میں سب لوگ رکھتے ہیں باہم — رضامندی و اتفاق و محبت

زن و طفل و ہمشیرہ و اُم و پدر کی — بقدرِ مدارج رہے قدر و عزت

حوادث سے اگر کچھ زوال آ گیا ہو

مگر ہے وہاں پھر بھی افراطِ برکت

وہ ساعت خوشی کی کہ جس سے کسی دن — ملے وصل کی دو دلوں کو مسرت

کسی شخص مسکیں کا وہ باوفا دل — ابھی جس کی دنیا سے ہوتی ہے رخصت

یقیناً ہے اُس کے شقی دل سے اچھا — جو زندہ ہے با نخوتِ مال و دولت

اور ان سب میں بہتر تو وہ دل ہے اختر

جو ہے محوِ عشقِ خدا در حقیقت

ماخوذ و ترجمہ نظم انگریزی

رباعی

شاہد بگمان صنم پرستم دانند — خمار بظن مست الستم دانند

گویند مرا ادیب و شاعر احباب — اے کاش کسے ہر آنچہ ہستم دانند

ہندوستان کی ضرورتیں

از خواجہ غلام الثقلین بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی ایڈیٹر عصر جدید

ہمارے فاضل دوست خواجہ صاحب سے یقیناً وہ تمام اہل ملک واقف ہیں جنہیں ملکی معاملات سے ذرا بھی دلچسپی ہے خواجہ صاحب کے پہلو میں ایک دل دردمند بیتاب ہے۔اور جو کوششیں مسلمانوں میں سوشیل ریفارم کے متعلق ہوئی ہیں ان میں سب سے ممتاز درجہ ہمارے دوست کا ہے باوجود کثرت مشاغل ناچیز ایڈیٹر کی درخواست کی تعمیل ذیل کا مضمون جو ہر ایک ہندوستانی کیلئے یکساں دلچسپی رکھتا ہے عنایت فرماتے ہیں جسے ہم دلی شکریہ کیساتھ درج کرتے ہیں ایڈیٹر

اس ملک میں برخلاف دنیا کے دوسرے مہذب ممالک کے بہت سی باتوں کی کوشش ایک ساتھ ضروری ہے +

سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ خواص سے لیکر عوام تک اپنی عقل اور دولت اور جسمانی قوتوں کا صحیح استعمال کریں +

جسمانی قوتوں کا صحیح استعمال یہ ہے کہ وہ اپنے جسم کو بدکاری اور سستی میں ضائع نہ ہونے دیں۔بہت سی فواحش شراب خواری چلنی کثرت کیساتھ ملک میں پھیلتی جاتی ہے اور بہت سی بری عادتیں پہلے سے موجود ہیں۔ان سب کی اصلاح سب سے زیادہ مقدم ہے۔اور ساتھ ہی اس کے اولاد کو برہا دکن صحبتوں سے بچانا اور ان کی تعلیم و تربیت جسمانی اور اخلاقی کا بندوبست کرنا +

دوسری اہم ضرورت یہ ہے کہ شادی وغمی و دعوتوں کی فضول خرچی اور جدید طرز معاشرت میں یوروپ جیسی سربرآوردہ اور دولتمند قوموں کی بیجا تقلید۔اور خیرات کے بیجا استعمال میں جو دولت ضائع کی جاتی ہے اُس کو تباہی سے بچایا جائے +

اور بعد دولت کو بچانے کے اُس دولت کو کاروبار صنعت و حرفت وزراعت و تجارت اور کارخانوں میں لگایا جاوے تاکہ دولت زیادہ ہو اور بہت سے غربا پرورش پا سکیں +

تیسری ضرورت یہ ہے کہ ہر صحیح اور تندرست لڑکا تعلیم پاوے اور جب تعلیم پا چکے تو کوئی نہ کوئی کام کرے۔ کوئی شخص بیکار نہ نظر آوے۔ نہ دوسروں پر بار ہو +

چوتھی۔ اور سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ ہم اُن تمام جسمانی۔ عقلی۔ اور روحانی قوتوں کو جو ہم میں ہے اپنی ملکیت نہ سمجھیں کہ جس طرح چاہیں اُن کو خرچ اور ضایع کر دیویں۔ بلکہ اپنی سب قوموں کو خدا کی طرف سے اپنی اور خدا کی دیگر مخلوقات کی خدمت کرنے کے لئے امانت سمجھیں +

یہ اُسی وقت ممکن ہے جبکہ ایک ذی عقل اور رحیم اور مدبر ہستی کا تعین ہمارے دل میں گھر کرے +

افسوس ہے کہ جدید تعلیم اس تعین کو ایک حد تک کمزور کر رہی ہے +

اپنے نفس کی حالت اول درست کرنا پھر اپنے گھر اور اپنے حالت درست کرنا اور ہمیشہ ترقی کی جگہ خدمت خلایق کو مقدم سمجھنا یہ پروگرام موجودہ نسل کا ہونا چاہئے +

اضطراب رام

از منشی ڈپٹی لال نگم بی-اے

جب راجہ رامچندر جی مہارانی سیتا جی کی تلاش میں چترکوٹ پہاڑ پر آئے۔ تو انہوں نے دیکھا۔ کہ سگریو اپنے بھائی بالی کے آئے دن کے نت نئے مظالم سے تنگ آ کر بھاگ کر پہاڑ پر چلا آیا ہے۔ اُنہوں نے سگریو کی رام کہانی سنی۔ اُس پر ترس آیا اور مستعد ہو گئے کہ کسی طرح اُس کو بالی کے پنجۂ تطاول سے رہائی دیں۔ چنانچہ اُنہوں نے سگریو سے وعدہ کیا۔ کہ میں بالی کو مار کر تجھے سلطنت دوں گا۔ سگریو نے بھی اقرار کیا کہ میں راج گدّی پر بیٹھنے کے بعد باحسن الوجوہ سیتا جی کی تلاش کروں گا۔ لیکن جب سگریو راجہ بن گیا۔ تو اپنے وعدہ کو بھول گیا۔ اور رات دن عیش و عشرت میں پڑا رہا۔ ایک دن رام چندر جی نے اُس کو بلایا اور اُن کے درمیان جو گفتگو ہوئی۔ اُس کا لب لباب ہدیۂ ناظرین ہے +

سینہ تپاں سوزِ جگر دل میں درد ہے ۔ بے سیتا رام ہجر میں بے طرح زرد ہے

جلتا ہے رات دن اسی سوز و گداز میں ۔ کٹتا ہے روز و شب اسی عرضِ نیاز میں

دن ہوگا کوئی وہ بھی کہ سیتا سے ہوگا وصل ۔ کِشتِ امید لائیگی بھرپور گل کی فصل

برسات جاکے جاڑے کے دن ہائے آگئے ۔ یارب کہیں امید کی کشتی وہاں لگے

ق

دریا کے جس کنارے یہ سیتا غریب ہے ۔ افسردہ حال اور پریشاں عجیب ہے

دن رات [illegible] رونے سے اُس نازنیں کو کام ۔ پتھر ہے سر [illegible] لے کے میرا نام

سگریو تو نے حال پہ میرے نظر نہ کی
ہے ہے غضب ملال پہ میرے نظر نہ کی

گھلتا ہوں اور مرتا ہوں فرقت میں اُسکی آہ
جینا ہو خاک دور ہو جب مجھ سے رشک ماہ

قاصد کو بھیج اور خبر جلد تو منگا
مت کیجو دیر غیر ہے بس حال اب مرا

اتنا سنا سگریو نے تو بہت ہی کڑھا
تعظیماً اُس نے رام کے چرنوں پہ سر دھرا

کہنے لگا کہ میرا گنہ ہے بہت بڑا
آرام سے گذاری رہا عیش میں پڑا

بالی جو مر گیا تو میرے گھر میں عید تھی
کرپا سے آپ کی مری زندہ اُمید تھی

اپنی خوشی میں سدھ نہ رہی شہ کے درد کی
اپنی ہسی میں سدھ نہ رہی آہ سرد کی

مشکل تو خود اُٹھائی مجھے راجدھانی دی
زحمت اُٹھائی آپ نے اور شادمانی دی

بس آرزو ہے سیتا سے جلد آپ جا ملیں
اور ہم بھی سین چرنوں پہ جلد اُنکے جا دھریں

ہنومنت بھیجتا ہوں میں لنکا کو جا کر اب
سیتا سے ملنے کا کرے جا کر کوئی وہ ڈھب

وہ عقل کا پتلا ہے او رہے طبع کا ذکی
وہ ذہن میں ہے طاق اور ہے دل کا وہ سخی

قوت میں شیر نر ہے اور ہے پہلیتن وہ مرد
دم بھر میں سام ورستم و بہمن ہوں پس کے گرد

گرچہ اُس سے وہ کبھی میدان میں کریں ق
ہم پلہ ہو کے اُس کے مقابل جو آاڑیں

ایسی صفات والا ہنومان یل دلبر
جاتا ہے کان کھولنے راون کے اب وہ شیر

سوار اجیہ الہ آباد۔ ہمارے دوست شہزادہ شانتی نارائن کی کوششوں نے سوراجیہ کو اسی معراج پر قائم رکھا۔ جس کی امید اس کا پہلا پرچہ دیکھکر کی گئی تھی۔ اس کا ہر ایک نمبر دیکھکر یہ پتہ چلتا ہے کہ پرچہ کو اڈیٹ کرنے میں کافی محنت برداشت کی جاتی ہے یہ ممکن ہے کہ ہمیں سوراجیہ کے مقاصد سے اتفاق نہ ہو مگر مہاشے نارائن نے جن مقاصد کو لیکر سوراجیہ جاری کیا انہیں خوب نبھایا اور وہ ہر طرح سے پبلک کی قدردانی کے مستحق ہیں قیمت سالانہ۔ شایقین منیجر سوراجیہ الہ آباد سے درخواست کریں +

پھوٹ و بیر

از خان بہادر شمس العلما منشی محمد ذکاء اللہ خان

ایک تو دل دردمند اور پھر تجربہ یہ دونوں ملکی رہبروں کو بیچین کر دینے کیلئے بلا کا اثر رکھتے ہیں۔ ہمارے مخترم محسن منشی صاحب کے دل پر اسلامیہ کالج لاہور کے ناگوار تنازعہ نے جو اثر ہوا اسکی تصویر ذیل کے مضمون میں کھینچی ہے۔ کاش ہندوستانی اپنی بہتری سمجھیں اور معمولی باتوں پر معاملات کی صورت اس قدر نہ بگاڑیں کہ قومی اور ملکی کاموں کا سنبھلنا دشوار ہو جائے اور وہ بات جو سالوں کی کوششوں سے نصیب ہوئی ہے ان کی ناعاقبت اندیشی کی بدولت غارت نہ ہو۔ ایڈیٹر

پہلے زمانہ میں بعض ہمارے حکام والامقام انگریز ہماری زبان میں اہل زبان کی سی لطیفہ گوئی کی قدرت رکھتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دہلی میں جنرل ڈاکٹر لوئی صاحب رزیڈنٹ دہلی ایک امیر کے ہاں بیٹے کی شادی کی تقریب میں تشریف فرما ہوئے۔ وہاں آتش بازی میں بہت سے انار چھوٹے جن کے دھوئیں سے گرمی کے موسم میں ان کا دماغ پریشان ہوا۔ تو انہوں نے فرمایا۔ کہ یہ ضرب المثل مشہور ہے کہ یک انار و صد بیمار مگر اس وقت میں یک بیمار و صد انار بن رہا ہوں ❖

ایک دفعہ لکھنؤ میں شاہ اودھ نے گورنر جنرل کی دعوت کی میز پر تھالوں میں ہندوستانی میوے لگائے گئے۔ شاہ نے گورنر جنرل سے پوچھا۔ کہ ان ہندوستانی میووں میں سے آپ کو کونسے میوے پسند ہیں۔ تو انہوں نے جواب میں فرمایا۔ کہ ہم کو ہندوستانی وہ میوے بہت پسند ہیں جو ایک پھوٹ اور دوسرا بیر ہے۔ اس لطیفہ میں ب کی زیر زبر کا بھی خیال کرنا چاہئے۔

حقیقت میں کیا یہ سچا لطیفہ کہا ہے ہمان کو ہندوستان کے پھوٹ اور بیر کیوں
نہ پسند آتے جن کی بدولت وہ گورنر جنرلی کی کرسی پر بیٹھے تھے۔ اگر ہم میں
پھوٹ اور بیر نہ ہوتے تو ہم اپنے اوپر آپ فرماں روا ہوتے غیروں کے زیر
فرمان نہ ہوتے۔ اس بیر اور پھوٹ ہی نے ہم کو اپنے پاؤں میں کلہاڑی
مارنے میں استاد بنایا ہے اور اپنے ہی سنورے ہوئے کاموں کو بگاڑنا سکھایا
ہے۔ اس کی مثالیں دیکھو تو روز دیکھنے میں آتی ہیں نیشنل کانگریس کو خود کانگریس
ہی نے ایسا صدمہ عظیم پہنچایا ہے جو کوئی اس کا جانی دشمن بھی نہیں پہنچا سکتا تھا
جس سے اس کی قوت متفقہ ایسی متفرق ہوگئی ہے۔ کہ پھر اس کا پیوستہ ہونا
مشکل معلوم ہوتا ہے۔ جب کسی کام میں آئے دن جھگڑے فساد رہتے ہیں تو
پھر اس کا اپنا سنورنا دشوار ہو جاتا ہے +

اسلامیہ کالج لاہور میں خود مسلمانوں نے حساب طلبی کا فساد و جھگڑا اکھڑا
کیا ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ جب روپیہ کی آمد و خرچ بہت بڑھ جاتے ہیں تو وہاں
حساب کا صحیح رکھنا اور روپیہ کو غبن سے بچانا بہت مشکل کام ہو جاتا ہے سرکاری
اکونٹنٹ آفس کو دیکھو جس میں صحت حساب کی جانچ و پڑتال کی نگہداشت کے
لئے ہزاروں روپئے کے نوکر رکھے جاتے ہیں۔ اس پر بھی اس کے ادنے
محکمہ کی اعلے محکمہ ہمیشہ حساب کی غلطیاں پکڑ کر بتلایا کرتا ہے سرکاری خزانوں
کو دیکھو جن میں ہزاروں روپیہ روپیہ کی حفاظت کے لئے خرچ کیا جاتا ہے
اس پر بھی کبھی کبھی اس میں غبن ہو جاتا ہے۔ بھلا اسلامیہ کالج اس سے کیوں
مستثنیٰ ہونے لگا جس میں یہ دونوں کام مجلس اسلامیہ کے سپرد ہیں جس کے
کسی ممبر کو ان کی دیانت کے بیچ پھوٹی کوڑی نہیں ملتی اگر کالج کے حسابات غلط
ہوں اور اس میں روپیہ بھی غبن ہو گیا ہو اس کے سبب سے کالج کی ماہ بماہ و

سال بسال ترقی پاتا شہادت دیتا ہے کہ کوئی اُس کو نقصان نہیں پہنچا۔ اب مخالف مسلمان جس طرح سے محاسبہ طلب کرتے ہیں کہ اخباروں میں اس کی خبریں چھپواتے ہیں۔ اس سے کالج کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ مگر اس سے اس کی چندہ کی آمدنی میں نقصان پہنچنے کا احتمال ہے کہ جو لوگ اس کالج کے لئے چندہ دینے میں ڈھل مل ہیں۔ وہ نہ چندہ دینے کے لئے اخبارات کی تحریرات کو دستاویز بنائیں گے۔ مگر جو لوگ کالج کے سچے خیر خواہ نیک سگال ہیں وہ ان اخباروں کی ذرا پرواہ نہیں کرتے اور ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں۔ کہ اخبارات اپنی دروغ بیانی و غلط بیانی کی عادت کے سبب سے زیادہ تر خاص و عام کے نزدیک ساقط الاعتبار ہیں۔ ان کے اکثر ایڈیٹر ایسے لوگ ہوتے ہیں۔ جو دوسروں کے ساتھ برائی کرتے ہیں۔ اور اس کا بہانہ یہ بناتے ہیں کہ ہم بھلائی کرتے ہیں پس وہ کالج کی دوستی کا ادعا کرتے ہیں۔ اور یہ اپنی خیر خواہی بتلاتے ہیں کہ اس محاسبہ سے یہ فائدہ ہوگا کہ آیندہ جو روپیہ کالج کے نام سے آئیگا وہ کالج ہی کے کاموں میں خرچ ہوگا۔ اس کو الفتے اُڑا کر نہیں لے جائیں گے۔ اگر کالج کے حقیقت میں دوست ہوتے تو اس بُرائی کے دور کرنے کی نصیحت خلوت میں اس طرح کرتے جس کی خبر کسی کو نہ ہوتی سنہ یہ کہ اخباروں میں اس کی فضیحت کرنیکا اشتہار دیتے۔ نصیحت فضیحت میں بھی فرق ہے کہ ایک ہی بات جو خلوت میں کہی جائے نصیحت ہوتی ہے اور وہی بات جو خلوت میں نہ کہی جائے وہ فضیحت ہوتی ہے +

ایک دفعہ میں دہلی میں مسٹر کلارک صاحب ڈپٹی کمشنر دہلی کی ملاقات کو گیا۔ تو اُنھوں نے مجھ سے پوچھا کہ اس کا کیا سبب ہے کہ دہلی میں مسلمانوں کی جتنی کمیٹیاں ہیں ان میں سے ہر کمیٹی کے ممبر آپس میں لڑتے ہیں اور مجھ سے درخواست

کرتے ہیں کہ آپ کمیٹی کے کاموں کا انتظام کر دیں۔ میں نے جواب میں عرض کیا۔ کہ دنیا میں ہر قوم کی تین حالتیں ہوتی ہیں +

اول ترقی و تہذیب +

دوم۔ تعیش و تنعم +

سوم۔ انحطاط و تنزل +

انحطاط و تنزل کے لئے فساد لازمی ہے۔ ہر چیز میں دیکھ لیجئے مسلمانوں کی انحطاط اور تنزل کی حالت ہے اس لئے ان میں فساد کا ہونا لازمی ہے +

اسلامیہ کالج مسلمانوں کے آپس کے فساد سے خالی نہیں ہو سکتا۔ ہمیشہ اس کے دوستوں اور دشمنوں میں معرکہ آرائیاں رہیں گی۔ دوستوں کی فتحیابی میں کالج کی زندگی ہے۔ اور ان کی شکست میں موت۔ کالج خواہ زندہ رہے یا مردہ ہو۔ مسلمان اس میں جھگڑا فساد کئے بغیر نہیں رہیں گے۔ مردہ دوزخ میں جائے یا بہشت میں اپنے پوری حلوے سے کام ہے +

غزل

آج پھر رونے کو جی چاہتا ہے رولیں ہم
داغ الفت کے جو کچھ باقی ہیں سب دھولیں ہم

ٹھیر اے حشر ابھی پاؤں تو پھیلانے دے
مدت العمر کے جاگے ہیں ذرا سولیں ہم

ہاں میں ہاں اُن کی ملاتے رہو خیریت ہے
کاٹ لیتے ہیں جو ہاں صاف اگر بولیں ہم

بیچتے پھرتے ہیں گٹھڑی میں نیاز اور وفا
کچھ خریداری ہو منظور اگر کھولیں ہم

شہر خوباں میں نہیں جنس وفا کی بکری
مفت بھی لے نہ کوئی جھکتا ہی کیوں تولیں ہم

ساتھ چلنے کو جہانگیر کسی نے نہ کہا
آگے آگے ہی نہ کیوں قافلے کے ہولیں ہم

جہانگیر

ملکی ترقی و تفریق مذاہب

از منشی پربھولال بی۔ اے

ہمارے دوست منشی پربھولال بی۔ اے مستند و نامور مضامین نگاروں میں سے ہیں۔ ناظرین آزاد آپ سے بخوبی آشنا ہیں اور کسی مزید تعارف کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ اتحاد کے بارہ میں جو تجویز منشی صاحب نے ذیل کے مضمون میں پیش کی ہے وہ ایک نہایت ہی عمدہ تجویز ہے ہم ملکی لیڈروں سے درخواست کرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں۔ کہ وہ اس مضمون پر بخوبی غور کریں اور تجاویز کو عمل میں لانے کی کوشش کریں۔ ہم خوش ہوں گے۔ اگر ہمارے ہمعصر اس مضمون کو اپنے کالموں میں جگہ دیں گے۔ ایڈیٹر

جس وقت لالہ لاجپت رائے کی گرفتاری اور جلاوطنی کی وجہ سے ایک محشر سا سارے ملک میں بپا تھا بعض ناعاقبت اندیش جماعتوں نے اُن کی جلاوطنی پر محض اس بنا پر اظہار خوشی کیا تھا کہ مذہبی معاملات میں اُن کو لالہ صاحب سے اتفاق نہ تھا یا یوں کہئے کہ جس مذہبی فرقہ سے لالہ صاحب کو تعلق تھا اُس کے ساتھ اُن جماعتوں کے مناظرات مدت سے چلے جا رہے تھے۔ اس سے یہ سمجھنا چاہئے کہ اُن جماعتوں کو محض اس بنا پر خوشی ہوئی کہ مذہب میں اُن کا جو مخالف تھا وہ اس طرح اپنی سزا کو پہنچا گو وہ سزا غیب سے کیوں نہ ملی ہو اور اُس میں اُس کو کوئی دخل نہ ہو۔ اُن کا تو کلیجہ بس اسی میں ٹھنڈا ہو گیا کہ ہمارا رقیب یا ہمارا مخالف پس پا ہوا۔ یہ اُس کی بدعقیدگی

یا مخالفت دین برحق کی سزا اُس کو منجانب خدا ملی - اِن جماعتوں کو دیکھنا یہ
چاہیئے تھا کہ جن کاموں یا جن کارروائیوں کی بابت لالہ لاجپت رائے کو
سرکار سے جلا وطنی کی یہ سزا ملی وہ کام یا کارروائیاں آیا اُن جماعتوں کے
حق میں زہر یا اکسیر کا اثر رکھتی تھیں - کیا وہ اُن کے لئے نفع بخش تھیں یا ضرر
رساں - یہ تو انہوں نے کچھ نہ دیکھا مگر دیکھا صرف یہ کہ وہ مذہب میں ہمارے
مخالف ہیں اس لئے بہت اچھا ہوا کہ اُن کو یہ روز بد نصیب ہوا - پس
ظاہر ہے کہ صرف اختلاف مذہب کی وجہ سے اُن جماعتوں کے دلوں میں
ایسے ناپاک خیالات پیدا ہوئے جس سے اُنہوں نے بجائے رنج کرنے کے
خوشی کا اظہار کیا - یہ تو اُن کو خوب معلوم تھا کہ جو کام لالہ صاحب نے
کئے وہ قطعاً ملکی بہی خواہی پر مبنی تھے - اُن کاموں سے سب کا بلا لحاظ دین
وملت فائدہ تھا - پس اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا تفریق مذاہب کو ملکی
بہی خواہی کی چلتی گاڑی میں ایک ایسا روڑہ سمجھنا چاہیئے جو کسی طرح دور
کئے دور نہیں ہو سکتا +

جو لوگ مذہب کے ایسے دلدادہ ہیں اُن سے ہمارا یہ سوال ہے کہ
کیا مذہب اسی کو کہتے ہیں کہ جو اصول مذہب کسی نے اپنے نزدیک قائم
کر لیے ہیں یا جن کی وہ پیروی کر رہا ہے اُن سے ہرگز انحراف نہ کیا جائے؟
خواہ وہ اصول معقولیت پر مبنی ہوں یا نہ ہوں جن کو اصل اصول مذہب
کہیں گے وہ تو یہ نہیں ہے! یہ تو محض وہ تنگ خیالی ہے جس کو عام
اصطلاح میں تعصب کہتے ہیں - سچے مذہب میں تعصب کو قطعاً دخل نہ ہونا
چاہیئے - مذہب کا تعلق صرف روح سے ہونا چاہیئے اس سے آگے اُس کو
بڑھنے نہ دینا چاہیئے اور اگر اور زیادہ بڑھنے بھی دیا گیا تو اپنے من یا دل

تک اُس کو محدود رکھنا چاہئے۔ اور اگر بالفرض اُس کو اور بھی بڑھنے دیا گیا تو
اُس کی آخری حد جسم تک تو ضرور ہونی چاہئے۔ جسم سے جب آگے بڑھنے دیا گیا تو
پھر وہ مذہب نہ رہا بلکہ وہ ایک مہیب شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ جس کو انگریزی
میں Fanaticism فناتسم یعنی تعصب کہتے ہیں۔ اس آخری
شکل میں دوسروں کے عقاید کے متعلق وہ چھیڑ چھاڑ شروع ہوتی ہے۔
جس کا انجام جیسا کہ تاریخ زبان حال سے کہہ رہی ہے۔ خونریزی ہے کہ اُس پر
انسان انسان نہیں رہتا ہے بلکہ درندہ سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ مذہب کو یقیناً
نفس تک محدود رکھنا چاہئے۔ عقیدے کے متعلق ہمارے جو عقاید ہیں اُن سے
ہم کو صرف اُسی قدر سروکار رکھنا چاہئے۔ کہ ہم اپنی آخرت کو اپنے مذہب کے
بموجب بنانے کی کوشش کریں اور اس سے ہم کو مطلقاً کوئی سروکار نہ رکھنا
چاہئے کہ دوسرا بھی ہمارے خیال ہی کے مطابق اپنی آخرت کو بنانے کی
کوشش کرتا ہے یا نہیں۔ حال میں جو مناظرات آریہ سماج و سناتن دھرمیوں
یا آریہ سماج و مسلمانوں کے درمیان ہوئے ہیں اُن کا تعلق زیادہ تر عقیدہ عقبےٰ
سے ہی رہا ہے۔ خدا کیا ہے ساکار ہے یا نراکار اور روح کیا ہے۔ بعد مرگ
ہماری کیا حالت ہوگی۔ ہم بہشت میں جائیں گے یا دوزخ میں یا پھر پیدا ہونگے
یا یہ کہ ہمارا پیغمبر یا ہادی برحق ہے معصوم ہے۔ تمہارا نبی جھوٹا ہے گنہگار رہے
غرض کہ یہی جھگڑے ہیں جن پر باہمی مباحثات و مناظرات ہوا کرتے ہیں۔ ہمارے
نزدیک یہ ایسے مسائل نہیں جن کو سچے مذہب سے کوئی تعلق ہے۔ سچا مذہب
وہ ہے جس سے کہ ہم روحانی ترقی کے معراج میں اپنے کو سب سے اعلےٰ درجہ
کو پہنچائیں۔ ہمارا دل صاف ہو کدورت سے پاک ہو۔ چشم ظاہری کی جگہ
چشم باطنی کھُلے۔ جس سے حقیقت کے وہ راز کھلیں کہ جس کے بعد پھر کوئی راز

نہیں رہتا ہے۔ ہم کو سمجھ لینا چاہیئے کہ ایسی تلقین کم و بیش کل مذاہب نے
کل انبیا نے کی ہے۔ اور اس لئے سب برحق ہیں مگر ہم برخلاف اس کے
دنیا میں یہ دیکھتے ہیں کہ ہر کوئی یہی کہتا ہے کہ جس طریقہ پر میں چل رہا ہوں وہی
افضل ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ تمام لوگ اُسی طریقہ کی پیروی کریں چاہتا ہی
نہیں ہے بلکہ اس امر کی کوشش بلیغ کرتا ہے کہ باقی لوگ بھی اُسی کے طریقہ
کو اختیار کریں اور اس کوشش میں وہ نوبت پہنچتی ہے کہ لوگ ایک دوسرے
کے دشمن جانی ہو جاتے ہیں۔ اور پھر وہ واقعات پیش آتے ہیں جن سے تاریخ
کے صفحے رنگے پڑے ہیں۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دو آدمیوں کے خیالات گو وہ
حقیقی بھائی کیوں نہ ہوں ایک سے نہیں ہوتے ہیں۔ تو پھر یہ کیسے ممکن
ہو سکتا ہے۔ کہ سب لوگ ایک ہی مذہب کے ہو جائیں۔ کوئی ایک مذہب
عام لوگوں کے لئے مناسب نہیں ہو سکتا۔ اور نہ تمام مذاہب کسی ایک کے لئے
موزوں نہیں ہو سکتے۔ البتہ اصل اصول تمام مذاہب کا ایک ہے۔ مگر فروعات
میں ہمیشہ اختلاف رہیگا کیونکہ انسان کی طبایع مختلف ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنی طبایع
کے لحاظ سے مختلف طریقوں کو ہی پسند کریں گے۔ خدا تک پہنچنے کا جو ایک
کا طریقہ ہے وہ دوسرے کا طریقہ نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کہ اُس سے اُس کو
نقصان پہنچے۔ اختلاف ہی موجب بقائے زندگی ہے۔ جب اختلاف جاتے
رہے تو پھر دنیا کہاں رہی۔ آپ کا طریقہ آپ کے لئے اچھا ہے مگر میرے لئے
نہیں۔ اسی طرح میرا طریقہ میرے لئے اچھا ہے مگر آپ کے لئے شاید نہ ہو
ہم کو دنیا کے کسی مذہب کے لئے جھگڑنا نہ چاہیئے۔ مگر جب ہم لوگوں کو یہ کہتے
سنتے ہیں کہ یہی ایک طریقہ اچھا ہے اور دوسرا نہیں تو ہم کو ہنسی آتی ہے ایسے
لوگ اتحاد و محبت سے کوسوں دور ہیں۔ اگر کسی کو خدا تک پہنچنے کے لئے مدد

کی ضرورت ہے۔ یعنی یہ کہ اُس کو تسبیح یا مالا چاہیئے۔ پوجا کرنے کو مندر یا نماز پڑھنے کو مسجد یا دل کی یکسوئی کے۔ لیے کسی مورت کی ضرورت ہے تو اس میں کسی کا کیا ہرج ہے اُس کو ایسی مدد لینے دینا چاہیئے۔ لہذا ہماری رائے میں مناسب یہ ہے کہ شاستر ارتھ یعنی مذہبی مناظرات کا طریقہ قطعاً اٹھا دیا جائے ایک دوسرے کے کھنڈن یا منڈن یعنی تردید و اثبات کا جو طریقہ اب جاری ہے وہ موقوف کر دیا جائے۔ اس کے جواب میں یہ کہا جائے گا کہ اگر مناظرے نہ ہونگے تو پھر سچ کی تحقیق کیسے ہوگی۔ یہ کیسے معلوم ہوگا کہ سچا مذہب کون ہے؟ اس کا یہی جواب دیا جا سکتا ہے کہ آغاز عالم سے یہ مذہبی مناظرے چلے جا رہے ہیں مگر اب تک اس کی قطعی تحقیق نہ ہوئی کہ فلاں مذہب سچا ہے۔ ہر کوئی اپنے اپنے مذہب کو سچا ہی سمجھتا ہے اور جب تک اُس کو اُس کی نسبت حسن عقیدت ہے اُس کو اُس کا خیال مبارک۔ اپنے مذہب کے متعلق اگر کسی گفتگو یا تقریر کی اجازت دی جا سکتی ہے تو صرف اُس طریقہ میں جو سوامی وویکانند نے اختیار کیا تھا۔ امریکہ یورپ وغیرہ میں اُنہوں نے ویدانت کی اشاعت کی غرض سے لکچر دیئے مگر اُنہوں نے اپنی کل تقریروں میں غیر مذہب کو بُرا نہیں کہا۔ بلکہ اس کو بھی اپنے وسیع مذہب ویدانت میں شامل کرکے یہ ثابت کر دیا کہ ہندوؤں کا مذہب کس قدر ٹالرنٹ ہے۔

ہم امید کرتے ہیں کہ آیندہ لوگ اپنے اپنے مذہبی خیالات کو صرف اپنے دلوں تک یا صرف اپنے اجسام تک محدود رکھنے کی کوشش کریں گے۔ دلوں تک محدود رکھنے سے مراد یہ ہے کہ ہم اپنے دل سے اُس کو سچا سمجھیں اور اُسکے جو تلقینات ہیں اُن کو سچ جانیں اور دوسرا ایسا سمجھتا ہے یا نہیں اس سے ہم کو کوئی سروکار نہ رہے۔ اور جسم تک محدود رکھنے کے یہ معنے ہونگے کہ اگر ہم کو

اپنے مذہبی ہدایات کے بموجب چھوت پاک کا خیال ہے۔ یا ہم آچار بچار سے رہنا چاہتے ہیں تو ہم کو اُس کی پابندی کرنی چاہیئے۔ یہ کچھ ضرور نہیں کہ خواہی نخواہی دوسروں کا پکا ہوا کھانا ہی لیں۔ اگر ہم اپنے اوپر تکلیف اُٹھا کر اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر کھائیں تو اُس میں دوسروں کا کیا ہرج ہے۔ تکلیف تو ہم اُٹھا رہے ہیں کوئی دوسرا تو نہیں اُٹھا رہا ہے — دوسروں کو کیا پڑی ہے کہ وہ اُس کے ایسے خیال میں مزاحم ہوں۔ مگر جب مذہب کو اپنے جسم سے باہر جانے دیا جاتا ہے یعنی یہ کہ دوسروں کے مذہب یا طریقہ میں مداخلت کی جاتی ہے تو جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ جہاں کہیں کسی مذہب کی تبلیغ یعنی اشاعت کی کوشش کی جائے گی وہاں ضرور جھگڑے پیدا ہونگے ناحق کے فساد برپا ہونگے۔ جو لوگ ایک دوسرے کو بھائی بھائی سمجھتے رہے ہیں۔ اُن میں بھی اس کا زہریلا اثر پھیلیگا +

ہم کو یہاں پر یہ کہنا پڑتا ہے کہ اگر آریہ سماج دیگر مذاہب کے ساتھ اُس قسم کے جھگڑوں ومناظروں میں نہ پڑتا۔ جن میں ایک عرصہ تک الجھا رہا ہے تو کیوں یہ نوبت آتی کہ اُس کے مخالفین اُس کے لیڈروں کی مصیبت کے وقت اظہار خوشی کرتے اگرچہ یہ صحیح ہے کہ اُن لوگوں نے اپنے اس اظہار مسرت سے اپنی حقیقت قلب کو ظاہر کیا۔ ہم نے جو تعریف مذہب کی اوپر کی ہے۔ اُس پر نظر رکھ کر اگر اب بھی ایسے مناظرات سے پرہیز کیا جائے اور گھر گھر اور پڑوس پڑوس کے لوگوں میں جو مذہبی خانہ جنگیاں چل رہی ہیں وہ دور ہو جائیں۔ تو نہ صرف باہمی دلی رنجشیں رفع ہو جائیں گی۔ بلکہ دوستی محبت و اخلاص کو ترقی ہوگی۔ اور لوگ بجائے کسی کا بُرا چاہنے کے سب کا بھلا چاہیں گے اور سب متفق ہو کر وہ کام کریں گے جس میں ملک کی بہتری

متصور ہے۔ اس کی کیا ضرورت ہے کہ ہم دوسروں کے مذہبی معاملات میں
دخل در معقولات کو راہ دیں یہ خیال کر لینا کہ ہم ہی صرف خدا کی طرف سے
سچے مذہب کی تلقین کے لئے مامور ہوئے ہیں داخل جہالت ہے ست سوان
نے ایسے ہی دعاوی کئے ہیں اور جو لوگ انکے پیرو ہوئے ہیں انہوں نے ان
دعووں کو سچا بھی سمجھا ہے۔ لیکن اس کا قطعی فیصلہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ کہ
فلاں کا دعوے سچا ہے اور باقیوں کا باطل ہے۔ جب یہ حال ہے۔ تو پھر
ایسے مذہب کے پیچھے آپس کی گردنیں کاٹ لینے کو دوڑنا نادانی نہیں ہے
تو کیا ہے؟ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا ہے کیونکہ تمام لوگ کسی ایک
مذہب کو قبول نہیں کر لیتے ہیں۔ اور تفرقے بدستور چلے جاتے ہیں مگر جو
نقصان ہوتا ہے وہ بعید ہوتا ہے کیونکہ اس سے ملک کی ترقی رک جاتی ہے
اور ملک بجائے سرسبز ہونے کے تباہ ہو جاتا ہے ✦

آخر میں ہمیں امید ہے کہ ہندوستان میں جتنے مذاہب ہیں یا جتنے مذہبی
فرقے ہیں ان کے سربرآوردہ اشخاص ملکی بہی خواہی کے لحاظ سے اس پر
عمیق غور کریں گے اور کوئی تدبیر ضرور سوچیں گے جس سے یہ باہمی عناد
و مخالفت کے خیالات رفع ہو جائیں اور باوجود امتیازات و تفرقات کے
سب جماعتیں ایسی شیر و شکر ہو جائیں کہ نفاق کا نام و نشان تک باقی نہ رہے
یہ مدعا اس وقت حاصل ہو سکتا ہے۔ جب لوگ ایک دوسرے کے مذہب کو برا
کہنے سے باز رہیں گے۔ اور اگر کسی نے کوئی مذہب اختیار کر لیا ہے اور وہ
اس کے نزدیک اچھا ہے تو وہ اس خیال کو اپنے ہی تک محدود رکھے۔
ہندوؤں میں پہلے کوشش تو یہ ہونی چاہیئے۔ کہ جو عظیم تفریق سناتن دھرم
و آریہ سماج کی ہو گئی ہے وہ مٹ جائے۔ آریہ سماج نے اگر ویدوں کی کوئی

تفسیر اپنے خیال کے مطابق لکھی ہے۔ تو وہ تفسیر اُن کو مبارک رہے۔ سناتن دھرم والوں کو اُس کی مزاحمت نہ کرنی چاہیئے۔ اور اسی طرح اگر پُرانے مذہب والے اپنے پرانے مذہب کے کل اصولوں پر عمل کرتے ہیں اور اُنہی پر چلتے ہیں تو آریہ سماج کو اُن کے معاملات میں کوئی دخل نہ دینا چاہیئے۔ اس کو سب لوگ تسلیم کرتے ہیں۔ کہ پُرانا ہندو مذہب ہمیشہ ٹالرنٹ رہا ہے۔ وہ اپنی صلح کل پالیسی کے لحاظ سے خیالات کو اپنے میں شامل کرتا آیا ہے۔ مگر جب اُس کی جڑیں کاٹنے کی کوشش کی گئی۔ تو البتہ اُس نے بھی اپنی حفاظت کی غرض سے مخالفوں کے حملوں سے بچنے کی تدبیریں کیں۔ لیکن باہمی تفرقہ کی جو آگ بھڑک رہی ہے۔ وہ اگر فرو ہو جائے تو پھر ایسی تدبیروں کے اختیار کرنے کی کوئی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ اس آگ کو فرو کرنے کے لئے سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ جو رسالے یا اخبارات مذہبی مناظرے کے نکالے جا رہے ہیں اور جو بیحد زہر اُگل رہے ہیں وہ یک قلم موقوف ہو جائیں۔ زبانی یا تحریری شاستر ارتھ جو ہوتے ہیں وہ بھی بند ہو جائیں۔ کیونکہ ہم کو یہ یقین ہے کہ ان شاستر ارتھوں کا کوئی نتیجہ نہیں ہوتا ہے۔ یہ بہت شاذ ہوتا ہے کہ جیتنے والا فریق اپنے حریف کو اپنے مذہب پر لے آتا ہے۔ جیتنے والے اور ہارنے والے دونوں فریق بدستور اپنے دعووں پر قایم رہتے ہیں۔ ہمیں پھر ایک بار یہ اُمید رکھنے کی جرأت ہوتی ہے کہ ہمارے ملک کے سربرآوردہ اشخاص اور نیز وہ اشخاص جو ملکی بہی خواہی کے لئے اپنا تن من دھن سب نثار کر رہے ہیں وہ ضرور ہمارے اس ناچیز مضمون پر غور کریں گے۔

مقررہ وقت

از میرزا سلطان احمد اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر

اورا بجفا ایں ہمہ بدنام مسازید
شاید کہ دفا ہم قدرے داشتہ باشد

جب ہم کوئی کام کرنا چاہتے ہیں۔ یا کوئی ارادہ کرتے ہیں تو اُس کے واسطے ایک وقت یا ایک موقعہ مقرر کرتے ہیں۔ ہمارے بہت سے ارادے اور عزائم ایسے ہیں جو ہماری اپنی تجویز کے مطابق ایک خاص موقع اور وقت پہ پورے یا ختم ہوتے ہیں +

وقت سے پہلے اگر کوئی دوسرا شخص ہمیں اپنی تجویز کے مخالف کرنے کو کہے تو ہم اُسے ایک دخل درمعقولات سمجھ کر ٹال دیتے ہیں۔ کیونکہ ہم اپنی تجویز کے خلاف کرنا موجب نقصان سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ قبل از وقت کیا جانا اچھا اور سودمند ثابت نہ ہوگا۔ اپنی تجویزوں کے علاوہ ہم یہ بھی دیکھتے اور پاتے ہیں۔ کہ اور لوگوں کی جانب سے بھی مہمات پیش آمدہ کی بابت ایک موقعہ اور ایک وقت مقررہ کیا جاتا ہے۔ جب ہم کسی دوسری یا اسے اعلےٰ طاقت سے کوئی التجا کے لئے جاتے ہیں اور اتمام کی درخواست کرتے ہیں تو اُس کے اس قدر کہنے سے ہماری تسلی ہو جاتی ہے کہ ابھی وقت نہیں آیا ہے +

کبھی بعض اشخاص یا طاقتوں کی جانب سے امور پیش آمدہ کے انصرام کی خاطر چند موقت قواعد یا ضوابط بھی مقرر کئے جاتے ہیں۔ جب اور ابنائے جنس

کی جانب سے اُن امور میں سے کسی امر کی بابت درخواست یا التجا ہوتی ہے تو بعض اوقات وہ طاقت یا وہ شخص یہ کہکر ٹال دیتا ہے - کہ تو قاعدہ یا ضابطہ اجازت نہیں دیتا - ان سب دستورات اور قواعد کے ہم عامی ہیں - اور کچھ نہ کچھ ان کے پابند بھی ہیں - اور ان حالات میں ہماری طرف سے کوئی اعتراض نہیں ہوتا - یہ صورت ہمیں یقین دلاتی ہے - کہ ہمارے یہ ضابطے اور طریق عمل صحیح اور درست ہیں ٭

اب ہم ان ضابطوں اور قاعدوں کی تطبیق کے حقیقت قدرت کے ضوابط اور قواعد میں سے کسی نہیں بہت سے قواعد اور ضوابط مل سکتے ہیں - سورج کا نکلنا - نباتات کی روئیدگی - جمادات کی پیدائش - طلوع شمس و قمر - نجوم طوالع کی چمک دمک - انسان کا نشو و نما - ہواؤں کا چلنا اور بند ہو جانا - دریاؤں کی موجیں اور سمندروں کی لہریں - یا دریاؤں کے تغیرات - سوچنے والے کے واسطے اس امر کی ایک سند اور برہان ہیں کہ کوئی کام کبھی بلا سبب اور بلا وقت نہیں ہوتا - چاہے دنیا کی عمر ہزاروں سال کی ہو اور چاہے دو چار لاکھ کی - یہ ثابت نہ کر سکو گے کہ دنیا کا کوئی کام کبھی بلا سبب اور بلا وقت ہوتا ہے ہر چیز اور ہر واقعہ یا حادثہ کے لئے ایک وقت مقرر ہے - ہر حرکت اور ہر جنبش اپنے اپنے وقت پر ہی ہوتی ہے ٭

یہ جدا بات ہے کہ ہمیں بدقسمتی سے چند واقعات کے اسباب لازمیہ اور اوقات مقررہ کی بابت علم نہ ہو ورنہ کوئی ایسا واقعہ اور کوئی ایسا حادثہ نہیں ہے جو بلا وقت اور بلا سبب حدوث یا وقوع میں آتا ہو - انسان دیگر چیزیں اور دیگر موجودات چھوڑ خود اپنی حالت اور خود اپنی زیست و حیات کو دیکھے - چند ہی ایام میں یہ خود بدولت کتنی کروٹیں بدلتا ہے - کن قاعدوں

سے پیدا ہوتا ہے۔ اور کیسی وقت کی پابندی ہے اُس کے تمام کام ہوتے
جاتے ہیں۔ یوں گننے کو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ بہت سے کام دنیا میں بے وقت
اور بلا سبب انصرام پا رہے ہیں۔ مگر جب غور کی نگاہوں سے دیکھیں تو
کوئی کام بھی بے قاعدہ اور بے وقت نہیں ہوتا۔ کبھی کسی نے اب تک دیکھا
ہے کہ آفتاب رات کو بھی نکلا ہو۔ اور چاند کی چاندنی کا سماں دھوپ میں
بھی پایا گیا ہو۔ بارش ہمیشہ اوپر سے ہی ہوتی ہے۔ نیچے سے اوپر کو کبھی
نہیں ہوتی۔ آگ ہمیشہ جلاتی ہے اور پانی سیال ہے۔ ہوا اجسام میں نفوذ
کرتی ہے۔ اور برق میں ایک خاص طاقت ہے۔ یہ باتیں ایک ہی صورت
سے اپنے اپنے وقت پر اپنا اپنا دورہ ختم کرتی ہیں۔ سائینس ان تمام قواعد
پر شہادت دیتا ہے۔ اور فلسفہ ان کے ثابت کرنے میں شروع سے
معاون اور مدد ہے۔ کوئی طاقت اور کوئی خیال ان مبنیات کا ابطال نہیں
کر سکتا +

ایک ہمارے اپنے کام اور اپنی تجویزیں ہیں۔ اور ہم اُن پر اپنے زعم
اور اپنے خیال کے مطابق اپنی دسترس یا حکومت رکھتے ہیں۔ اور ایک وہ
کام یا خواہشیں اور آرزوئیں ہیں جو بالقوہ تو ہماری اپنی اختیاری ہیں۔
لیکن اُن کی تکمیل اور اُن کا انصرام بہ بعض وجوہ ہمارے حیطہ اختیار سے باہر
ہے۔ ہم ایسے کاموں کو یا تو :-

(الف) کسی محسوس بالغیر طاقت کے متعلق سمجھتے ہیں +

(ب) اور یا ایک ایسی طاقت کے جو اُن سب طاقتوں سے برتر اور
اعلےٰ ہے +

پہلی طاقت کے متعلق جو ہماری ضرورتیں اور کام ہوتے ہیں۔ اُن کی

نسبت بھی ہم چاہتے ہیں کہ فوراً ہی اُن کا انصرام حسب خواہش ہو جائے۔
اور دوسرے شق کی بابت عموماً ہمارا یہ خیال ہوتا ہے کہ کیوں وہ بھی فوراً
ہی نہ ہو جائیں۔ ان دونوں صورتوں میں سے دوسرے شق کی نسبت ہمیشہ
ہماری یہ خواہش بعد یہ آرزو رہتی ہے۔ کہ کاش ہماری ایسی سب آرزوئیں
ہمارے عزم اور ارادے کے ساتھ ہی تکمیل پا جائیں۔ جب ہم اس آرزو
میں ناکامیاب ہوتے ہیں تو ہم یہ کہنے لگ جاتے ہیں :۔

(۱)۔ کیوں ہمارے کام فوراً نہیں ہو جاتے +

(۲)۔ اور کیوں ہم اپنی خواہش کے مطابق کامیاب نہیں ہوتے +

یہ خیال اور یہ وہم ہمیں صرف کمزور اور بدخیال ہی نہیں بناتا۔ بلکہ
ایک ایسے غم اور خدشہ میں ڈالتا ہے کہ ہماری زندگی پر فوراً ہی اس کا مہلک
اثر ہونے لگتا ہے۔ اور ہم تھوڑی دیر کے لئے اپنے آپے سے باہر ہو کر
دنیا و مافیہا سے بھی گزر جاتے ہیں۔ اور ہماری زندگی ایک وبال میں پڑ جاتی
ہے۔ بعض اوقات یہ صدمہ ہمارے دماغ سے گزر کر ہمارے دل اور روح
پر بھی آفت لاتا ہے۔ اور ہم اس مایوسی اور اندوہ یا قلق کی حالت میں اُس
اعلےٰ طاقت سے بھی منکر ہو جاتے ہیں۔ جو ہمارے اردگرد اور
ہمیں محیط ہے اُس کے ساتھ ہی خوشی اُڑ جاتی ہے۔ اور غم رگ و ریشہ
پر مستولی ہو جاتا ہے۔ دنیا میں خوشی اور غم کی کمی بیشی کے واسطے یہ ایک
معیار ہے +

ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اور کیوں انسان اپنے ہاتھوں اس گرداب
میں گر کر اپنے تئیں بدحال بناتا ہے۔ صرف اس لئے کہ اس جامع مانع
اصول سے

۱۲۳۵۲

(الف) کہ کوئی چیز اور کوئی حادثہ یا واقعہ وقت مقررہ کے بغیر وقوع اور حدوث میں نہیں آتا +

(ب) ہر واقعہ کے واسطے ایک وقت مقرر ہے +

بے خبر ہو جاتا ہے۔ اُس کی خود آرائی اور خود پسندی اُس کو اُس کوچہ سے دور جا پھینکتی ہے۔ اور وہ ایک مصیبت میں پھنس کر ماؤف ہو جاتا ہے +

انسان خود تو اپنے کاموں کے انصرام کی خاطر ایک وقت اور ایک موقعہ مقرر کرتا ہے لیکن بڑا ایک افسوس ہے کہ قدرت کو یہ حق نہیں دینا چاہتا۔ جب قدرت سے کسی خواہش یا کسی آرزو کی تکمیل اور انصرام چاہتا ہے تو یہی چاہتا ہے کہ فوراً ہی ہو جائے۔ جن تجویزوں سے انسان خود کام لینا چاہتا ہے۔ اُنہیں کسی نہ کسی ضابطہ اور قاعدہ کا پابند رکھتا ہے۔ اور اُن قواعد یا ضوابط میں کوئی نہ کوئی حکمت مذکور ہوتی ہے۔ اور اگر وہ خود ہی اُس کے خلاف عمل کرے تو اُس کی حکمت اور فطرت پر حرف آتا ہے لیکن جب قدرت سے ایسی خواہش کی جائے تو اُس وقت اُس کی حکمت اور عظمت پر کوئی حرف نہیں رکھ سکتا۔ یہی کمزوریاں ہیں جو حضرت انسان کی گمراہی کا باعث ہیں +

---

[۱] ہر کام وقت مقررہ پر ہوتا ہے اور اُس کے واسطے ایک موقعہ ہے۔ اگر ہم اُس موقعہ یا وقت سے واقف ہیں تو یہ ہمارے علم کے اندر ہے۔ اور اگر ہم اُس سے واقف نہیں ہیں تو وہ ایک امر مقدر ہے۔ اُسی کو نوشتہ اور قسمت کہتے ہیں۔ ہم کسی دوسرے مضمون میں اس بحث پر روشنی ڈالیں گے

ہر چیز کے واسطے اور ہر کام کرنے کے لیے ایک وقت اور ایک موقعہ مقرر ہے۔ خواہ اُسے انسان نے خود مقرر کیا ہے۔ اور خواہ قدرت کے ہاتھوں سے اُس نے ترکیب یا ترتیب پائی ہے۔ وہ اپنے وقت پر ہوگا۔ کوشش شرط ہے۔ لیکن اگر وہ ارادہ کے موافق عمل میں نہ آسکے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم خوشی کے بدلے اُلٹے رنج خرید لیں۔ اور اپنے تئیں ایک گرداب میں ڈالیں ؛

یہ کہنا کہ یہ کام کیوں نہیں ہوا۔ اس جواب کا متقاضی نہیں ہے۔ کہ ضرور ہو جانا چاہئے تھا۔ بلکہ یہ جواب چاہتا ہے کہ ابھی اُس کا وقت نہیں تھا۔ پھر اُس پر دامن سعی کو وسعت دینا چاہئے۔ کوشش چھوڑ دینا اس امر کی شہادت ہے۔ کہ ہم اکثر کاموں کے مواقعہ اور اوقات سے واقف اور آشنا نہیں۔ یہ ایک غلطی ہے۔ ہم اکثر کاموں کے نتائج اور اوقات سے محض نابلد اور ناآشنا ہیں۔ برائے نام چند ہی نتائج سے واقف ہیں باقی خیر صلاح ہے ؛

انسان اپنے تئیں بڑا خبیر و علیم و بصیر کہتا ہے۔ اس کی خبرت و بصیرت خود اُسے معلوم ہے۔ پسِ دیوار بھی نہیں جان سکتا کہ کیا ہو رہا ہے۔ ایک اعلیٰ تجویز سب جھگڑوں بکھیڑوں سے پوری دماغ سوزی سے نکالتا ہے۔ اور من چلتے نتیجہ نکال نکال خوش ہوتا ہے۔ چشم زدن میں وہ بات نکلتی ہے کہ مارے حیرت کے دم بخود ہو جاتا ہے۔ مانا کہ وہ علیم اور خبیر بھی ہے۔ صدہا لطیف قیاسات اور نازک اور نکلت کا بانی اور مالک ہے۔ لیکن اُس کی بے علمی اور وحشت سے بھی کون انکار کر سکتا ہے۔ ؎

گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم
گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

جب ہمارے وقوف اور علم کا یہ حال ہے تو پھر کس بہتے پر کُل اوقات مقررہ سے شناسا ہو سکتے ہیں۔ کوشش اور تدبیر شرط انسانیت ہے۔ اور اس کے سوائے چارہ اور گریز نہیں۔ لیکن اس خیال سے کہ کیوں کوئی کام فی الفور نہیں ہوا۔ اور کیوں ہمارے شجرِ آرزو کو دلخواہ پھل نہیں لگا۔

قدرت کے سامنے ایک قسم کی مساہمت ہے۔ اور اس کا جواب وہ خود انسان ہے۔ اور اس کا اثر ان آثار سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ خوشی سے کوسوں دور ہو کر وادیِ غم و الم میں آجاتا ہے۔

جن قوانین کی تعبیر فلسفہ اور سائینس اوقاتِ مقررہ سے کرتا ہے مذہب اُن کو الفاظ نوشتہ اور تقدیر یا شدنی سے تعبیر کرتا ہے۔ مفہوم دونوں کا ایک ہی ہے اور مطلب واحد قدرت نے اپنے کشادہ صحیفہ میں جو موٹی موٹی نظیریں اور دلچسپ زندہ سبق دیئے ہیں اُنہیں پڑھو اور دیکھو کہ اُن کا مفہوم کیا ہے دل کی کمزوریوں اور وحشتوں سے اُن اسباق سے پہلو تہی نہ کرو جو ہماری خیریت اور بصیرت کا موجب ہیں۔ موتیوں کے عوض میں روڑے اور کنکریاں نہ خریدو ۔

دل بہ زلفِ دلبراں مفروش اے ناقدرداں
سودِ ایں سودا چہ مے پرسی زیانے بیش نیست

قطعہ

اجاب دل میں شکیباں لیتے ہیں کہ کے یہ | کوئی بھی فن ہو چاہیئے حاصل کمال ہو
لیکن ہنر کو عیب تصور کریں جو لوگ | پھر کس امید پر کہو کسبِ کمال ہو

اظہر

مناظرہ

مندرجہ بالا مستقل عنوان سے بحث طلب مضامین درج رسالہ ہوا کریں گے۔ ہر ایک مضمون ایک جواب اور لکھنے والے کے جواب الجواب پر مکمل سمجھا جائے گا۔ اس عنوان کی تحریروں میں اختلاف رائے سے ناشدہ اُٹھانے کی کوشش کی جائے گی۔ اس سلسلہ کا آغاز ایک نوجوان ہونہار طالب علم کی تحریر سے ہوتا ہے جو کسی مصلحت سے اپنا اصلی نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔ آپ ایک ہونہار طالب علم ہیں۔ اور بی۔ اے میں تعلیم پاتے ہیں +

طالب علم اور ملکی خدمت

از منشی "روشن رائے"

درمیانِ قعر دریا تختہ بندم کردۂ
باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

ہر ایک زبان کے علوم کچھ اثر رکھتے ہیں جو اس کے طالب کے دل پر نقش ہو جاتے ہیں اور حقیقت میں ایسا ہونا بھی چاہیئے۔ ہ

علم چنداں کہ بیشتر خوانی — گر عمل در تو نیست نادانی
چار پائے برو کتابے چند — نے محقق بود نہ دانشمند

تحصیل علوم سے مراد عمل ہے اور اس کے بغیر تمام علوم بیکار رہیں۔ اس وقت میں اور زبانوں کے اثرات کو چھوڑ کر صرف انگریزی کو لوں گا۔

کیونکہ میرے مضمون کا تعلق اس سے ہے +

ہر ایک زبان کی کتابیں اہل زبان کے خیالات کا مجموعہ ہوتی ہیں۔ اکو ان کے پڑھنے والوں کی طبیعتیں بھی اہل زبان کے خیالات کے سانچے میں ڈھل جاتی ہیں۔ اور اگر اس صورت میں اس زبان کا مطالعہ کرنیوالوں سے کچھ ایسی بیداری ظہور میں آئے جو اہل زبان کی خصلت کا پتہ دیتی ہو تو کوئی وجہ تعجب نہیں۔ اور اگر اہل زبان فاتح قوم ہے تو اسے برابری کے دعوے پر ناراض نہ ہونا چاہیئے +

ہر ایک اثر کے درجے ہوتے ہیں جو بتدریج گھٹتے بڑھتے۔ کمزور ہوتے اور طاقت پکڑتے ہیں اور جب وقت ان کے اثر کا پارہ ۹۹ ڈگری پر ہو اس وقت جو کام نکل سکتا ہے وہ گھٹاؤ کے وقت نہیں ہو سکتا ۔ ہندوستانیوں کی اس کمزوری سے تو شاید کسی کو بھی انکار نہ ہوگا کہ وہ کسی کتاب کو بلا ضرورت پڑھنا گوارا نہیں کرتے اور ایسا کرنے کو اپنے نزدیک تضیع اوقات خیال کرتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ۹۰ فی صدی زمانہ طالب علمی سے گذر کر کسی ملکی یا قومی کام کے قابل نہیں رہتے۔ کیونکہ جو کچھ وہ پڑھتے ہیں اس کا اثر بتدریج کم ہوتا جاتا ہے اور اس کمی کے ساتھ ان کی قوت ارادی میں بھی کمزوری پیدا ہوتی جاتی ہے یہ ایک عام اظہر من الشمس اثر ہے جس کی ہم رفتہ مثالیں دیکھتے ہیں +

ہندوستانیوں میں قوم اور ملک کا کام کرنے والوں میں زیادہ تعداد وکالت پیشہ لوگوں کی ہے اور غور کرنے والے ایسے لوگ ہیں جنہیں اس فرقہ سے واسطہ پڑتا ہے بخوبی جانتے ہیں کہ ان میں اس جان کی وجہ یہی ہے کہ ان کا مطالعہ کتب کبھی ختم نہیں ہوتا اور جو کچھ وہ پڑھتے ہیں اس کا

اثر بتدریج بڑھتا اور انہیں قومی اور ملکی خدمت کے لیئے زیادہ مستعد بناتا ہے۔ اس وقت میں یہ نہیں کہوں گا کہ باقی لوگوں کو اپنی طبیعتوں میں یہ برقی اثر پیدا کرنے کے لیئے کیا کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اس وقت یہ میرا مضمون نہیں آیندہ کبھی وقت ملا تو لکھوں گا۔ اس وقت مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ طالب علموں پر جو اثر انگریزی تعلیم کا ہوا اس کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ وہ قومی خدمت کا بوجھ اپنے کندھوں پر لیتے اور فاتح قوم کو اس سے کوئی وجہ ناراضگی نہ ہونی چاہیئے۔ بلکہ خوش ہونا چاہیئے۔ کہ ان کا مقصد تعلیم پورا ہوا اور ہندوستانیوں کے دلوں میں وہ روشنی پیدا ہو گئی جو اقوام کو مہذب بناتی اور منزل ترقی کی طرف لے جاتی ہے اور ایسا بننا ان کا فرض تھا کیونکہ مہذب گورنمنٹ کی رعایا کا جہالت میں رہنا گورنمنٹ کے نام پر ایک بدنما دھبہ ہوتا ہے +

اس وقت یہ دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو کتابیں ہمارے بچوں کو پڑھائی جاتی ہیں ان میں تو اس احتیاط کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ کہ جو کچھ ہندوستانی طالب علموں کو پڑھایا جائے اس سے گورنمنٹ انگلشیہ کی عزت کا نقش ان کے دلوں پر ہو جانا چاہیئے اور باوجود بیان تشفی کی تمثیلوں کے انہیں اپنی گورنمنٹ کو رعایا پرور سمجھتے ہوئے خوشامد کے لیئے ہر وقت میاں مٹھو کی طرح تیار ہونا چاہیئے۔ اور ہر ایک سوال کے جواب میں بلا سوچ بچار دریں چہ شک پکار اٹھنا ان کی مستقل عادت بنجانا چاہیئے۔ مگر ان تمام کوششوں کا اثر الٹا ہوتا ہے۔ اگر آج سرشتہ تعلیم کو اس بات کا ذرا بھی اشارہ مل جائے کہ نصاب مقررہ کا فلاں حصہ ہندوستانی طالب علموں کے دلوں میں آزادی کا بیج بوتا ہے تو وہ اسے فوراً خارج

کر دینے میں ذرا بھی تامل نہ کرے گا۔ مگر ہمیں اس وقت شیخ سعدی کا وہ فقرہ یاد آتا ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ میں نے عقلمندی بیوقوفوں سے سیکھی اور یہ فقرہ اس سارے معمہ کو حل کر دیتا ہے +

ہم اس نتیجہ پر تو پہنچ گئے کہ جو کچھ پولٹیکل بیداری ہم میں پائی جاتی ہے اس کا بنیادی پتھر انگریزی تعلیم ہے اور اب ہمارے لئے یہ نہایت دشوار ہے۔ کہ آزادی کی آرزوئیں رکھتے۔ ہم عرض مدعا سے باز رہیں مگر اسی قدر میرا آج کا مضمون نہیں۔ میری مندرجہ بالا دلائل پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ کہ انگریزی تعلیم کے اثرات کو مانتے ہوئے یہ لازمی نہیں ٹھیر سکتا۔ کہ طالب علم پولٹیکل تحریکوں میں حصہ لیں کیونکہ پولٹیکل کام کے لئے جیسا کہ وائس چانسلر نے ۱۹۰۸ء کی کونوکیشن میں طلبا کو مخاطب کر کے کہا تھا۔ پختہ مغز تجربہ کار اور ملکی معاملات سے پوری واقفیت ہونا لازمی ہے۔ طلبا کی ملکی واقفیت کافی نہیں کہی جا سکتی۔ نہ ہی انہیں تجربہ ہوتا ہے۔ اس لئے انکی پولٹیکل تحریکوں میں شراکت اکثر بُرے نتائج پیدا کرتی ہے! اگر یہاں میرا سوال یہ ہوگا کہ کیا ہر ایک شخص کا جو پولٹیکل تحریک میں حصہ لیتا ہے یا دوسرے الفاظ میں قومی رہنماؤں کے اقوال کی پیروی کرتا ہے۔ تجربہ کار اور پختہ مغز ہونا لازمی ہے؟ میں کہوں گا نہیں کیونکہ اس طرح سے کوئی انتظام قایم نہیں رہ سکتا اور کوئی حقیقی بہتری عمل میں نہیں آسکتی اس وقت تک جب نا تجربہ کار تجربہ کار ہوں قومی فلاح کو ملتوی رکھنا حماقت ہوگی کیونکہ اس کے معنے صریح طور پر یہ ہونگے کہ کوئی فلاح مقصود نہیں یا یہ کہ کوئی بہتری عمل میں نہیں آسکتی۔ تاریخ اور تجربہ بتلاتا ہے کہ قومی اور ملکی ترقی کے لئے یہ لازمی ہے کہ چند برگزیدہ لوگوں کی رہنمائی میں سب لوگ چلیں اور جو کچھ ملکی

لیڈر کہیں ان پر غور کرنے کے لئے بعد عمل کیا جائے۔ جہاں سب کے سب
رائے دینے والے اور رہنمائی کرنے والے ہوں وہاں کبھی تسلی بخش نتیجہ
حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ پس ہم اس بحث کے بعد اس نتیجہ پر یقیناً پہنچتے ہیں
کہ طلبا کو کسی پولٹیکل تحریک میں رہنمائی نہ کرنی چاہیئے۔ بلکہ جو کچھ ملکی لیڈر
ملک کی بہتری کے لئے کہیں اس پر عمل کرنا ان کا فرض ہے۔ یہاں ایک
اور اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اگر طلبا پولٹیکل سرگردانی میں رہے تو پڑھائی
ہو چکی۔ اس کے جواب میں صرف اسی قدر کہنا کافی ہے کہ وہ شخص جو وقت
اور فرصت کا عذر پیش کرتے ہوئے خدا کی بندگی نہیں کرتا وہ روز قیامت
کو کبھی بخشا نہیں جا سکتا۔ ملکی خدمت خدا پرستی سے کسی طرح کم نہیں۔ تو
کیا وہ شخص جو وقت اور فرصت کا عذر پیش کرتے ہوئے اس خدمت سے
جی چُراتا ہے۔ ملک کی بہتری چاہنے والوں کے نزدیک قابل معافی ٹھیرایا جا سکتا
ہے؟ نہیں۔ ہرگز نہیں +

اس کے بعد ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ وہ کونسے پولٹیکل امور ہیں جن میں
طلبا بیشتر حصہ لیتے ہیں۔ اور جو اس طرز عمل کے مخالفوں کے نزدیک قابل
اعتراض ہیں +

(۱)۔ سودیشی تحریک۔ ولایتی اشیا کی مخالفت اس تحریک پر پولٹیکل
رنگ چڑھا دیتی ہے معترضین کہینگے کہ ولایتی اشیا کی مخالفت کے بغیر بھی ایک
طالب علم سودیشی کا حامی ہو سکتا ہے۔ جو کسی طرح قابل اعتراض نہیں۔
(حالانکہ اس پر بھی اعتراض کیا جاتا ہے) مگر سودیشی بنکر ولایتی اشیا
کی مخالفت سے انکار کرنا ایک مہمل سا فقرہ ہے جس کے معنے کم از کم میں تو
کچھ نہیں سمجھ سکا۔ جب کوئی شخص بدیشی چیزیں استعمال نہیں کرتا تو یقیناً اسے

ان سے نفرت یا بہتر لفظوں میں مخالفت ہے اور اس طرح وہ پولیٹکل تحریک
میں حصہ لیتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ سودیشی تحریک کو پولیٹکل تحریک کون
کہتا ہے؟ اسے پولیٹکس سے واسطہ ہی کیا ہے؟ یہ تو ایک تجارتی تحریک
ہے لیکن غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ سودیشی تحریک بلکہ ہندوستانیوں کی
ہر ایک تحریک پولیٹکل تحریک ہے کیونکہ اس کا تعلق کسی نہ کسی طرح گورنمنٹ
سے ضرور ہے۔ جس کے خلاف کسی جائز خواہش کے لئے بھی آواز اُٹھانا
سلطان پرستی کی رسم کے خلاف شان ہے +

سودیشی تحریک کی کامیابی کا جو اثر انگریزی تاجروں کو برداشت کرنا
پڑے گا ذرا اس کا خیال کیجئے اور اس کے ساتھ ہی یہ خیال فرمائیے کہ حکمران
قوم کو اس نقصان سے جو صدمہ ہوگا اسے وہ کیا سمجھے گی اور ہندوستانیوں
کے حق میں کیا دعا خیر مانگے گی۔ سلطنت کے ایجنٹ جن کے ہاتھ میں ہندستان
کی قسمت کا فیصلہ ہے ہندوستانیوں کی طرح سے اپنے قومی فرائض اور اپنی
قوم کے عروج و زوال سے غافل نہیں نہ ہی وہ اس سے غافل رہنا چاہتے
ہیں۔ اس لئے وہ کبھی گوارا نہیں کر سکتے۔ کہ سودیشی تحریک کو کامیابی ہو۔
پس جو شخص ان حالتوں کو جانتے ہوئے سودیشی تحریک کا حامی ہے وہ
صاف الفاظ میں حکمران قوم کی مخالفت کرتا ہے خواہ وہ مخالفت جائز ہی
کیوں نہ ہو اور جس تحریک میں حکمران قوم کی مخالفت کی جائے وہ آج کل
کی تعریف کے مطابق یقیناً پولیٹکل ہے۔ میں نے ابھی کہا تھا کہ ہر ایک
تحریک پولیٹکل ہو سکتی ہے اور مثالوں کے طور پر سودیشی تحریک کو پیش کیا
ہے۔ ایک اور مثال سن لیجئے۔ مسئلہ تعلیم کو لیجئے ظاہر میں اس میں کوئی بات
ایسی معلوم نہیں ہوتی جو مسئلہ تعلیم کا تعلق پولیٹکس سے ظاہر کرتی ہو مگر غور

کرنے پر معلوم ہوگا۔ کہ اس معصوم مسئلہ میں بھی پولیٹیکل رنگ کی جھلک موجود ہے۔ آپ کہیں گے کیونکر؟ خیال فرمایئے کہ آپ کو ہندوستان میں تعلیم کو عالمگیر بنانے کے لیئے گورنمنٹ کی بہت سی امداد کی ضرورت ہے اور اس کے لیئے مدت سے آواز بلند کی جا رہی ہے اور کہا جا رہا ہے۔ کہ گورنمنٹ جو یہ دعوے کرتی ہے کہ ہم نے ہندوستان کی عنان حکومت محض اس لیئے اپنے ہاتھ میں لی ہے کہ یہاں کے جاہل لوگوں کو (افسوس کہ اب ہم جاہل کہلانے کے درجہ تک پہنچ گیئے) تعلیم دے کر مہذب بنا دے اور جب وہ اس قابل ہو جائیں کہ اپنے نیک و بد کو بخوبی سوچ سکیں اور اپنا انتظام اس خوبی سے کرسکیں کہ امن عامہ قایم رہے تو ہندوستانیوں کی امانت انہیں سونپ کر انگلستان لوٹ جائیں۔ ہر ایک قصبہ میں مدرسے کھول دے اور لازمی اور مفت تعلیم کا سلسلہ مثل دوسرے مہذب ممالک کے جاری کردے۔ اس کے اخراجات کے لیئے وہ گراں ٹیکس جو ہم سے وصول کیئے جاتے ہیں۔ خرچ میں لائے جائیں مگر کیا اس شور و شغب کا کچھ نتیجہ ہوا؟ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمیں مایوس ہو جانا چاہیئے۔ میں ان آدمیوں میں سے نہیں ہوں جو مایوس ہونے والے ہوں۔ مجھے تو سخت سے سخت دشوار سے دشوار اور ایسے کاموں میں بھی جنپر گورنمنٹ باوجود ہماری جد و جہد کے توجہ نہیں کرتی امید کی صورت نظر آتی ہے میرا عقیدہ ہے کہ ایک وہ وقت آئے گا اور ہر ایک ایسے کام کے لیئے جو نیک نیتی پر مبنی ہو ایسا وقت آتا ہے۔ کہ گورنمنٹ تو کیا کوئی انسانی طاقت خواہ کتنی ہی زبردست کیوں نہ ہو اسے نہیں روک سکتی۔ مگر یہاں تو یہ دیکھنا ہے کہ تعلیم کے سے معصوم اور ہر دلعزیز مسئلہ پر بھی گورنمنٹ کا تساہل ہونا

پڑتا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ گورنمنٹ کے طرز عمل کی شکایت اس مسئلہ کو پولٹیکل بنا دینے کے لئے کافی ہے۔ اب اس نتیجہ پر ہم پہنچ گئے۔ کہ ہر ایک تحریک جو ملکی بہتری کے لئے کی جاتی ہے۔ کم و بیش پولٹیکس سے متعلق ہے۔ پس ایسی صورت میں یہ کہنا کہ طلبا پولٹیکس میں حصہ نہ لیں کہاں تک مناسب ہوگا کہ طالب علم سودیشی نہ ہوں یہ نہیں ہو سکتا۔ طالب علموں کو اپنی تعلیم کی فکر نہ ہو یہ غیر ممکن ہے۔ کیا طالب علم اپنے اہل وطن کی بے عزتی پر آواز بلند نہ کریں۔ یہ انسانی حمیت سے بعید ہے۔ کیا طالب علموں کو ایسا مردہ دل بنا دینا چاہتے ہیں کہ گویا وہ اس دنیا میں پیدا ہی نہیں ہوئے جو بچے اس مردہ دلی میں زندگی کا ایک معقول حصہ گذاریں گے۔ کیا وہ بڑے ہو کر اور زندگی میں داخل ہو کر کام کے آدمی ہو سکتے ہیں۔ یقیناً نہیں +

انگلستان کی زندہ اور مردہ تاریخ ہمارے سامنے ہے اور ہم دیکھتے ہیں طالب علموں سے بڑے بڑے ملکی کام نکلے ہیں۔ ان حالات میں طالب علموں کو پالٹیکس سے علیحدہ رہنے کی ہدایت کرنا میرے نزدیک گناہ ہے +

میں یہ ضرور کہوں گا کہ طالب علموں کا یہ کام نہیں کہ وہ رہنمائی کریں یا خود تجاویز سوچکر ان پر عمل کریں یا اپنا تمام وقت ملکی خدمت کے وہم میں ضایع کر دیں بلکہ ان کا کام ملکی رہنماؤں کی پیروی ہے۔ ملکی بہتری کی تحریکوں پر عمل کرنا ان کا کام ہے۔ میرے خیال میں تو طالب علموں ہی پر کیا منحصر ہے ہر ایک شخص کو رہنما بننے کی کوشش نہ کرنی چاہیئے۔ قانون قدرت جسے ذریعہ ترقی کہنا چاہیئے تو یہ ہے۔ کہ راہنمائی کرنے والے چند ہوں اور پیروی کرنے والے بہت سے۔ پڑھا لکھا کر طالب علموں کی کیا اس کمزوری کی امید کی جانی چاہیئے۔ حمیت ایسے گوارا نہیں کرتی۔

نئے سال کی نئی اُمیدیں

شادیم کہ سال نو در آمد
غافل کہ ز عمر رفتہ سالے

دنیا بہ اُمید قایم - سینکڑوں سال آئے اور چلے گئے اور ہر ایک سال باوجود سال گذشتہ کی مایوسیوں کے آیندہ بہتری کی امید کی جاتی رہی - ہندوستانیوں کی معمول سے زیادہ برداشت پسند طبیعت کا سہارا وہ سنہری امیدیں ہیں جن کے بھروسہ پر وہ کسی تکلیف کی پرواہ نہیں کرتے اور ہمیشہ اسی امید میں مگن رہتے ہیں کہ اب نہیں تو اب ہو جائیگا حقیقت میں یہ خصلت ایک حد تک قابل تعریف ہے کیونکہ جو لوگ کبھی مایوس نہیں ہوتے اور اپنی کوششوں میں سرگرم رہکر زمانہ کی تبدیلیوں اور تکالیف کی پرواہ نہیں کرتے وہ ایک دن ضرور کامیاب ہوتے ہیں +

سال گذشتہ کے ابتدائی واقعات ہی کچھ افسردہ کرنے والے تھے - خدا کا شکر ہے کہ موجودہ سال کوئی ایسی صورت دکھائی نہیں دیتی اگرچہ موجودہ واقعات کو بھی خوش آیند نہیں کہا جا سکتا - مگر اتنا ضرور ہے کہ وہ قہر آلود نہیں - کانگریس کی فرقہ بندی پر تو اس کے آغاز سے ہی ملک کی نظریں تھیں - مگر گذشتہ افسوس ناک واقعات نے ملک کو یکبارگی چونکا دیا - اور وہ لوگ بھی جو اس انجمن قومی سے بالکل غافل تھے اس کے حالات اور آیندہ پروگرام کے مشتاق نظر آتے ہیں ملک

کی نظر میں ان پرجوش کارکنوں کی طرف لگی ہوئی ہیں جنہوں نے ۲۲ سال
تک کانگریس کو کامیابی سے چلایا اور صدہا دشواریوں کے باوجود اسے
کمزور نہ ہونے دیا۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ پولیٹکل معاملات پر گفتگو کرنا ہی
بغاوت تھا۔ شاہی معاملات میں دخل دینا انتہا درجہ کی گستاخی خیال
کی جاتی تھی۔ آج کانگریس کی ۲۳ سالہ کوششوں کا نتیجہ خواہ اطمینان
بخش نہ ہو مگر اتنا تو ضرور ہوا ہے کہ ملک کے ایک طرف سے دوسری
طرف تک اپنے حقوق کی نگاہ داشت کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے
زمیندار جنہیں سب سے زیادہ سادہ لوح خیال کیا جاتا ہے۔ ملکی پیچیدگیوں
اور کانگریس کا تذکرہ کرتے دکھائی دیتے ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بہت
بڑا کام تھا جو کانگریس نے ۲۲ سال کی چھوٹی سی عمر میں انجام دیا۔ سب
سے زیادہ اشتیاق کے ساتھ جس بات کا انتظار کیا جا رہا ہے وہ کانگریس
کی فرقہ بندی ہے۔ آیندہ اجلاس کانگریس کیا ہوگا یہ ایک معمہ ہے جسے
حل کرنے کے لئے بڑے بڑے صاحب فہم و ذکا رائے زنی کر رہے
ہیں اور نہ صرف ہندوستان کے ہر گوشہ سے آواز بلند کی جا رہی ہے
بلکہ غیر ممالک کے اہل الرائے بھی رائے زنی کر رہے ہیں۔ متعصب
اینگلو انڈین اخبارات اس افسوسناک انجام پر بھی نیش زنی سے باز نہیں
آتے۔ پائونیر نے فریق نرم و گرم کی جو تعریف ان افسوسناک واقعات
کے بعد جو سورت میں پیش آئے کی ہے وہ خالی از دلچسپی نہیں۔ اور اس
تعریف سے ہم پر یہ راز کھل جاتا ہے کہ ہماری وفاداری کی ہر ایک کوشش
ان متعصب نکتہ چینیوں کی نظر میں قابل تعریف نہیں ٹھہر پا سکتی۔ پاونیر
صاحب فرماتے ہیں :-

اکسٹریمسٹ وہ لوگ ہیں جو اپنے خیالات کو معمہ نہیں بناتے اور
صاف صاف ظاہر کر دیتے ہیں۔ موڈریٹ وہ اکسٹریمسٹ ہیں۔
جو ظاہر میں وفاداری جتاتے ہیں اور حقیقت میں اکسٹریمسٹ کے مقاصد
سے ہمدردی رکھتے ہیں +

یہ حقارت آمیز الفاظ ہر ایک محب وطن کے دل پر تیر و نشتر کا کام
کرینگے۔ ع

ہم مرے اور انہیں یقیں نہ ہوا

یہ الفاظ ہیں جنہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ وفادار ہندوستانیوں
کی ہر ایک کوشش جو وہ اپنی بہتری کے لئے کرتے ہیں بنا وٹ سمجھی
جاتی ہے لیکن کیا ہمیں ایسی زہریلی رائے معلوم کرنے کے بعد مایوس
ہو کر بیٹھ جانا چاہیے۔ کیا ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہماری ہر ایک
کوشش بے اثر ہے۔ کیا ہمیں یہ مان لینا چاہیئے کہ گورنمنٹ کبھی ہمیں
ہمارے حقوق نہ دے گی۔ نہیں نہیں جلد مایوس ہو جانے والے کبھی
کامیاب نہیں ہوا کرتے۔ ہمیں اپنی کوششوں میں ثابت قدم
رہنا چاہیئے۔ اور جب آغاز کانگرس پر ہم نے ان لوگوں کی رائے زنی
کی پرواہ نہ کی تھی جنھوں نے کانگرس کو ایک باغی گروہ قرار دیا تھا تو اب بھی
ہمیں ان زہریلی راؤں کی طرف سے اپنے کان بہرے کر لینے چاہئیں۔
جو وفادار ہیں وہ کبھی وفاداری زبان پر نہیں لایا کرتے۔ وفاداری
اعمال سے نہ کہ الفاظ سے ظاہر ہوتی ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنے
مبارک ارادوں کو نیک نیتی سے جیسا کہ اب تک کرتے چلے آئے
ہیں انجام دئے جائیں اور اس کے نتیجہ کے لئے اس انصاف کل پر

بھروسہ رکھیں جس کے دربار میں بے انصافی کا کھٹکا ہی نہیں +

مندرجہ بالا زہریلی رائے سے ایک سبق تو یہ ملا کہ ہماری وفاداری کی کوششیں بے سود ہیں۔ دوسرا یہ کہ ہماری التجائیں اور درخواستیں کبھی مفید نتائج پیدا نہیں کر سکتیں جب تک ہم خود کو ان کے قابل ثابت نہ کر دیں۔ وہ لوگ دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہوئے جنھوں نے دوسروں پر بھروسہ رکھا۔ گذشتہ اجلاس کانگرس کی افسوسناک کیفیت سے ہم پر ہماری کمزوریاں ظاہر ہو گئی ہیں۔ اور اب وقت ہے کہ ہم ان کمزوریوں کو دور کر کے جلد خود کو ان حقوق کے قابل بنالیں جن کا مطالبہ ہم گذشتہ تیس سال سے کر رہے ہیں۔ ہمارا اپنا عقیدہ ہے کہ جب ہم اس قابل ہو جائیں گے جن کی آرزو ہم رکھتے ہیں تو پھر یہ ممکن نہیں کہ ہم اپنے حقوق سے محروم رکھے جائیں +

گذشتہ اجلاس کانگرس منعقدہ سورت میں ہماری سب سے بڑی کمزوری جسے افسوسناک کمزوری کہنا چاہیئے ہم میں یہ پائی گئی کہ ہم اُن محبان وطن میں سے ہیں جو ذاتیات کو ملکی مفاد پر قربان نہیں کر سکتے یا یوں کہئے کہ ہم اپنے فریق کو ملک کی نسبت زیادہ محبت کرتے ہیں۔ ملک کے لیئے ایثار نفسی ہم نے ابھی نہیں سیکھی۔ ہماری تاریخ میں ابھی وہ واقعات زندہ ہیں جنھوں نے ہمیں اس درجہ پستی پر پہنچایا۔ جن کی بدولت آج ہم غلام ہیں۔ ہم اپنے فریق کی حمایت میں ملک کی بھلائی اور بُرائی کو بھول جاتے ہیں اور ہمارا جوش ہماری ترقی کی راہ میں مشکلات حائل کر دیتا ہے۔ یہ کمزوری ہمیشہ ہمارے زوال کا باعث ہوتی رہی ہے۔ کس قدر افسوس ہے یہ کمزوری جو ہم نے

ایسے نازک وقت میں جب ہمارے جوش ومحبت کا امتحان تھا ظاہر کی۔ ہمارے ہمدردوں کے حلقہ میں محسوس کی گئی مگر ایسی کمزوری پر بھی مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ یہ کمزوری کوئی ایسی کمزوری نہیں جو غیر ممالک کی تہذیب کی دعوبدار قوموں میں نہ پائی گئی ہو ہم دیکھتے ہیں کہ یوروپین ممالک میں فریق کی حمایت میں روز جنگ ہوتے ہیں۔ جوت چلتا ہے مگر اس سے ہرگز یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم بھی اس کی تقلید کئے جائیں۔ ہم ایک مرتبہ یہاں پھر لالہ لاجپت رائے جی کے الفاظ دہرانے مناسب سمجھتے ہیں جو حقیقت میں آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں :۔

ہندو مسلمانوں اور پارسیوں کے لئے وہ دن نہایت ہی نامبارک ہوگا جب مغربی طریقے اور مغربی قاعدے ان پر بالکل غالب آجائیں گے +

اگر ان ممالک کی یہ افسوسناک حالت ہمارے لئے کوئی سبق رکھتی ہے تو صرف اتنا کہ کمزوریاں انسان میں ہونا کوئی تعجب خیز اور انوکھی بات نہیں۔ ہر ایک انسان میں کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ اور ہمارا فرض ہے کہ ان کمزوریوں کو جلد دور کرنے کی کوشش کریں اور خود کو اس قابل بنائیں کہ کسی منصف مزاج کو نکتہ چینی کا موقع نہ ملے۔ ان لوگوں کی نکتہ چینی کی جو تعصب سے نکتہ چینی کرتے ہیں کبھی پرواہ نہ کرنی چاہیئے۔ اگرچہ سورت کا واقع نہایت افسوسناک ہے۔ اور اس لئے زیادہ افسوسناک ہے کہ وہ ایک نہایت نازک وقت میں وقوع میں آیا مگر تجربہ کار لوگ جانتے ہیں کہ کمزوریوں کے ظاہر

ہونے کے لئے ایسے ہی مواقع ہؤا کرتے ہیں۔پس ہمیں مایوس نہ ہونا چاہئے۔اور ان کمزوریوں کو جلد دور کرکے یہ دکھلا دینا چاہئے کہ اگرچہ ہم میں زوال کی طرف دھکیلنے والی کمزوریاں تھیں مگر ہم ان پر غالب آئے اور اپنی حالت کو بہت جلد درست کرلیا۔

آیندہ اجلاس کانگرس میں کافی وقت ہے۔اور اگر ہم عقلمندی اور دور اندیشی سے کام لیں ان اختلافات کو دور کرنے کا موقعہ ہے جنہوں نے گذشتہ اجلاس کانگرس کو ناگوار بنایا۔یہ وقت اختلافات پر جھگڑنے اور محض اختلاف پر ایک دوسرے کا دشمن بن جانے کا نہیں۔کوئی اختلاف ایسا نہیں جو غور کرنے سے مٹ نہ سکتا ہو مگر اس کے لئے ازبس ضروری ہو گا کہ ہم ہٹ دھرمی اور ضدی عادات کو چھوڑ کر سچائی کے طالب ہوں اور اگر باہمی مباحثہ سے ہمارا کوئی خیال یا عقیدہ غلط ثابت ہوتا ہے اس کے لئے رنجیدہ نہ ہوں۔ہم نے ابھی کہا تھا کہ کوئی انسان غلطی سے خالی نہیں ہو سکتا اسی اصول قدرت پر یہ کوئی عجب بات نہیں کہ جسے آپ درست سمجھتے تھے۔وہ غلط ثابت ہؤا اور اس لئے کوئی وجہ ناراضگی یا کبیدگی نہ ہونا چاہئے۔قومیں ایثار نفسی سے بنتی ہیں۔اگر ہم اپنے ملک کی سچے دل سے خدمت کریں۔اور ذاتیات خود غرضی کو بالائے طاق رکھ کر اور بالکل فنا فی القوم ہو کر کام کریں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اپنی قوم کے واسطے ترقی کا ایک عمدہ راستہ نہ نکالیں۔یہ ہمارے اختلافات کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔بشرطیکہ وہ نیک نیتی پر مبنی ہوں اور ہمارے پاس ایسا یقین کرنے کی وجوہات ہیں۔

یہ وقت اخبارات کے لئے نہایت نازک ہے اس وقت ان کی قوم پرستی کا امتحان ہے اور دیکھنا ہے کہ جس خدمت کا انہیں دعوے ہے وہ کہاں تک خوبی سے انجام دی جا رہی ہے۔ ہندوستان اور غیر ممالک کا تجربہ بتلاتا ہے کہ اخبارات بڑی سے بڑی طاقت ثابت ہوئے ہیں اور انہوں نے اقوام کی حالت میں انقلاب پیدا کئے ہیں۔ ہندوستان کو بھی انقلاب پیدا کر دینے والے اخبارات کا مقام قرار دینا ذرا تعجب سے سنا جائے گا۔ مگر یہ حیرت و تعجب ذرا غور کرنے پر فوراً دور ہو سکتا ہے شاید کسی کو بھی اس بات سے انکار نہ ہوگا کہ اخبارات کے جنم سے پیشتر ہندوستان میں ۹۰ فی صدی باشندے ایک دوسرے کے حالات سے بے خبر تھے وہ سمجھتے تھے کہ اگر ہمارا محلہ یا زیادہ سے زیادہ ہمارا شہر امن و راحت میں ہے تو تمام ہندوستان بلکہ تمام دنیا چین سے بسر کرتی ہے مگر یہاں بیان کر دینا ضروری ہے کہ احساس قومیت اُس زمانہ میں جب کہ تمام ملک کی ہر طرف سے آنکھیں نہ کھلی تھیں۔ تب زیادہ تھا۔ ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

محبت و ہمدردی کا دائرہ وسیع کرنے کے لئے جو کوششیں کی گئیں اُنہیں کامیاب نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جن لوگوں نے اس مبارک فرض کا بیڑا اُٹھایا وہ خود فریق پرستی اور خود غرضی کے شکار ہو گئے۔ اخبارات کا فرض جیسا کہ نازک تھا افسوس کہ اس توجہ سے انجام نہیں دیا گیا اور آج ہم ایک عرصہ کے بعد اخبارات کی ان خدمات کا جنہوں نے ملک میں آثار بیداری پیدا کئے شکریہ ادا کرنے کی بجائے اس

امر کے شاکی ہیں کہ تفرقہ اندازی اخبارات کا شعار ہے اور جو ترقیں ملک کی ترقی میں پیدا ہوئی یا ہو رہی ہیں وہ اخبارات کی بدولت ہیں یہ افسوسناک رائے ظاہر کرتے ہوئے محب الوطن کا دل دکھتا ہے اور ایڈیٹران اخبارات کے لئے جنہوں نے ملکی خدمات کے لئے کسی تکلیف کی پرواہ نہیں کی دنیا کی تمام راحتوں کو ملک پر قربان کر دیا اس سے زیادہ حوصلہ شکن رائے کوئی نہیں ہو سکتی۔ ع

ہماری جان گئی آپ کی ادا ٹھہری

ہم نے اپنی راحتوں اور خوشیوں کو آپ پر قربان کیا اور آپ مشکور ہونے کی بجائے شاکی ہیں کاش اپنے اپنے فرض کو سمجھا جاتا تو نہ تو اہل ملک شکایت کرتے اور نہ اخبار نویس۔ اخبار نویس کا درجہ فریق پرستی اور تعصب سے بالا تر ہے۔ کیا یہ افسوس کی بات نہیں کہ اخبار نویسی میں معقول ترقی کرنے اور زمانہ کا اُتار چڑھاؤ دیکھنے کے بعد ہم علانیہ طور پر اخبارات کو دو فریق میں تقسیم کرتے ہیں بلکہ مالکان و ایڈیٹران اخبارات بڑے فخر سے خود کو کسی مخصوص فریق کا وکیل بتلاتے ہیں بھلا اُن لوگوں سے ترقی اور بہتری کی کیا اُمید کی جا سکتی ہے جن کا جنم اور جن کی ہستی ہی تعصب پر مبنی ہے۔ فریق پرست اخبارات سے سوائے اس خدمت کے کبھی کوئی نمایاں خدمت ظہور میں نہیں آئی کہ اُنہوں نے ملک میں اختلافات کو بڑھا کر کامیابی کی راہ میں اور مشکلات حائل کر دیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سب اخبارات فریق پرست اور متعصب ہیں مگر یہ یقینی امر ہے کہ فریق پرست اخبارات کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ دوسری آواز سنائی تک نہیں دیتی۔ اخبار نویس کا اختلافات اور تعصب سے بالاتر ہونا لازمی ہے۔ اخبار لکھنے کے لئے

ایسا بن جانا چاہئے جیسے کوئی دنیا سے بلند کسی جگہ پر بیٹھا ہوا اور تمام واقعات
کو دیکھ کر رائے قائم کرتا ہو۔ ضرورت ہے کہ بلا تعصب رائے ظاہر
کرنے والے اخبار نویسوں کی قدر کی جائے اور ملک میں صحیح رائے پھیلے
اخبار نویس کو بلا رو رعایت تحسین و نفرین کہنا چاہئے۔ اس کے لئے
کوئی شخص بلا وجہ تعریف وحقارت کے قابل نہیں ہو سکتا۔ سورت
کانگرس کے واقعات پر بحث کرتے ہوئے فریق پرستی اور بیجا خوشامد و
تعریف سے اگر کام نہ لیا جاتا تو یقیناً اس وقت تک مفید نتائج پیدا ہوتے
کانگرس کے متعلق غلط فہمیاں دور کرنے کی بجائے اختلافات بڑھائے
جا رہے ہیں فریق گرم کے اخبارات نرم اخبارات کو صلواتیں سناتے ہیں۔
اور نرم فریق کے اخبارات گرم اخبارات کو باغی ٹھیراتے ہیں۔ ہم نہیں
سمجھ سکتے کہ آخر اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ مانا کہ مہاراج تلک نے اجلاس کانگرس
کو تہ وبالا کیا یا مہاراج گوکھلے اور سر فیروز شاہ مہتہ نے کانگرس میں یہ ناگوار
صورت پیدا کی مگر اب ایک دوسرے کی حمایت کرنے اور قصور جتانے
سے جہانتک ہم سمجھ سکے ہیں کسی بہتری کی امید نہیں کی جا سکتی۔ وہ لوگ جو
یہ دعوے کرتے ہیں کہ ہم ملک کی بہتری کے لئے جان تک دینے کو تیار
ہیں۔ افسوس ہے کہ وہ اتنی معمولی قربانی بھی نہیں کر سکتے کہ خود پسندی اور
فرقہ پرستی کو چھوڑ کر اختلافات مٹانے کی کوشش کریں۔ غیر ممالک کے
اہل الرائے نقادوں کی رائے پر خوش ہونا اور اپنے اپنے فریق کی تعریف
سنکر جامہ میں نہ سمانا کبھی ملک کے لئے مفید نتائج پیدا نہیں کر سکتا ضرورت
ہے کہ اب ہم اختلافات کو مٹا کر اتفاق سے کام کی کوشش کریں۔ تاکہ
دشمنوں کو ہم پر ہنسنے اور ہماری نااتفاقی سے فائدہ اُٹھانے کا موقعہ

نئے سال

انقلاب انگیز سال تمام ہؤا۔ نئے سال نے ہزاروں امیدوں اور سینکڑوں آرزوؤں کے ساتھ جنم لیا۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ ہم میں کتنے لوگ گذشتہ واقعات سے سبق حاصل کرنے اور اس کے تجربہ سے فائدہ اُٹھانیکی کوشش کرتے ہیں۔ جو کچھ ہونا تھا وہ ہوچکا۔ اب اس پر پچھتانا اور آپس میں جھگڑنا فضول ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم گذشتہ افسوسناک واقعات سے فائدہ اُٹھائیں اور آیندہ ایسی ناگوار صورت پیدا نہ ہونے دیں۔

کانگرس کے آغاز سے آج تک یہ ایک دستور چلا آیا تھا کہ ہر سال آیندہ سال کی تجاویز پر غور کرلیا جاتا تھا۔ اور اس پر کاربند رہنے کی کوشش کی جاتی تھی افسوس کہ اس سال اس کی نوبت نہ آئی۔ جو کچھ کیا گیا وہ قابل اطمینان نہیں اس لئے آیندہ کانگرس تک تمام اختلافات کو مٹانا اور اپنی عزت اور حقوق کی نگاہداشت کرنا اشد ضروری ہے۔ تمام ملک کی نگاہیں کانگرس کے کارکنوں اور ملکی رہنماؤں کی طرف ہیں اور وہ امید کر رہے ہیں کہ آیندہ سال ہم کانگرس کو ویسی ہی کامیابی سے ہوتا ہؤا دیکھیں گے جیسا کہ گذشتہ بائیس سال تک دیکھتے رہے بلکہ اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کو محسوس کرکے دور کرنے کے بعد نئے جوش کے ساتھ زیادہ مستعدی سے سرگرم نظر آئیں گے۔ یہ تو ملک اور ملک کے رہنماؤں سے امید کی جارہی ہے۔ گورنمنٹ سے بھی بہت سی امیدیں ہیں کیونکہ ۱۹۰۷ء کے واقعات نے نہ صرف کانگرس یا دیگر اہل ملک کے لئے سبق خیز واقعات پیش کئے بلکہ گورنمنٹ کو بھی ہندوستانیوں کی موجودہ بیداری اور حکام کے سلوک کے اثر کا تجربہ ہؤا ہے۔ زمانہ شناس گورنمنٹ کو اس تجربہ سے فائدہ اُٹھانے کا مشورہ

دینا تو گویا لقمان کو پڑھانا ہے لیکن اگر ہمیں گورنمنٹ کو گذشتہ واقعات کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت ہے تو محض اس لئے کہ ہمیں ہمیشہ گورنمنٹ کی طرف سے اس معاملے میں مایوسی ہوئی ہے۔ ہندوستان کے لئے شاید ایسا سال تو کوئی بھی نہیں آیا جو مصائب سے خالی ہو اگر گورنمنٹ اِن کے تجربہ سے فائدہ اُٹھاتی تو شاید وہ افسوسناک واقعات ظہور میں آتے جن کا ہمیں اور گورنمنٹ کو سال گذشتہ میں مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ ہمارے اختلافات کو دور کرنے کے لئے گورنمنٹ کی امداد سب سے زیادہ پُر اثر ثابت ہوگی۔ ہماری لاکھوں کوششیں وہ نتائج پیدا نہیں کر سکتیں جو گورنمنٹ کی معمولی سی توجہ کر سکتی ہے۔ اہل ملک میں اختلاف رائے کا آغاز گورنمنٹ کے ناپسندیدہ طرز عمل سے ہوا اور اگر آج گورنمنٹ دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے گذشتہ واقعات کے تجربہ پر ان شکایت کو رفع کرنے کی کوشش کرے جو بےچینی کا باعث ہیں تو یقیناً سب کے سب فریق نرم کے حامی ہو جائیں گے۔ جن سے کہا جاتا ہے کہ گورنمنٹ ہمدردی رکھتی ہے۔ یہ دشوار ہے کہ ہم پر سختیاں کی جائیں۔ ہماری شکایت کی طرف سے کان بہرے کر لئے جائیں اور ہماری آواز کو دبانے کی کوشش کی جائے اور پھر ہم گورنمنٹ سے سچی ہمدردی رکھیں اور وفاداری کا دم بھریں۔ یہ قانون قدرت ہی ہیں اس میں کوئی کیا کر سکتا ہے۔ ہم کبھی ایک لحظہ کے لئے بھی یہ یقین کرنے کے لئے تیار نہیں۔ کہ وہ مالدار لوگ جو گورنمنٹ کی ہر وقت خوشامد کرتے اور اس کے ہر ایک بُرے بھلے کام کی تعریف کرتے ہیں۔ گورنمنٹ سے سچی محبت رکھتے ہیں۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ مفلس لوگ کبھی گورنمنٹ کی سختی

سے جلد موثر نہیں ہوا کرتے۔ مثال کے طور پر دیکھ لیجئے۔ کہ اگر معاملہ بڑھا دیا جائے اور اس کے اثر سے نرخ اجناس میں فرق آجائے تو ایک غریب مزدور جو صبح سے شام تک پسینہ بہا کر چند پیسے کماتا اور اس سے اناج خرید کر اپنا پیٹ پالتا ہے۔ اس گرانی کو کبھی گورنمنٹ کی طرف سے نہیں سمجھتا۔ اسے کبھی خیال بھی نہیں آتا کہ اس گرانی کا باعث کیا ہے۔ وہ اس تکلیف کو خدا کا غضب سمجھتا اور اس پر شاکر رہتا ہے۔ اگر گورنمنٹ کی سختی اور نرمی اثر رکھتی ہے تو وہ ہمیشہ ان جاگیرداروں اور دولتمندوں کے لئے ہے جن کی جیب سے شروع میں روپیہ نکلتا ہے اور جو ظاہر میں حکام کو خوش کرنے کے لئے حضور بجا ہے کہدیا کرتے ہیں۔ پس یہ ایک ایسی معمولی بات ہے کہ گورنمنٹ کا اس سے ناواقف ہونا ناممکن ہے۔ محبت ہمیشہ محبت سے پیدا ہوتی ہے۔ جبر اور سختی۔ حقارت و ذلت کبھی محبت پیدا نہیں کر سکتی۔ جو حکام سختی کے جواب میں محبت اور وفاداری کی امید رکھتے ہیں۔ وہ سخت غلطی پر ہیں۔ ایسا کرنا کانٹے بو کر پھولوں کی امید رکھنا ہے +

جو لوگ خود بہادر ہیں وہ بہادروں کی عزت کرتے ہیں۔ جو سچے ہیں وہ سچوں کی عزت کرتے ہیں اور جو قوم پرست ہیں وہ قوم پرستوں پر قربان ہونے کو تیار ہیں۔ انگریز حکام سے کبھی کوئی یہ توقع نہیں رکھتا کہ وہ ان فنا فی القوم لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھینگے یا ان کی خواری اور ذلت گوارا کریں گے۔ جو اپنے ملک اور اپنی قوم کے لئے ہر ایک قسم کی تکلیف برداشت کرتے ہیں۔ اگر ایسا ظہور میں

آئے تو ہمیں افسوس ہوگا۔ اور ہم یہ کہنے کے لئے مجبور ہوں گے کہ نیکی کے جوہر ان میں نہیں رہے وہ جوہر جس نے ان کے ملک کو ممتاز بنایا۔ وہ جوہر جنہوں نے ان کی تہذیب کو ترقی کا معراج بتلایا۔ وہ جوہر جس کی بدولت وہ ہر دلعزیز ہوئے یا یوں کہدیا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ جوہر جنہوں نے ہندوستان کو ان کا بندۂ بے دام بنایا۔ حقیقی بہتری چاہنے والے کبھی بے چینی یا بُرائی پھیلانے کے لئے آواز بلند نہیں کیا کرتے۔ اور جو لوگ ایسے کمینہ مقصد کے ساتھ قومی ہمدردی کا دم بھرتے ہیں۔ انکے داؤں دیر تک نہیں چلا کرتے۔ اہل ملک ہی خود انہیں حقارت سے دیکھنے لگتے ہیں اور وہ بہت جلد اپنی سزا کو پہنچتے ہیں +

ہندوستانیوں کی محسن پرستی کا ایک زمانہ قائل ہے۔ ان سے ذرا سا سلوک کرنا انہیں بندۂ بے دام بنانے کے لئے کافی ہے۔ گورنمنٹ کے لئے اس کی مثال خود ہندوستان کا آغاز سلطنت ہے۔ تعصب تو اور بات ہے مگر منصف مزاج جانتے ہیں کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کی بنیاد ہندوستانیوں کی محسن پرستی ہے۔ غرض اس طویل بحث سے صرف یہ ہے کہ اگر گورنمنٹ بے چینی دور کرنا سلطنت کے حقیقی وفادار بنانا رعایا سے محبت کا سلوک اور انتہا پسندوں کو خاموش کرنا چاہتی ہے تو یہ ضروری ہے کہ سیڈیشن کے وہم میں نہ پڑے۔ رعایا سے محبت کا برتاؤ کرے ان کی شکایات کو سُنے اور دور کرے۔ یہ نسخہ اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ اور اگر اس پر عمل کرنے کی ٹھان لی جائے تو بے چینی دور کرنے کی تجاویز سوچنے

کی پریشانی نہیں رہتی - لالہ لاجپت رائے کے یہ الفاظ آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں :-

جو شخص جس قوم یا جس ملک میں پیدا ہوا ہے - اگر اس کی خدمت کو اپنا فرض اوّلین نہیں سمجھتا تو اس سے کہہ دو کہ اگرچہ جامۂ انسانیت اس نے پایا ہے - مگر انسانیت اس سے ابھی کوسوں دور ہے +

آؤ ہم سب مل کر کوشش کریں - کہ اختلافات کو مٹا کر امداد باہمی کے ساتھ ان مرحلوں کو طے کریں جو ہر قوم اور ہر ملک کے لئے پیش آنے ضروری ہیں اور گورنمنٹ سے امید رکھیں کہ وہ واقعات کے تجربہ سے فائدہ اٹھائے گی - اور اس سے وہ کمزوریاں ظہور میں نہ آئیں گی جو ملک اور گورنمنٹ دونوں کی پریشانی کا باعث ہوئیں - ملک کی خدمت کرنا ہمارا فرض ہے اور اس سے ہمیں کوئی سختی باز نہیں رکھ سکتی ہے +

اہل ملک اور گورنمنٹ دونوں فریق سے آیندہ دوراندیشی سے کام لینے کی امید کی جاتی - اور یہ امیدیں مبارک ہیں - کیونکہ جن لوگوں کا مقصد اعلےٰ ہے - وہ ضرور ممتاز ہوتے ہیں +

افسانۂ برہما کی بقیہ اشاعت محض اس وجہ سے معرض التوا میں ہے کہ شریمان لالہ لاجپت رائے جی اس وقت لاہور میں تشریف نہیں رکھتے ناظرین اس کا سبب ایڈیٹر کا بخل یا کوئی اور نہ سمجھیں - ہم اپنی طرف سے کوشش کریں گے کہ جلد سے جلد شایع ہو +

آزاد کے معاونین کو نئے سال کا نادر تحفہ

ذیل میں دو فارم خریداری آزاد درج کیے جاتے ہیں جو صاحب انکو خانہ پری کرکے پندرہ دن کے اندر آزاد کی خریداری شروع کرینگے انھیں آزاد کا کانگرس نمبر مفت نذر ہوگا

درخواست خریداری آزاد

جناب مینیجر صاحب آزاد

تسلیم۔ میرا نام خریداران آزاد کاغذ قسم اول۔ دوم۔ سوم میں درج فرماکر قیمت

بذریعہ منی آرڈر / وی پی وصول کر لیجئے گا

دستخط

پتہ مفصل خوشخط

نوٹ: جس قسم کے کاغذ کا رسالہ مطلوب ہو اسکے سوا باقی سب الفاظ متعلقہ قسم کاغذ کاٹ دیجئے

درخواست خریداری آزاد

جناب مینیجر صاحب آزاد

تسلیم۔ میرا نام خریداران آزاد کاغذ قسم اول۔ دوم۔ سوم میں درج فرماکر قیمت

بذریعہ منی آرڈر / وی پی وصول کر لیجئے گا

دستخط

پتہ مفصل خوشخط

نوٹ: جس قسم کے کاغذ کا رسالہ مطلوب ہو اسکے سوا باقی سب الفاظ متعلقہ قسم کاغذ کاٹ دیجئے

نئی صدی کی نئی تصنیف

اردو شاعروں کا بسیط اور جامع تذکرہ

یہ سب کو معلوم ہے کہ وقتاً فوقتاً اردو زبان کے شاعروں کے تذکرے لکھے جاتے رہے ہیں جنمیں شعراء کا کچھ کلام اور کچھ حال درج ہے۔ مگر جتنے تذکرے اسوقت تک نکلے وہ تقریباً سب اپنی خاص وضع کے تھے انمیں سے ایسا کوئی نہ تھا کہ جو اردو شاعروں کے انسائیکلوپیڈیا کا کام دے سکے کہیں صرف انتخاب اشعار ہی پر قناعت کی گئی تھی کسی میں مدح سرائی یا ہجو سے کام لیا گیا تھا۔ کوئی تذکرہ محض خاص حیثیت کے شعراء سے مخصوص تھا۔ کوئی خاص شہر سے منسوب تھا۔ اردو شاعری کے شائقین کو لالہ سری رام صاحب ایم۔ اے رئیس دہلوی مقیم لاہور کا مشکور رہنا چاہیئے کہ انہوں نے اس اہم ضرورت کو پورا کیا۔ اور سترہ برس کی محنت شاقہ اور صرف کثیر سے ایک جامع اور بسیط تذکرہ اردو شعراء کا تالیف فرمایا جو شعراء کی کثیر تعداد۔ اون کے حالات اور سوانح عمری کے مندرجہ حال کی تکمیل مختلف اصناف کلام کے بامذاق انتخاب جنکا کلام بیمبصرانہ تنقید اور دیگر اوصاف میں اپنی نظیر آپ ہے یہ تذکرہ ۲۹×۲۲ کی تقطیع کے قریباً تین ہزار صفحوں پر ختم ہوتا ہے بالفعل کہ ہزار داستان یا خمخانۂ جاوید کی اول جلد جو الف سے ت تک ردیفوں پر مشتمل ہے تیار ہو چکا ہے صرف چند جلدیں چھپنے کو باقی ہیں کاغذ نہایت عمدہ اور لکھائی چھپائی اعلیٰ درجہ کی ہے جلد بھی نہایت نفیس ہے۔ درخواستیں ابھی سے دھڑا دھڑ آرہی ہیں خوف ہے کہ شائقین کام نہ بگاڑ دیں اسلئے اعلان کیا جاتا ہے کہ جو صاحبان مذاق اس تذکرہ کو خریدنا چاہیں وہ صاحب مولف کے پاس بہت جلد درخواست خریداری بھیجیں۔ ایسا نہ ہو کہ سستی سے مایوسی اوٹھانی پڑے قیمت کاغذ اعلیٰ مبلغ [illegible] قسم دوم [illegible] دونوں قسم کے خریداروں کو مجلد کتاب دیجائیگی محصول ڈاک [illegible]

بندے ماترم ہندوستاں کے ہم ہیں ہندوستاں ہمارا بندے ماترم

سوراجیہ

قیمت سالانہ عہ معہ محصول ڈاک — نمونہ کا پرچہ مفت

اردو کے کثیر الاشاعت اخبار ہندوستان کے سابق ایڈیٹر مہاشیہ نارائن کی پر زور قلم سے ہر سنیچر کو پریاگ (الہ آباد) سے نکلتا ہے +

دنیا کیا کہتی ہے

سوراجیہ سودیشی اور بائیکاٹ سوراجیہ کی اغراض ہیں اور وہ اپنی اغراض کو خوبی سے بنھا رہا ہے۔ سوراجیہ ہر پہلو سے سرپرستی اور حوصلہ افزائی کے قابل ہے (آریہ گزٹ لاہور) +

یہ پرچہ ملک اور قوم کیلئے بہت کچھ مفید ثابت ہوگا۔ بشرطیکہ ملک و قوم بھی اس کی قدر افزائی کرے۔ سوشیل پولیٹکل معاملات پر نہایت آزادی سے بحث کرنا اس کا فرض ہے (ساہائی اخبار بنارس) +

اہل پنجاب ہمارے دوست کے زور قلم سے اچھی طرح واقف ہیں اس لئے کسی مزید تعریف کی ضرورت نہیں (آزاد لاہور) +

اخبار بظاہر ہونہار ہے اور ملکی مذاق پر نظر کرتے ہوئے اس کی کامیابی بھی یقینی ہے (اصلاح سخن لاہور) +

مضامین بردست اور خیالات آزاد ہیں پولیٹکل مسایل پر نہایت معقول بحث ہوتی ہے (منشور امرتسر) صوبجات متحدہ میں اس سے بہتر اور کوئی دوسرا اردو پرچہ اس وقت موجود نہیں (اردوے معلےٰ علیگڑھ) +

ان صوبجات میں دیسی اخباروں کی عام رائے کے قومی بنانے میں ہم کو سوراجیہ سے پوری مدد ملے گی (ہندوستانی لکھنؤ) +

آزاد دھن اور مسلک ہے صلح کل

آزاد

مرتبہ بشن سنگھا آزاد

جلد ۳ | فروری سنہ ۱۹۰۸ء | نمبر ۲

فہرست مضامین

تصاویر - پنڈت مدن موہن مالویہ - مہاراجہ ...

قیمت سالانہ قسم اول ۲؎ قسم دوم ۱؎ قسم سوم (بلا تصویر) ۱۲ علاوہ محصولڈاک

آزاد پریس لاہور میں چھپکر مالک کے اہتمام سے شائع ہوا

قیمت فی کاپی قسم اول ۴ر قسم دوم ۳ر قسم سوم ۲ر

پولیٹیکل لٹریچر

ہندوستان میں آثار بیداری کے ساتھ یہ ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ ایسا پولیٹیکل لٹریچر جو ملک میں صحیح جذبات اور جائز خواہشات پیدا کرنے والا ہو ملک کے روبرو پیش کیا جائے بہی خواہان ملک محسوس کر رہے ہیں کہ محض اسی لٹریچر کی کمی ہے کہ بعض اوقات ناتجربہ کار اور منزل سیاست کی دشواریوں سے ناواقف لوگ ملک کے لئے مصائب لاتے اور ہندوستان کی ترقی میں زیادہ اُلجھن ڈال دیتے ہیں۔ آزاد کی اشاعت کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ ہم سمجھتے ہیں کہ ملک کو اس قسم کی تصنیفات کی ذاتی لائبریری کی ضرورت ہے۔ انگریزی میں تو ایسی بہت سی کتابیں ہیں مگر اردو علم ادب ابھی تک ان سے محروم ہے اس اہم ضرورت کو محسوس کر کے ہم نے ایسی تصنیفات جو با مذاق محبان وطن کی الماریوں کی زینت اور ان کی خدمت میں باریاب ہونے کے لائق ہوں۔ اردو میں شایع کرنے کا ارادہ کیا ہے اس سلسلہ میں انگریزی تصانیف کے تراجم کے علاوہ ملک کے نامور زمانہ شناس اہل قلم کی تصانیف بھی شایع کی جائیں گی اور ان کی اشاعت کا انتظام اچھے کاغذ صحت اور خوبصورتی کے ساتھ ہوگا۔

اس سلسلہ کا آغاز مشہور محب ہند سر ہنری کوٹن کی لاجواب تصنیف

نیو انڈیا

کے ترجمہ سے ہوگا۔ اور آیندہ سہ ماہی کم از کم سو صفحہ کی ایسی ہی تصنیف ملک کے روبرو پیش کی جائے گی۔ مگر اس سلسلہ کی کامیابی کے لئے پانچ سو ایسے محبان وطن کی ضرورت ہے جو اس سلسلہ کی مستقل خریداری منظور کریں۔ ہم پیشگی قیمت نہیں مانگتے صرف عہ روپیہ بذریعہ منی آرڈر بھیجکر نام درج کرا لیجئے اور ہر ایک تصنیف آپ کی خدمت میں بصیغہ ویلیو پی ایبل بھیجی جائیگی یہ کوشش کی جائیگی کہ سال کی چاروں تصانیف کی قیمت کسی صورت میں للعہ سے زیادہ نہ ہو اس ارادہ کی کماحقہ تکمیل کیلئے محبان وطن کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔ نیازمند لبشن سہائے آزاد مالک و ایڈیٹر

کیا سارے مسلمانوں کیلئے ایک کالج کافی ہے

از سید محمد فاروق صاحب

سرسید احمد خان مرحوم کے سیاسی عقاید سے اگر قطع نظر کرکے غور کیا جائے تو ہر شخص کو بشرطیکہ وہ طبعاً انصاف پسند اور بے تعصب ہو تسلیم کرنا پڑے گا کہ سرسید مرحوم کی تعلیمی کوششوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو بہت بڑا فائدہ پہنچایا ہے۔ اُنھوں نے مسلمانوں کو محض تعلیم کی ضرورت پر ہی متوجہ نہیں کیا بلکہ علیگڈھ میں محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج جو آج کل اپنے اعلےٰ نتائج کے لحاظ سے اپنے معاصرین میں ہر طرح سے مشہور و محسود ہو رہا ہے قایم کرکے حصول علم کا ذریعہ بھی بتا دیا۔ یہ صرف سرسید مرحوم کی مساعی جمیلہ کا خوشگوار نتیجہ ہے کہ وہی مسلمان جو ایک زمانے میں انگریزی پڑھنا کفر و الحاد سمجھتے تھے آج اس ضروری اور مفید زبان کی تحصیل بطیب خاطر کرتے ہیں اور اب یہ بات اُن کے ذہن نشین ہوگئی ہے کہ کم از کم ہندوستان کے مسلمان بلا انگریزی زبان حاصل کئے اپنی ہمعصر اقوام سے تنازع البقا (Struggle of

ہیں عہدہ برآ نہیں ہوسکتے +

انگریزی زبان صرف اسی لئے ضروری نہیں کہ بلا اُس کے سرکاری ملازمت غیرممکن ہے یا تجارتی معاملات میں اُس کی ازبس ضرورت رہتی ہے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ علوم وفنون کی وہ نایاب وبیش قیمت کتابیں جن کو بلا مبالغہ زمانۂ موجودہ کی علمی فتوحات میں شمار کیا جاتا ہے زیادہ تر انگریزی زبان میں پائی جاتی ہیں اور تا وقتیکہ اس زبان سے کماحقہ واقفیت نہ ہو جدید فلسفہ اور سائینس پر حاوی ہونا محال ہے۔ آج کل تقریباً جس قدر نئی نئی معلومات بہم پہنچائی جاتی ہیں یا جو عجیب وغریب تھیوریاں قایم ہوتی ہیں یا نت نئی ایجادیں معرض وجود میں آتی ہیں وہ سب اسی زبان کے ذریعہ اقصائے عالم میں مشتہر ہوا کرتی ہیں۔ مختصر یہ کہ دنیاوی کاروبار میں انگریزی کا رواج آج کل بہت بڑھا ہوا ہے۔ ہمیں سرسید کا مشکور رہنا چاہیئے کہ انہوں نے جس طرح ہوسکا ہمیں اس زبان کے فوایدپر متوجہ کر کے اُسے سیکھنے کے لئے ترغیب دی اور محمڈن کالج قائم کر کے مسلمان کمیونٹی میں اُس کی روزافزوں اشاعت کے اسباب مہیا کئے +

اس میں کوئی شک نہیں کہ علیگڈھ کالج سے مسلمانوں نے بہت بڑی حد تک منفعت حاصل کی ہے اور گو اُس نے آنریبل مسٹر گوکھلے اور مسٹر بینرجی ایسے محب وطن اشخاص ملک کی خدمت کے لئے نہیں پیدا کئے تاہم ایک معقول تعداد ایسے اصحاب کی مہیا ہوگئی ہے جو انگریزی ایسی عالمگیر زبان جاننے کا فخر رکھتے ہیں اور جن کی ذات سے قوم کو کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور پہنچا ہے اور امید ہے کہ اگر اس کے تعلیم یافتہ زبان کی ضروریات پر متوجہ اور اپنے دیگر ابنائے وطن سے ایثار نفس حب قومی اور ہمدردی ملک کا سبق

سیکھتے رہے تو آیندہ کے لئے مسرت بخش اُمیدیں اُن کی ذات سے پوری ہوسکتی ہیں۔ اے کاش علیگڈھ کالج سے ایسے لوگ تعلیم پاکر نکلیں جو اپنی ساری زندگی کا منقصد صرف نوکری کو یا دوسرے لفظوں میں غلامی کو نہ سمجھیں بلکہ اُن کے خیالات وسیع ہوں اُن کی نظریں بلند اور بالغ ہوں اور اُنکے دلوں میں جایز حریت اور آزادی کے خوش گوارا ور قابلِ تحسین جذبات پائے جائیں +

انگریزی تعلیم کا بہترین نتیجہ ایک یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ انسان کی طبیعت میں ایسے عالی خیالات پیدا کرتی ہے جو قومی عصبیت کے لئے بہت مفید ثابت ہوئے ہیں۔ آج کل ہندوستان میں بیداری کے سامان مہیا ہوگئے ہیں اور لوگ اپنے پولٹیکل حقوق کی محافظت پر آمادہ و مایل نظر آتے ہیں۔ کانگرس عرصہ سے قایم ہے۔ کئی سال سے سودیشی تحریک ملک میں جاری ہے۔ غرضیکہ ملکی ترقی و بہبودی کے آثار ظاہر ہیں اور یہ سب باتیں اس وجہ سے ہوئی ہیں کہ انگریزی تعلیم کی بدولت یہاں کے باشندے اپنی پوزیشن اور اپنی حاجات سے واقف ہوگئے ہیں چنانچہ سال پیوستہ حضور والیسرائے لارڈ منٹو بہادر بالقابہ نے بھی محمڈن ڈیپوٹیشن کے ایڈریس کا جواب دیتے ہوئے بنگال کی بے چینی کا ذکر فرمایا تھا اور اعتراف کیا تھا کہ ایجیٹیشن وغیرہ کی ذمہ وار محض انگریزی تعلیم ہے۔ بہر کیف انگریزی تعلیم سے ہم کو بہت سے فواید حاصل ہوئے ہیں اور آیندہ بھی بہت سی اُمیدیں اُس سے وابستہ ہیں۔ اس لئے انگریزی زبان کی تحصیل پر افراد قوم کو راغب کرنا اور اُس کے سامان مہیا کرنا بجائے خود ایک قومی خدمت ہے اور اس وجہ سے علیگڈھ کالج کی وہ خدمات جو انگریزی کی ترویج کے متعلق اُس سے

عمل میں آئی ہیں تحسین و آفرین کے قابل ہیں لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا چھ سات کروڑ مسلمانان ہندوستان کے لیئے صرف ایک کالج کافی ہے؟ اور آیا صرف محمڈن کالج علیگڈھ سے مسلمانوں کی تمام علمی ضرورتیات پوری ہو سکتی ہیں؟

یہ سوال اپنی ضرورت و اہمیت کی وجہ سے ملک اور قوم کے اہل الرائے گروہ کی کامل توجہ اور غور و خوض کا محتاج ہے لیکن ضروری ہے کہ اس بارے میں جو رائے ظاہر کی جائے وہ بیجا طرف داری اور ہٹ دھرمی سے بری ہو۔ اس سوال کے متعلق ہم اس موقع پر اپنے ناچیز خیالات ظاہر کرکے اس مفید و اہم مسئلہ کو خاص طور پر زیر بحث لانا چاہتے ہیں اور اہل قلم حضرات سے اس نفع بخش مباحثہ میں شرکت کے خواستگار ہیں +

کئی سال کا عرصہ ہوا کہ بریلی کالج کی زندگی اور موت کا سوال پبلک کے سامنے درپیش تھا اور کالج مذکور کے حامیوں نے رقمی ضروریات پر نظر کرکے اہل ملک سے بلاتفریق مذہب و ملت مالی امداد کی اپیل کی تھی۔ صاحبان ہنود نے بخندہ پیشانی چندے دیئے لیکن جب مسلمانوں کے سامنے فہرست چندہ پیش ہوئی تو اُن میں سے بعض نے بخوشی اُس میں شرکت کی اور اس طرح اپنی روشن خیالی اور زمانہ شناسی کا قابل تعریف ثبوت دیا اور اکثروں نے یہ خیال کیا کہ یہی رقم علیگڈھ کے قومی کالج کو کیوں نہ دی جائے۔ مسلمانوں کی اس دورنگی پر جو افسوس ہے کہ ہمارے قومی کاموں کا جزو اعظم بن گئی ہے! اخبارات میں خوب خوب رائے زنی ہوئی اور موافقانہ و مخالفانہ خیالات ظاہر کیئے گئے۔ علیگڈھ کالج کے دوستوں نے بلا عقل سلیم سے کام لئے۔ اور مقامی ضرورتوں پر غور کیئے آنکھ بند کرکے یہ فتوے دے دیا کہ چاہے

بریلی کا کالج باقی رہے یا مٹ جاوے مسلمانوں کو اُس سے کوئی واسطہ نہیں گویا کہ مسلمانوں کو کالج کے وجود سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ اور اس وجہ سے اُنہیں اُس کی بقا کی فکروں میں مبتلا ہونے اور چندہ دینے کی ضرورت نہیں بلکہ وہی رقم جو بریلی کالج کو دیجاتی ہے مسلمانوں کے قومی کالج کو بھیج دی جائے۔ اس فتوے کے برخلاف جو حالات اور واقعات سے چشم پوشی کر کے صادر کیا گیا تھا دوسرا گروہ یہ کہتا تھا کہ علیگڈھ کالج کے قومی تعلیم گاہ اور اس وجہ سے ہماری امداد کا مستحق ہونے سے کسی کو انکار نہیں لیکن بریلی اور اُس کے قرب وجوار والوں کو جس قدر ایک مقامی کالج سے فائدہ اُٹھانا ممکن ہے۔ علیگڈھ کالج سے کسی طرح ممکن نہیں اور اس لیئے بریلی کالج کے ٹوٹ جانے سے تحصیل علم کا ایک آسان اور سہل الحصول ذریعہ ہاتھ سے جاتا رہیگا +

مندرجہ بالا دونوں رایوں کو نیک نیتی کے ساتھ موازنہ کرنے سے ہم اپنے سوال معلومہ کے جواب پر پہنچ سکتے ہیں۔ جن لوگوں نے بریلی کالج کی امداد ضروری سمجھی وہ فی الحقیقت آخر بیں تھے وہ جانتے تھے کہ جو آسانیاں اُنہیں مقامی کالج سے مستفید ہونے کے لیئے تھیں وہ دوسری صورتوں میں مفقود تھیں۔ بعد مسافت اور کثرت اخراجات یہ دو چیزیں اکثر تحصیل علم کے راستے میں مارج ثابت ہوئی ہیں اور مسلمانوں کی غفلت اُس پر [illegible] طرہ ہے۔ یقیناً انہی وجوہ سے مسلمان طلبہ کا کثیر حصہ علیگڈھ کالج سے فائدہ اُٹھانے میں قاصر ہے۔ علیگڈھ کالج میں جس قدر طلبا صوبجات متحدہ اور پنجاب کے پائے جاتے ہیں اُتنے مدراس اور بمبئی کی طرف کے نہیں ہیں اس کے اسباب چاہے جو کچھ ہوں۔ لیکن اُن کے منجملہ ایک یہ بھی ہے کہ فاصلہ

اور دوری کی وجہ سے جو اخراجات درکار ہیں وہ کسی طرح بہم نہیں پہنچتے۔ اور یوں بہت سے طالب علم اپنے قومی دارالعلوم کی تعلیم و تربیت سے متمتع ہونے سے محروم رہتے ہیں +

نظر برایں اسباب اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ مختلف حصص ہند میں مسلمانوں کی قومی درس گاہیں کھول دی جائیں۔ یا جو درس گاہیں اب موجود ہیں اُن کی توسیع کی جائے۔ مثلاً بمبئی میں انجمن اسلام کا جو مدرسہ ہے وہ مقامی چندہ سے اول یا دوم درجہ کا کالج بنا دیا جائے اور اسی نوع کا انتظام مدراس میں بھی کیا جائے۔ پنجاب میں کسی نئے کالج کی ضرورت نہیں کیونکہ لاہور کا اسلامیہ کالج اپنے نتائج کے لحاظ سے بہت کچھ قابل اطمینان حالت میں ہے۔ ہاں اگر ضرورت ہے تو اس بات کی کہ زندہ دلان پنجاب کے اس کالج کی اہمیت ذہن نشین کر دی جائے اور ثابت کر دیا جائے کہ اُن پر علیگڈھ کالج سے زیادہ حق اسلامیہ کالج لاہور کا ہے +

بنگال میں بھی سرے سے کسی نئے اہتمام و انتظام کا ہونا ضرور نہیں ایک قومی کالج کا کام وہاں کے "محسن فنڈ" کے ذریعہ سے پورا ہوتا ہے۔ اب چونکہ ایجوکیشنل کانفرنس نے جو مسلمانان ہند کی ایک نامور تعلیمی مجلس ہے اُس کی جانب خصوصیت سے توجہ فرمائی ہے اور اس کے متعلق مزید واقفیت بہم پہنچانے کا گورنمنٹ نے وعدہ کر لیا ہے اس لیے "محسن فنڈ" کا وجود اب اور بھی فائدہ رساں ثابت ہوگا کیونکہ اُس کی باقاعدہ نگرانی اور مناسب طریق عمل سے اُس کا کام بہت وسیع پیمانے پر ہونے لگیگا +

غرضیکہ ہر صوبہ میں اگر متعدد نہیں تو کم سے کم ایک ایسا مدرسہ یا کالج ہونا چاہیئے۔ جہاں مسلمانوں کے غریب و کم استطاعت لڑکے جن سے دور دراز

سفر اور بورڈنگ وغیرہ کے اخراجات بہم پہنچانا مشکل ہو بہ آسانی تعلیم پا سکیں اور جب یہ ہو جائیگا تو ہر صوبہ میں چندہ وغیرہ وصول کرنیکا حق صرف اُسی صوبہ کے کالج کو ہو گا۔ اور اس طریقے سے علیگڈھ کالج کے حصہ میں صوبجات متحدہ پڑیں گے +

ممکن ہے کہ بعض بزرگ ہماری اس رائے سے علیگڈھ کالج کی فرط محبت اور جوش حمایت کے سبب اتفاق نہ کریں اور ہر صوبے میں جدا جدا تعلیم گاہیں کھولنے کے خلاف ہوں۔ لیکن اگر وہ ذرا بھی غور کریں گے تو اُنہیں ہمارے اس خیال سے اختلاف باقی نہ رہیگا۔ متعدد کالجوں کے وجود سے علیگڈھ کے قومی مدرسے کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ بلکہ جو غرض علیگڈھ کالج کے قیام سے سید مرحوم کو مد نظر تھی باحسن الوجوہ پوری ہوگی +

ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس ڈھاکہ کے موقع پر ایک تقریر میں خواجہ غلام الثقلین صاحب کو جن کی بیش قیمت قومی خدمات بیحد شکریہ کی مستحق ہیں۔ جنوبی ہند میں ایک نئے کالج کے قیام پر اظہار رائے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ آپ اس بات کو پسند فرماتے ہیں کہ ملک میں بہت سے قومی مدارس کھولے جائیں۔ لیکن آپ کی رائے ہے کہ علیگڈھ کالج بدستور تمام ہندستان کے مسلمانوں کا تعلیمی مرکز رہے۔ ہم اس رائے سے اتفاق نہیں کر سکتے کیونکہ اس صورت میں مقامی کالج کا وجود کچھ زیادہ سودمند نہ رہیگا۔ اور نہ اُس کا فنڈ جس کے لئے ازروئے یونیورسٹی ایکٹ اب ایک کثیر رقم درکار ہے۔ قابل اطمینان شکل اختیار کر سکیگا۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ اسلامیہ کالج کی مالی کمزوری کا حقیقی راز علیگڈھ کالج کا وجود ہے جس کی وجہ سے پنجابیوں کی ہمدردی منقسم ہو جاتی ہے اور نیز وہ دو دو جگہ چندہ دینے سے بھی عاجز آجاتے ہیں ۔

رکھا جس وجہ سے خواجہ صاحب تمام مسلمانوں کو علیگڈھ کالج سے تعلق برقرار رکھنے کے خواہشمند ہیں وہ غرض بھی ہاتھ سے نہیں جاسکتی کیونکہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس تمام قومی کالجوں کو اتفاق و ہمدردی کے ایک ہی شیرازے میں منسلک رکھے گی۔ اور "اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ" کی حالت ملک میں نہ پیدا ہوسکیگی اس کے علاوہ اگر علیگڈھ میں قومی یونیورسٹی جس کا خواب عرصہ سے دیکھا جارہا ہے۔ قایم ہوگئی تو وہاں کا محمڈن کالج خواہ مخواہ اپنی تعلیمی اہمیت میں بہت بڑھ جائے گا +

دو سال ہوئے کہ پنجاب میں اسلامیہ کالج کے ہست و نیست کا سوال بڑے زور شور سے معرض بحث میں لایا گیا تھا۔ لیکن اسلامیہ کالج کے حق میں جو فیصلہ شمس العلما ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے مسٹر ماریسن کی لکھنؤ والی تقریر[1] صدارت کے حوالہ سے صادر فرمایا وہ بہت مدلل تھا +

فی الحقیقت چھ سات کروڑ مسلمانوں کے لئے ایک کالج کسی طرح کافی نہیں ہوسکتا۔ بلکہ جس قدر درسگاہیں زیادہ ہونگی اُسی قدر قوم میں تعلیم کا چرچا زیادہ ہوگا۔ اس لحاظ سے اگر ہمارے لیڈر قوم کے افراد کو زیور تعلیم و ہنر سے آراستہ دیکھنا چاہتے ہیں تو اُنہیں اس بات کی کوشش کرنی چاہیئے کہ ملک میں متعدد علمی انسٹیٹیوشن قائم ہوجائیں +

[1] مسٹر ماریسن نے اپنی محولہ بالا تقریر میں اُن لوگوں کے خیال کی تردید کی ہے جن کی رائے ہے کہ "ایک مسلمان کو علیگڈھ کالج کے سوا کسی دوسری جگہ بی۔ اے پاس کرنا حمیت قومی کے خلاف ہے" مسٹر موصوف فرماتے ہیں کہ "ایک وہ زمانہ تھا جبکہ لوگ سمجھتے تھے کہ کوئی اسلامیہ ہائی سکول علیگڈھ سے باہر نہ ہونا چاہیئے مگر اب ہائی سکولوں کے متعلق یہ خیال جاتا رہا اور میں سمجھتا ہوں کہ بی۔ اے کے درجے کے کالجوں کے متعلق بھی یہ خیال بہت عرصہ تک نہ رہیگا"۔ فاروق

اکبر بادشاہ کی مجلسیں

از منشی دیبی پرشاد ورما ممبر رائیل ایشیاٹک سوسائٹی

راجپوتانہ میں اکبر بادشاہ کی مجلسوں کی بابت عجیب عجیب باتیں مشہور ہیں۔ ازانجملہ ایک یہ ہے کہ ایک رات جبکہ محفل خوب گرم ہو رہی تھی بادشاہ نے ایک دوہا یعنی ہندی شعر پڑھا جس کا یہ مطلب تھا کہ آفریدگار نے کسی کسی گھوڑے کسی کسی مرد اور کسی کسی عورت کو ایسا پیدا کیا ہے کہ گویا تینوں دنیا میں تین رتن یعنی جواہرات ہیں +

معاصرین نے اس کی بہت تعریف اور تحسین کی مگر نواب خان خانان نے کہا کہ بے شک ایسا ہی ہے جیسا کہ حضرت نے فرمایا ہے لیکن ان تینوں کے اوصاف بھی کچھ ارشاد ہوتے +

یہ نکتہ چینی بادشاہ کے دل پر تو گراں گذری مگر بظاہر اُس کی تائید کر کے خان خانان سے فرمایا کہ اچھا ان کے اوصاف تم ہی کہو خان خانان نے ایک دوہا کہا جس کا حاصل یہ ہے۔ کہ خدا نے ان تینوں کو دنیا میں تین رتن تو بنایا ہے مگر اُس حالت میں کہ جب یہ اوصاف ہوں +

(۱)۔ گھوڑا وہ رتن ہے جو تیز و چالاک ہو +

(۲)۔ مرد وہ رتن ہے جو سب سے پہلے بڑھ کر دریائے جنگ میں غوطہ مارے +

(۳)۔ عورت وہ رتن ہے جس کا ڈھنگ سدا یکساں رہے +

یہ سنکر سب نے واہ واہ کی مگر بادشاہ چپ رہے۔ راجہ رائے سنگھ

والئے بیکانیر کے بھائی مہاراج پرتھی راج جو شاعر بھی تھے اور ہونے کے علاوہ ادا فہم رمز شناس اور بادشاہ کے مزاج داں بھی تھے کہنے لگے کہ اس معاملہ کے گرم اور نرم پہلو دونوں ہی دکھلانا چاہئیں تھے +

نواب نے کہا کہ راجہ صاحب یہ دونوں پہلو اب آپ ہی دکھلا دیجئے۔ اس پر پرتھی راج نے ایک دوہا کہا جس میں حروف تو تھوڑے اور مطلب بہت ہے۔یعنی

(۱)۔ وہ گھوڑا رتن ہے کہ جو تیز بھی ہو اور آہستہ خرام بھی تاکہ سوار کے اختیار میں رہے وہ جہاں دوڑانا چاہے دوڑے اور جہاں روکنا چاہے وہاں رُک جائے یہ نہیں کہ دوڑا ہی چلا جائے اور سوار کو معرض ہلاکت میں ڈالکر واپس آئے +

(۲)۔عورت وہ رتن ہے کہ جو ایک ہی ڈھنگ پر چلنے والی نہ ہو خاوند کی رائے پر چلے +

(۳) مرد وہ رتن ہے جو بہادر بھی ہو اور قائم مزاج بھی ہو۔ یہ نہیں کہ لڑائی کے وقت پہلے ہی دوڑ کر مثل پروانہ کے جا مرے اور اپنی جان کی پروا نہ کرے بلکہ ہوش و حواس کو بجا رکھ کر جہاں جیسا موقع دیکھے ویسا ہی کام کرے۔برچھے کی جگہ برچھے سے تلوار کی جگہ تلوار سے اور کٹاری کی جگہ کٹاری سے کام لے تاکہ دور و نزدیک کی جنگ کرنیکا وقت فوت ہوجانے سے کوئی ارمان دل میں نہ رہجاوے +

اس پُرمعنے شعر کی سب لوگوں نے داد دی اور بادشاہ تو ایسے خوش ہوئے کہ اپنی بیش بہا پوشاک اُتار کر مہاراج کو عنایت کی۔کیونکہ اُنھوں نے نواب کی نکتہ چینی کی تھی +

مارواڑ کا ایک چارن دُرساجی نام بھی جو مہاراج کی بدولت حضور رس ہو گیا تھا۔ اس مجلس میں بھی باریاب تھا اُس نے جو یہ ماجرا دیکھا کہ بادشاہ کا خاصہ لباس جو کئی ہزار روپیہ کے جواہرات سے جڑا ہؤا ہے مہاراج کو ایک دوہے کے صلہ میں مل گیا تو اُس کے دل میں بھی اپنی شاعری کے جوہر دکھلانے کا جوش ہؤا اور اُس نے ہاتھ جوڑ کر قدردان کے حضور میں عرض کی کہ جہان پناہ جان کی امان پاؤں تو میں بھی کچھ عرض کروں۔ ارشاد ہونے پر یہ عرض کی کہ دنیا کے تین بہترین رتنوں کے نام بھی آ گئے اُن کے اوصاف بھی بیان ہوئے نہ اُن پر ردوقدح ہو گئی مگر کوئی مثال نہیں دی گئی اور نہ نام لیکر بتائے گئے۔ کہ وہ تین رتن اس وقت کون ہیں۔ حکم ہؤا کہ تم ہی کہو۔ درساجی نے اس عنایات خسروانہ کا آداب بجا لا کر پھر جان کی امان مانگی اور فی البدیہہ ایک دوہا پڑھا جس کا اصل مدعا یہ ہے +

کہ گھوڑا تو سبزہ ہے۔ مرد پرتھی راج ہے اور عورت چانپاوے رانی ہے بس جہان میں یہ ہی تین رتن ہیں +

اس دوہے کی تعریف اور تو کسی نے نہیں کی مگر پرتھی راج نے وہی بادشاہی پوشاک جو زیب تن کئے ہوئے تھے بطور انعام کے اُس کو دے دی اور بادشاہ نے بھی کچھ نہ کہا کیونکہ اُن کو پرتھی راج کی خاطر عزیز تھی۔ اور درساجی نے بھی اسی غرض سے اپنے محسن کی تعریف کر کے اُن کو اُن اوصاف کا نمونہ بتایا تھا جو حرف شاندار ہی نہیں تھے بلکہ واقع میں بھی ایسا ہی تھا۔ کس لئے کہ پرتھی راج کا سبزہ گھوڑا انہیں اوصاف کی مثال تھا جو پرتھی راج نے گھوڑے کے بیان کئے تھے اور پرتھی راج خود بھی ویسے ہی سپاہی تھے جو موقع اور محل دیکھ کر آہستگی اور مستقل مزاجی سے

چستی و دلیری کے ساتھ جنگ کرتے تھے جس میں دشمن کا وار خالی جائے اور اپنا کارگر ہو +

پرتھی راج میں سپاہ گری کے علاوہ مدبری حب الوطنی - قومی ہمدردی - ملکی ترقی - حکیمانہ و شاعرانہ خیالات سے دلیل و تقریر کرنے کے اوصاف بھی تھے - اور انہی اوصاف سے اُنہوں نے اکبر بادشاہ کے دل میں گھر کر کے اُن کو صلح کل کی طرف مایل کیا تھا - اور باتوں ہی باتوں سے اُن کے مزاج میں ہندوؤں خصوص راجپوتوں کی ترقی و قدردانی کرنے کی روح پھونک دی تھی +

چانپا دے رانی بھی پرتھی راج کی ہی رانی تھی - عورتوں میں جن جن شیریں شمایل اور خجستہ خصایل کی ضرورت سمجھی گئی ہے کہتے ہیں کہ وہ سب اُن کی ذات میں موجود تھے +

یہ حکایت بادی النظر میں تو ایک مجلسی کہانی ہے مگر سوشیل اور پولٹیکل نصایح سے بھی خالی نہیں ہے - اور اس سے اس وقت کے نرم و گرم دل یا معتدل مزاج اور انتہا پسند فرقوں کے لئے کچھ نہ کچھ حکیمانہ ہدایت اور مشفقانہ مشورت اگر وہ لینا چاہیں تو مل سکتی ہے - اور یہ ہی اصلی غرض اسکے شایع کرنے کی ہے +

دانشمند یعنی مجموعہ پہلیاں یہ نوطرز کتاب منشی محمد امین خان صاحب خلف ڈاکٹر احمد شاہ خان صاحب مرحوم قیصر گنج لودیانہ نے تالیف کی ہے اس میں علاوہ قدیم پہلیوں چیستانوں - کہہ مکرنیوں کو منشی صاحب نے اپنی نو ایجاد کی ہوئی پہلیاں وغیرہ بھی درج فرمائی ہیں اس مجموعہ کی ضخامت اڑتالیس صفحہ اور لکھائی چھپائی کاغذ وغیرہ اچھا ہے قیمت علاوہ محصول ڈاک چار آنے - شایقین مصنف سے طلب کریں +

عورتوں کی جدوجہد سے مردوں کیلئے سبق

از رائزادہ شانتی نارائن ایڈیٹر سوراجیہ

ہمارے فاضل دوست رائزادہ شانتی نارائن نوجوان پرجوش محب وطن ہیں نومبر کے آزاد میں پردیسی سیلانی نے جو قصہ لکھا تھا اس میں ایک پرانے خیال کے ضعیف العمر منشی صاحب بھی انگلستان میں عورتوں کی جد و جہد دیکھ کر جوش میں آ گئے تھے۔ رائزادہ صاحب تو ماشاءاللہ نوجوان ہیں۔ اور نئی روشنی کا زمانہ دیکھا ہے۔ یہ کیونکر ممکن تھا کہ ان کے دل پر اس جدوجہد کا اثر نہ پڑتا ہے۔ رائے زادہ صاحب یہ ضرور تسلیم کریں گے۔ کہ ہر طریقے کی تقلید لازم نہیں خدا وہ دن نہ دکھائے جب ہندوستانی انگلستان کے طرز معاشرت کے اس طرح گرویدہ ہو جائیں کہ تہذیب سے گری ہوئی باتوں کی بھی تقلید کرنے لگیں اور ادب آداب کو بھول جائیں۔ ہماری ہر بات میں متانت اور دور اندیشی پائی جانی چاہیئے۔ ایڈیٹر

مرد باید کہ گیرد اندر گوش
اگر نوشت است پند بر دیوار

ہندوستان میں مردوں نے عورتوں کو عموماً ناقص العقل کا خطاب دے رکھا ہے اور ان کی عقل گدی کے پیچھے بتایا کرتے ہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کو ناقص العقل بتانے والے خود عقل کے لحاظ سے ناقص ہیں اور ان کی عقل کو گدی کے پیچھے کہنے والوں کی عقل گدی کے پیچھے بھی نہیں۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اپنی ماتاؤں کو جو کہ فرقہ اناث سے ہی ہیں ایسی

بیہودہ خطابات نہ دیتے۔ کہ جنہوں نے انہیں عقل و تمیز سکھائی ہے۔ تم سے پانی روٹی سے روٹی کہنا سکھایا ہے۔ ان کی اس طرح مذمت نہ کرتے +

اس میں شک نہیں کہ ہمارے ملک کی عورتیں موجودہ زمانے میں مردوں کی نسبت عقل اور تمیز میں کم ہیں۔ مگر یہ بھی مردوں کا ہی قصور ہے کیونکہ وہ اپنی نادانی اور بیوقوفی سے ان غریبوں کو علم کے بے بہا زیورات سے محروم رکھتے ہیں۔ اور علم کے بغیر عقل کا آنا محال ہے۔ اس لئے اگر ہندوستانی عورات جاہل اور بے عقل ہیں تو یہ بھی ہندوستانی مردوں کی بے عقلی اور جہالت کا نتیجہ ہے۔ ورنہ جب ہم غیر قوموں کی عورتوں کی طرف نظر ڈالتے ہیں۔ تو وہ ذہانت اور فراست میں مردوں سے کسی طرح بھی کم نہیں پائی جاتیں۔ اور یہی بنا ہے جس پر آج کل انگلستان میں مردوں اور عورتوں میں چھیڑ رہی ہے +

عورات کا دعوےٰ ہے کہ جب ہم علم میں عقل میں۔ لیاقت میں۔ قابلیت میں غرضیکہ ہر ایک بات میں مردوں کی برابر ہیں تو ہمیں میونسپل کمیٹیوں۔ ڈسٹرکٹ کمیٹیوں۔ پارلیمنٹ اور دیگر کونسلوں میں ممبر کیوں نہیں بنایا جاتا۔ جب ہم کسی بات میں مردوں سے کم نہیں۔ قوانین وضع کرنے میں ہماری رائے کیوں نہیں لی جاتی۔ اور ہمارے منتخب کردہ قائم مقاموں کو کیوں قومی مجلسوں میں جگہ نہیں دی جاتی +

جب ہم اسی ملک کی رہنے والی ہیں جس ملک کے کہ مرد ہیں۔ جب ہم وہی ٹیکس ادا کرنے پر مجبور ہیں جو ٹیکس کہ مرد ادا کرتے ہیں تو ہمیں یہ مجاز کیوں نہیں دیا جاتا۔ کہ ہم اپنے فرقۂ اناث کے حقوق کی محافظت

بھی اسی طرح کریں جیسے کہ مرد کرتے ہیں۔ تب ہمیں وہی شہری ہونے کے پورے پورے حقوق کیوں نہیں دیئے جاتے جو کہ مردوں کو حاصل ہیں +

شروع شروع میں ان کے ان دعووں پر کسی نے غور نہیں کیا۔ بلکہ انہیں ایسے ہی بہانہ سازی سے ٹالنا چاہا۔ جیسے کہ ہندوستانیوں کو ٹالا جا رہا ہے۔ ان سے کہا گیا کہ تمہارا یہ دعوے غلط ہے۔ تم لیاقت قابلیت میں مردوں کے برابر ہرگز نہیں۔ مرد تم سے اس بات میں زیادہ ہیں اُس بات میں زیادہ ہیں۔ تم میں یہ کمی ہے وہ نقص ہے +

کچھ عرصہ تک وہ مردوں کی باتوں میں آگئیں۔ مگر ان میں سے جو سمجھدار تھیں وہ غور کرتی رہیں کہ کیا دراصل ہم ایسی ہی ہیں جیسا کہ ہمیں بتایا جاتا ہے آخرکار وہ اس نتیجے پر پہنچیں کہ یہ سب بہانہ بازی ہے ورنہ ہم مردوں سے کسی بات میں کم نہیں۔ انہوں نے اپنے اس خیال کا اپنی بہنوں میں پرچار کرنا شروع کیا اور گذشتہ سال سے انہوں نے اپنے حقوق کے لئے باقاعدہ جدوجہد شروع کر دی ہے +

ان کی جدوجہد کے طریقے قریباً سب ایسے ہیں جو کہ اب تک مردوں نے کبھی استعمال نہیں کئے اور ان طریقوں پر غور کرنے سے عورتوں میں ایجاد اور اختراع کے مادہ کا پتہ لگتا ہے۔ اپنی جدوجہد کے ان نئے طریقوں پر وہ اس دلیری اور بیخوفی سے کام کرتی ہیں کہ عورتوں کا دل کمزور سمجھنے والوں کو تعجب ہوتا ہے اور انہیں مجبوراً یہ ماننا پڑتا ہے کہ دراصل فرقہ اناث فطرتاً ایسا بزدل اور ڈرپوک نہیں جیسا کہ انہیں بتایا جاتا ہے۔ بلکہ ذات شریفوں (مردوں) نے اپنا مطلب گانٹھنے کے لئے اور انہیں ہمیشہ غلامی میں رکھنے

کے لئے ان بیچاریوں کو بھی ناجائز طریقوں سے کمزور اور ڈرپوک بنا رکھا ہے +

۱۹۰۶ء میں جب کہ یہ جدوجہد شروع ہوئی اُس وقت ان مردوں سے حقوق چھیننے کی خواہشمند عورات نے پارلیمنٹ میں شور و غل مچانا شروع کیا۔ اور صاف صاف کہدیا کہ جب تک ہمیں ہمارے حقوق نہیں ملینگے ہم اپنی کوششوں سے ہرگز باز نہ آئیں گی۔ اور تم لوگوں کو آرام سے گورنمنٹ کا کام نہ کرنے دیں گی۔ بہت سی اُن میں سے گرفتار ہوئیں۔ مگر جب اُنہیں عدالت میں لے گئے تو اُنہوں نے نہایت جرأت اور بیباکی سے مجسٹریٹ سے یہ کہدیا کہ چونکہ تم مرد ہو اور جس قانون کی رو سے تم ہمارا مقدمہ سماعت کروگے وہ قانون مردوں کا ہی بنایا ہوا ہے عورتوں نے اس میں رائے نہیں دی۔ اس لئے نہ تم ہمارے مقدمات کی سماعت کر سکتے ہو اور نہ اس قانون کی رو سے ہمیں سزا دے سکتے ہو۔ اگر تم ان حالات میں ایسا کروگے تو وہ صریحاً ظلم ہوگا اور انصاف نہ کیا جا سکیگا +

مجسٹریٹ نے سزا تو دے دی۔ مگر شہیدان ظلم کی قربانی رنگ لائی وہ چار کے اس طرح جیل جانے نے دو چار سو کو ان کی جگہ لینے کے لئے اور طیار کر دیا۔ غرضیکہ ان کی اس طرح جدوجہد نے چند دنوں میں ہی مردوں کا ناک میں دم کر دیا اور مجبوراً اُنہوں نے اسی میں بہتری سمجھی کہ عورات کو بھی کسی قدر حقوق دے دیئے جائیں چنانچہ انہیں میونسپلٹیوں کے ممبر بننے اور ممبر منتخب کرنیکا حق مل گیا۔ اور ایک عورت کو بھی انگلستان کے کسی شہر میں میئر کا منصب دے دیا گیا +

اگر ہندوستانیوں کے ساتھ اتنی مہربانی ہوتی تو ان کا شکرگزاری کا دریا

اُبل پڑتا اور جگہ بہ جگہ شہر بہ شہر گورنمنٹ کا شکریہ ادا کرنے کے لیئے جلسے کیئے جاتے۔ مگر جہاں تک ہمیں معلوم ہے ان آزادی پسند عورات نے ایک جلسہ بھی شکر گذاری کا نہیں کیا۔ کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ ہمیں یہ جو کچھ بھی ملا ہے ہمارا جائز حق ہے ہم پر کسی نے احسان نہیں کیا جو ہم کسی زید یا بکر کے شکر گذار ہوں۔ اور نہ وہ ہندوستانیوں کی مانند میونسپل کمشنری پر صبر کر کے ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھ گئیں۔ کہ بس جو ملنا تھا مل گیا۔ کافی ہے۔ نہیں بلکہ ابھی چند ماہ بھی نہیں گذرے کہ اُنہوں نے اپنے باقی ماندہ حقوق کے لیئے ان ہی طریقوں سے لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا ہے۔ بلکہ ان میں اور بھی ایزادی کر دی گئی ہے +

اب وہ سینکڑوں کے جتھوں میں وزراے سلطنت کے محلات کا جا کر محاصرہ کر لیتی ہیں۔ اور ان کے دروازے پر پیٹنا شروع کرتی ہیں۔ پولیس کے آدمی آ کر انہیں مارتے ہیں وہ اور بھی شور اور غل مچاتی ہیں۔ تمام محلہ سر پر اُٹھا لیتی ہیں۔ لوگوں کو نہ سونے دیتی ہیں نہ کچھ کام کرنے دیتی ہیں۔ گرفتار ہو کر عدالت میں جاتی ہیں۔ وہاں سب کا وہی اظہار ہے۔ تم مرد ہونے کے باعث ہمارا مقدمہ سماعت نہیں کر سکتے اور اس قانون کی رو سے جسے کہ اپنے قایم مقاموں کی رائے کے بغیر پاس ہونے کی وجہ سے ہم ماننے سے انکار کرتی ہیں۔ انصافاً تم ہمیں کوئی سزا نہیں دے سکتے۔ البتہ تم زبردست ہو۔ ہم زیر دست۔ ظلم و ستم جتنا چاہو کر سکتے ہو۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ان خیالات کی عورتوں کے گروہ انگلستان کی ہر ایک کچہری کے ارد گرد جمع رہتے ہیں اور جب کسی عورت کا مقدمہ عدالت میں پیش ہوتا ہے تو یہ عورات عدالت میں جا کر عدالت کی کارروائی کے خلاف اپنی رائے

کا ضرور اظہار کر دیتی ہیں اور تقریباً ہر ایک ایسے مقدمے میں عدالت کی کارروائی کو ناجایز اور غیر منصفانہ قرار دیتی ہیں۔ ان کو زبردستی پکڑ پکڑ کر روتی چلاتیوں کو عدالت کے کمرہ سے باہر نکالا جاتا ہے۔ مگر پھر بھی یہ باز نہیں آتیں۔ اور ان کے اس طرح ہاے توبہ کرنے سے عدالت کا بہت ہرج ہوتا ہے۔ لیکن امید کامل ہے کہ اگر وہ اسی طرح ڈٹی رہیں تو جلد ہی پارلیمنٹ کی ممبر بھی بنالی جائیں گی۔ اور شاید وہ دن بھی دور نہ ہوگا جب کہ لیڈیاں دارالامرا میں بھی جگہ پائیں اور آخر میں کبھی وزیر سلطنت بھی بن جائیں۔ ملکہ بن کر عنان سلطنت تو ہاتھ میں رہ ہی چکی ہے +

انگریزی عورتوں کی آزادی کے لئے اس جدوجہد پر غور کرنے سے ہم پر اپنے حکام کی آزادخیالی اور عالی حوصلگی کا حسن وقبح اچھی طرح کھل جاتا ہے۔ اور ہم اُن حضرات سے جو انگلستان کی تمام رائے کو اپنے موافق بنا کر سیلف گورنمنٹ اور سوراجیہ حاصل کرنے کی اُمیدیں کرتے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ذرا اس نظارے پر غور کریں اور زمانہ سازی کو بالائے طاق رکھ کر صدق دل سے کہیں کہ وہ حضرات جو کہ اپنی ماؤں بہنوں بیٹیوں اور بھتیجیوں کو ان کے حقوق محض اپیلیں گذارنے۔ درخواستیں بھیجنے میموریل پیش کرنے اور ناراضگی دکھانے سے نہیں دیتے۔ ہندوستانی غلاموں کو کب ان کے حقوق بآسانی دینے والے ہیں۔ جب انگریزی عورات کو اپنے جائز حقوق کے لئے انگریزی مردوں کا اس ہمت اور دلیری سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور سینکڑوں کی تعداد میں جیل میں جانا پڑتا ہے تو کیا ہندوستانی غلاموں کو ان کے جائز حقوق اور مناسب آزادی بآسانی تمام مل سکتی ہے +

ہندوستانی بھائیو۔ اگر آپ دراصل اپنے لئے جائز حقوق حاصل کیا چاہتے ہو۔ تو اپنی طاقتوں کو بڑھاؤ۔ جدوجہد کرکے دنیا میں زندہ رہنا سیکھو۔ اپنے اوپر بھروسہ کرو۔ اور ؎

احسان ناخدا کے اٹھائے مری بلا

کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں

کو اپنا مقولہ بناؤ اور ہمیشہ یہ خیال رکھو ؎

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است

رفتن بپائے مردی ہمسایہ در بہشت

تب ہی تم دنیا کے اندر زندہ رہ سکتے ہو۔ تب ہی تم قحط اور طاعون سے نجات پا سکتے ہو۔ تب ہی تم اپنی قوم اور اپنے ملک کو اٹل تباہی اور ہلاکت سے بچا سکتے ہو۔ اگر تم خود اپنے آپ کو قعر ذلت سے نہیں نکال سکتے تو یاد رکھو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں تمہاری قوم کو تمہارے ملک کو تباہی سے نہیں بچا سکتی۔ اس لئے پرماتما پر بھروسہ کرو۔ اور ہمت اور استقلال سے اپنے قومی جہاز کو دائمی ہلاکت کے سمندر سے نکالنے کے فکر میں لگ جاؤ۔ ورنہ جو حال امریکہ اور افریقہ کے اصلی باشندوں کا ہوا ہے وہی آپ کا بھی ہوگا۔ اور آپ رام کرشن۔ گوتم کناد کا کوئی نام لیوا اور پانی دیوا۔ بابر۔ ہمایوں۔ اکبر اور شاہجہان کے نام پر کوئی فاتحہ اور درود پڑھنے والا صفحہ ہستی پر نہ رہیگا +

رامائن کا ایک ورق

از "لکشمن" بی - اے

رامائن میں راجہ دسرتھ کی وفات کے متعلق ایک روایت ہے جسے راجہ رام چند جی کی مفارقت کا باعث کہا جاتا ہے۔ ہمارے فاضل دوست "لکشمن" جنکا نام رامائن کے مضامین لکھنے کیلئے خاص طور پر موزوں ہے اس قصہ کو دلچسپ پیرایہ میں بیان کرتے ہیں۔ ایڈیٹر

دن ڈھل گیا ہے۔ شام کا سہانا وقت ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے جھومتے ہوئے پھولوں کی کلی کلی کھلی ہوئی ہے۔ ابھی ابھی برس کر کھل جانے والے ابر نے آسمان کو رشک نسیم بنا رکھا ہے۔ جس پر کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے بادلوں کے سفید سفید ٹکڑے ہوا میں اُڑتے ہوئے نہایت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ آفتاب گوشۂ مغرب میں پھول جانے والی شفق کی سرخی میں منہ چھپا رہا ہے۔ دن بھر کی دھوپ کھائے ہوئے درخت ٹھنڈی ہو جانے والی ہوا کے نرم نرم جھونکوں سے معشوقان سبز پوش کی طرح کمر کو لوچ دے دیکر مشتاق نگاہوں کو اپنی طرف محو کئے لیتے ہیں۔ ہری ہری گھاس پر خوبصورت ہرنیاں گوپیوں کی طرح اپنے کنھیا کو گھیرے چوکڑیاں بھرتی پھرتی ہیں۔ باغ کی روشوں کے سبزے پر ابر کے قدرتی چھڑکاؤ نے ہوا کے جھونکوں سے ہل ہل کر ڈھلکنے والے آبدار موتی بکھیر دیئے ہیں اور ڈھلے ڈھلائے رنگ رنگ کے پتے نئی کونپلوں کا جامہ پہنکر صبا کے جھونکوں سے دھوپ چھاؤں کے اُڑتے ہوئے دامن کی طرح چمکتے اور دھیمے پڑ جاتے

ہیں۔ دریا عین مستی میں لہریں مارتا چلا جاتا ہے۔ اور سورج درختوں میں
سے جوش جوانی میں ایک دوسرے سے الجھتی ہوئی لہروں کو رشک کی نگاہوں
سے دیکھ رہا ہے۔ اور اس کی رقابت کی تیز نگاہیں پانی میں آگ لگا رہی
ہیں۔ سوسن دست قدرت کی لگائی ہوئی مستی۔ نرگس نشیلی آنکھوں کو
مست کر دینے والے کاجل۔ گلاب لب نازک پر لاکھا جمانے والے پان
کی سرخی۔ سنبل بکھرے ہوئے بالوں کے پیچ وخم اور سرو و شمشاد اپنے
قد وقامت کی راستی سے نازک بدنوں کے حسن کی منہ سے بول اٹھنے
والی تصویریں بن رہے ہیں۔ دن بھر مٹرگشت لگانے والے پرندے شاخوں
پر بیٹھے اپنے بھیگے ہوئے پروں کو سنوار رہے ہیں۔ بعض نے اپنی اگنیاں
الاپ کر اس سہانے وقت کو اور بھی دلفریب بنا رکھا ہے۔ مور چمکیلی
پشواز پہنے اٹھلا اٹھلا کر ناچتے اور مست آوازیں سناتے ہیں۔ ایسے
سہانے وقت میں کونسا مردہ دل ہوگا جو گھر کی چاردیواری میں مقید
ہو کر بیٹھا رہے۔ مجھے بھی شیر شکار کی سوجھی اور میں تیر وکمان لیکر جنگل
کو روانہ ہوا۔ تلاش شکار میں چاروں طرف نظریں دوڑاتا تھا۔ اور
میری یہ آرزو تھی کہ کوئی جانور دریا سے پانی پینے آئے یا میرے راستے
سے گذرے تو اسے تیر اجل کا نشانہ بنا کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کروں۔ بہت
دیر تک اِدھر اُدھر دیکھا کیا مگر کچھ نظر نہ پڑا۔ رات کا اندھیرا شروع ہو گیا
تھا۔ مایوس ہو کر واپس ہونے ہی کو تھا کہ دو وقتوں کے ملنے کی دھندلی
روشنی میں لب دریا سیاہ سیاہ کچھ چیز نظر پڑی۔ مینے آنکھیں پھاڑ پھاڑ
کر دیکھا مگر میں یہ نہ جان سکا کہ وہ کیا چیز ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد پانی پینے
کی آواز نے مجھے چوکنا کیا۔ مینے ترکش سے تیر نکالا اور چلے پر چڑھا کر آواز

کے رُخ پر چھوڑ دیا۔ مجھے اس تیر کی کامیابی کی ہرگز ہرگز امید نہ تھی۔ مگر
قضا میرے تیر کی رہبر بن گئی اور تیر زد پر بیٹھا۔ تیر کا لگنا تھا کہ ایک دردناک
چیخ نے میرا دل ہلا دیا۔ اس آواز کے سنتے ہی مجھ پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا
پاؤں سو گئے۔ بدن خوف سے کانپنے لگا۔ چونکہ خاموشی کا عالم تھا اس لئے
جب میں نے اسی چیخ کے رخ پر کان لگا کر سنا تو یہ دردناک مری آواز سنائی
دی۔ "ہائے اے جلاد صیاد تو نے مجھے مجروح کیوں کیا۔ میں نے تیرا کیا بگاڑا
تھا۔ مجھے اپنے طائر روح کا نشانہ اجل ہونے کا غم نہیں۔ مگر پیاسے
والدین کی بے قراری میں تڑپنے کا رنج ہے۔ جیسے ان کی آنکھوں کا
نور جاتا رہا۔ وہ میرے ہی سہارے بیٹھے تھے۔ میں ہی ان بوڑھوں کا
عصا تھا۔ ہائے پتا جی پیاسے بیٹھے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ پیاری
ماں میری راہ میں بے قرار ہوں گی۔ وہ سب میری موت کا حال سنیں گے
تو رو رو کر جان کھوئیں گے۔ میری مفارقت انہیں دم بھر گوارا نہ ہو گی۔
پیاس سے ان کے حلق خشک ہوں گے۔ انہیں امید ہو گی کہ میں دریا سے
ٹھنڈا پانی لاتا ہوں گا۔ مگر افسوس انہیں ٹھنڈے پانی کے بدلے اشک
پینے ہوں گے۔ اُف زخم نے مجھے ایسا لاچار کر دیا۔ کہ ان تک پانی پہنچانا
دشوار ہے۔ اب درد حد سے گذر گیا۔ ہائے پتا پیاری ماتا۔ میں اب تم سے
جدا ہوتا ہوں" +

جب میں نے یہ جان گسل نوحہ سنا تو میری چھاتی پھٹنے لگی اور ایک
تیر سا کلیجہ کے پار ہو گیا۔ میں لڑکھڑاتا ہوا اپنے بسمل کی طرف بڑھا تو کیا
دیکھتا ہوں کہ ایک خوبصورت نوعمر لڑکا خاک پر پڑا تڑپ رہا ہے۔ بکھری
ہوئی بھوری جٹائیں اس کے چہرے پر بکھر رہی ہیں۔ آنسو آنکھوں سے

جاری ہیں۔ کپڑے خون سے تر ہیں اور ٹوٹا ہُوا گھڑا اس کے پاس پڑا ہے میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ پانوں لڑکھڑانے لگے ۔تیر و کمان ہاتھ سے گر پڑے۔ ہائے میں نے یہ کیا ظلم کیا۔ مفت میں ایک معصوم کی جان لی۔ مجھے یہ ہرگز معلوم نہ تھا۔ جب اس بسمل نے میری آواز سنی۔ تو بیکسی سے آنکھیں کھول دیں اور ایک حسرت بھری نگاہ سے مجھے دیکھا +

بسمل۔ "اے راجہ جسرتھ۔ او ظالم جسرتھ۔ میں نے تجھے کب ستایا جو تو نے آج مجھے تیر اجل کا نشانہ بنایا" +

میں۔ (غور سے دیکھکر) "کون سرون" +

بسمل۔ "ہاں سرون۔ کیوں کیا ابھی کوئی اور ستم باقی ہے" +

میں۔ "اُف۔ مجھ پر آسمان کیوں نہیں ٹوٹ پڑتا۔ جو میں پاپی چنڈال اس دنیا سے نابود ہو جاؤں اے زمین تو پھٹ کیوں نہیں جاتی کہ میں تجھ میں سما جاؤں۔ بے شک میں ظالم ہوں۔ گنہگار ہوں" +

یہ کہکر میں خنجر کو۔ اپنے جگر کے پار کرنے ہی کو تھا۔ کہ بسمل سرون نے مجھے سمجھایا +

سرون۔ "اے راجہ تو خودکشی نہ کر تیرا اس میں کچھ قصور نہیں۔ میری قسمت یونہی لکھی تھی۔ اب تو میرے گھر جا۔ میرے والدین کو جو انتظار میں بیقرار ہوں گے تسلی دے۔ میں اُن کے لئے پانی لینے آیا تھا۔ مگر افسوس انہیں میرے ہاتھ سے پینا نصیب نہ ہُوا۔ وہ گھنٹے بھر سے پیاسے بیٹھے ہیں۔ اگر تو نہ گیا تو ان کی آہ سے تیرا خاندان جلکر خاک ہو جائیگا۔ بس اب درد کسی پہلو چین نہیں لینے دیتا۔ ذرا تیر سینے سے نکال دے کہ جان حزیں نکلجائے" ۵

نکال اب تیر سینے سے کہ جانِ پُر الم نکلے
جو یہ نکلے تو جاں نکلے جو جاں نکلے تو دم نکلے

میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اور میرا بدن کانپ رہا تھا۔ جگر تھام کر میں نے اس کا تیر نکالا۔ تیر نکلنا تھا کہ اس کی آنکھیں پتھرا گئیں اور وہ سرد ہو گیا +

اس صدمہ سے جو چوٹ میرے دل پر لگی۔ اسے بیان کرنا محال ہے میں اپنے کیے پر پچھتاتا تھا۔ اور اس جوانامرگ لڑکے کی موت پر آنسو بہاتا تھا۔ قیامت کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فرشتے مجھے جہنم میں دھکیل رہے ہیں۔ بہزار خرابی گرتا پڑتا اس گھر تک پہنچا جہاں ضعیف و ناتواں اندھے والدین بیٹھے اپنے سعادتمند لڑکے کی راہ تک رہے تھے۔ بے قراری کا یہ عالم تھا کہ ذرا سی آواز پر سرون سرون پکارتے تھے۔ جب میرے پاؤں کی چاپ کی آواز سنائی دی تو انہیں اسکے آنیکا یقین ہو گیا۔ اور بوڑھے رشی نے بیقراری کے لہجے میں کہا +

بوڑھا۔ بیٹا اتنی دیر کہاں رہے۔ یہاں پیاس سے جان لبوں پر آئی ہے اور تمہیں کھیل کود کی سوجھی ہے۔ تمہاری والدہ الگ فکر کر رہی ہیں آؤ جلدی سے ہمیں پانی پلاؤ +

مگر اس کا جواب کون دیتا۔ وہ زبان جس سے جواب دیا جاتا ہمیشہ کے لئے گونگی ہو چکی تھی اور وہ بدن جسے آغوش میں لینے کی پیاری والدین کو آرزو تھی سرد ہو چکا تھا۔ جب دیر تک کوئی جواب نہ سنا تو پیار سے یوں بولا بیٹا خفا نہ ہو والدین ملامت کرتے ہی آتے ہیں تمہیں تو ہماری زندگی کے سہارے ہو تمہیں ان بے نور آنکھوں کے نور ہو۔ بیٹا خاموش کیوں ہو بولتے کیوں نہیں" +

خدا ہی جانتا ہے جو کچھ میرے دل کی حالت تھی۔ خاموش کھڑا رہا تھا۔ منہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ بصد مشکل دل تھام کر جواب دیا +

"اے مہاتما رشی میں تمہارا بیٹا نہیں ہوں بلکہ اس ملک کا کمبخت راجہ ہوں میں شکار کو جا رہا تھا کہ تمہارا لڑکا ایک ندی میں سے پانی بھرتا نظر پڑا چونکہ اندھیرا ہو چکا تھا۔ اس لئے میں پہچان نہ سکا اور شکار سمجھ کر میں نے ایک تیر مارا جو کاری لگا اور وہ راہی ملک عدم ہوا" +

اس خبر نے ان بوڑھے والدین سے وہ کیا جو برق خرمن اور خزاں چمن پر کرتی ہے دونوں غش کھا کر زمین پر گرے بہت دیر کے بعد بوڑھے رشی کو ہوش آیا اور وہ ایک آہ جگر دوز بھر کر بولا۔ اے راجہ اگر تو خود آ کر ماجرا نہ سناتا تو ضرور تو اس گناہ کے بدلے کسی سخت عذاب میں پڑتا مگر تیرے یہاں آتے سے مجھے یقین ہو گیا کہ یہ گناہ تجھ سے دانستہ نہیں ہوا۔ اب ہمیں اس لاش کے پاس لے چل کہ دل کی آخری حسرت نکال لیں +

غرض زار زار روتے ہم اس لاش کے پاس پہنچے بوڑھی والدہ اپنے پیارے بچے کی لاش کو ہاتھ لگاتے ہی ایک دردناک چیخ مار کر روئی اور جان بحق تسلیم ہوئی۔ بوڑھا رو رو کر جان کھوتا۔ اپنی سفید جٹائیں نوچتا اور سینہ کوٹتا تھا۔ آخر ایک سرد آہ بھر کر کہا اے راجہ میرا یہ ایک ہی لڑکا تھا جسے تو نے بیجان کیا۔ اب مجھ پر بھی ایک وار کر کہ غم سے چھوٹ جاؤں مگر یاد رکھ کہ تو بھی بیٹے ہی کی جدائی میں جان دے گا +

میں نے جنگل سے لکڑیاں جمع کیں اور چتائیں چن کر دونوں لاشیں ان پر رکھیں اور آگ روشن کی جب آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے اور بڑے رشی نے آگ کی تپش محسوس کی تو ایک چتا میں کود کر اپنے بیٹے کے فراق میں جان دی +

آجکل

از جہانگیر

آنکھوں میں پھرتی ہے تری رفتار آجکل ۔ کانوں میں گونجتی ہے وہ گفتار آجکل
گھبرا رہے ہیں سارے وفادار آجکل ۔ ہے ہے کہاں گیا وہ جفا کار آجکل
جوشِ شباب نشۂ فزائے بہارِ حسن ۔ کچھ بے طرح وہ پھرتے ہیں سرشار آجکل
یا مرمٹینگے کھینچ بلائیں گے یا تجھے ۔ بس فیصلہ ہے او بتِ عیار آجکل
بھولی نگاہ دل میں جو برسوں رہی مری ۔ شوخی سے ہو رہی ہے وہی پار آجکل
گلشن میں تجھ بغیر جو گھبرا گیا ہے دل ۔ میں ڈھونڈتا ہوں وادیٔ پُرخار آجکل
کوئی نہ کوئی فیصلہ آخر تو ہو چکے ۔ ہم ہیں ہمارا سر تری دیوار آجکل
پیرِ مغاں کی بھٹی ہے شاید چڑھی ہوئی ۔ خوش خوش اکٹھے پھرتے ہیں میخوار آجکل
اس لب کو دیکھ شربتِ عناب کون لے ۔ جا بند کر دکان کو عطار آج کل
مرکز میں دیکھ خال کو رخسارِ یار کے ۔ حیراں ہیں سارے سادہ و پُرکار آجکل
کیا میں نے کہدیا ہے الٰہی یہ کیا سبب ۔ مجھ پر خفا سے ہیں مری سرکار آجکل
اُلفت میں تیری سب کے ہیں دل سے اتر گیا ۔ محسن میرا نہ کوئی مددگار آجکل
برسوں چھپا چھپا کے اسے خوش ہوا کئے ۔ جس راز کا کہ ہوتا ہے اظہار آجکل
کچھ کچھ نگاہِ یاس نے پیدا کیا اثر ۔ وہ دیکھ لیتے ہیں سرِ دربار آجکل
کیونکر نہ روئے جان کو اپنی جرس کا دل ۔ سویا پڑا ہے قافلہ سالار آجکل
یوں بلبلیں چمن میں بھلا چہچہے کریں ۔ ہوتی ہمیں بھی رخصتِ گفتار آجکل
ساقی کہے تو رندا بھی سب اُتار دیں ۔ پی ہے جو شیخ نے مئے پندار آجکل

سچائی کا زمانہ ہی اب دل نہیں رہا ایسی نہ بات بولیو زنہار آج کل
دل دیکھے ایک طفل برہمن کو شیخ نے ڈالا گلے میں شوق سے زنار آج کل
بیوجہ جہانگیر کی خاموشیاں نہیں
پھر کوئی مل گیا ہے طرار آج کل

غزل

یہ دل بے قرار ہے صاحب اور شب انتظار ہے صاحب
گئے وہ دن کہ تھا غم الفت اب غم روزگار ہے صاحب
دل پر درد سینۂ پر سوز دیدۂ اشکبار ہے صاحب
آپ یاں میں ہوں مے ہے اور خلوت کس کا اب انتظار ہے صاحب
مال و زر ہم کہاں سے لائینگے جان و دل تو نثار ہے صاحب
دل کی حالت نہ عشق میں پوچھو خوار و زار و نزار ہے صاحب
مارے وحشت کے ہے گریباں چاک پیرہن تار تار ہے صاحب
پوچھتے کیا ہو کون ہے دلبر آپ کا خاکسار ہے صاحب
تم میرے پاس میں تمہارے پاس فضل پروردگار ہے صاحب
محتسب میکشوں سے کیوں بگڑے وہ تو یاروں کا یار ہے صاحب
دل میں کیا گنتیاں سی کرتے ہو آج روز شمار ہے صاحب
اپنے دل پر تو جبر کر نہ سکے آپ پر اختیار ہے صاحب
تیر مژگاں کمان ابرو ہو مرغ دل پر شکار ہے صاحب
وہ جہانگیر کیا ہوئیں باتیں
اب یہ کیا گیر و دار ہے صاحب

ناصح مشفق

(ایک سنجیدہ خیال رفیق کی اپنے وارفتہ مزاج دوست کو فہمایش)

از منشی نیاز احمد صاحب میرٹھی

منشی نیاز احمد میرٹھی مرحوم کا عطیہ۔ افسوس آج ہم ان کی وفات کے
کے بعد درج کرتے ہیں۔ مرحوم کو خدا بخشے نہایت علم دوست محب
وطن تھے۔ علمی دنیا میں کافی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ افسوس کہ
موت نے ہمارے محسن کو ہم سے چھین لیا۔ اور بہت سے کام جو مرحوم
سے ظہور میں آنے تھے ادھورے رہ گئے۔ ایڈیٹر

کیسے رنج و قلق کا مقام ہے کہ تم سا لایق شخص ایسی ردی حالت میں ہو
کہ جس کی وجہ سے تمام تعلیم یافتہ گروہ پر کسی کو حرف گیری کا موقعہ ملے۔ اور
خصوصاً اُن کے اخلاق پر جو دنیا و دین میں ایک نہایت ضروری چیز ہے
بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ تمام مذہبوں اور خصوصاً اسلام کا تو دار و مدار اسی پر
ہے۔ تمہارے جاننے والوں میں کسی کو یہ امید نہ تھی کہ تم ایسے ہو جاؤ گے
اور اپنی اور اپنے والدین کی عزت و دولت کو اس طرح برباد کر دو گے۔
میں سچ کہتا ہوں کہ ابھی تم کو ہرگز اس بات کا اندازہ نہیں کہ تم کیا ظلم
کر رہے ہو۔ غیر قومیں تو وہ کام کریں جس سے اُن کو روز افزوں ترقی ہو اور
مسلمان اگر صدہا میں ایک کی حالت قابل اطمینان ہوئی تو وہ یہ کرم
کرے۔ اُف وہ کون سا مسلمان ہے جس کو یہ باتیں سُنکر اور تمہاری حالت
دریافت کر کے تاب و قرار رہے۔ بھائی ذرا اپنی حالت کو سنبھالو اور

ہم کو دنیا میں روسیاہ مت کرو۔ دیکھو اگر تمہاری یہی حالت رہی تو روز قیامت تم احکم الحاکمین کو کیا جواب دو گے۔ اور اپنے والد مرحوم کو کیا منہ دکھاؤ گے۔ سمجھو کہ تم پر بہت سی دینی اور دنیوی ذمہ داریاں ہیں اور تم اُن میں سے ابھی ایک سے بھی سبکدوش نہیں ہوئے۔ خدا کے لئے قوم پر رحم کرو اور اپنے آپ پر احسان کرو اور اپنی حرکات سے توبہ و استغفار کرکے اُس نابکار کی صورت تک مت دیکھو جس نے تم کو اس حالت کو پہنچایا ہے کہ دوست افسوس کے ساتھ اور دشمن نفرین کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ وہ بڑا ارحم الراحمین ہے تمہاری توبہ قبول کرلیگا۔ مجھ کو تعجب ہے کہ تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ اگر میں سحر کی کچھ بھی بنیاد سمجھتا تو یقین کرلیتا کہ ضرور اُس نے تم پر جادو کیا ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ میں ذرا بھی اس کا معتقد نہیں۔ پھر میں کیا کہوں کہ آخر تم پر کس کا اثر ہے۔ یہ مانا کہ حسن بھی ایک سحر بلکہ زندہ کرامات ہے مگر وہ ایسی کہاں کی دنیا سے نرالی ہے جس پر تم اپنی ساری دولت و عزت قربان کر بیٹھے۔ مجھ کو اس وقت ایسا رنج و قلق ہے کہ جس کے صدمے سے مجھ کو معلوم نہیں میری زبان سے کیا نکل رہا ہے۔ بھائی میں پھر دست بستہ عرض کرتا ہوں کہ ہم کو خون نہ رُلاؤ اور اپنی حرکات سے توبہ کرکے اُس پر لعنت بھیجو ورنہ ایک دن یہ ہوگا کہ وہ صدہا چالوں سے تم کو فقیر کردے گی اور آپ مالا مال ہو جاوے گی مجھ کو یہ بھی معلوم ہوا ہے۔ کہ تم سے ایسا بیان کیا گیا ہے یا تم ایسا یقین کرتے ہو کہ وہ تم پر عاشق ہے۔ تو بھائی جان بخلے للاینال اس کی کچھ بھی حقیقت نہیں ہے۔ معلوم نہیں وہ ایسے کتنوں پر عاشق ہوئی ہوگی اور آیندہ ہوگی۔ اس گروہ کے ایسے ہی عشق و محبت کے ہاتھوں کیا صد

آدمی تباہ و برباد نہ ہو گئے ہوں گے۔ تم کو ابھی معلوم نہیں ہے کہ تمہارے
افعال نے تم کو بلکہ تمام سوسائٹی کو کس قدر نقصان پہنچا رہے ہیں لیکن بعد کو جب
یہ خمار اترے گا تو سر پر ہاتھ دھر کے رو گے اور پھر کچھ بنائے نہ بنے گا۔
سب لوگ جانتے تھے کہ تم اعلیٰ درجہ کی تعلیم پاکر دنیوی زندگی میں قدم رکھتے
ہو تم راہ راست سے کبھی نہ بھٹکو گے۔ مگر اب تجربہ سے ظاہر ہوا ہے۔ کہ ع

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

تمہاری ذات سے تمہارے احباب، تمہارے اعزا، تمہارے نیازمندوں
کی اور خصوص اُس سرچشمہ کو جس سے تم نے سیرابی حاصل کی ہے۔ بہت سی
امیدیں وابستہ تھیں۔ مگر میرا کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ جس وقت میں یہ کہتا ہوں
کہ ہماری اُن ساری امیدوں پر آج پانی پھر گیا۔ ذرا تو اپنے دل میں خیال
کرو اور منصف مزاج بنکر سوچو کہ اپنی ان حرکات سے تم کس قدر بدنامی کا
باعث ہوئے ہو۔ اول تو یقین تھا کہ تم جلد کسی معقول عہدے پر پہنچ جاتے
اور اگر نوکری نہ کرتے تو تم کو لازم تھا کہ اپنی جائداد کا انتظام کرتے اور اپنے
روپیہ کا تجارت وغیرہ میں مفید استعمال کرتے جس سے دین و دنیا میں
تمہاری اور تمہارے معزز خاندان کی عزت و حشمت قایم رہتی اور تم سرخ رو
رہتے۔ مجھ سے اکثر صاحبوں نے نہایت قلق کے ساتھ اس بات کا اظہار
کیا ہے۔ کہ ایسا مسلمان خاندان جس کی مثال تلاش سے قوم میں مل سکتی ہے
تمہارے ہاتھوں اور تمہارے مصاحبوں کے ہاتھوں اس طرح تباہ و برباد
ہو رہا ہے۔ مگر میں یہی کہوں گا کہ سب سے زیادہ بلکہ صرف تم ہی قصوروار
ہو اور کوئی اس میں ذرا بھی شامل نہیں ہے کیا مسلمانوں کی فی زمانناایسی
حالت ہے کہ وہ اپنا وقت۔ اپنی عزت اور اپنا روپیہ ایسے کاموں میں صرف کریں

جن میں خاندان کے خاندان تباہ ہو چکے ہیں۔ اور یہ عشق کا جو خیال ہے تو تم ایسے کہاں کے پری زاد ہو کہ وہ تم پر عاشق ہو گی۔ مجھ پر عاشق نہیں ہو جاتی کسی اور پر نہیں ہو جاتی۔ خدا کے صدہا بندے تم سے زیادہ حسین وجمیل ہیں۔ کیا تم ہی دنیا میں کوئی یوسف ثانی پیدا ہوئے ہو اور اگر فی الواقع عاشق ہی ہوئی ہے تو معہ اپنے گھر بار اور دولت کے تمہاری ہو جاوے۔ یہ کیا عشق ہے کہ بازار میں بیٹھی ہے اور تمہاری دولت پر دانت ہے۔ آج مکان خرید دو۔ کل یہ خرید دو۔ پرسوں وہ خرید دو۔ تو دراصل عاشق وہ تمہاری دولت پر ہے نہ کہ تم پر۔ اگر آج اُس کو کوئی تم سے زیادہ دولتمند مل جاوے اور وہ بیچارہ جعل میں پھنس جاوے تو وہ اُس کی ایسی عاشق ہو جاوے کہ تمہاری صورت تک دیکھنے کی روادار نہ ہو۔ کیا دنیا کی تواریخ میں ایسی مثالیں نہ ملیں گی۔ مگر تعجب اور افسوس ہے کہ تم سے دوراندیش اور دانا شخص نے ان سب باتوں پر ذرا بھی غور نہ کیا۔ اور اس کو بہت آسانی سے قبول کر لیا۔ کہ وہ تو مجھ پر مرتی ہے مرد خدا میں سچ کہتا ہوں کہ وہ تو نہ مرتی ہے اور نہ مرے گی۔ مگر تم اُس کے ہاتھوں مر گئے۔ اور اگر ابھی کچھ دم باقی ہے تو بہت جلد خاتمہ ہو جائیگا۔ تم دور کیوں جاتے ہو اسی شہر میں دیکھ لو کہ ان دل زادیوں کے ایسے چٹکلے سے کتنے معزز شخص خراب خستہ ہو گئے ہیں جو دنیا میں منہ تک دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ اگر ان باتوں پر ذرا بھی غور کرو۔ تو ماشاءاللہ تم صاحب فہم و فراست ہو۔ فوراً یہ باتیں تمہارے ذہن نشین ہو جاویں گی۔ اور ہاں ایک تم اُن دوستوں کی جو دراصل دوست نہیں ہیں صحبت مطلق چھوڑ دو۔ جنہوں نے تم کو اپنے مطلب کے لئے اس

راستہ پڑ ڈال دیا ہے۔کیا تمہاری عزت و شان ہے کہ تم دنیا بھر کی ذلیل اور آوارہ لوگوں سے ہر وقت ہم نوالہ اور ہم پیالہ رہو۔ تمہارے دوست اور ملنے والے شہر کے معزز آدمی ہوتے مگر بخلاف اُس کے تم نے اُن بدمعاشوں کو منتخب کیا ہے جو ہر وقت دوست بنکر تمہاری بربادی کے درپے رہتے ہیں۔ خدا کی قسم ایسے لوگوں کی معاش یہی ہے کہ وہ امیرزادوں کو ایسے مشغلوں میں لگا دیں جس سے اُن کی مٹھی گرم ہووے۔اب یہ لوگ منہ پر تمہارے مداح ہیں کہ حضور ایسے فیاض طبع ہیں اور حضور ایسے رئیس ابن الرئیس ہیں مگر غیبت میں تم کو بیوقوف بناکر ہنستے ہونگے۔خوش قسمتی سے تم ایک ایسی معمولی بات کو بھی نہیں سمجھ سکے۔کہ دنیا میں اعلےٰ اور مہذب سائٹی ایک نعمت غیر مترقبہ ہے جس کو حاصل کرنے کے لئے انسان کو کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرنا چاہئے۔جن کی وجہ سے تم دین و دنیا دونوں میں رُوسیاہ ہوگئے ہو۔جس وقت سے مجھ کو تمہارے حالات معلوم ہوئے اُس وقت سے میں بیتاب تھا۔ اور خاص یہی غرض ہم سب لوگوں کے یہاں آنے کی تھی۔کہ تم کو راہ راست پر لانے کی کوشش کریں۔اور یقین ہے کہ خدا کی امداد سے ہم کو اِس کوشش میں کامیابی حاصل ہوگی۔ میں نے آپ کا بہت وقت لیا اور اب صرف ایک بات اور عرض کرتا ہوں کہ جو باتیں میں نے لکھی ہیں اُن پر آپ بہت اطمینان کے ساتھ کسی وقت غور کریں اور اپنی اصلاح حالت پر متوجہ ہوں۔بس اب رخصت +

اسباب جہالت کا مٹانا معلوم! جاپان کا انگلینڈ کا جانا معلوم!
ہم سمجھے ہیں جبتک ہمیں ہوجائے نہ اظہر بگڑی ہوئی قوم کا بنانا معلوم!

روحانی بادشاہت

از پنڈت شو نرائن صاحب شمیم پلیڈر

روحانی بادشاہت بھی ایک عجیب حیرت انگیز مشاہدہ ہے۔ اُس کے مقابلہ میں دنیوی بادشاہت کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ سینکڑوں شہنشاہ بڑی بڑی عظیم الشان سلطنتوں کے مالک راہی ملک بقا ہوئے اُن کی عزت اُن کی حیات تک کم و بیش قایم رہتی ہے۔ ان کے بعد اُن کے کارنامے باقی رہتے ہیں۔ کسی کو تاریخ طوق عزت بخشتی ہے اور کسی کو نفرین سے یاد کرتی ہے۔ لیکن روحانی بادشاہت ایک اور چیز ہے +

روحانی بادشاہوں کے نام اور ذات کے ساتھ جاہ و جلال تزک و شان شامل نہیں ہوتی۔ بلکہ اُن کے الفاظ تسخیر کا کام کرتے ہیں۔ وہ جادو بھرے الفاظ انسانوں کے دلوں میں ایسی جگہ پکڑتے ہیں کہ صدیوں تک من و عن قائم رہتے ہیں۔ اُن کی وفات کے بعد اُنہیں الفاظ کو ایسی احتیاط سے قایم رکھا جاتا ہے کہ جب تک اصل زبان میں وہ مطالعہ اور ورد نہ کیے جاویں کماحقہ حظ روحانی حاصل نہیں ہوتا۔ اُن کے نام لاکھوں بلکہ کروڑوں مضطرب دلوں کو سکون بخشتے ہیں۔ وہ شیریں کلام وہ استعارے۔ وہ تمثیلیں۔ وہ ضرب المثلیں۔ وہ مکاشفیں۔ وہ تشبیہیں جو اُن کے دہن مبارک سے ایک دفعہ نکلی ہیں وہ نقش کالحجر ہو گئی ہیں اُن کے مرید اور پیرو اُن کے ورد میں اپنی شفا ڈھونڈتے اور شانتی اور نروان کے درجے طے کرتے ہیں۔ جھوم کر وجد میں آتے ہیں۔ کیا ایسے شخص ہیں

چور ہو جاتے ہیں کہ صدیوں تک فرو نہیں ہوتا۔ پاک اور متبرک مقامات پر وہ کتب رکھی جاتی ہیں۔ جن میں اُن کے کلام درج ہیں۔ وہ ایسے موتی اور جواہرات ہیں جو دلوں کے سیف میں محفوظ رہتے ہیں۔ اُن کے اسمائے مبارک کی توہین کیجئے تو جنگ وجدل شروع ہو جائے۔ دنیا بھر کی جملہ نعمتوں سے۔ اپنے عزیزوں سے۔ بال بچوں سے زیادہ عزیز سمجھے جاتے ہیں +

روحانی بادشاہ بھی عجیب طرح کے حکمران ہیں۔ ان کے انتقال پر تخت وتاج کا کوئی دعویدار نہیں بنتا اور اُن کے احکام بعد مرگ اور بھی زیادہ اطاعت اور عقیدت سے مانے جاتے ہیں۔ ہفت اقلیم کے شہنشاہ۔ تاجر۔ اُمرا۔ وزرا۔ جرنیل۔ اہل پیشہ وحرفہ۔ غریب وامیر زن ومرد ہر ایک متنفس جو اُن کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ معبدوں اور مندروں میں سر جھکایا کرتے ہیں۔ اور اُن روحانی بادشاہوں کو یاد کر کے روحانی بھوک پیاس مٹاتے ہیں +

آخر یہ مشاہدہ کسی قانون کا پابند ہونا چاہیئے۔ یہ کیا اسرار ہے کہ دنیوی بادشاہت کو وہ منزلت حاصل نہیں ہوتی جو روحانی بادشاہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اگر ہم ذرا ہندوؤں کے رشیوں اور اُتاروں کے کلام کو غور سے پڑھیں۔ اگر ہم حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم پر ایک نظر ڈالیں۔ اگر ہم مہاتما بدھ کے عالمگیر قانون اخلاق پر توجہ کریں۔ اگر ہم حضرت محمدؐ صاحب کی تعلیم توحید ذہن نشین کریں تو صرف ایک اصول معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ بنی **نوع انسان کی بہبودی میں ساعی تھے نہ کہ اپنی مطلب براری میں** + بس یہ ہی تفاوت ہے۔ دنیوی بادشاہ

اور روحانی بادشاہ ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کسی روحانی بادشاہ نے الہام ووحی کا دعویٰ کیا۔ کسی نے اسی مسئلہ کو عقل سے حل کیا۔ کسی نے تجربہ ذاتی سے اخلاق کی بنیاد ڈالی۔ لیکن ہر ایک روحانی بادشاہ کا مقصد اپنی ذات کا فراموش کرنا اور دیگر ابنائے جنس کی ہمدردی کرنا تھا۔ یہی قانون قدرت کا کلیہ قاعدہ سمجھئے کہ ع

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد

دنیوی بادشاہ اپنے لئے اپنے خاندان کے لئے۔ اپنی قوم کے لئے عیش وعشرت کے سامان جمع کرتا ہے۔ دنیوی بادشاہ اپنے علو اور جاہ وجلال کی افزدیادی کا کوشاں ہوتا ہے۔ روحانی بادشاہ اپنی ذات کو بھول جاتا ہے۔ نفس کشی۔ منہمکی۔ عجز وانکسار اور معصوم زندگی سے اپنا پایہ حاصل کرتا ہے +

ایشیائی اقوام کو خواہ فخر سمجھئے۔ خواہ نادانی۔ ہمیشہ سے روحانی زندگی سے ایک خاص وابستگی چلی آئی ہے۔ اور یہ ہی اُن کے مرشد و رہنما انہیں سکھاتے رہے ہیں۔ اب زمانہ حال میں وہ یورپین قوموں کی تقلید کرنے لگے ہیں۔ اور روحانی راستہ سے تجاوز کرتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ انہیں۔ ع

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

غزل

از شیخ محمد رفیق صاحب صفیرؔ سٹوڈنٹ بی۔ اے کلاس لاہور

شرر ہوں سوزِ دل ہوں نقشِ پا ہوں جانِ حیرت ہوں
میں پامالِ خرامِ ناز ہوں رشکِ قیامت ہوں

سراپا دردِ غم ہوں صورتِ تصویرِ حسرت ہوں
بشانِ رقصِ بسمل ہوں نگہ شمعِ تربت ہوں

میں انجامِ تمنا گریۂ چشمِ ندامت ہوں
مجھے دیکھو کہ میں آئینۂ تصویرِ عبرت ہوں

وفا کیا اضطرابِ شوق کیسا شور سودا کیا
تکلف برطرف میں گمانِ رسمِ الفت ہوں

ہجومِ ناامیدی اس طرح مجھ کو مٹاتا ہے
کہ گویا میں کسی کا اشتیاقِ بے نہایت ہوں

چھپاتا لاکھ ہوں حالِ دل لیکن نہیں چھپتا
مگر میں اضطرابِ دردِ پنہاں کی شکایت ہوں

فروغِ اشتیاقِ جستجو مجھ سے یہ کہتا ہے
ابھی دیکھا ہی کیا ہے میں تو آغازِ حیرت ہوں

میری حیرت پہ میری شورشِ فریاد کہتی ہے
ابھی برپا کروں شورِ قیامت میں وہ آفت ہوں

کوئی کیا مجھ کو سمجھے گا کہیں خود کو نہیں سمجھا
[illegible] اک نقشِ حیرت ہوں

[illegible] سے کچھ میرا احوال کھلتا ہے
[illegible] رنگِ طبیعت ہوں

[illegible] گریہ [illegible]
میں [illegible] آلودۂ گردِ مصیبت ہوں

[illegible]
میں خود کیا ہوں [illegible]

عجب [illegible] ہیں کچھ میرے کمالِ [illegible]
کسی کی [illegible] ہوں [illegible] ہوں

ابھی کس نے مجھے جانا ابھی کس نے مجھے سمجھا
میں گویا سادگیِ حسنِ معنی کی نزاکت ہوں

اسیری میں بھی ہوں آزادِ غمِ ہر دو جہاں یعنی
صفیرؔ بادہ کش ہوں بندۂ سرکارِ الفت ہوں

دردِ دل

از حکیم مظفر حسین صاحب اظہر ھاپوری از لاھور

نوآبادیوں میں جس قسم کا سلوک ہندوستانیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے وہ عموماً اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔

حال میں ٹرنسوال میں ہندوستانیوں کو جن تکالیف کا مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ اُن کی شکایت اخبارات میں بتفصیل شایع ہو چکی ہے اور وہ ناظرین سے پوشیدہ نہیں۔ اسکے علاوہ اکثر شہروں میں پبلک جلسوں کے ذریعہ ناراضی کا اظہار کر کے گورنمنٹ سے استدعا کی گئی ہے کہ وہ سختی کے قانون کی ترمیم کرے۔ کوئی مہینہ ہوا کہ آیا کہ لاہور میں بھی ایک اسی قسم کا جلسہ بریڈلا ہال میں منعقد ہوا تھا۔ جس میں راقم بھی حاضر تھا۔ خالی دل لیکر گیا۔ مگر درد سے بھر کر لایا۔ دماغ تھا کہ بحرِ خیالات میں غوطہ زن تھا۔ طبیعت موزوں پائی ہے اور دل دردمند۔ اس لئے خیالات نے نظم ذیل کی صورت اختیار کر لی اور چونکہ یہ دردِ دل تھا اس لئے اسے اسی نام سے موسوم کر کے ناظرین آزاد کی خدمت میں پیش کر کے درخواست کرتا ہوں کہ آخر ہماری اس ذلت کے اسباب کیا ہیں؟ کیا وہی ہیں جو ہیں نے سمجھے ہیں یا کچھ اور؟ (اظہر)

کبھی ہم سے کیا تھا ہند کی قیصر نے یہ وعدہ
برابر ہم کو سب انگریز اور ہندوستانی ہیں

مگر افسوس! اُسکے جانشیں اس قول کو بھولے
ستم اینٹال میں پامال ہم ہندوستانی ہیں

وہی ہندوستانی جو کہ فاتح اس مہم کے تھے
غضب اب سمجھے جاتے وہ نحوست کی نشانی ہیں

وہاں کے لاٹھ صاحب نے کیا قانون یہ جاری
کرالیں نام کو لیسنس جو ہندوستانی ہیں

اور اپنی عورتوں کے نام لکھوا دیں جو بہتر ہیں — یہاں تک ہم فخرِ لیلیٰ خوار و وقفِ بدگمانی ہیں
اگر اب ایسی رسوائی پہ بھی چونکے نہ ہم ہندی — تو سمجھو ہم ہیں اس ذلت و خواری کے بانی ہیں
مسلماں پارسی ہندو ہوں یا عیسائی ہوں سمجھو — یہاں کے جتنے باشندے ہیں سب ہندوستانی ہیں
یہ تفریق مذاہب تو نہیں ہے مانعِ اُلفت — عقائد جس قدر ہیں سب کے سب الفت کے بانی ہیں
تخالف ہر طرف غفلت بڑھی ہے اس قدر اپنی — کہ اس میں کوچے چھوٹے بڑے ہندوستانی ہیں
جو بوڑھے ہیں وہ بوڑھے ہو چکے تدبیر ہمت ہیں — جواں ہمت جواں ہیں جو شکارِ نوجوانی ہیں
یہی حالت رہی اس قوم کی چندے اگر اظہر — تو پھر اللہ ہی جانے کیا بلائیں سر پہ آتی ہیں

غزل

شبِ وعدہ کی جوں جوں زلف کالی ہوتی جاتی ہے — شرابِ شوق سے آنکھوں میں لالی ہوتی جاتی ہے
مرا عشقِ مجازی بن گیا زینہ حقیقت کا — طبیعت اب جمالی سے جلالی ہوتی جاتی ہے
تماشہ دیکھتی ہیں پتلیاں تک چشمِ پرفن کا — خدا رکھے یہ اتنو تیرہ تالی ہوتی جاتی ہے
ڈھلا جاتا ہے کوئی دن میں وہ اُبھرا ہوا جوبن — ستم ہے یہ کسی کی گود خالی ہوتی جاتی ہے
تمہاری آبیاری اشکِ حسرت خاک پھل لائی! — کہ باغِ آرزو کی پائمالی ہوتی جاتی ہے
کسی کو یاد ہوں شاید مزے عہدِ جوانی کے — یہاں تو اپنی ماضی احتمالی ہوتی جاتی ہے
گئے وہ چل دیا دل حسرت و ارماں ہو کر رخصت — رفیقوں سے مری آغوش خالی ہوتی جاتی ہے
خدا سمجھے یہ کس بدچشم کی دیدہ دلیری ہے — کہ چنچل شوخ صورت بھولی بھالی ہوتی جاتی ہے
کلیجہ میں مرے سوراخ غم سے پڑتے جاتے ہیں — نہ گھبرائے کوئی گردہ میں جالی ہوتی جاتی ہے
اگر رنجش ہے واعظ سے تو اَن بن ہے برہمن سے — مری خو بھی دنیا سے نرالی ہوتی جاتی ہے
اگر کثرت ہے دنیا میں تو ہے بغض و عداوت کی — مروّت کی وفا کی قحط سالی ہوتی جاتی ہے
عبث الزام ہے اظہر کسی پر بیوفائی کا — طبیعت ہی تری کچھ لااُبالی ہوتی جاتی ہے

ہندوستان قدیم کے مدبر

آج ہم ہیں کہ گئے گذرے ہیں گر کل دن تھا
نسل اسکندر ہیں تھا حکمرانی پہ گھمنڈ

پرانے قصے کو دُہرانا اور اپنے بزرگوں کی عظمت و شوکت کو گری ہوئی قوم کے دلوں میں تازہ کرنا ایک نہایت مبارک کام ہے۔ یہ ممکن ہے کہ بعض لوگ انہیں اس لئے مفید جانیں کہ وہ عظمت و شوکت ہماری عزت و عظمت کا باعث نہیں ہو سکتی مگر میرا تو یہ خیال ہے کہ اگر ہندوستان کبھی ترقی کرے گا تو اس کا باعث یقیناً اُس کے بزرگوں کے دل ہلا دینے والے کارنامے ہونگے جو آج قصہ کہانی ہیں۔ مہذب ممالک میں اپنے مشاہیر کے بت نصب کرنا ان کے مقبروں کو شاندار بنانا۔ ان کی سوانح عمریاں لکھنا یہ سب کچھ آیندہ نسل کی رہنمائی کے لئے کیا جاتا ہے۔ بھارت ورش کے کارنامے خواہ کتنے ہی پرانے کیوں نہ ہو جائیں مگر اپنے میں وہ نئی تاثیر رکھتے ہیں۔ [illegible] ایک مرتبہ تو مردہ دل [illegible] کے [illegible] ہندوستان ہے اور اس کا [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

ہندوستان کی تاریخ اگرچہ واقعات سے پر ہے۔ مگر اس قدر پریشان

ہے۔ کہ غیر ملک کے مورخین ہمارے مدبروں کے طریق سلطنت کی کبھی تعریف نہیں کرتے۔ میں آج کے مضمون میں یہ بیان کرنے کی کوشش کروں گا کہ ہندوستان کے مدبروں کا طریق سلطنت موجودہ طریق سلطنت سے کسی طرح کم درجہ کا نہ تھا بلکہ یہ کہنا غلط نہیں کہ دنیا کے مدبروں نے ہندوستان سے سبق لیا +

ہندوؤں کی تاریخ کچھ اس قدر تاریکی میں ہے جس کی وجہ یقیناً بیرونی حملہ آوروں کے متواتر حملے ہیں کہ موجودہ زمانہ کا نکتہ چین ہندوستان قدیم کی عظمت و شوکت پر یقین نہیں لا سکتا۔ میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ تاریخی واقعات ہندوستانیوں کے کمال سلطنت اور اس کے مدبروں کی قابلیت کا بجائے خود ثبوت ہیں۔ اور ان سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ہندوستان کے شہنشاہ اس زمانہ کے یوروپین تاجداروں سے حکومت اور انتظام سلطنت میں کسی طرح کم نہ تھے +

سولھویں صدی میں اکبر کے عہد سلطنت کا اسی زمانہ کے یوروپین فرماں رواؤں مثلاً ہنری ہفتم شہنشاہ فرانس اور ملکہ الزبتھ ملکہ انگلستان سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اگرچہ اکبر نے ہندوستان کو اپنا وطن قرار دے لیا تھا۔ مگر پھر بھی وہ ویسا ہی غیر ملک کا شہنشاہ تھا۔ جیسا ایک انگریزی وائسرائے اور اس لئے ہندوستان کو اس کی قابلیت پر فخر کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس اعتراض کو دور کر کے ہمیں بہت قدیم زمانہ کی طرف جانا پڑے گا۔ جب ہندوستان مذہب کا گمان تک نہ تھا۔ ایسا کرنے سے ہمیں معلوم ہوگا کہ قدیم ہندوستان نے مدبر پیدا کئے تھے۔ اور یہ دیکھ کر امید بندھتی ہے کہ دیگر سینکڑوں ممالک کی طرح

ہندوستان کی تاریخ بھی پلٹا کھائے گی۔ جنوبی ہندوستان کے واقعات درست نہیں ملتے۔ اور اس لئے ہم ان پر غور کرنے سے معذور ہیں۔ ہماری توجہ شمالی ہندوستان یعنی دریا نربدا سے بالا بالا محدود رہیگی۔ جسے جنوبی ہندوستان کے بعد کا ہندوستان کہنا چاہئے +

مسلمان حملہ آوروں سے پیشتر تین ہندو سلطنتیں نمایاں نظر آتی ہیں۔ اور ان تینوں کے معقول حالات قلمبند ہیں۔ ہندوستانیوں کو چونکہ تاریخ نویسی کا شوق نہ تھا۔ اس لئے ہماری معلومات کا ذریعہ صرف تین بیرونی سیاحوں کے تحریر کردہ حالات ہیں جن سے ہندو سلطنتوں کی عظمت و شوکت کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں سے ایک تو یونانی اور دوسرا اور تیسرا چینی ہے۔ وہ تین خاندان جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور جن سے ہندوؤں کی انتظامی قابلیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے یہ ہیں :-

اول۔ خاندان سوریا (۳۲۱ سے ۲۳۲ قبل مسیح تک) +

دوئم۔ گپت (۳۲۰ - ۴۸۰ عیسوی تک) +

سوئم۔ مہاراج ہارشہ کا عہد حکومت (۶۰۶ سے ۶۴۸ عیسوی تک) +

عہد اول میں چندرگپت۔ سنڈراکوٹس اور مہاراج اشوک کے نام قابل ذکر ہیں۔ عہد دوم کی عظمت کا ثبوت چندرگپتاس اور سمدرگپتا کے نام ہیں۔ عہد سوم میں صرف ہارش ہے۔ جو اپنے دونوں بزرگوں سے شان و شوکت میں کچھ کم تھا +

ان میں سے ہر ایک عہد کے حالات خوش قسمتی سے بے تعصب پردیسی سیاحوں نے جو عرصہ تک ہندوستان میں رہے اور جنہیں ان

تاجداروں کی قابلیتوں کے مشاہدہ کا بہترین موقعہ ملا قلمبند کئے ہیں - ان پردیسی سیاحوں میں سے سب سے پہلے یونانی میگا تھینس اپنے آقا سلوکس نکاٹر شہنشاہ مغربی ایشیا کا سفیر ہو گیا اور وقت فرصت میں یہاں کے حالات لکھتا رہا - یہ حالات ایسے معتبر ہیں کہ پندرھویں صدی سے پیشتر جب پرتگالی جہازرانوں نے ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کیا اور مشرق و مغرب میں تجارت کا سلسلہ قائم کیا یہی حالات انگریزوں کے بھی ہندوستان کے متعلق معلومات کا ذریعہ رہے - یونانی سفیر نے جو حالات قلمبند کئے وہ محفوظ نہ رہ سکے لیکن اور مصنفوں نے جو اقتباسات ان سے کئے تھے ان کی بدولت یہ ضائع نہ ہوئے - چندر گپت کے دربار کی شان و شوکت اور انتظام سلطنت کی کیفیت جو کچھ میگا تھینس نے لکھی ہے - اس کی تائید چندر گپت کے پوتے راجہ اشوک کے کتبوں سے ہوتی ہے - یہ واقعات جب ایک منصف مزاج مورخ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں تو ہندوستان کے نظم و نسق کا احوال کھلتا ہے - ان سے مہاراج چندر گپت کے وزیر کی قابلیت کا بھی پتہ چلتا ہے - ان حالات - عمارات کتبوں اور آثار قدیمہ کی مدد سے تاریخ کا مطالعہ کرنے پر خاندان سوریہ کی عظمت اور ہندوؤں کی سلطنت کی قابلیت کا بھید کھلتا ہے +

چند مورخین کا خیال ہے کہ ہند کی سلطنت کا طریق اسکندر اعظم کی طرز حکومت کی نقل ہے مگر اسے درست رائے نہیں کہا جا سکتا ہے - معلوم ایسا ہوتا ہے کہ چندر گپت نے اپنی سلطنت کی بنیاد سلطنت دارس کے سپرس اور اس کے خاندان جس تخت پر اسکندر بھی چند سال کے لئے بیٹھا ڈالی تھی - اگرچہ ہستالیس کے بیٹے ڈارئیس کے زمانہ سے ہندوستان

کا اپنے مغربی ہمسائیوں سے تعلق رہا ہے مگر اسکندر اعظم کی مثال یقیناً
شاہی شوکت سکھانے کا باعث نہیں ہوئی۔ چندر گپت نے خواہ کسی سے
سیکھا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے انتظام سلطنت پر غور کرنے اور
ان پر عمل کرنے کی قابلیت بوجہ احسن پیدا کر لی تھی۔ اور چوبیس سال کے
قلیل عرصہ (۳۲۱ سے ۲۹۷ قبل مسیح تک) میں مقدونیہ کے بادشاہوں کو
نکال دینے اور سلوکس نکٹر کی سکندر کی کھوئی ہوئی سلطنت کو حاصل کرنے
کی آرزو کو ناکامیاب بنانے اور مگدھ دیس (موجودہ بہار) جیسی عظیم الشان
سلطنت جو ہندوکش سے نربدا تک پھیلی ہوئی تھی کی بنیاد ڈالنے سے
اس کی اس قابلیت کا ثبوت ملتا ہے کہ چندر گپت میں ملکی اور فوجی انتظام
کی زبردست قابلیت تھی۔ اس نتیجہ کی تائید اس کے عہد کے حالات سے
ہوتی ہے جن سے ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں چوتھی صدی قبل مسیح میں ہندوستان
سے زیادہ عظیم سلطنت دنیا کے کسی حصہ میں نہ تھی +

چندر گپت کی سلطنت کا طریق مطلق العنان تھا اور فرمانبرداری
کے طریقے ذرا سخت تھے۔ وہ خونریزی کے لئے زیادہ مستعد تھا اور
اپنے افسروں پر جن کے ماتحت قواعددان فوج تھی بھروسہ رکھتا تھا۔
سلطنت وسطی نے اگرچہ ماتحت سلطنتوں کو بہت سے اختیارات دے
رکھے تھے مگر ان کی سخت نگہداشت کی جاتی تھی اور ان کی خود مختار ہو جانے کی
آرزو کو کمزور کرنے کے لئے تدبیریں پیش کرنے کا سلسلہ جاری رکھا جاتا
تھا۔ راجہ اشوک کا یہ حکم کہ شاہی ملازم اسے تمام عام معاملات سے باخبر
رکھیں اس کے دادا چندر گپت کے اُن قواعد سے ملتا ہے جو اس نے
اپنے وزیروں کے لئے مقرر کر رکھے تھے اور جو سرکاری رؤسا کی مدبری نہایت

ضروری سمجھتا تھا اور تاج کی بہتری کے لئے بعض اوقات نازیبا اجازتیں
بھی دیدیا کرتا تھا۔ مگر اس قسم کی تمام اجازتیں صرف بدمعاش لوگوں
کے لئے تھیں۔ ہندو مورخین نے بھی ان حالات کو پوشیدہ نہیں رکھا۔
بلکہ صاف طور پر لکھدیا ہے۔ کہ سرکاری ملازمین جن کا کام امن قایم رکھنا
تھا بعض اوقات ایک ہی خاندان کے دو آدمیوں کو لڑوادیا کرتے تھے
اور ایک کو دوسرے کے خلاف بھڑکاتے تھے۔ جو کامیاب ہوتا تھا اسے
اسے اس کی سختی کے جرم میں گرفتار کرلیا جاتا تھا۔ اور ان کا مال و دولت ضبط
کرلیا جاتا تھا۔ یہ طریق بالکل میکیولی کا سا ہے۔ جس کا یہ اصول تھا کہ
سلطنت کے قیام اور حکام کی پرورش کے لئے ہر ایک جائز و ناجائز طریقہ
روا رکھا جا سکتا ہے اور شہنشاہ کا ہر ایک طریقہ خواہ وہ کتنا ہی ظالمانہ
اور بیقاعدہ کیوں نہ ہو رعایا یں بدمعاشوں کے لئے روا رکھا جا سکتا ہے
اس لحاظ سے خواہ ہندو فرماں رواؤں کو اچھا نہ کہا جائے مگر اس میں شک
نہیں کہ وہ زبردست حاکم تھے۔ اگرچہ ان کے طریقے سخت تھے ان کے قبضہ
میں ایک وسیع حصہ ملک تھا۔ ان کے پاس جری فوجیں تھیں جو ان کے
مال و منال اور سلطنت کی محافظت کرتی تھیں۔ اگرچہ موریا خاندان کے
دارالخلافہ پٹنہ (پاٹلی پترا) اور گرنار (کاٹھیاواڑ) میں بہت فاصلہ تھا
لیکن چندر گپت نے موخرالذکر شہر میں ایک گورنر مقرر کر رکھا تھا جس کا نام
اس کی آبپاشی کے انتظام کے لئے مشہور ہے۔ جو نہر اس نے تعمیر کی تھی وہ گذشتہ
سات صدیوں تک ناقابل مرمت خیال کی گئی +

مگس تھنیز کے بیان سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی طریق
آبپاشی مصر سے ملتا جلتا تھا۔ یہ دریاؤں پر قابض تھے اور ان کے پانی کو

کھیتوں کے کام میں لاتے تھے۔ موجودہ زمیندار اور کاشتکار آجکل شکایت کرتے ہیں۔ کہ انہیں گراں محصول ادا کرنے پڑتے ہیں مگر ان کے بزرگوں کو بھی آج سے دو ہزار برس پیشتر بھی یہی شکایت تھی اور انہیں بقول "جناکیا" اندکا بھاگا کے نام سے گراں محصول دینا پڑتا تھا۔ مال کی محافظت کا طریق پسندیدہ تھا۔ سڑکیں بنی ہوئی تھیں۔ میونسپل انجمنیں ترقی پر تھیں اور پردیسی باشندوں کی محافظت کا بھی بخوبی انتظام تھا۔ زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں۔ ان معمولی باتوں سے ہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ خاندان موریا کے زمانہ میں ملک کے ہر ایک حصے اور محکمے کا انتظام پرانے طریقہ کے مطابق قابل تعریف تھا۔ اور ہندوؤں کا طریق سلطنت تین صدی قبل از مسیح۔ ویسا ہی اچھا تھا۔ جیسا سولھویں صدی میں شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں +

"چناکیا" کے بیان کے مطابق ہندو سلطنت کا اخلاقی پہلو قابل تعریف نہیں۔ اس بیان کے غلط ہونیکے ثبوت میں ہمیں مہاراج اشوک کے کتبے ملتے ہیں۔ جن میں اخلاق کے بہتر اصول پائے جاتے ہیں اور ان کے عام اور ذاتی معاملات میں بدھ مذہب کے رنگ کی جھلک پائی جاتی ہے۔ موریا خاندان کے اخلاق کے متعلق خواہ ہمارا کچھ ہی فیصلہ کیوں نہ ہو مگر اس میں ذرا شک نہیں کہ ان تینوں عظیم الشان سلطنتوں کا جنہوں نے سو برس حکومت کی (۳۲۱ سے ۲۳۲ قبل مسیح تک) سے زیادہ انتظام ہر طرح قابل تعریف ہے۔ پٹنہ سے دور دور تک انتظام قائم رکھنا خصوصاً اس وقت جب خبر رسانی کے ذریعہ جو آج موجود ہیں نہ تھے۔ موجودہ انگریزی سلطنت کی سی عظیم الشان سلطنت کا انتظام کوئی معمولی بات نہیں۔ اس پر بھی یونانی شاہان سائریہ مقدونیہ اور مصر سے ہمعصرانہ برابری کے تعلقات رکھتے تھے +

خاندان موریا میں زوال آتے ہی ہندوستان پر اندرونی خانہ جنگیوں اور بیرونی حملوں کے باعث سخت مصیبت نازل ہوئی۔ کشان اور سانڈو سکائیتھین تاجداروں کے طرز حکومت کے حالات واضح طور پر معلوم نہیں مگر جو حالات معلوم ہو سکے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سلطنت نہایت مستحکم اور مہذب طریق پر قائم تھی۔ چونکہ یہ بادشاہ غیر ملک کے باشندے تھے اس لئے ان کی پولیٹیکل قابلیت سے اس وقت ہمیں واسطہ نہیں۔

دوسری قابل ذکر ہندو سلطنت جو توجہ کی مستحق ہے راجہ گپتا س کا عہد حکومت ہے۔ اس سلطنت کی بنیاد ۳۲۰ء میں پڑی۔ اور تقریباً ۲۰۰ سال تک اس کا عروج رہا۔ شاہان قدیم کا دار الخلافہ اشوک کے زمانہ سے پٹنہ چلا آیا تھا مگر رفتہ رفتہ پولیٹیکل تحریکوں کا مرکز مغرب کی طرف منتقل ہوتا گیا کیونکہ سلطنت بحیرہ عرب تک پھیلی تھی۔ سمدر گپتا جس نے ۳۲۶ء سے ۳۷۵ء تک حکومت کی۔ نہایت منچلا شہزادہ تھا۔ اس نے اپنی شمالی ہند کی سلطنت پر قانع نہ ہو کر جنوب کا رخ کیا۔ اور قریباً تمام شمالی ہند پر قابض ہو گیا یہ فتحیابی اگرچہ عارضی ثابت ہوئی کیونکہ دیر تک قبضہ میں نہ رہ سکی مگر یہ فتح بھی کوئی معمولی فتح نہ تھی۔ اور فاتح ہر طرح جرمنی شہنشاہوں میں ممتاز درجہ پانیکا مستحق ہے۔ اس شہزادہ کے عہد حکومت کے تفصیلی حالات معلوم نہیں ہوئے اور ہمارا ذریعہ معلومات صرف فیہین نامی بدھ مت کے چینی سیاح کا بیان ہے جو پانچویں صدی کے آغاز میں چندر گپت ثانی کے زمانہ میں ہندوستان میں آیا +

اس زمانہ میں سکندر کی قایم کردہ سلطنتوں کا نام و نشان بھی باقی نہ تھا۔ اور روم کی سلطنت میں اسیرک اور گوتھس کے حملوں سے زوال آرہا

تھا۔ اور موجودہ یورپین طریق سلطنت کا نام تک نہ تھا۔ ایسے زمانہ میں ہم ساڈو
لوح چینی جاتری کے تجربہ کردہ حالات کو حیرت سے پڑھتے ہیں جس کا بیان ہے
کہ شمالی ہندوستان میں ایسی مدبرانہ اور شائستہ حکومت تھی جس کی نظیر یورپ
میں نہیں ملتی۔ یہ نامی سیاح ہندوستان میں کامل چودہ برس رہا اور زبان سنسکرت
کے مطالعہ میں مصروف رہا۔ چین میں بدھ مذہب کی تلقین کے لئے اسباب
فراہم کرتا رہا۔ چونکہ اس کے دل میں مذہبی تحقیقات کی لگن تھی اس لئے وہ اور
حالات زیادہ واضح طور سے قلمبند نہیں کر سکا مگر واقعات سے متاثر ہو کر وہ
ہندوستان انسٹیٹیوشن کے حالات جن میں وہ ایک عرصہ تک رہا تھا بیان کئے بغیر
نہ رہ سکا اور اس نے اس ملک کے حیرت انگیز سیاسی و تمدنی معاملات پر روشنی
ڈالی ہے۔ ان میں اس قدر تعریف کی گئی ہے کہ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے اس نے
اپنے سفر کے طویل عرصہ میں ایک جگہ بھی جبر یا نقصان کا ذکر نہیں کیا وہ لکھتا
ہے کہ میں یہ معلوم کر کے نہایت خوش ہوتا تھا کہ کوئی تکلیف وہ پابندی
بادشاہ کی طرف سے رعایا کے لئے نہ تھی اور ہر ایک شخص کو غیر ممالک میں سفر کرنے
یا باہر سے ہندوستان میں آنے کی کامل آزادی تھی اور پاسپورٹ کا ناگوار
طریق نہ تھا۔ سادہ لوح جاتری نہایت خوشی کے لہجہ میں لکھتا ہے کہ "ہر ایک
شخص اپنی مرضی کے مطابق جا آ سکتا تھا"۔ ممالک وسطی متھرا کے قرب جوار
میں اس کا بیان ہے کہ رعایا خوش حال تھی اور میں قانون جرائم کی نرمی کو چین
کے قواعد سے مقابلہ کر کے بہت خوش ہوا۔ بہت سے جرائم کی سزا محض جرمانہ
تھی۔ پھانسی کا مطلق رواج نہ تھا اور دائیں ہاتھ کا کاٹ صرف متواتر
سخت جرائم کی سزا تھا۔ افسران کو معقول تنخواہیں ملتی تھیں اور اس لئے
وہ رعایا کا گلا نہ دباتے تھے۔ مگدھ دیس کے حالات بھی ایسے ہی دلچسپ بیان

کئے گئے ہیں۔ اس کا بیان ہے کہ رعایا متمول اور خوش حال تھی اور نیکی، فیض رسانی میں ایک دوسرے سے سبقت لے گئے تھے۔ خیراتی کاموں میں ہسپتال کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے۔ جہاں بیماروں کو دوا اور خوراک مفت ملتی تھی اور ان کے آرام آسایش کا بخوبی انتظام تھا۔ یہ سب باتیں اس بات کا کافی ثبوت ہیں کہ چندر گپت ثانی (وکرما دتیہ) نہایت قابل اور عاقل بادشاہ تھا جس کی قابلیت سے ایک پردیسی سیاح کا دل بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ ایک ایسا عہد حکومت تھا جس میں رعایا کو ہر ایک جائز آزادی تھی۔ اور علم و دولت دونوں ترقی پر تھے۔ یہ حالات اس لئے زیادہ تعریف کے مستحق ہیں کیونکہ چینی جاتری ایک کٹر بدھ تھا اور وکرما دتیہ پکا ہندو اور وشنو کا پجاری تھا۔ یورپ کے کسی ملک کا ذکر اس زمانہ کے کسی سیاح نے ایسے قابل تعریف الفاظ میں نہیں کیا اور ان حالات سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ۴۰۰ء میں ہندوستان میں وہ مدبر موجود تھے جو جبر و تشدد کے بغیر کامیابی سے حکومت کرنا جانتے تھے۔ عام سوشیل ترقی اور بڑھی ہوئی سیاسی قابلیتوں کا اثر سنسکرت پر ہوا جس نے اسی زمانہ میں کمال حاصل کیا۔ جیسا کہ کالیداس کی تصنیفات سے ظاہر ہے +

فہیین کے سفر کے تقریباً نصف صدی بعد گپت سلطنت کی شوکت کو وسط ایشیا کی ہنگی قوموں نے درہم برہم کر دیا۔ یہ جتھے پہلے دریا گنگا کے سیراب کردہ مقامات پر [illegible] آئے۔ مگر وہاں کے راجہ نے انھیں شکست فاش دی مگر [illegible] اور ہندوؤں پر چھا گیا چند ہی سال میں وہ شمالی ہندوستان پر قابض ہو گئے

چونکہ یہ لوگ وحشی اور غیر مہذب تھے۔ ہندوستانی ان کے ظالمانہ طریق سے
تنگ آگئے اور ۵۲۸ء میں ہندو راجاؤں کا ایک جتھا ان کے ناقابل
برداشت ظلم کے مقابلہ کے لیے اُٹھا اور ان کے سرگروہ مہرگلا نامی کو
سرحدی علاقہ پنجاب اور کشمیر میں بھگا دیا۔

لیکن جو بدنظمی ان وحشی حملہ آوروں کی بدولت ملک میں پھیل گئی
تھی۔ اس سے ہندو مدبری بالکل برباد ہوگئی اور گپتا کی سلطنت کو تباہ
کر دیا یہاں تک کہ جب دشمن کو باہر نکال دیا گیا تو مظلوم ملک کی حفاظت
کے لیے کوئی مدبر میسر نہ آسکا۔ چھٹی صدی میں مورخ کے لیے کوئی قابل
ذکر بات نہیں۔ اور ۶۰۶ء تک کوئی راجہ ہارش سے پہلے قابل ذکر بادشاہ
تخت نشین نہیں ہوا۔ راجہ ہارش قنوج تھانیسر پر حکومت کرتا تھا۔
چالیس سال کی عظیم سلطنت میں وہ قریباً تمام شمالی ہند پر قابض ہوگیا۔
اور مشرق میں آسام اور مغرب میں کاٹھیاواڑ کے حکمران اس کے
باج گزار تھے۔

جس طرح گپت کے زمانہ کے حالات ہمیں فاہیان چینی سیاح کی بدولت
معلوم ہوتے ہیں ہارش کے حالات ایک چینی ہیون سانگ نامی مشہور سیاح نے
تحریر کئے ہیں۔ جو اپنے پیشرو کی طرح ہندوستان میں ۱۴ برس رہا۔ وہ
ہارش کی عظمت و شوکت کے دلچسپ حالات بیان کرتا ہے کہ یہ شہنشاہ بہت
طاقتور اور اولوالعزم تھا اور اپنی تمام زندگی فتوحات کے خیال میں صرف
کی۔ اگرچہ گپتا اس کے زمانہ کی طرح امن و امان نہ تھا اور قواعد جرائم بھی
سخت مقرر کیے گئے تھے جس کی وجہ غالباً انگریزوں کے [illegible] معلوم
ہوتے ہیں مگر تاہم ملک نہایت خوشحال تھا اور بادشاہ کے ماتحت غریب

ترقی کر رہا تھا۔ بادشاہ ہمیشہ سفر میں رہتا تھا اور اپنے رؤسا سلطنت کے سامنے کی نگہداشت کو ضروری سمجھتا تھا۔ پر اسکے آئین سلطنت میں بھی زوال آگیا تھا اور اس لئے جب ہارش کے وفات پائی تو وہ انتظام جو اس کی ذات سے قایم تھا بالکل درہم برہم ہوگیا جس کا نتیجہ بدعملی ہوا۔ ہارش ہندو راجاؤں میں سے آخیر اور مہاراج تھا۔ اگرچہ یہ سچ ہے۔ کہ راجہ بھوج پچاس سال تک ایک وسیع حصہ ملک پر قابض رہا مگر اس کے حالات کچھ اس قدر تاریکی میں ہیں کہ ہم اسے ہندوستان کے مدبروں میں ممتاز درجہ نہیں دے سکتے۔ اس کے بعد بہت سی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں دنیا کے پردے پر آئیں اور وہ بجائے خود اس بات کا ثبوت ہیں کہ ان میں حکومت کی قابلیت نہ رہی تھی۔ ان چھوٹی چھوٹی سلطنتوں نے جو کوشش مسلمان حملہ آوروں کے روکنے کے لئے کی اس میں انہیں سخت ناکامیابی ہوئی جو عام طور پر سب کو معلوم ہے اور مدتوں تک سوائے راجہ ٹوڈرمل کے کوئی ہندوستانی کا مدبر قابل ذکر معلوم نہیں ہوتا ۔

موجودہ زمانہ گذشتہ زمانہ سے ہمیشہ وابستہ ہوتا ہے اور موجودہ مرحلے گذشتہ حالات معلوم کئے بغیر کبھی ٹھیک طور پر حل نہیں کئے جا سکتے قدیم مورخین کا سب سے بڑا اصول موجودہ نسل کو ان کے بزرگوں کے واقعات سے واقف کرنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ہندوستانیوں کو اپنے بزرگوں کی عظمت کا بخوبی علم ہو جائے کہ زمانہ قدیم میں ہندوستان کی خاک پاک سے ایسے ایسے مدبر پیدا ہوئے جنہوں نے سلطنت کا کام نہایت خوبی سے انجام دیا اور نام پایا تو ان میں اپنی عزت کا خیال پیدا

ہو جائے جو آیندہ ترقی کا ذریعہ کہا جا سکتا ہے اور یہ ترقی بیسویں صدی کے روشن زمانے کے مطابق ہو گی۔ اگرچہ موریا اور چندر گپتا کا زمانہ پھر نہیں آ سکتا۔ مگر ان کے کارنامے نمایاں جنہیں ہم فخر سے بیان کرتے ہیں موجودہ زمانہ کے لوگوں میں ایک تازہ روح پھونک سکتے ہیں تاکہ وہ اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر زمانہ کے مطابق چلیں تواریخ صدیوں تک بالکل فراموش کر دی گئی تھی۔ گذشتہ سو سال کے عرصہ میں بے شمار لائق مصنفوں کی بدولت دوبارہ زندہ کی گئی ہے جس میں بیشتر حصہ یوروپین۔ فرانسیسی۔ روسی اور جرمنی مورخین کا ہے۔ ہندوستانیوں نے جو تحقیقات اپنی تاریخ کے متعلق کی ہے وہ بہت کم ہے۔ لیکن یہ معلوم کر کے خوشی ہوتی ہے کہ ہندوستانیوں کے نام پر جو یہ دھبا ہے وہ رفتہ رفتہ مٹتا جاتا ہے۔ اور ہمیں اس زمانہ کی امید رکھنی چاہئے۔ جب ہندوستانی مصنف جن میں نکتہ چینی اور حب الوطنی دونوں ہونگی اس فرض کو جسے اب تک دوسروں نے انجام دیا اپنے سر لیں گے اور ہندوستان کی تاریخ کے معمہ کو حل کریں گے۔

جو مضمون میں نے آج ناظرین آزاد کی ضیافت طبع کے لئے پیش کیا ہے۔ وہ مسٹر ڈی۔ اے۔ سمتھ کے عالمانہ آرٹیکل مندرجہ امپلمنٹ اینڈ ویسٹ بابت ماہ اپریل ۱۹۰۶ء کا ترجمہ ہے۔ اگرچہ میں آزاد کے لئے کوئی اور طبعزاد مضمون لکھنا چاہتا تھا۔ مگر یہ مضمون اس قابل ہے کہ سینکڑوں اور جمیل مضامین اس پر نثار کئے جائیں۔ اس لئے یہی پیش کرتا ہوں۔ ع

گر قبول افتد زہے عز و شرف

مناظرہ

اس عنوان سے بحث طلب مضامین درج آزاد ہوا کریں گے
ہر ایک مضمون ایک جواب اور لکھنے والے کے جواب الجواب پر
مکمل سمجھا جائیگا +

نرم و گرم

از "شانتی"

ایک زمانہ تھا کہ ہندوستان کی گرم بازاری تھی۔ زمانے نے ورق الٹا اور سرد مہری کی ہوائیں چلیں۔ خدا خدا کر کے پھر وہ دن آیا کہ ہندوستانیوں کے خون نے جوش کھایا اور انہیں بھی لوگ گرم فریق کے نام سے منسوب کرنے لگے۔ کانگرس کی فرقہ بندیوں سے خواہ نتیجہ کچھ ہی کیوں نہ ہوا ہو مگر اتنا تو ضرور فائدہ ہوا ہے کہ ہندوستان کی گرم بازاری کی امید پھر تازہ ہو گئی ہے +

اختلاف قانون قدرت ہے اور کوئی انسانی طاقت اسے نہیں روک سکتی۔ عام مخلوقات کے مشاہدہ سے ہمیں اپنے دعوے کا ثبوت ملتا ہے۔ صرف انسانوں ہی نہیں حیوانوں کی شکلیں بھی الگ ملتی ہیں۔ کالے۔ پیلے۔ گورے۔ موٹے دبلے سب طرح کی مخلوق ہے۔ مگر ایک کی صورت دوسرے سے مشابہت نہیں رکھتی۔ یہ تو رہا صورت کا اختلاف اب طبیعت کے اختلاف کو لیجئے جانوروں میں بھی کئی تند مزاج اور کئی اصیل ہوتے ہیں۔ انسانوں کی

طبیعتیں بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتیں۔ جب اختلاف قانون قدرت ہے تو کانگرس کے کارکنوں میں اختلاف رائے کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ ہمارے اختلافات سے کیا مفید نتائج پیدا ہو سکتے ہیں کیونکہ عام طور پر اختلافات اگر نیک نیتی پر مبنی ہوں تو مفید ہی نتائج پیدا کیا کرتے ہیں ؎

کانگرس میں نرم و گرم فریق کی تفریق نمایاں طور پر کلکتہ کانگرس کے زمانہ سے ظہور میں آئی ہے مگر ہمارے پاس یہ یقین کرنے کی وجوہات ہیں کہ بہت سے یہ اختلاف موجود تھا اور اگر یہ کہا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ کانگرس کے قیام کے وقت بھی یہ اختلاف موجود ہو تو عجب نہیں۔ اگر اس جدید فریق کی تجاویز پر غور کرنے اور ان سے کوئی نتیجہ نکالنے کی کوشش کی جاتی تو شاید موجودہ دشواریاں جن کا ہمیں مقابلہ کرنا پڑا ہے پیش نہ آتیں۔ کسی معاملہ پر غور کئے بغیر فیصلہ دے دینا پسندیدہ طریق نہیں اور اگر ایسا عمل میں لایا جائے تو کانگرس کے کارکنوں پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ جس امر کی وہ گورنمنٹ سے شکایت کرتے ہیں اس طریق کے خود عامل ہیں۔ یہ بات بجائے خود نہایت مضحکہ آمیز ہے اور کانگرس کے لئے ایک افسوسناک اعتراض ہے۔ ان معترضین اور نکتہ چینوں میں سے نہیں ہوں جو اپنے فریق کی حمایت میں دوسرے فریق کا صرف تاریک پہلو دکھلائے اور اپنے فریق کی صرف خوبیاں بیان کرے۔ اس قسم کا بحث و مباحثہ محض تضیع اوقات ہے۔ اور کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ اگر راستی کی تلاش ہے تو دونوں صورتوں کے ہر ایک پہلو پر غور کرنا اور ٹھنڈے دل و دماغ سے اس پر فیصلہ دینا چاہئے۔ میں مانتا ہوں کہ واقعات پر غور کرتے

اور اپنے اپنے مقاصد کے قابل عمل در آمد ہونے پر غور کرنے کی کسی فریق نے پرواہ نہیں کی ہیں آج کے مضمون میں فریق گرم کے مقاصد پر بحث کرنے کی کوشش کروں گا اور اپنے معترضین کے جواب سننے کا مشتاق رہوں گا ؛

زمانہ کا دستور چلا آیا ہے اور ایک طرح سے یہ قانون قدرت بن گیا ہے کہ کمزور چند زبردست ہمیشہ قابو پاتے رہے ہیں۔ اخلاقی رستے میں خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائیں۔ مگر آئی ہوئی چیز کو ہاتھ سے دے دینا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ نپولین جیسا جمہوری سلطنت کا حامی بھی جس نے محض اس کامیابی کے لئے خون کے دریا بہائے خود اس آرزو سے نہ بچ سکا کہ فرانس کا مطلق العنان بادشاہ بنے اور اس کے احکام میں کوئی معترض نہ ہو۔ میرا اپنا عقیدہ ہے کہ ہندوستانیوں کو مانگنے سے تو کبھی کچھ نہیں ملیگا۔ مانگنے سے صرف اسی صورت میں کچھ مل سکتا ہے۔ جب ہماری ہستی محسوس کی جائے مگر خود کو اس قابل بنانے کے لئے دوسروں پر بھروسہ رکھنا خوفناک نادانی ہے +

جو قومیں اور ملک ترقی کے معراج پر پہنچے ہیں یا ترقی کر رہے ہیں اُن کی مثال ہمارے سامنے ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی ترقی ان کی اپنی کوششوں اور محنتوں کا نتیجہ ہے۔ اپنی آپ مدد کرنا ایک نہایت مبارک اصول ہے۔ اور دنیا کے لیڈر اہل الرائے اس سے اتفاق رکھتے ہیں۔ پس فریق گرم کا یہ اصول کہ ہمیں اپنے زور بازوؤں پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔ ہر طرح قابل عمل درآمد ہے اور کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ ایک ایسے مبارک اصول کی پابندی نہ کی جائے +

مگر اپنے حقوق کی طلب میں حکام گورنمنٹ پر بیجا دباؤ ڈالنا مصلحت نہیں ہیں۔ نے ابھی کہا تھا کہ اخلاقی رسمیں خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائیں۔ مگر آئی ہوئی چیز اور پھر سلطنت کی سی چیز کو کوئی دینا گوارا نہیں کر سکتا۔ مگر اس کے یہ معنے ہرگز نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم حکام کو اس قدر دق کریں کہ وہ ہمیں چھوڑ کر چل دیں اس خیال کی بنیاد سراسر ناتجربہ کاری اور ناعاقبت اندیشی پر ہے۔ مقام غور ہے کہ جنہوں نے ہندوستان ایسی عظیم الشان سلطنت کو باوجود اس کی اعلےٰ ترین مدبری کے اپنی حکمت عملی سے قبضہ میں لیا۔ کیا وہ ایسے کمزور طبیعت ہو سکتے ہیں کہ ہم ہندوستانیوں کے ڈرانے اور دھمکانے سے خصوصاً اس وقت جبکہ وہ جانتے ہیں کہ ہماری ہر ایک کوشش زبانی شور و غل ہے۔ ہندوستان ہمیں سونپکر چلدیں؟ وہ سلطنت جو ہزاروں حکمت عملیوں سے قبضہ میں لائی گئی ہو کبھی اس قدر آسانی سے واپس نہیں دی جا سکتی۔ ایسا کرنا اپنے راستہ میں خود مشکلات حائل کرنا اور تعلقات کو زیادہ کشیدہ بنانا ہوگا۔ اپنی آپ مدد کرنے کے یہ معنے ہرگز نہیں ہو سکتے کہ اپنے راستہ میں زیادہ مشکلات پیدا کر لی جائیں۔ اپنی ہستی محسوس کرانے کے اور طریقے بھی ہیں اور جب تک ان سے کام چل سکتا ہے کسی ایسے طریقے کو عمل میں لانا جو زیادہ دشواریاں پیدا کرنے والا ہو عقلمندی نہیں +

یہاں یہ سوال ہوگا کہ وہ اور طریقے کون سے ہیں جو ہماری کامیابی کا ذریعہ ہو سکتے ہیں اور سخت گیر حکام پر اثر ڈال سکتے ہیں اس کے جواب میں صرف اس قدر کہنا کافی ہوگا۔ کہ بائیکاٹ کا طریقہ بہترین طریقہ ہے۔ صرف یہی ایک ایسا طریقہ ہے کہ ہم حکام اور گورنمنٹ پر جائز دباؤ ڈالیں اور

نہیں ہے کہ ہم دفتروں میں کلرک بنیں تو یہ ضروری ہوگا۔ کہ ہم اپنے تعلیمی سلسلہ میں ضروری تبدیلیاں کریں جس سے ممکن ہے کہ گورنمنٹ کو اتفاق نہ ہو۔ مثلاً ہماری قومی تعلیم کا جزو اعظم ہمارے بزرگوں کے کارنامے ہونے چاہئیں۔ جن کی عظمت و شوکت ہمارے نوجوانوں کے دلوں میں اولوالعزمی کے ولولے پیدا کرے گی اور اپنی ترقی کی طرف مائل کرے گی۔ یہ طریقہ غالباً ہمیں تعلیم یافتہ بنانے کے دعوے داروں کو پسند نہ ہوگا۔ اور جب ہمارا تعلیم کا مقصد ہی فوت ہو جائے تو ہمارے نوجوانوں کے دماغ پریشان کرنے سے کیا حاصل ہے!!

تعلیم کو عالمگیر بنانے میں بھی ہمیں قومی تعلیم کی ضرورت ہے۔ کیونکہ گذشتہ سالوں کا تجربہ ہمیں بتلا رہا ہے۔ کہ گورنمنٹ سے یہ توقع رکھنا کہ وہ مفت تعلیم کا سلسلہ جاری کر دے ابھی پیش از وقت ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں تعلیم عام ہو۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ تعلیم کا نتیجہ ہمارے ملک میں اولوالعزمی اور عالی ہمتی ہو تو قومی تعلیم کا ہونا نہایت ضروری ہے اس سے انکار کرنا ایک صریح غلطی ہے۔ تعلیم کے معاملے میں بھی ہمیں اپنے سب سے بڑے اصول "اپنے قوت بازو پر بھروسہ رکھنے" کو نہ بھول جانا چاہئیے۔ پس یہ ثابت ہوا۔ کہ ہماری ترقی کے لئے قومی تعلیم ازبس ضروری ہے۔ یہ مقاصد تو ایسے ہیں جن پر ماڈریٹ کا شاید زیادہ اختلاف نہ ہو۔ سب سے بڑی بنائے فساد سوراج قرار دی گئی ہے۔ اگر بزرگ اعظم دادابھائی نوروجی یہ جانتے کہ ان کا یہ بیان ہندو مسلمانوں میں اس درجہ اختلاف پیدا کر دے گا کہ ہم آپس میں لڑ مرینگے تو یقیناً وہ اسے کچھ عرصہ تک اور محفوظ رکھتے +

سوراجیہ کے خیال کا اعلان خواہ کلکتہ کانگرس کے موقعہ پر ہوا مگر یہ کہنا یقیناً غلطی نہیں کہ یہ آرزو مدت سے ہندوستانیوں کے دل میں پیدا پیدا ہو چکی تھی۔ اس مبارک خیال کی بنیاد ہندو نگ اعظم دادا بھائی نوروجی کے الفاظ نہیں بلکہ ملکہ معظمہ آنجہانی کا ۱۸۵۸ء کا فرمان ہے جس کی طاقت پر ہندوستانیوں کو حقوق طلبی کی جرأت ہوتی ہے۔ حکومت میں برابر کا حصہ دیا جانا بجائے خود سوراج ہے ٭

سوراج کے یہ معنے سمجھنا کہ اس کا مقصد انگریزوں کو ہندوستان سے نکال دینا ہے ایک فاش غلطی ہے اور ہم حیران ہیں کہ یہ مہمل فقرہ کہاں تک فریق گرم کے خیالات کا صحیح ترجمہ کہا جا سکتا ہے۔ فریق گرم کے سب سے بڑے حامی اور رہنما مہاراج تلک کی رائے کا یہاں بیان کر دینا میرے خیال میں سب اعتراضات کا کافی جواب ہوگا۔ مہاراج تلک کہتے ہیں :-

> ہمارا منشا نہیں ہے۔ کہ حکومت برطانیہ کا تخت الٹ دیں۔ بلکہ ہمارا منشا یہ ہے کہ آخرکار ہم کو اپنے ملک کے نظم و نسق میں حصہ کثیر ملے۔ ہمارا انتہائی مقصد یہ ہے کہ ہندوستان میں نوآبادیوں کی سی حکومت خود اختیاری زیر سایہ سلطنت برطانیہ قایم ہو۔ اور انگلستان میں سنٹرل گورنمنٹ تمام امپیریل مسایل کو طے کیا کرے ہمارا ہوم رول اس قسم کا ہوگا کہ ہر ایک صوبہ کی کونسلوں میں پچاس یا ساٹھ ممبر ایسے ہوں جو اولاً نامزد کیے جائیں یا منتخب شدہ ہوں۔ اور بعدازاں جوں جوں تعلیم کی ترقی ہوتی رہے ان ممبروں کو رعایا منتخب کرے۔

اس میں تو ذرا بھی کلام نہیں اور شاید کسی بھی خواہ ملک کو انکار نہ ہوگا کہ ہندوستان کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے ابھی انگریزوں کی امداد کی ضرورت ہے اور اس لیے وہ لوگ جو حقیقت میں ملک کی بہتری چاہنے والے ہیں۔

کبھی ایسی غلطی کے مرتکب نہیں ہو سکتے +

جن لوگوں نے غور کیا ہے وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ فلاں گروہ جسے باغی اور خدا جانے اور کیا کیا کہا جاتا ہے گورنمنٹ کا دشمن نہیں بلکہ اُنکے خیالات میں اسی قدر شائستگی متانت اور وفاداری موجود ہے جتنی ہر ایک سچے خیر خواہ ملک میں ہونی ضروری ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ لوگ جو دوسروں پر بھروسہ رکھیں اور اپنی ترقی کو غیروں کی امداد کے تابع بنائیں کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔ ان کی ترقی امداد کرنے والوں کے رحم پر منحصر ہے اور رحم کا منتظر رہنا باہمت لوگوں کا طریقہ نہیں۔ میں نے جہاں تک غور کیا ہے میں اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ موڈریٹ اور ایکسٹریمسٹ کا اختلاف محض غلط فہمی کی بنا پر ہے۔ اور اس پر خود پسند شہرت کے شیدائیوں کی فتنہ انگیزی آگ پر تیل کا کام کرتی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم اس پردہ کو جو ہماری کمزوریوں کا بنا ہوا ہے اُٹھا دیں۔ اور اُن طریقوں پر عمل کرنے کی کوشش کریں۔ جن سے حقیقت میں کسی بہتری کی امید کی جا سکتی ہے ہر ایک کامیابی کے لئے تکالیف کا پیش آنا ضروری ہے اور اس لئے بہتری اور ترقی چاہنے والے کبھی اُن سے نہیں ڈرا کرتے۔ ہماری برداشت تکالیف سے ہماری ہمت اور استقلال کا پتہ چلتا ہے۔ اور یہی ہماری زندگی ثابت کرتی ہے۔ آؤ ہم سب دعا کریں کہ ہمارے اختلافات جو غلط فہمی کی بدولت پیدا ہوئے ہیں دور ہو جائیں اور ہم ان فرائض کو بغیر کسی رکاوٹ کے انجام دے سکیں جو ہر ایک شخص کا اس قوم اور ملک کے متعلق جس میں وہ پیدا ہوا ہے مقدم فرض ہے +

سہ کتاب ہیچ ہیں ہم کروٹیں ہر سو بدلتے ہیں
جو جل اٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں

کیونکہ عالم خیال کی سیر کرتے ہوئے اس وقت ہم جس جگہ پہنچے ہیں وہ ایک مقدس مقام ہے ہم دیکھتے ہیں کہ سامنے ایک تقدس مآب بزرگ ۔ با خدا فرشتہ صورت مصلے پر بیٹھے ہوئے نہایت خضوع اور خشوع کے ساتھ عبادت خداوندی میں مصروف ہیں ۔ برف کی مانند سفید داڑھی اور متبرک چہرہ پر ایسا نور برس رہا ہے جو اہل دنیا میں سے کبھی کسی نے نہ دیکھا ہوگا ۔ وہ بلا مبالغہ نور آسمانی ہے ۔

یہ فرشتہ خصلت انسان عبادت خداوندی میں کچھ ایسا محو اور مستغرق ہے کہ اس بھیانک سین اور رات کی لامحدود تاریکی اُس کے نورانی قلب پر کچھ اثر نہیں کرتی ۔ نہ یہ دلیر کھلے ہوئے تارے اس عابد شب بیدار کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں ۔ کیوں نہ ہو وہ فرشتہ ! اپنے عقیدہ اور خیال میں ایک ایسے بادشاہ کی حضور میں حاضر ہے جسکی سلطنت غیر محدود ۔ جسکی حکومت لازوال اور جسکا ملک فتنہ و فساد سے خالی ہے ۔ جسے نہ کسی کی سرکشی کا فکر نہ کسی غنیم کی چڑھائی کا خطرہ ۔ بلکہ وہ ہمیشہ کیلئے لازوال سلطنت کا مالک ہے ۔

یہ بزرگ جس حجرہ میں بیٹھے اللہ اللہ کر رہے ہیں نہ مسجد کی حیثیت رکھتا ہے نہ خانقاہ کی نہ آبادی سے دور واقع ہے بلکہ گنجان آبادی کے عین مرکز میں ہے ۔ اور اگرچہ یہ کمرہ بادی النظر میں ایک علیحدہ مکان معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک عالیشان محل سرا کا حصہ ہے

یہ محل سرا ایک امیر کبیر رئیس اعظم میرزا **حشمت بیگ** صاحب کی ہے ۔

میرزا صاحب کا تمام خاندان اسی بزرگ سے بیعت ہے ۔ اور اس لئے یہ سب لوگ اسی خضر رہ طریق کے نہایت صدق دل سے سچے خادم ہیں ۔

اس بزرگ کی سکونت اور خورونوش کا ہلکا سا خوشگوار بار ۔ اسی خاندان پر ہے جسے یہ لوگ اپنی سعادت مندی اور موجب خیر و برکت سمجھکر خوشی سے برداشت کرتے اور

اور قابل فخر سمجھتے ہیں!

زاہد شب بیدار اپنے مبارک شغل میں مستغرق تھا کہ کسی خارجی کھٹکھٹاہٹ نے جو غالباً کسی آنے والے کے پاؤں کی آہٹ تھی اسے گویا چونکا دیا۔ وہ آنکھیں جو ابھی ابھی نیم وا ہو کر پاک مصلے پر سیدھی شعاعیں ڈال رہی تھیں اوپر کو اٹھ گئیں۔ اس بزرگ نے دیکھا کہ ایک دل کش شکل اوس کے سامنے سے گذرتی جا رہی ہے اور وہ باوجود دروازہ بند ہونیکے عنقریب اس مکان سے نکلا چاہتی ہے۔ بزرگ نے پہلو بدل کر ہاتھ بڑھا دئے اور قبل اس کے کہ وہ دروازہ کے باہر ہو اوس کو اپنے دونوں مقدس ہاتھوں سے پکڑ لیا اور اوس سے اس طرح ہمکلام ہوا۔

بزرگ وہ اے خدا کی پیاری مخلوق! تو سچ سچ بتا کہ تو کون ہے۔ انسان کی تو طاقت نہیں کہ بند مکان میں اس طرح داخل ہو جائے اور پھر اس طرح گذر بھی جائے۔

اجنبی۔ (خاموش رہتا ہے)

بزرگ۔ تجھے قسم ہے! اُسی کی عزت اور جلال کی جسنے تجھے یہ عجیب و غریب طاقت بخشی ہے اور اوس کی تمام خدائی کی مجھے سچ سچ بتا کہ تو کون مخلوق ہے

اجنبی۔ (مسکرا کر) میں بھی آپکی طرح خدا کا ایک بندہ اور خادم ہوں

بزرگ۔ یہ تو میں بھی جانتا ہوں لیکن یہ تو کہو کہ کون ہو! اس وقت کہاں سے آئے اس طرح آندھی دھاندی بنکر غیر کے مکان میں آنا کیسا!

اجنبی۔ میں اپنے آقا کے حکم سے اُس کے احکام کی تعمیل کرنے آیا ہوں

بزرگ (حیران ہو کر) کیا تمھاری مراد آقا سے خدا ہے! اگر ایسا ہے تو کیا میں مان لوں کہ تم فرشتہ ہو؟

اجنبی۔ بیشک

بزرگ۔ سبحان اللہ! مبارک ہے وہ خدا جسکی وسیع خدائی کی مبارک مخلوق سے پڑے اچھا لگے ہاتھوں میرے ایک سوال کا جواب دیتے جاؤ

وہی فرشتہ۔ اور رات کا وہی حصہ ہے۔ ہم اس عابد اور فرشتہ کو ذیل کی گفتگو میں مصروف پاتے ہیں۔

عابد۔ آپ گویا منشی تقدیر ہیں

فرشتہ۔ آپ کچھ ہی سمجھیں لیکن میں تو یہی کہونگا کہ میں اُس ذات واحد کا غلام اور تابع فرمان ہوں۔

عابد۔ اس میں کیا شک ہے۔ لیکن دوست یہ تو کہو کہ اب کے کس کی قسمت لکھنے آئے۔ کیا اس مکان میں کوئی مولود عالم وجود میں آنے والا ہے

فرشتہ۔ بیشک اس امیر کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہونے والی ہے

عابد۔ تو یار بتاؤ تو اوس کی قسمت میں کیا لکھنے کا حکم ہوا ہے

فرشتہ۔ اُس کو بڑا حسن دیا گیا ہے۔ لیکن اُس کی قسمت بہت بُری ہے کیونکہ وہ نیک چلن نہ ہوگی۔

——— (۴) ———

اعتبارے نیست بر کار جہاں
بلکہ بر گردون گرداں نیز ہم

جن واقعات کی تفصیل پچھلے فقرات میں کیگئی ہے۔ اُن کو مدت مدید اور عرصہ بعید گزر گیا۔ یعنی تقریباً دس بارہ سال اس اثنا میں زمانہ نے بہت سے پہلو بدلے۔ کئی آبادیوں کو اُجاڑا۔ کئی مکانوں کو مسمار کیا۔ اور کئی ویرانوں کو آباد علیٰ ہذا القیاس کئی خاندانی رئیس غریب و نادار ہوگئے۔ اور کئی مفلس صاحب طبل و علم سامنے ایک کھنڈر ہے۔ کم بخت کا ملبہ بھی تو اصلی حالت پر نہ رہ سکا۔ ٹوٹی ہوئی اینٹیں چونا تک خاک کے ڈھیر ہوگئے اور عمارت کا تو کچھ کھوج ہی نہیں۔ اس وسیع رقبہ سے جو اس وقت ایک ٹیلہ کی حیثیت رکھتا ہے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ یہ کیسی عالیشان محل سرا کا مٹا ہوا نشان ہے۔

ہم اس وقت اُس بزرگ کو جس سے اب سے دس سال پیشتر ملاقات کی تھی ساز و سامان سفر سے لدا ہوا اس جگہ کھڑا ہوا پاتے ہیں۔ مگر عجب حیرت کے عالم میں۔ دانتوں میں انگلیاں کاٹ رہا ہے۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھتا ہے۔ کبھی سرد آہیں بھرتا ہوا یا اللہ یا اللہ کہکر خاموش ہو جاتا ہے۔

اس کے چہرہ پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا دماغ خیالات کا اور دل جذبات کا جولانگاہ بنا ہوا ہے۔ آخر وہ اندرونی جذبات سے مجبور ہو کر ایک راہگیر سے اس طرح مخاطب ہوتا ہے۔

"مہربان! ذرا سنئے تو! یہاں ایک رئیس میرزا حشمت بیگ رہا کرتے تھے وہ اب کہاں رہتے ہیں۔؟

راہگیر۔ حشمت بیگ! اس نام کا تو اس شہر میں کوئی بھی رئیس نہیں ہے!

بزرگ۔ تم کیا کہتے ہو! وہ تو بڑا نامی گرامی امیر کبیر ہے۔ اور پہلے اُس کا مکان یہیں تھا جس جگہ ہم کھڑے ہیں۔

راہگیر۔ (تعجب سے) ہوگا! مگر اب تو نہیں ہے۔ تم بات کتنے دنوں کی کرتے ہو

بزرگ۔ کوئی دس بارہ سال کی بات ہے کہ میں جب حج بیت اللہ کو گیا تھا تو اون کو اسی جگہ چھوڑ کر گیا تھا مگر۔۔۔۔ (ایک اور راہگیر آکر استفسار حال کرتا اور اس طرح جواب دیتا ہے)

دوسرا راہگیر۔ افسوس جن مرزا صاحب کو آپ دریافت کرتے ہیں مدت ہوئی اُن کا انتقال ہو گیا

بزرگ۔ انتقال ہو گیا! (افسوس کر کے) انا للہ وانا الیہ راجعون وہ بہت ہی نیک شخص تھا خدا مغفرت کرے۔ مگر اون کے عیال و اطفال کہاں رہتے ہیں

راہگیر۔ جناب اُن کا کچھ پتہ نہیں

بزرگ۔ یعنی اس شہر میں نہیں ہیں۔

رانگیر - نہیں!

بزرگ - مجھے یقین نہیں آتا کیا کہتے ہو! اُن کے دونوں بیٹے تو اب ماشاءاللہ جوان ہونگے اور باپ کی ریاست کا انتظام کرتے ہونگے

رانگیر - نہیں جناب آپ کس خیال میں ہیں - جائداد و ریاست سب نیلام میں لگ گئی - وہ سب لوگ خدا جانے کہاں کے مارے کہاں پھرتا پھرتے ہیں - کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں

بزرگ - افسوس زمانہ نے کیا پلٹا کھایا - کبھی اس مکان پر ہاتھی جھومتے تھے اور آہ اب گدھوں کے ہل چل گئے ہیں

اس کے بعد اس کو فرشتہ کی ملاقات اور تقدیر کی تحریر کا خیال آگیا کہ معاً اوسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے - مگر اوس مرد خدا نے مستقل ارادہ کر لیا کہ خواہ کچھ ہو ان لوگوں کی امداد ضرور کرنی چاہئے - مجھ پر ان کا حق بھی تو ہے میں کتنے عرصہ اُن کا نان و نمک کھا چکا ہوں - آہ امیر یا ایسا شریف نامی گرامی آدمی اور ایسا گمنام ہو جائے کہ نشان تک نہ ملے - یہ جو کچھ میں کانوں سے سن اور آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں دل اوس کے صحیح ہونے کا یقین ہی نہیں کرتا - کسی نے سچ کہا ہے

اعتبارے نیست بر کار جہاں
بلکہ بر گردون گردان نیز ہم

زمانہ کا انقلاب! آسمانوں کی گردش! کسی امیر کو یا غریب کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتی خصوصاً یہ ظالم! کم بخت سفلہ پرست شریفوں کی عزت پر پانی پھیرتی بلکہ جان تک لیکر بھی پیچھا نہیں چھوڑتی بعد یہ کہتا ہوا کسی طرف کو چل دیتا ہے - باقی آئندہ

یادِ گذشتہ

حقارت، ذلت، بے عزتی، رسوائی جو کچھ قسمت دکھائے وہ ناچار دیکھنا۔ ہندوستانیوں کی گری ہوئی حالت کے ساتھ یہ سب اسباب ذلت کا جمع ہو جانا ضروری تھا۔ کہ ایک مفلسی ہزار عیب دنیا کا دستور ہے ۔

ٹرنسوال میں ہندوستانیوں سے جو سلوک کیا گیا اس کے تفصیلی حالات تو ناظرین کو اخبارات کے ذریعہ پہنچ چکے ہونگے اور کوئی ہندوستانی ایسا نہ ہوگا جسے اس بے عزتی سے صدمہ نہ پہنچا ہو۔ آہ وہ ہندوستان جو کبھی زرخیز کہلاتا تھا۔ وہ ہندوستان جو مال و دولت کا خزانہ تھا۔ وہ ہندوستان جس نے دنیا کے باشندوں کو آغوش مروت میں پالا اور ان کا پیٹ پالا آج اس درجہ حقیر و ذلیل ہو گیا کہ اس کے باشندوں سے معمولی اخلاقی رسموں کا سلوک بھی گوارا نہیں۔ ان کی آبروریزی ایک ایسی معمولی بات ہے جیسے کتے کو دھتکار دیا جاتا ہے۔ یہ کیوں اور کس لئے کیا اس لئے کہ وہ اسی سلوک کے لائق ہیں؟ کیا اس لئے کہ وہ اس ذلت و رسوائی کی پرواہ نہیں کرتے؟ یہ دونوں وجوہات کچھ ہوں گی مگر سب سے بڑی اور زبردست وجہ یہ ہے کہ ان کی بے عزتی اور رسوائی کی باز پرس کرنے والا کوئی نہیں۔ جس گورنمنٹ کے وہ تابع ہیں وہ ان کی بے عزتی کو اپنی رسوائی نہیں سمجھتی حالانکہ تہذیب و عقل کی رسموں کے مطابق رعایا کی بے عزتی بادشاہ کی بے عزتی ہے ۔

ہندوستانی اسی بے عزتی کے قابل تھے۔ یہ ایسا نہایت [illegible]

نتیجہ ہے مگر اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اگر ہم اپنی حالت پر غور کریں۔ اپنے اعمال پر انصاف کی نظر ڈالیں تو یقیناً ہم اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ وہ قوم جو اپنے معمولی اختلافات کو نہیں مٹا سکتی۔ وہ قوم جس کے افراد میں خدمت ملکی فرض نہیں سمجھا جاتا۔ وہ قوم جو اپنی معمولی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے دوسروں کا منہ تکتی ہے۔ وہ قوم جس کے مذہبی مباحثے ایک کو دوسرے کا جانی دشمن بناتے ہیں اگر اس قدر حقیر و ذلیل سمجھی جاتی ہے۔ کہ ان کے ساتھ ایک سڑک پر چلنا جہاں وہ رہتے ہوں وہاں رہنا گناہ سمجھا جاتا ہے تو کونسی تعجب کی بات ہے۔ موٹی مثل ہے "اگر تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہاری عزت کریں تو پہلے اپنی خود عزت کرنا سیکھو" جس کی گھر میں عزت نہیں ہوتی وہ کبھی باہر عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ اگر ہندوستانی اپنی آپ عزت کرنا سیکھیں اور معمولی اختلافات کو جن کا ہونا ہر قوم اور ہر ملک میں ضروری ہے۔ بنا فساد نہ بنائیں۔ محرم اور ہولی پر معمولی سی باتوں سے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نہ بن جائیں اور دنیا کو دکھا دیں کہ ہم میں اہل وطن کے لئے محبت۔ عزت اور ہمدردی ہے تو پھر یہ ناممکن ہے کہ ان کی ہر جگہ عزت نہ کی جائے۔ اور وہ لوگ جو اب انہیں حقیر جانتے ہیں انہیں سر آنکھوں پر نہ بٹھائیں۔ جاپان کی ہر جگہ عزت کیوں کی جاتی ہے ان پر ہندوستانیوں کی طرح شرائط کیوں عاید نہیں کی جاتیں؟ محض اس لئے کہ ان میں پاس عزت ہے۔ ان کی ذرا سی توہین تمام جاپان کو لڑنے مرنے پر آمادہ کر دے گی۔ یہاں طبعاً یہ سوال پیدا ہوگا کہ جاپان کی اپنی گورنمنٹ ہے اور اس لئے ان کی غیر ملک عزت کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ کسی جاپانی کی توہین کو جاپان گورنمنٹ اپنی توہین جانیگی اور انتقام پر آمادہ ہو جائیگی۔ یہ

بالکل درست ہے مگر اس معاملہ میں ہم بالکل بے بس ہیں اگر ہماری گورنمنٹ میں یہ کمزوری نہ ہوتی۔ اگر وہ ہم سے خود نفرت اور سختی کا برتاؤ نہ کرتی اگر اس کی طرف سے ہماری وفاداری کا جواب ہماری بہتری اور ہماری عزت کا جواب محبت ہوتا تو یقیناً یہ ناممکن تھا کہ ہندوستانیوں کی طرف کوئی نظر بھر کر بھی دیکھ سکتا۔ ہم جانتے ہیں کہ حضرت کرزن کے بعض کرشمے یہ رنگ لا رہے ہیں اگر اس خود پرست کے پیچھے مہاراجے اردلی بنکر نہ چلتے۔ اگر دہلی دربار میں قرض لیکر شرف باریابی کی آرزو پوری نہ کی جاتی تو غیر ممالک پر ہماری اس درجہ غلامی کا نقش نہ ہوتا اور وہ ہمیں حقیر نہ جانتے مگر یہ کہتے ہوئے ہمیں بھول نہ جانا چاہیئے کہ ہمارے راجے مہاراجے کہاں تک اس تماشہ کے طرف دار اور دل سے شایق تھے۔ کون نہیں جانتا کہ اگر وہ اس کو قہر درویش برجان درویش کہکر پورا نہ کرتے تو حضرت کرزن سینکڑوں آفتیں ڈھاتے۔ ایسی نازک حالت میں جب گورنمنٹ کا یہ سلوک ہو اور اپنی حالت ان دشواریوں میں ہو سخت مایوسی ہوگی۔ مگر ہمت اور استقلال کی یہ شرط نہیں۔ سونے کو کندن بنانے کے لئے کئی بار تپایا جاتا ہے۔ اگر ہم اب ان واقعات سے سبق حاصل کریں اور آیندہ خود کو اس قابل بنائیں کہ اس درجہ توہین نہ ہو تو یقیناً یہ بہت بڑی جیت ہوگی۔ اور یہ سب بے عزتی نفرت شہرت اور عزت میں تبدیل ہو جائے گی +

انسان پیٹ کی خاطر دنیا بھر میں پھرتا ہے۔ غربت کی تکلیف وطن کی تکلیف سے کہیں زیادہ ہے۔ آہ ذرا اس سین کو خیال میں لایئے جب حسرت نصیب ہندوستانی وطن کو خیرباد کہکر غیر ملک میں اس امید کو لئے ہوئے پہنچتا ہے کہ پیٹ بھر کھانے کو تو ملیگا مگر وہاں اس کی توہین کے

طریقے رائج ہیں۔ پیٹ کے لئے وطن سے ہزاروں کوسوں گئے مگر وہاں بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

سر پھول وہ چڑھا جو چمن سے نکل گیا
عزت اسے ملی جو وطن سے نکل گیا

مگر ہندوستانیوں پر یہ شعر صادق نہیں آتا۔ ان کیلئے تو ع

روز قسمت میں نئے ہیں دل پر ستم کے لئے

ایک دل ہزار صدمے۔ ایک صدمہ ہو چکا تھا۔ ایک اور نیا ہو گیا۔ یہ آخر ان اقوام کی انتہا ہی ہے۔ ذیل میں وہ شرائط درج کی جاتی ہیں جن کی پابندی ہر ایک ہندوستانی کا جو نٹال جانے کا ارادہ رکھتا ہو لازمی ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ کہاں تک ان شرائط کو ادا کر سکتی تھی۔ وہ ہماری گورنمنٹ کو اس سے کہاں تک واسطہ ہے +

(۱) ہر ہندوستانی کو ایک سرٹیفکیٹ حاصل کرنا ہوگا جس میں اس کا حلیہ درج ہوگا۔ اس سرٹیفکیٹ کا ہر وقت پاس رکھنا ضروری ہے۔ ہر ایک معمولی پولیس مین کو اختیار ہے کہ جب چاہے اسے دیکھ لے ورنہ بصورت خلاف ورزی پولیس میں چالان کر دیئے جاتے ہیں +

(۲) سرٹیفکیٹ حاصل کرتے وقت نام ایک رجسٹر میں درج کر لیا جائیگا — جس میں ہاتھ کی دسوں انگلیوں کے نشان لگانے ہونگے۔ پڑھے لکھے آدمیوں کو بھی جاہلوں کی طرح انگوٹھے لگانا لازمی ہے۔ ان کے دستخط ان کی کافی ضمانت شمار نہیں کئے جا سکتے +

(۳) شہر سے باہر رہنا پڑے گا +

(۴) رات کو آٹھ بجے کے بعد باہر نکلنے کی اجازت نہیں بلکہ ضروری

ہے۔کہ ۹ بجے چراغ گل کر کے چین بستر پن جاؤ۔ اگر آٹھ بجے کے بعد کہیں جانا منظور ہو تو اس کے لئے خاص اجازت لینی ضروری ہوگی جس کے لئے ایک اور سرٹیفکٹ ملیگا +

(۵)۔ انگریزی دوکانوں میں نہ جاؤ +

(۶)۔ لائسنسدار گاڑیوں پر سوار نہ ہو +

(۷)۔ گوروں سے علیحدہ چلو +

(۸)۔ ہوٹلوں میں جانے کی ممانعت ہے +

(۹)۔ ٹریموے سفر کے لئے گاڑیاں مخصوص ہیں اور ان پر "صرف کالے لوگوں کے واسطے" لکھا ہوا ہے +

(۱۰)۔ ریل میں سفر کرنے کے لئے چند گاڑیاں مقرر کر دی گئی تھیں ان میں صرف تیسرے درجہ میں سفر کرنے کی اجازت تھی +

(۱۱)۔ صرف اُن سڑکوں پر چلو جو کالوں کے لئے مخصوص ہیں +

(۱۲)۔ انتخاب میں رائے نہ دو +

(۱۳)۔ زمین خریدنے کا حق نہیں +

(۱۴)۔ ۵ پونڈ فیس رجسٹری ادا کرو +

(۱۵)۔ اپنے بچوں کو بوئروں کے مدرسوں میں نہ بھیجو +

مندرجہ بالا شرائط معلوم کر کے کونسا ایسا شخص ہے کہ جس میں ذرا بھی حمیت انسانی ہے اور اس کا خون جوش نہیں مارتا۔ جاہل لوگوں کے لئے بھی ایسے سخت قوانین مقرر نہیں کئے جاتے۔ جو شرائط مقرر کی گئی ہیں۔ ان سے ہندوستانیوں کا تہذیب و اخلاق سے گرا ہوا اور جاہل ہونا ثابت ہوتا ہے۔ یہ نہ صرف تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی بلکہ تمام

ہندوستانیوں کی بہت بڑی توہین ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی گورنمنٹ کی بھی توہین ہے۔ کیونکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ۱۵۰ سال کی انگریزی حکومت ہندوستانیوں کو مہذب و تعلیم یافتہ نہ بنا سکی۔ شرائط تو سب دل دکھانے والی ہیں۔ مگر ایک ضرور دلچسپ ہے "انگریزی دوکانوں میں نہ جائیں"۔ خدا نہ کرے کہ ہندوستانیوں کو انگریزی دوکانوں میں جانے کا خیال آئے۔ وہ دن نہایت مبارک ہوگا جب ہندوستانی اپنی ہر ایک ضرورت اپنے ملک کی چیزوں سے ہی پوری کر سکینگے +

اس بے عزتی پر ناراضگی کے جو جلسے کئے گئے وہ ہر طرح قابل تعریف ہیں کیونکہ ان سے ہماری بیداری کا پتہ چلتا ہے اور ہماری بیداری کا ثبوت بجائے خود بہت ہی اس قسم کی وحشیانہ حرکتوں کو جو غیر ممالک سے ظہور میں آتی ہیں روک دے گا۔ اس چیخ پکار کا نتیجہ صرف یہ ہی نہیں ہوا کہ وہ قواعد منسوخ ہوگئے بلکہ ہمیں سبق ملا کہ اگر ہم مردانہ وار اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کریں تو کوئی طاقت ہمیں ذلیل و رسوا نہیں کر سکتی۔ ہمیں یہ صاف طور سے بتلا دینا چاہئیے کہ جو لوگ ہم سے تہذیب و اخلاق سے پیش نہیں آتے وہ ہم سے کسی سلوک کی امید نہ رکھیں۔ ہمارا سلوک ان کے اعمال کا عکس ہوگا +

ٹرنسوال کے اس رنج دہ واقعہ کے ساتھ جو ہندوستان کی تاریخ میں ایک افسوسناک یادگار رہیگا۔ ان باہمت محبان وطن کے نام کبھی نہ بھولینگے جنھوں نے جیل میں جانا منظور کیا مگر ملک کی یہ بے عزتی گوارا نہ کی۔ مبارک ہیں وہ لوگ جن کے دل و دماغ ان مبارک ارادوں سے منور ہیں۔ اور جن میں وطن کی اس درجہ محبت ہے۔ مسٹر گاندھی کا نام جنھوں نے اس

مصیبت کا نہایت ہمت اور استقلال سے مقابلہ کیا اور اپنے غریب الوطن ہموطنوں کی امداد اور حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ ہمیشہ عزت کے ساتھ لیا جائے گا۔ ماہ گذشتہ کا ایک واقعہ تو ایسا افسردہ کرنے والا تھا اگرچہ اس کا انجام اچھا ہوا۔ دوسرا واقع وہی پرانی رام کہانی ہے جس سے ہمیشہ ہماری آس بندھی رہی ہے +

لبرل وزارت اور اس کے گورو گھنٹال مسٹر مورلے کی ذات سے ہندوستان کی بہت سی امیدیں وابستہ تھیں۔ جب تک آنحضرت کا دور دورانہ تھا تو جو خیالات ان کے اعمال و خیالات سے ہمارے دلوں میں پیدا ہوئے تھے وہ نہایت حوصلہ افزا تھے مگر مسند وزارت میں خدا جانے کون سحر کا اثر تھا کہ اس پر رونق افروز ہوتے ہی وہ تمام محبت آزادی ہمدردی ہوا ہوگئی اور اب لبرل وزارت اور مسٹر مورلے اس خوبصورت پھول کی طرح ہیں۔ جو دیکھنے میں دلکش مگر سونگھنے میں نفرت کرنے کے قابل ہے۔ سال گذشتہ میں ان کی تقریروں اور ہماری مصیبت میں انکے جوابات سے اندازہ ہو گیا کہ مسٹر مورلے کا قول و فعل ظاہر و باطن ایک نہ تھا۔ وہ آزادی خیالات جو ہمیں خوش کر رہی تھی ہمارے لئے نہ تھی۔ مصائب کے زمانہ کے بعد پارلیمنٹ ماہ گذشتہ میں پھر کھلی۔ ملک کو انتظار تھا کہ اس قدر سوچ بچار کے بعد جب انہیں سنجیدگی سے غور کرنے کا موقع ملا ہے۔ مسٹر مورلے کیا گل فشانی فرماتے ہیں۔ اگرچہ دور اندیش کچھ زیادہ توقع نہ رکھتے تھے۔ مگر ایک عام خیال تھا کہ اب مسٹر مورلے کے خیالات و اعمال میں ضرور کوئی تبدیلی واقع ہوگی۔ مگر سے

نہ سمجھا عمر گذری اس بت خودسر کو سمجھاتے
پگھلکر موم ہو جاتا اگر پتھر کو سمجھاتے

وہی دم خم وہی تیوری میں تین بل۔ وہی انداز جفا! +

مسٹر مورلے نے جو تقریر کی اس میں ڈھونڈے سے کہیں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ملتا۔ جس سے ان کے خیالات کا راہ راست پر آنا معلوم ہوتا ہو۔ کونسل میں دو ہندوستانی ممبروں کی ایزادی مسٹر مورلے کے نزدیک ہندوستانیوں پر بہت بڑا احسان ہے اور انہیں افسوس کہ ہندوستانی ایسے احسان فراموش ہیں کہ ان کے اتنے بڑے لمبے چوڑے احسان۔ کے لئے بھی سراپا شکریہ نہ بن گئے +

ہمارا خیال ہے کہ مسٹر مورلے نے ہندوستانیوں کے شکریہ کو کان لگا کر نہیں سنا ورنہ انہیں معلوم ہو جاتا۔ کہ محبان ہند نے جو تقریریں ان کی تقریر سے پہلے کیں وہ تسلی بخش شکریہ سمجھا جانا چاہئے۔ سادہ لوح ہندوستانیوں کو خوش کرنے کے لئے تو دو ہندوستانیوں کی تقرری بہت بڑا احسان ہے مگر افسوس کہ ان کے ہم قوم ہی جو ہندوستانیوں کی نسبت زیادہ مزاج شناس ہو سکتے ہیں۔ آپ کے احسان سے خوش نہیں اب زبانی باتوں سے خوش کرنیکا وقت نہیں رہا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہندوستانیوں میں بھی یہ حس پیدا ہو گئی ہے کہ وہ اپنی حقیقی بھلائی اور برائی کو سمجھ سکیں۔ کیا مسٹر مورلے بتا سکیں گے کہ دو ہندوستانیوں کے کونسل کا ممبر ہو جانے سے فاقہ کش ہندوستانیوں میں سے کتنوں کا پیٹ پل جائیگا؟

مسٹر مورلے کی اسپیچ کے متعلق اگر کسی پہلو سے اطمینان ہو سکتا ہے

تو وہ صرف یہ ہے کہ ان کی یہ سپیچ بھی ویسی ہی لفاظی کا اعلےٰ نمونہ تھی جیسی ان کی تقریریں عام طور پر ہوا کرتی ہیں۔ اس تقریر میں بھی واقعات اور اصلاحات کو ایسا اُلجھایا گیا ہے کہ ان میں سے اصلیت معلوم کرنا دشوار ہے وہ لوگ جو مسٹر مورلے کو مسند وزارت سے پہلے آزادی اور ہمدردی انسانی کا پیغمبر شمار کیا کرتے تھے۔ حیران ہیں کہ وہ مسٹر مورلے جو دوسروں کی کمزوریوں پر ہنستا اور تعجب کرتا تھا۔ آج ہندوستانیوں کے لئے کٹڑ سے کٹڑ ٹوری سے بڑھکر ہے اور ہم ان کی جابرانہ تجاویز کے متعلق تعجب خیز معذرت معمولی تدابیر اصلاح عمل میں لانے سے صاف انکار اور طے شدہ امورات کے لئے زبان بند کرنے کی کوشش کو سوائے نوشتہ تقدیر کے کیا کہہ سکتے ہیں ✣

مسٹر مورلے کی تقریر میں تو ہم کوئی بات قابل تذکرہ نہیں پاتے۔ اور اس لئے اس کے اقتباس کو غیر ضروری خیال کرتے ہیں کیونکہ ہم ابھی کہہ چکے ہیں کہ اس تقریر میں سوائے اُن پرانے الفاظ کے جن پر نیا رنگ وروغن چڑھا ہوا ہے اور جن میں وہ اکثر ہندوستان کو یاد فرمایا کرتے ہیں اور کچھ بھی نہیں۔ اگر مسٹر مورلے نے گذشتہ ایام میں اپنے طرز عمل سے اپنا اعتبار نہ کھو دیا ہوتا تو ممکن ہے کہ ان کے یہ چکنے چپڑے الفاظ سادہ لوح ہندوستانیوں کو پرچا لیتے مگر افسوس کہ اب وہ وقت نہیں کہ کاغذ کے پھول عندلیب قفس کی دل نوازی کر سکیں۔ آپ نے اپنی تقریر میں لارڈ کرزن کو نفرین کہی ہے اور فرمایا ہے کہ "یہ تمام مشکلات لارڈ کرزن کی نفرت انگیز حکومت کی بدولت ہے"۔ ظاہر میں تو یہ الفاظ نہایت دل خوش کن ہیں کیونکہ انتقام قدرتی ہے اور ہندوستانی اپنے دشمن کو جس کے مظالم کو وہ اب تک بھگت رہے ہیں اپنے

اعمال کی سزا پاتے دیکھکر خوش ہونگے مگر جب ہم مسٹر مورلے کے اپنے طرز عمل کی طرف خیال کرتے ہیں تو ہمیں سخت مایوسی ہوتی ہے +

کاش مسٹر مورلے ان الفاظ پر جن سے لارڈ کرزن کو یاد فرمایا گیا ہے خود بھی غور کرتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ جن الفاظ کا استعمال وہ آج کسی دوسرے کے لئے کر رہے ہیں۔ خدا وہ دن نہ لائے کہ کوئی اور بھی کبھی انہیں انہی الفاظ میں یاد کرے۔ اگر لارڈ کرزن نے ان جابرانہ کارروائیوں کو روا رکھا جن سے ہندوستان اور انگلستان کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ اور محبت کی جگہ نفرت نے لے لی تو کچھ تعجب نہیں کیونکہ ہم ان سے کچھ بہتر توقع نہ رکھتے تھے مگر مسٹر مورلے کی ذرا سی کمزوری بھی ان کے لئے کرزن کی نسبت زیادہ بدنامی کا باعث ہے اور ہمیں سخت مایوس کرنے والی ہے۔ ہم ابھی تک مایوس نہیں ہوئے اور اس مبارک وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔ جب آپ اپنی غلطیوں کو سمجھیں اور بہتری کی کوشش کریں +

ڈاکٹر ردر فورڈ جو گذشتہ ایام میں ہندوستان میں دورہ کر رہے تھے اور جنہوں نے کانگرس کے افسوسناک سانحہ کو بچشم خود دیکھا تھا۔ مقام مسرت ہے کہ ان پر ہندوستانیوں کی اس کمزوری کا کچھ زیادہ برا اثر نہیں ہوا۔ اور ان میں ابھی تک ہندوستان کی بہتری کی امید زندہ ہے۔ اگرچہ سورت کا واقعہ کبھی دل سے بھولنے والا نہیں مگر ہمیں ڈاکٹر صاحب کی مثال سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔ اور ان واقعات کو بھلا کر متحد ہونے کی کوشش کرنی چاہئے۔ جو لوگ فلاح ملک کے مبارک مشن کا بار اپنے کندھوں پر اٹھاتے ہیں۔ ان کے لئے یہ دشواریاں بالکل معمولی ہیں اور وہ کبھی

مایوس نہیں ہوا کرتے۔خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔غرض یہ ہے کہ محبان ہند اب بھی ہماری بہتری کی کوششوں میں سرگرم ہیں اور ہمیں اپنی حالت جلد ایسی بنا لینی چاہیئے۔کہ ان کے حوصلے پست نہ ہوں۔ اور ان کے ارادوں کو تقویت پہنچے +

ڈاکٹر صاحب نے ایک نہایت موثر تقریر کی اور ہماری شکایات کی ایک طویل فہرست پیش کی جو بقول ڈاکٹر صاحب باوجود طویل ہونے کے مکمل نہیں کہی جا سکتی۔آپ کی اسکیم ہندوستان کے طرز حکومت کے متعلق یہ تھی۔کہ

(۱)۔ ہر ایک صوبہ کی ایک پارلیمنٹ ہو جس کے ممبر براہ راست انتخاب کیئے جائیں +

(۲)۔ ان تمام پارلیمنٹوں کی حاکم ایک امپیریل ڈیوما ہو +

ڈاکٹر صاحب نے ہوس آف کامنز کو یہ جتا دیا کہ ہندوستان کی شکایات کی تلافی صرف اسی طریقہ سے ہو سکتی ہے۔اور اب وقت ہے کہ اس طریقہ کو عمل میں لایا جائے۔اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ فرمایا وہ بالکل درست ہے اور کوئی دانشمند بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا مگر یکایک اس قدر انقلاب پیدا کرنا ذرا دشوار ہے۔اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر آپ اس درجہ انقلاب انگیز سکیم پیش نہ کرتے تو ممکن ہے کہ آپ کی تقریر زیادہ موثر ہوتی +

سر ہنری کاٹن صاحب نے بھی ایک نہایت موثر تقریر کی جس کی تعریف مسٹر مورلے صاحب نے بھی کی ہے۔ان تقریروں میں جو بات امید دلانے والی ہے وہ صرف یہ ہے۔کہ جو تجاویز زیر غور ہیں ان سے کسی قدر

بہتری کی اُمید کی جاسکتی ہے۔ اگر تقریریں صرف لفاظی ثابت نہ ہوئیں اور محبان ہند کی کوششیں رائگاں نہ گئیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندستانی اسی قدر اصلاح کو غنیمت جانیں گے +

(۱)۔ مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹی +

(۲)۔ وائسرائے کی انتظامی سلطنت میں ایک ہندوستانی ممبر کی تقرری +

(۳)۔ علحدگی جوڈیشل و انتظامی اختیارات +

تجویز اول کے متعلق مسٹر مورلے صاحب نے جو اعتراض کیا ہے یقیناً اس کے خلاف توقع نہ کی جاسکتی تھی۔ کیونکہ وہ بالکل اپنی خصلت کے موافق رہے ہیں آپ فرماتے ہیں کہ تجربہ کار منتظموں کی جماعت کا ہونا معلوم! حالانکہ مسٹر مورلے بخوبی جانتے ہیں کہ پارلیمنٹ میں ہندوستانی معاملات میں دلچسپی لینے والوں کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ اگر معاملات ہند سے واقفیت نہ ہو تو وہ تحقیقات کر سکتے ہیں۔ ایک اسی قسم کا اور اعتراض آپ کی نکتہ رسی کا پتہ دیتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ آپ کہاں تک واقعات کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ کا اعتراض ہے کہ حکام کو اپنے فرائض منصبی سے ان معاملات کی طرف متوجہ ہونے کے لئے کافی وقت نہ ملیگا۔ کیا خوب +

مدتوں سے تجاویز پیش ہوتی ہیں۔ اور امیدیں دلائی جاتی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ موجودہ تجاویز کیا ہمارے لئے حقیقت میں کوئی بہتری ہے یا ایک خواب ہے جو ایک عرصہ کے بعد ہمیں وہیں چھوڑ دے گا۔ جہاں سے ہم چلے تھے +

تاجروں کو مژدہ

(نرخ نامہ اجرت

طبع اشتہار آزاد لاہور)

اگرچہ جو اجرت اشتہار اب تک سوداگر صاحبان سے چارج کی جاتی رہی ہے وہ زیادہ نہ تھی۔ لیکن اب بعض تاجروں کے اصرار سے اس میں تخفیف کے ساتھ نرخ نامہ پیش کر کے عرض کرتے ہیں کہ آپ اشتہار کی خواست کریں کیونکہ یہ بہت بڑی رعایت ہے

جگہ	سالانہ	ششماہی	سہ ماہی
صفحہ	۲۵ [illegible]	۱۳ [illegible]	[illegible]
نصف صفحہ	۱۳ [illegible]	[illegible]	[illegible]
چوتھائی صفحہ	[illegible]	[illegible]	[illegible]

متفرق بحساب ۲ فی سطر فی اشاعت کے حساب سے درج ہونگے۔

نوٹ سرورق پر اشتہار دینے کی صورت میں دس فیصدی زیادہ اجرت لیجائیگی

نوٹ ۲۔ رسالہ لفافہ کی پشت جسمیں آزاد بند ہو کر روانہ ہوتا ہے سالانہ۔ ششماہی۔ سہ ماہی بالترتیب بیس۔ بارہ۔ اور سات روپیہ

المشتہر

منیجر رسالہ آزاد سوتر منڈی لاہور

آزاد کے معاونین کو نئے سال کا نادر تحفہ

ذیل میں دو فارم خریداری آزاد درج کئے جاتے ہیں جو صاحبان انکے ذریعہ سے پندرہ دن کے اندر آزاد کی خریداری منظور کر لینگے انھیں آزاد کا کانگریس نمبر مفت دیا جائیگا

درخواست خریداری آزاد

جناب منیجر صاحب آزاد

تسلیم میرا نام خریداران آزاد [illegible] میں درج فرما کر ممنون

بذریعہ [illegible]

نوٹ - جس [illegible] باقی سب الفاظ متعلقہ قسم کاغذ کاٹ دیجئے

درخواست خریداری آزاد

جناب منیجر صاحب آزاد

تسلیم میرا نام خریداران آزاد کاغذ قسم اول - دوم - سوم میں درج فرما کر ممنون

بذریعہ منی آرڈر / وی پی وصول کر لیجئےگا

دستخط

پتہ مفصل خوشخط

نوٹ - جس قسم کے کاغذ کا رسالہ مطلوب ہو اسکے سوا باقی سب الفاظ متعلقہ قسم کاغذ کاٹ دیجئے

نئی صدی کی نئی تصنیف

اردو شاعروں کا بسیط اور جامع تذکرہ

یہ سب کو معلوم ہے کہ وقتاً فوقتاً اردو زبان کے شاعروں کے تذکرے لکھے جاتے رہے ہیں جن میں شعراء کا کچھ کلام اور کچھ حال درج ہے۔ مگر پچھلے تذکرے اس وقت نکلے وہ تقریباً سب ہی خاص وضع کے تھے انمیں سے ایسا کوئی نہ تھا کہ جو اردو شاعروں کے اس بڑے ذخیرہ کا پتہ دے سکے کہیں صرف انتخاب دواوین پر زور تھا کسی میں صرف طرحی یا ہجو سے کام لیا گیا تھا۔ کوئی تذکرہ محض خاص حیثیت کے شعراء سے مخصوص تھا۔ کوئی خاص شہر یا صوبہ سے متعلق تھا۔ اردو شاعری کے شائقین کو لالہ سری رام صاحب ایم۔ اے۔ کا صمیم قلب سے مشکور رہنا چاہیے کہ انھوں نے اس اہم ضرورت کو پورا کیا۔ اور کئی برس کی محنت شاقہ اور صرف کثیر سے ایک جامع اور بسیط تذکرہ اردو شعراء کا تالیف فرمایا جو شعراء کی کثیر تعداد۔ اور ان کے حالات اور سوانح عمری کے مندرجہ حال کی تکمیل مختلف اصناف کلام کے بامذاق انتخاب طرز کلام پر مبصرانہ تنقید اور دیگر اوصاف میں بے نظیر ہے یہ تذکرہ ۲۲×۲۹ تقطیع کے قریباً تین ہزار صفحوں پر ختم ہوتا ہے۔ بالفعل تذکرہ ہزار داستان یا خمخانۂ جاوید کی اول جلد جو الف سے تک ردیفوں پر مشتمل ہے طیار ہوا چاہتا ہے صرف چند صفحے باقی ہیں کاغذ نہایت عمدہ اور لکھائی چھپائی اول درجہ کی ہے جلد بھی نہایت نفیس ہے درخواستیں ابھی سے دھڑا دھڑ آرہی ہیں خوف ہے کہ شائقین ناکام نہ رہ جاویں اسلئے اعلان کیا جاتا ہے کہ جو صاحبان مذاق اس تذکرہ کو خریدنا چاہیں وہ صاحب مولف کے پاس بہت جلد درخواست خریداری بھیجدیں۔ ایسا نہ ہو کہ سستی سے مایوسی اوٹھانی پڑے قیمت کاغذ اعلیٰ بلغ عہ قسم دوم للعہ دونوں قسم کے خریداروں کو مجلد کتابیں بھیجی جاینگی محصول ڈاک علاوہ

ہندوستان کے ہم اہل ہندوستان ہمارا

بندے ماترم — بندے ماترم

سوراجیہ

قیمت سالانہ عا معہ محصول ڈاک — نمونہ کا پرچہ مفت

اردو کے کثیر الاشاعت اخبار ہندوستان کے سابق ایڈیٹر مہاشیہ ناراین کی پرزور قلم سے ہر سنیچر کو پریاگ (الہ آباد) سے نکلتا ہے +

دنیا کیا کہتی ہے

سوراجیہ سودیشی اور بائیکاٹ سوراجیہ کی اغراض ہیں اور وہ اپنی اغراض کو خوبی سے نبھا رہا ہے۔ سوراجیہ ہر پہلو سے سرپرستی اور صدا افزائی کے قابل ہے (آریہ گزٹ لاہور) +

یہ پرچہ ملک اور قوم کیلئے بہت کچھ مفید ثابت ہوگا۔ بشرطیکہ ملک و قوم بھی اس کی قدر افزائی کرے۔ سوشیل و پولیٹیکل معاملات پر نہایت آزادی سے بحث کرنا اس کا فرض ہے (سیاحی اخبار بنارس) +

اہل پنجاب ہمارے دوست کے زور قلم سے اچھی طرح واقف ہیں اس لئے کسی مزید تعریف کی ضرورت نہیں (آزاد لاہور) +

اخبار بظاہر ہونہار ہے اور ملکی مذاق پر نظر کرتے ہوئے اس کی کامیابی بھی یقینی ہے (اصلاح سخن لاہور) +

مضامین بہت عمدہ اور خیالات آزاد ہیں۔ پولیٹیکل مسایل پر مناسب معقول بحث ہوتی ہے (منشور امرتسر) صوبجات متحدہ میں اس سے بہتر اور کوئی دوسرا اردو پرچہ اس وقت موجود نہیں (اردوئے معلےٰ علیگڈھ) +

ان صوبجات میں دیسی اخباروں کی عام رائے کے قومی بنانے میں ہم کو سوراجیہ سے پوری مدد ملے گی (ہندوستانی لکھنؤ) +

شکریہ

خدا کا شکر ہے کہ آزاد نے اپنی زندگی کے دوسرے سال میں بخیر وخوبی قدم رکھا اور یہ تیسرا نمبر حاضر خدمت ہوتا ہے۔ نئے سال اور آزاد کے مقاصد کی کامیابی کی مبارکباد کے خطوط کا شکریہ میں فرداً فرداً ادا نہ کرسکا اگرچہ میں ایسا کرنا چاہتا تھا مگر بُرا ہو عدیم الفرصتی کا کہ میں اس مبارک فرض کو جسے میں موجب فخر سمجھتا ہوں انجام نہ دے سکا۔ میں احباب سے معافی چاہتا ہوں اور اب صرف اس قدر عرض کرتا ہوں کہ میں کیا اور میری خدمات کیا۔ آزاد آپکا۔ کوششیں آپ کی پھر کامیابی کیونکہ نہ ہو۔ آپ کی کوششیں آزاد کی کامیابی کا باعث ہیں اور اس کے لیے میں شکریہ کے کافی الفاظ نہیں پاتا۔ معزز معاصرین کا شکریہ ادا کرنا بھی میرا فرض ہے۔ جنہوں نے حوصلہ افزا الفاظ میں آزاد کے مقاصد سے ہمدردی ظاہر کی +

تاخیر اشاعت کی بے اطمینانی کی بدولت میں اپنے احباب کے دلچسپ خطوط اور ان احباب کے اسمائے گرامی جنہوں نے توسیع اشاعت میں مدد کی درج آزاد نہیں کرسکا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ ناگوار سلسلہ تمام ہوا آیندہ یہ خطوط اور احباب کے اسمائے گرامی زینت اوراق آزاد ہونگے +

خدا آپ کی ہمت میں برکت - اور مجھے آپ کی خدمت کی توفیق دے +

خیر اندیش لشن سہائے آزاد مالک ایڈیٹر

Sir. W. Wedderburn.

C. S. P.

آزاد

قیود ذات اور ملکی ترقی

از رائے پربھو لعل صاحب بی - اے

جنوری نمبر میں ہمارے محترم دوست کا ایک مضمون "ملکی ترقی اور تفریق مذاہب" کے عنوان سے درج ہو چکا ہے - اُسی سلسلہ میں یہ دوسرا مضمون عنایت فرماتے ہیں - حقیقت میں یہ ایک نہایت ضروری مسئلہ ہے جس پر ہمارے دوست نے بڑی قابلیت سے روشنی ڈالی ہے - ایڈیٹر

سابق کے مضمون میں یہ بتایا جا چکا ہے - کہ اختلاف مذاہب جو مانع اتحاد و باعث نفاق ہو رہا ہے اور جس کی وجہ سے ہم ملکی بہی خواہی کے اپنے خیالات کو ترقی نہیں دے سکتے - اُس کا مذموم اثر کس طرح دور کیا جا سکتا ہے - اب دیکھنا چاہیئے کہ اس ملک میں جو تفریق ذات اور قوم کی پائی جاتی ہے - اور جو اختلافِ مذاہب سے بھی زیادہ اُس میل وجول کے مانع ہے جو ملکی بہبودی کے لیئے ضرور ہے اُس کے مذموم اثر کو ہم

کس طرح مٹا سکتے ہیں - کیونکہ یہ تو کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ یہ تفریق ذات و قوم مٹ جائیں - اور یہ ضرور تسلیم کرنا ہوگا کہ جس طرح اختلافات مذہب مٹ نہیں سکتے - اسی طرح اختلافاتِ ذات و قوم کا بھی مٹنا محال ہے - کیا اہل یورپ اور کیا اہل ہند جو اپنے کو ملک ہند کے بہی خواہ سمجھتے ہیں ہمیشہ یہی کہتے آئے ہیں کہ باشندگان ہند میں باہمی نفاق کا باعث یہی تفریق ذات و قوم ہے اور چاروں طرف یہی شور و غل سنا جا رہا ہے کہ ہندوؤں کو اُن کی اسی تفریق ذات و قوم نے تباہ کر دیا - اب دیکھنا چاہئے کہ یہ الزام کہاں تک صحیح ہے - ہندوستان میں ورن آشرم یعنی تفریق ذات کی بنا کس طرح پڑی اس کی تاریخ لکھنا یہاں ہمارا مقصود نہیں - ہم تو صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ جس طرح ہم اس تفریق ذات کو نبھا رہے ہیں وہ اپنا کیا اثر ہندو سوسائٹی پر ڈال رہی ہے - اس تفریق ذات کی وجہ سے ہندوؤں کو خواہ جو کچھ نقصان پہنچے ہوں خواہ وہ خیالی ہوں اور خواہ اصلی مگر اس سے انکار نہیں جا سکتا کہ اسی نے ہندو قوم کو اپنی قدیم حالت پر قایم رکھا - اگرچہ وہ حالت پہلے کی نسبت اب کسی قدر گری ہوئی کیوں نہ ہو - جب وہ آپس میں ہی بٹے ہوئے ہیں اور کھانے پینے میں ایک دوسرے سے پرہیز کرتے ہیں تو اُس زمانہ میں جبکہ غیر قوموں اور غیر مذہب کے لوگوں نے اس ملک پر حملہ کیا وہ اس تفریق ذات کی وجہ سے ہی اُن غیر قوموں و غیر مذہب کے لوگوں کے ساتھ باہمی خورد و نوش وغیرہ کے تعلقات پیدا کرنے سے بچے رہے جن تعلقات کا اثر ضرور اُن کے مذہب اور اُن کے طرز معاشرت پر پڑتا اور اس کا وہی نتیجہ ہوتا جو دیگر ممالک مثل ایران وغیرہ کا ہوا -

جہاں کے اصلی باشندے اپنی پرانی حالت پر باقی نہیں رہے ہیں ۔ اس تفریق ذات کا فائدہ ہندوؤں کو ایک طرح اب بھی محسوس ہو رہا ہے ۔ کیونکہ اُس سلوک کے لحاظ سے جو فاتح قوم کے لوگ اب اُن کیساتھ کر رہے ہیں اُن کے لئے ذات کا بھی ایک عزہ باقی رہ گیا ہے جس پر ست وہ کبھی ادل بدل کر اپنی نفرت کا اظہار کر سکتے ہیں مگر مقام افسوس کا ہے کہ اس نفرت کے خیال کو بھی ہمارے رفارمر اب مٹا دینا چاہتے ہیں ۔ کسی سے نفرت کرنا ہمارے مذہب میں ہرگز جائز نہیں ہو سکتا ہے لیکن جب اور طرح ہم کو قدرت حاصل نہیں ہے تو نفرت کا جواب نفرت سے ہی دیا جا سکتا ہے ۔ غرض کہ ایک طرح یہ تفریق ذات ہمارے لئے مفید ہے اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپس میں یہ نفرت کیوں ! آپس میں کشمکش اور کنارہ کشی کیوں اشودر اور برہمن کا یہ جھگڑا کیوں ! ایک دوسرے سے آپس میں ایسی نفرت اور ایسی کنارہ کشی پہلے کبھی نہ تھی جیسی کہ اب دیکھی جاتی ہے ۔ شودر اور برہمن کا یہ امتیاز پہلے اگر تھا تو کسی اور وجہ سے تھا یا کسی اور اصول پر مبنی تھا ۔ اگر جیسا کہ حال کے مورخ کہتے ہیں یہ مان لیا جائے کہ آرین لوگ باہر سے آکر یہاں کے قدیم باشندوں کو مغلوب کر کے اس ملک میں آباد ہوئے ہیں تو یہ امتیاز اُس غرور کی بدولت تھا جو ایک فاتح قوم کے لوگوں کو ہوا کرتا ہے اور جس کی وجہ سے ہی وہ مفتوحہ قوم کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ۔ اور اگر یہ مانا جائے کہ نہیں ابتدا سے ہی سب یہاں کے باشندے ہیں تو یہ امتیاز برہمن اور شودر کا برہمنوں کے تقدس اور شودروں کے عدم تقدس پر مبنی تھا ۔ برہمنوں کو یہ تقدس صرف اُن کی علمی و روحانی فضیلتوں کی

وجہ سے حاصل تھا وہ نہایت پاک زندگی بسر کرتے تھے برخلاف اس کے شودروں کی ایسی حالت نہ تھی۔ چونکہ پاک زندگی بسر کرنے کے لئے پاک خیال پاک کلام اور پاک افعال کا ہونا نہایت ضرور ہے اس لئے ایسی صحبتوں سے بچنا لازم تھا۔ جو پاک زندگی بسر کرنے کے مانع ہوں۔ اُس زمانہ میں شودروں کی حالت بالعموم ایسی نہ تھی کہ اُن کی صحبت سے پرہیز نہ کیا جاتا اور اگر فرضاً کوئی ایک شودر یا چند شودر پاک زندگی بسر کرنیوالے تھے بھی تو اُن چند نفوس کے لئے عام قاعدہ توڑا نہیں جا سکتا تھا کیونکہ جیسی کہ ضرب المثل ہے مستثنیات سے کلیہ کی تائید ہوتی ہے لیکن اب وہ حالت باقی نہیں رہی ہے۔ زمانہ کے انقلاب نے اور ہی کچھ حالت پیدا کر دی ہے۔ برہمن اب فاتح قوم نہیں رہے۔ بلکہ وہ خود کسی اور کے مفتوح اسی طرح ہیں جیسے کہ شودر ہیں۔ اور اس لئے پولٹیکل حالت کے لحاظ سے دونوں میں مساوات ہے۔ مذہبی تقدس کی نگاہ سے اگر دیکھا جائے تو پہلی حالت میں بہت کچھ انقلاب ہو گیا ہے۔ نہ برہمن اب ویسے مقدس رہے جیسے کہ وہ تھے۔ اور نہ شودر اب ایسے ذلیل ہیں جیسے کہ وہ پہلے تھے زمانہ کی بدلی ہوئی حالت میں کیا اب یہ مناسب نہیں ہے کہ برہمن اور شودر کا یہ جھگڑا ہمیشہ کے لئے مٹا دیا جائے۔ اس سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ برہمن شودروں کے ساتھ ایک چوکے میں بیٹھ کر کھانا کھائیں یا باہم رشتہ مناکحت جوڑیں۔ مذہبی معاملہ میں ہر ایک کو اختیار ہے جیسا چاہے رہے۔ گو یہ اصلی مذہب نہیں ہے یہ تو بقول سوامی وویکا نند مذہب کو رسوئی خانہ میں لے جانا ہے۔ خورد و نوش یا ازدواج کے معاملہ میں وہ انتیاز جو ضروری ہو باقی رکھا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ معقول حد

کے اندر رہے کیونکہ یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ کھانے پینے یا ازدواج کا یہ
پرہیز کسی خاص نفرت پر مبنی نہیں ہے بلکہ ایک ایسے خیال پر جو کچھ بیجا
نہیں کہ جس کسی کا مقصود پاک زندگی بسر کرنے یا اپنی نسل کو پاک رکھنے
کا ہو اُس کو اس امر کا لحاظ ضرور رکھنا چاہیئے کہ وہ کس کے ہاتھ کا کھانا
کھائے اور کس کے ہاتھ کا نہ کھائے۔ یا کس کے ساتھ مناکحت کرے اور
کس کے ساتھ نہ کرے۔ میں یہ بھی نہیں کہتا ہوں کہ ان شودروں کو نہ
رگ سنگھتا یا یجر سنگھتا پڑھاؤ۔ ان مقدس کلاموں کو پڑھنے یا سننے کے
لائق تو اب اعلےٰ قومیں بھی نہیں رہی ہیں۔ پھر شودر تو کیسے ان کو پڑھنے
یا سننے کے لائق سمجھے جا سکتے ہیں۔ شاستر کی مریاد برابر قایم رکھو مگر
جب یہ مقدس کلام نہایت پرانی ویدک زبان میں ہونے کی وجہ سے
خود برہمنوں کے لئے مقفل ہو رہے ہیں۔ تو عام طور پر یہ دوسروں
کے لئے تو اور بھی زیادہ مقفل ہیں۔ ہم اپنی موجودہ حالت میں جبکہ
ہماری روحانی حالت اس قدر گری ہوئی ہے ترجموں کے ذریعہ سے
ہی ان کلاموں کے معنے کو پہنچ سکتے ہیں۔ ان سب باتوں کے لحاظ
سے ہمارے لئے مناسب یہی ہے کہ جس طرح بھگوان بدھ نے دیوبانی
کو چھوڑ کر پالی زبان میں جو اُس وقت کی عام بول چال تھی اپنی تلقینات
کو عوام میں پھیلایا تھا اُسی طرح ہم کو بھی چاہیئے کہ ویدوں کے تلقینات
کی جو اصلی روح ہے اُس کو لیکر ہم ایک نئے طور پر آج کل کے طرز
بیان سے ملتے جلتے مضامین کے پیرایہ میں اُن تلقینات کو اپنی
اپنی بھاشا کے ذریعہ سے کیا اعلےٰ اور کیا ادنےٰ سب قوموں کو پہنچائیں
ایسا کرنے میں اُن مقدس کلاموں کی توہین بھی نہیں ہوتی ہے۔

اور یہی اُن کے تلقینات کا جو مقصد ہے وہ سب کو بالحاظ قومیت وغیرہ
کے پہنچ بھی جاتا ہے۔ اسی طرح عمل کرنے سے کل اقوام پر یعنی کیا اعلےٰ
اور کیا ادنےٰ سب پر وید کی تعلیم پہنچائی جا سکتی ہے اور پھر مقدس کتابوں
کی بے حرمتی بھی نہیں ہوتی ہے۔ اور برہمن اور شودر کا جھگڑا بھی پاک
ہو جاتا ہے۔ لیکن گو ہم ایک شودر کو برہمن کا مرتبہ نہ دے سکیں لیکن تاہم ہم کو
یہ بھی نہ چاہئے کہ اُس کو ہم ذلیل ہی رکھیں ہم اُس سے نفرت کریں۔ اگرچہ
چاروں ذاتوں میں آپس میں یہ تفراب بہت کچھ جاتا رہا ہے اور برہمن اور
شودر بلحاظ اپنی دنیوی حیثیت کے بلا روک ٹوک اب میل جول کر رہے
ہیں۔ لیکن جو شودروں سے بھی نیچی قومیں ہیں یعنی دھربیئے۔ چمار۔ ڈوم۔
چنڈال وغیرہ اس کے متعلق ہی ہمارے رفارمروں کا خاص شور و غل
ہے۔ اور یہ شور و غل کچھ حد تک بجا بھی ہے۔ کیونکہ ان نیچ قوموں کے
ساتھ اعلےٰ قومیں جو نفرت کا اظہار کرتی ہیں۔ اُس کا نہایت مضر اثر پڑ رہا ہے
یہی وجہ ہے کہ یہ قومیں ایک طرح کی دنیوی عزت حاصل کرنے کے لئے دوسرے
مذاہب کا سہارا ڈھونڈ رہی ہیں اور جب وہ اس طرح اپنی کایا پلٹ کر لیتی
ہیں تو پھر وہ اعلےٰ قومیں اُن کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ کرنے لگتی ہیں کہ
گویا اُن سے کبھی نفرت ہی نہیں کی جاتی تھی۔ جنوبی ہند کے اکثر قصبوں
میں نیچ قوموں کے ساتھ اعلےٰ قوموں کی یہ نفرت اس حد تک کو پہنچی
ہوتی ہے کہ نیچ قوم کے لوگ اُن گلیوں میں جہاں برہمنوں کے مکان
ہوتے ہیں آنے نہیں پاتے۔ لیکن اگر ان میں سے کوئی تبدیل مذہب
کر کے یعنی عیسائی ہو کر وہاں آئے تو پھر کس کی مجال ہے کہ اُس کو
وہاں آنے سے روکے۔ بلکہ اگر وہ کوئی سرکاری عہدہ دار ہے تو وہ

یا اروک ٹوک اُن کے گھروں میں بھی داخل ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت
میں اُن لوگوں سے جو نیچ قوموں سے نفرت کرتے ہیں ہمارا یہ سوال ہے
کہ جب آپ اپنی نفرت کے خیال پر قابو نہیں رہ سکتے تو پھر ایسی نفرت
سے فائدہ کیا۔ جیسی نفرت آپ کرتے ہیں وہ تو کسی حال میں آپ کو زیب
نہیں دیتی پھر زمانہ کی بدلی ہوئی حالت میں تو اور بھی آپ کو نفرت کے
ایسے خیالات سے قطعاً حذر کرنا چاہیئے۔ لہذا انعافات خورد و نوش و مناکحت
کو چھوڑ کر باقی اور طرح سے ہمارے لیئے مناسب یہی ہے کہ امتیازات
ذات و قوم کو بالکل نکال دیں۔ اور ملک کے فائدہ کے لیئے کاموں کے
کرنے میں ہم کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ ہمارا پیشوا لیڈر کوئی برہمن ہے یا
شودر ہے۔ اگر ان کاموں میں کوئی شودر ہمارا پیشوا ہے تو ہم کو اگرچہ برہمن
یا چھتری یا ویش ہیں لازم یہ ہے کہ ہم اُس کو ویسا ہی اپنا بزرگ اور ہادی
سمجھیں جیسا کہ ہم اپنے گرو یعنی مرشد کو اپنے دینی معاملات میں اپنا ہادی سمجھتے ہیں۔

اب اُن لوگوں کی حالت پر نگاہ کرنا چاہیئے جو چنداں کسی اعلے
روحانی پرہیزگاری کے خیال سے نہیں بیٹھے ہوئے ہیں بلکہ جو محض
اپنی اعلے ذات کی بنا پر ہی پرہیز کرتے ہیں وہ خود تو کسی اعلے
روحانیت کے خیال سے پرہیزگار نہیں ہیں۔ مگر ظاہری پرہیزگاری کے
مدعی ہیں۔ اور محض اپنی اونچی ذات کے گھمنڈ سے اُن لوگوں سے جو
کھانے پینے کے معاملہ میں یا اور طرح پرہیز کرتے ہیں جو ذات میں گو
اُن سے نیچے ہیں مگر جن میں روحانی پرہیزگاری شاید اُن سے بڑھ کر
ہو۔ پھر کچھ ایسے لوگ ہیں جو محض لکیر کے فقیر ہیں کیونکہ اُن کے آبا
اجداد نے ایک طریقہ اختیار کیا تھا۔ اور وہ اُس پر مجبوری چل رہے

ہیں اور اُس کو چھوڑ نہیں سکتے - ایسے لوگوں کے متعلق ہماری کوشش ہونی چاہیئے۔ کہ یہ تفریقیں جہاں تک ممکن ہو اگر بالکل مٹ نہ سکیں تو کم تو ضرور ہو جائیں +

میں نے اس مضمون میں ارتھوڈاکس اور رفارم پارٹی دونوں کے لیئے ایک بین بین طریقہ بتایا ہے۔جس پر اگر عمل کیا جائے تو باہمی تعصب اور اختلاف ایک بڑی حد تک دور ہو سکتا ہے۔ اگرچہ بھگوان بدھ کا ایسا خیال نہ تھا مگر اُس کے مقلدوں نے رفارم کے جوش میں قدیم بنی ہوئی عمارت کو جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دینا چاہا اور اس میں اُن کو جیسی کامیابی اس ملک میں حاصل ہوئی وہ تاریخ سے ظاہر ہے یعنی یہ کہ اُن کو بالکل شکست نصیب ہوئی اور اُن کے مذہب کا اب یہاں نام و نشان بھی نہ رہا۔ حال کے پرجوش رفارمروں کا بھی ایسا ہی خیال ہے چنانچہ انہی لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر سوامی وویکانند یہ کہتے ہیں:-

"وہ جو بنی ہوئی عمارت کو توڑ کر از سر نو بنانا چاہتے ہیں۔
کوئی حقیقی فائدہ دنیا کو نہیں پہنچاتے!"

ہم کو اپنی کوششوں میں بھگوان شنکراچارج کے اعلےٰ دماغ کے نتائج سے جہاں از روئے تعین تمام امتیازات جائز ہیں مگر از روئے حقیقت سب جانداروں میں یعنی کیا مرغی اور کیا چنڈال میں آتما کا یکساں جلوہ ہے - اور بھگوان بدھ کے وسیع رحم سے جو ادنےٰ جانور کے لیئے بھی ظاہر ہوا تھا۔ کام لینا چاہیئے - اور پھر بھگوان شنکراچارج کے اس اصول پر بھی نگاہ رکھنی چاہیئے۔ کہ اگر کوئی اصلی رفارم ہو سکتا ہے تو وہ وید و شاستر کے ہدایات کو قایم رکھ کر ہی ہو سکتا ہے - نہ کہ اُن کو

کائیستھ کانفرنس - ویش کانفرنس - کھتری کانفرنس وغیرہ وغیرہ ہندوستان
تو پہلے ہی سے مذہبی اور ذاتوں کی تفریق میں منقسم ہو رہا ہے مگر اب ان
کانفرنسوں کی بدولت اُس میں ایک اور نئی تقسیم پیدا ہو گئی ہے - ہر
کانفرنس اپنی اپنی قومی ترقی اور قومی ہمدردی کی صدائیں بلند کر رہی ہے
ان کانفرنسوں کو ضرور اپنے اپنے مقاصد کو پورا کرنا چاہیے - مگر ان
مقاصد کے پورا کرنے میں اس امر کو ضرور ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ایک
جماعت کے اغراض دوسری جماعت کے اغراض کے ساتھ نہ ٹکرائیں
بلحاظ مذہب ہونے یا بلحاظ ہمسائگی جو تعلقات ایک جماعت کو دوسری
جماعت کے ساتھ ہیں اُن تعلقات کو مدنظر رکھ کر ہی ہر ایک جماعت
کی کانفرنس کو کام کرنا چاہیے - جب اس کے خلاف عمل ہوتا ہے تو ایک
جماعت کو دوسری جماعت کے ساتھ شکر رنجیاں پیدا ہوتی ہیں اور
رنجشیں بڑھتی ہیں - ہندو سوسائٹی مثل ایک جسم کے ہے جس کا منہ
برہمن بازو چھتری - کمر ویش اور پانوں شودر قرار دئے گئے تھے - شیخ
سعدی شیرازی فرماتے ہیں +

قطعہ

بنی آدم اعضائے یکدیگر اند — کہ در آفرینش زیک جوہر اند
چو عضوے بدرد آورد روزگار — دگر عضوہا را نماند قرار

ظاہر ہے کہ اگر ایک عضو کو کوئی تکلیف ہو گی تو اُس کا اثر ضرور
دوسرے اعضا پر بھی پڑے گا - لہذا یہ سمجھ کر جسم تو ایک ہے گو بلحاظ
اعضا جدا جدا ہیں - ہر جماعت کو وہ کام کرنے چاہئیں جن سے دیگر

جماعتوں کو نقصان نہ پہنچے۔ کیونکہ پھر اُس کا اثر اُلٹا اُنہیں پر پڑے گا اس اصول کو مدنظر رکھ کر اگر کام کیا جائے تو ہر جماعت اپنی اپنی ترقی اچھی طرح کرے گی اور دوسروں کو بھی شکایت کا موقع نہ دے گی +

پھر آخر میں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں اپنے رفارم کی دُھن میں اس بات کا ضرور لحاظ رکھنا چاہیئے کہ ہمارا تعلق ہمارے گذشتہ زمانہ کے ساتھ برابر قایم رہے اور اس لئے ایسی کوئی کایا پلٹ کرنیکی کوشش نہ کرنی چاہیئے جس سے کہ ہم بالکل ایک نئی نئی قوم معلوم ہوں۔ اگر ایسی کوئی کایا پلٹ کی گئی تو کچھ عرصہ کے بعد یہ بھی بھول جائے گا کہ ہم کسی عالی شان اور بدرجہ اعلےٰ مہذب قوم کی اولاد ہیں۔ اور کیا تعجب ہے کہ آگے چلکر یہ سمجھا جائے کہ تھوڑے ہی پہلے ہم وحشی یا نیم وحشی تھے۔ اور ہماری موجودہ تہذیب بالکل حال کی ہے بلکہ ہم کو اہل فرنگ نے ہی مہذب کیا ہے نہیں تو افریقہ یا جزائر اوشینیا کے باشندوں کے مثل ہم قطعاً وحشی تھے +

حال اُس پہ کھل گیا جو دلِ بیقرار کا | پاتا نہیں دماغ زمیں پر میں یار کا
دامن رہی کسی کی جو منظور ہو تجھے | کیوں بن نہ جا غبار سرِ رہگذار کا
پژمردگیٔ دل مری جائے یہ ہے غلط | احساں کیا ضرور ہے ابر بہار کا
اس سے کہیں زیادہ ہے گلریزیٔ آہِ دل | کیا دیکھئے تماشہ ہو شاخ چنار کا
چادر چڑھاؤں گل کی مزارِ ہزار پر | گر وصل ہو نصیب کسی گلعذار کا
مجبوریاں ہیں منزلِ الفت میں سدِ راہ | دل پہ نہ اختیار نہ دل اختیار کا
عشرت کدہ میں بیٹھ کے اظہر جو خوش ہوئے | آنکھوں میں پھر گیا وہیں نقشہ فرار کا

اتفاق طاقت ہے

از منشی "نواب رائے" صاحب

ہندوستان میں کسی زمانے میں لوگ اس حد تک آزرم جو تھے
کہ بات بات پر تلواریں چلتی اور خون کی ندیاں بہتی تھیں - پر اب لوگ
ایسے صلح پسند ہو گئے ہیں کہ پتوں کے کھڑکنے سے کان کھڑے ہوتے
ہیں - اور آہ و اویلا مچ جاتی ہے - یہ انگریزی راج کی برکت عظمے ہے
جب سے سورت کانگریس چند کوتہ اندیش محبان وطن کی جابرانہ کارروائیوں
سے درہم ہو گئی ہے - نیشنلسٹ اور ماڈریٹ دونوں فریق ایک دوسرے
کے جانی دشمن ہو گئے ہیں اور ذمہ دار حلقوں سے یہ آواز متواتر سنائی
دیتی ہے کہ اب دونوں فریقوں میں اتفاق ہونا امر محال ہے - یہاں تک
کہ جانبین سے علیحدہ علیحدہ جلسے کئے گئے - اور آیندہ کئے جانے کی تیاریاں
ہو رہی ہیں - ہندوستان اپنی آزاد خیالی اور فراخ دلی کے واسطے ہمیشہ
مشہور رہا ہے - یہ بات اسی ملک میں دیکھنے میں آتی ہے - کہ معمولی
پتھروں کے روبرو سر عقیدت خم کرنے والوں سے لیکر اعلےٰ درجہ کے
آزاد خیال فلاسفر تک سبھی ہندو مذہب کے وسیع انجمن کے ممبر سمجھے جاتے
ہیں - مگر کانگریس باوجود اس کے کہ وہ قیود مذہب سے آزاد ہے دو متشابہ
خیالات کے فریق کو اپنے حلقہ میں جگہ نہیں دے سکتی - اور وہ بھی اس
حالت میں کہ جبکہ دونوں فریق کا اختلاف فروعی ہے - نہ کہ واقعی - ہم
یہ مانتے ہیں کہ اب کی کانگریس میں چند شوریدہ سر نوجوانوں نے بہت غل

مچایا۔ اور قوم کے بعض مسلمہ سرغنوں کو بولنے نہ دیا۔ یہ حرکت اُن کی
سراسر بیجا تھی۔ [illegible] فہم و شعور [illegible] تھی۔ ہم ان بے قاعدگیوں کی حمایت نہیں
کر سکتا۔ مگر ایسی حالت میں اُن حضرات کو جنہیں حب الوطنی کا ادعا ہے۔
خوش ہونا چاہئے تھا آخر کانگریس کے ساتھ نوجوانوں کو بھی دلچسپی
لینے کا شوق تو پیدا ہوا۔ اور انہیں اس کوشش میں اپنی وہی طاقت
صرف کرنی چاہئے تھی۔ کہ کس طرح اس تازہ جوش کا بہترین استعمال
کیا جائے۔ نہ یہ کہ اُسے خس کم جہاں پاک کے مصداق پر یکبارگی علیحدہ
کر دینے کی ضرورت سمجھی جائے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ جب کانگریس
برخاست کی گئی تو سب یا دہان قوم کانگریس کے انتخاب کے متعلق نئی
تجویزیں اور قوانین منضبط کرتے۔ ہر ایک صوبہ اور شہر کو اُس کی آبادی
اور تاجرانہ اہمیت کے لحاظ سے ممبروں کی ایک معین تعداد کے منتخب
کرنے کا حق دیا جاتا۔ اور آئندہ سال کانگریس دو چند آب و تاب کے ساتھ
معہ ہر دو فریق کے ممبروں کے یکجا منعقد ہوتی۔ اس وقت کسی جماعت
کو اس کی شکایت نہ ہوتی۔ کہ ایک فریق نے ایک خاص مقام کے صدہا
ڈیلیگیٹ بھرتی کر دیئے۔ خیالات انسانی میں ہمیشہ اختلاف رہا ہے۔
اور رہیگا۔ یہ قریباً غیر ممکن ہے کہ کل افراد انسانی ایک ہی خیال کے
ہوں۔ دنیا میں جہاں کہیں ایسی قومی جماعتیں ہیں وہاں اختلافات
تو ہمیشہ اعزاز کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس وقت تو اعتدال
پسند فرقہ خوش ہے کہ ہم نے اپنی جماعت کو خس و خاشاک سے پاک
کر دیا۔ اور اب ہم کامل اطمینان سے سال بسال جلسے کرتے رہیں گے۔
مگر کیا یہ لوگ اس بات کا ذمہ لے سکتے ہیں کہ آئندہ اہل اعتدال میں پھر

کسی مسئلہ پر اختلاف نہ ہوگا۔ اور کیا اُس حالت میں پھر کنونیشن کی بھی دو جماعتیں نہ ہو جائیں گی؟ اور کیا یہ سلسلہ نا ختم ہی اُس وقت تک جاری نہ رہے گا۔ جب تک کہ کانگرس کٹ چھٹ کر چند بوڑھے آدمیوں کی ایک منڈلی رہ جائے گی۔

دانشمندوں کا دستور ہے کہ اُن سے جب کوئی غلطی سرزد ہو جاتی ہے تو بہت جلد نادم ہوتے ہیں۔ اور اُس غلطی کو سدھارنے کی فکر کرتے ہیں۔ مسٹر تلک نے سب سے پہلے صلح و آشتی کی آواز بلند کی ہے اور اس کی ضرورت کو تسلیم کیا ہے۔ اس کے برعکس اعتدال پسند جماعت کے رہبر جو کم از کم بے عنوانیوں کے اُسی حد تک ذمہ دار ہیں جس حد تک مسٹر تلک اتحاد کے نام سے گھبراتے ہیں۔ گویا یہ اُن کی کئی ماہ کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ انہیں نہ صرف اپنی غلطی پر افسوس ہے۔ بلکہ اس غلطی کو صحیح کر دکھانے کی کوششوں میں سرگرم ہیں۔ اور کانگرس کی اُس غلطی کو مسٹر بارسے کے قابل یادگار الفاظ میں "طے شدہ امر" سمجھتے ہیں۔ مسٹر تلک سمجھے ہوئے ہیں کہ کانگرس کے باہر اُن کی حیثیت کچھ نہیں۔ مگر مسٹر گوکھلے وغیرہ اس خیال میں بھولے ہوئے ہیں کہ اب ہماری اس حرکت سے خوش ہو کر گورنمنٹ ہم پر اعانت خسروانہ کی بھرمار کر دے گی وہ یہ بالکل بھول جاتے ہیں کہ نیشنلسٹوں کی جماعت چند دنوں سے وجود پذیر ہوئی ہے۔ اُس کے قبل سب لوگ اعتدال پسند ہی تھے۔ اس وقت گورنمنٹ نے اُن کے ساتھ کیا رعایت کر دی تھی۔ خدا نیشنلسٹوں کا بھلا کرے کہ اُن کے شور و غل نے گورنمنٹ کو اعتدال پسند لوگوں کی معروضات پر توجہ کرنے کا وعدہ تو کیا۔ مگر یہ واضح رہے کہ یہ وعدہ اُس وقت ہوا تھا جب دونوں فریق

ظاہرا متحد تھے۔ اور اگر اُن کی علیحدگی کسی اصولی مسئلہ پر خوش مزگی کے ساتھ ہوتی تو ممکن تھا کہ گورنمنٹ اپنے وعدوں کا ایفا کرتی۔ اس خیال سے کہ اعتدال پسند فرقہ نیشنیلسٹوں سے الگ رہتے۔ اور منتشر نہ ہونے پائے مگر اب جبکہ دونوں فریقوں میں بدمزگی پیدا ہوگئی ہے۔ نفسانیت و شخصیت کا زہر اثر کر گیا ہے۔ اور اُن کے متحد ہونے کی بظاہر کوئی اُمید نہیں نظر آتی۔ تو گورنمنٹ کو ایفائے وعدہ کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ کیونکہ اب وہ یہ سمجھے گی کہ یہ دونوں ناچاقی و باہمی منازعت کے جوش میں آپس میں سرد پڑ جائیں گے۔ ہمیں اس کی کیا ضرورت ہے کہ ایک کو دبانے کے لئے دوسرے کی پیٹھ سہلائیں اور تھپکیاں دیں۔ آپ اُسے نیشنلسٹوں کی رفتار کے بڑھنے کا خوف مطلق نہیں رہا۔ کیونکہ وہ حضرات جو اب اعتدال پسند بن رہے ہیں۔ اگر کسی اصول سے نہیں تو محض اکڑ اور خودداری کے خیال سے نیشنلسٹوں کی جماعت سے محترز رہیں گے۔ اور خواہ گورنمنٹ کی جانب سے مایوس بھی ہو جائیں۔ مگر اعتدال پسند بنے رہیں گے۔ کانگرس کو جو وقار اور اعزاز ان گذشتہ دو سالوں میں حاصل ہؤا وہ اس کے قبل کے بیس سالوں میں بھی نہیں ہؤا تھا۔ اور یہ اسی نئی جماعت کا طفیل تھا۔ اب چونکہ دونوں جماعتیں علیحدہ ہوگئی ہیں۔ کانگرس کا گورنمنٹ کی نظروں میں وہی رسوخ اور وقار رہ گیا جو دو برس پہلے تھا۔ وہ حضرات جو اب اس علیحدگی سے خوش ہو کر بغلیں بجا رہے ہیں۔ اور بجائے نادم ہونے۔ اور متفق ہونے کی کوشش کرنے کے اس معمولی دراز کو غار بنانے کی فکر کر رہے ہیں۔ اُنہیں خوب سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ گورنمنٹ کا وعدہ اُسی وقت تک کے لئے تھا جب تک دونوں جماعتیں

ایک تھیں - اُس کا مقصد اب حاصل ہو گیا - اور اُسے گذشتہ بائیں سالوں
سے معلوم ہے کہ ماڈریٹ لوگوں کی عرض داشت کی کیا وقعت کرنی
چاہیئے - اگر مسٹر گوکھلے - بنیرجی - مہتہ وغیرہ واقعی فلاح قوم کے دلدادہ
ہیں تو اُنہیں اتفاق و اتحاد کے اس موقعے کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے -
اور مسٹر تلک کی مثال سے سبق حاصل کر کے گذشتہ باتوں سے درگذر کرنا
چاہیئے - ضبط - ہمت - استقلال اور عفو - یہ حب الوطنی کی پہلی شرطیں
ہیں - جو لوگ اپنے ہی بھائیوں کے شور و غل اور اختلاف سے جھلا کر
جامہ سے باہر ہو جائیں - اور اُنہیں دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینکدیں
وہ اس سے زیادہ نازک مواقع پر قوم کا کیا ساتھ دیں گے - کیا مسٹر بنیرجی
جیسے محب وطن سے یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ اپنے قومی مجمع میں گالیاں
کھانا اور مطعون ہونا اتنا مذموم نہیں ہے - جتنا قوم کے ایک جزو کو یہ
جانتے ہوئے خانہ بدر کرنا کہ گورنمنٹ بہت جلد ان کی ہستی خاک میں
ملا دے گی - وہ دن ہمارے اعتدال پسند بھائیوں کے لئے ڈوب مرنے
کا ہوگا - جب اس باہمی شکر رنجی کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ گورنمنٹ کا سخت ہاتھ
نیشنلسٹوں کی گردن میں ہوگا - اور وہ موقعہ اس سے بھی زیادہ شرمناک
ہوگا - جب نیشنلسٹ لوگ گورنمنٹ کے دست تظلم سے واویلا مچائینگے
اور ہمارے اعتدال پسند بھائی تالیاں بجائیں گے +

آپکی توجہ سے تاخیر اشاعت کا ناگوار سلسلہ ختم ہوا جنوری - فروری کے پرچے نکل
گئے - مارچ کا عین وقت پر حاضر ہوتا ہے گو یا ہم اپنے فرض سے سبکدوش ہوئے لیکن ناظرین!
ضروری یہ ہے کہ آپ بھی توسیع اشاعت میں کوشش کر کے فرض سے سبکدوش ہوں منیجر آزاد

شری امرناتھ جی کا یاترا

از سوامی سیتہ دھاری مہاراج

سری نگر کشمیر سے پرے اٹھاسی میل کے فاصلے پر امرناتھ جی کا استھان واقع ہے۔ پہلگام (Phalgam) تک راستہ اچھا ہے۔ اس سے آگے نہایت سخت اور خراب ہے۔ باربرداری کے لئے مزدور اور پہاڑی ٹٹو بکثرت ملتے ہیں۔ مزدوری یومیہ چار سے آٹھ آنے تک ہے۔ مزدور لوگ اپنے پٹھوں میں ٹٹوؤں سے زیادہ بوجھ اٹھا لیتے ہیں بعض اس بوجھ پر بھی ایک اور لڑکا یا آدمی بٹھلا لیتے ہیں۔ پالکیاں بھی جاتی ہیں۔ مگر ان میں اکثر بیمار اور آرام طلب امراء اور یاتری سوار ہوتے ہیں۔ اگر کہیں چڑھائی اترائی سخت آ جائے تو سب کو پیدل چلنا پڑتا ہے میں اس وقت اپنی سرگذشت اور چشم دید حالات کو دوہرانے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں سری نگر سے دریا جہلم کے راستے کھنہ آباد تک کشتی پر گیا۔ وہاں سے چلکر اننت ناگ پہنچا۔ اور وہاں سے مٹن آیا۔ یہ مقام پڑاؤ کا ہے اور ہر ایک ضروری چیز دستیاب ہو سکتی ہے۔ یاتری لوگ ایک چشمہ کے قریب جو نہایت مصفا اور قابل دید ہے فروکش ہوتے ہیں۔ یہاں سے دوسرے دن روانہ ہوا۔ تو عیش مقام پر جا کر مقام کیا۔ یہ جگہ بلحاظ آب و ہوا کے نہایت اچھی ہے۔ مگر ویسے بالکل ویران اور غیر آبادسی معلوم ہوتی ہے۔ رات کو یہاں آرام کیا اور صبح کو پھر چل پڑا۔ یہاں سے چلکر سیدھا پہل گام کے مقام پر دم لیا۔ یہاں پر یاتریوں کو دو روز تک قیام کرنا

پڑتا ہے۔ تاکہ بھولے بھٹکے۔ نھکے ماندے لوگ قافلہ میں آکر شامل ہو سکیں
یہاں سے آگے چلتے وقت سرکاری حفاظت شروع ہو جاتی ہے۔ قافلہ
کے آگے پیچھے پولیس اور درمیان میں یاتری ہوتے ہیں۔ یہ لوگ تنگ
راستوں میں قطار در قطار آگے بڑھے چلے جاتے ہیں۔ کوئی یاتری واپس
نہیں لوٹ سکتا۔ زائرین میں کثرت تعداد سادھوؤں کی ہوتی ہے۔ اگر
کوئی تھکان یا بیماری کی وجہ سے راستہ میں بیٹھ جائے تو پولیس والے بیٹھنے
نہیں دیتے۔ جو شخص چلنے کے قابل نہ ہو اُس کو اُٹھا کر بھی ساتھ لے آتے
ہیں۔ الغرض بہت ہی کڑی حفاظت ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ راستہ سخت
خطرناک اور غیر آباد ہے۔ نہ کھانے کو اناج نہ جلانے کو لکڑی۔ نہ پناہ لینے
کو کوئی مکان یا بستی نظر آتی ہے۔ اگر کوئی آدمی ان پہاڑوں میں راستہ بھول
جائے تو شاید گھبرا کر مر جائے۔ اِس سے آگے چندن باڑی کا مقام آتا
ہے اور یہیں تک پہاڑوں پر کچھ سبزی وغیرہ دکھلائی بھی دیتی ہے۔
یہاں سے آگے برفوں کے نظارے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ مقام پہاڑوں
کے اندر چاروں طرف سے گھرا ہوُا ہے۔ اور ایک اور عجیب قابل دید منظر
پیش کر رہا ہے۔ اِس سے آگے جھیل شیش ناگ آتی ہے۔ اس کا پانی نہایت
صاف اور ستھرا ہے۔ یہ جھیل ایک بہت بڑے وسیع تالاب کی مانند ہے
جو چاروں طرف سے سربفلک پہاڑوں کے درمیان گھری ہوئی ہے
اور ایک طرف پانی نے خود بخود اپنے نکلنے کا رستہ بنا لیا ہوُا ہے۔ اس
سے تھوڑی دور آگے وایو ورجن کا مقام آتا ہے۔ اس سے آگے پنج ترنی
ہے جو اس سفر کی آخری منزل ہے۔ یہاں پر یاتری لوگ بہتے پانی کے
کنارے اپنی حسب پسند جگہوں پر اپنے خیمے اور چھولداریاں نصب کر دیتے

ہیں۔ یہاں بھی دو دن قیام کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ اس سے آگے چند میل کے فاصلے پر امرناتھ جی کا استھان واقع ہوا ہے۔ رات کو آرام کر کے صبح کے وقت لوگ نہایت مختصر اور ضروری سامان ساتھ لیکر یاترا کی نیت سے زیارت گاہ کی جانب روانہ ہوتے ہیں۔ باقی تمام خیمے اور سامان پولیس کی حفاظت میں رہتا ہے۔ بعض یاتری پہر رات رہتے ہی وہاں سے چل پڑتے اور صبح ہونے سے پہلے امرناتھ جی کے مقام پر پہنچ بھی جاتے ہیں۔ مگر یاترا کر کے فوراً ہی واپس بھی لوٹنے لگ جاتے ہیں۔ اور یہ آمدو رفت کا تانتا قریب دوپہر تک لگا رہتا ہے۔ شام سے پہلے پہلے سب لوگ واپس آچکے ہوتے ہیں۔ پوجاری یعنی چھڑی والے (مہامد) سب سے پہلے وہاں پہنچتے ہیں۔ اور یاتریوں کے پہنچنے سے پہلے ہی سب کچھ وہاں ٹھیک ٹھاک کر چکے ہوتے ہیں۔ درشنوں کے واسطے صرف ایک ہی دن ہوتا ہے۔ اور وہ بھی صبح سے دوپہر تک جو لوگ یاترا کے واسطے جاتے ہیں۔ پہلے اشنان کرتے اور پھر جا کر امرناتھ جی کی زیارت کرتے ہیں زیارت کے بعد پھر اشنان کرنا ہوتا ہے۔ کیونکہ دو دفعہ اشنان کرنے کا فرض بتایا گیا ہے۔ مگر اکثر ایک دفعہ۔ اور بعض سردی کے خوف سے بالکل بھی نہیں کرتے ہیں۔ اور بہت تھوڑے ہوتے ہیں جو اُس برفانی پانی میں دو دفعہ اشنان کرتے ہیں۔ میں کسی قدر رات باقی رہتے خیمہ سے چلا اور اور صبح ساڑھے سات بجے وہاں پہنچا تھا۔ میں نے وہاں چند انگریز اور لیڈیوں کو بھی دیکھا۔ جو صرف بطور تماشائی وہاں آئے ہوئے تھے۔ ایک انگریز نے اُس مقام کی فوٹو بھی لی تھی۔ میں وہاں تین دفعہ نہایا۔ مجھے اُس ٹھنڈے پانی میں نہانے سے ایک خاص قسم کا سرور اور لطف

روحانی حاصل ہوتا تھا۔جس کی تصویر لفظوں میں اُتارنا مشکل ہے۔وہ پانی نہایت شیریں اور شفاف تھا۔اِدھر اُدھر چھوٹے بڑے نالوں کی صورت میں بہ رہا تھا۔بعض بعض جگہوں پر بہتے پانیوں کے اوپر ہزاروں منوں برف جمی ہوئی مثل ایک چھت کے معلوم ہوتی تھی جو بہت دُور دُور تک چلی جاتی تھی۔میں اس کے نیچے ہو کر نہاتا اور بہت خوش ہوتا تھا۔ میرے واسطے وہ جگہ ایک اچنبہ تھی اور بالکل نیا نظارہ تھا۔ایک جگہ میرے پاؤں میں زخم آگیا تھا۔اور میں اس کو بھگونے سے ڈرتا تھا۔کہ کہیں پانی نہ بھر جائے۔مگر بھگونے سے اُلٹا زخم اچھا ہوگیا۔پھر جب کبھی مجھے کوئی ٹھوکر لگتی جو وہاں پتھروں میں معمولی بات تھی اور خون بہ نکلتا تھا میں اُس کو جلدی خواہ دیر جس وقت بھی بھگوتا زخم بہت جلد اچھا ہوجاتا تھا شاید یہ برف کے پانی کی تاثیر تھی۔یا وہ پانی اپنے میں کوئی خاص قسم کی تاثیر رکھتا تھا۔خیر اس کی نسبت تو اطباء ہی کوئی رائے قایم کر سکتے ہیں۔ بعض پہاڑوں کی چوٹیاں عرصہ دراز تک برفوں میں ڈھکی رہنے کی وجہ سے اس طرح جلی سڑی ہوئی نظر آتی تھیں کہ گویا کسی نے ہزاروں سال تک ان کے گرد آگ جلا جلا کر ان کو خاکستر کر دیا ہے۔جس طرح کوئی جست کو مار کر کشتہ کر دیتا ہے۔اُسی طرح اکثر پتھروں کی حالت تھی۔ بعض سفید رنگ پتھر کے ٹکڑے پتھر سمجھ کر ہاتھ میں اُٹھائے جاتے۔مگر ہاتھوں میں دبانے سے سُرمہ کی طرح مہین یا یوں سمجھو کہ میدہ کی طرح پس جاتے تھے۔اسی کو راکھ ہے جس کو یاتری لوگ امرناتھ جی کی بھبوتی کے نام سے نامزد کرتے اور واپس لوٹتے وقت وہاں سے اپنے ساتھ لاتے ہیں۔امرناتھ جی کے مقام پر انسانی ہاتھوں کا بنا ہوا ایک بھی مندر

نہیں۔ صرف ایک پہاڑ کے پہلو میں ایک گفا سی ہے۔ وہ بھی برائے نام
یعنی جس کو ہم مینہ بوندی کے دنوں میں چند آدمیوں کے واسطے جائے پناہ
کہہ سکیں۔ یا یوں سمجھئے کہ کوئی بہت بڑے پھاٹک والا بے قطع وضع ناہموار
سطح کا مکان ہو۔ مگر مدتوں سے بوسیدہ ہو کر ٹوٹ چکا ہو۔ اور اُس کا
کوئی دروازہ نہ ہو۔ اور ویران پڑا ہو۔ یہ اُس مقام یا زیارت گاہ کا نقشہ
تھا۔ اُس کے اندر خاصی ہوا اور روشنی داخل ہوتی تھی۔ اُس میں ایک
برف کی چھوٹی ڈھیری لگی تھی۔ لوگ جس کے درشن کرتے اور اُس پر
نذریں چڑھاتے تھے۔ اُس کے دائیں بائیں دونوں جانب تھوڑے
فاصلہ پر گنیش جی۔ پاربتی اور نندی گن (بیل) کی برف کی تراشی ہوئی
مورتیاں بھی استھاپن تھیں۔ مجاور لوگ تینوں جگہوں پر الگ الگ بیٹھتے
اور نذریں وصول کرتے جاتے تھے۔ اور نذریں تینوں جگہوں پر چڑھتی
تھیں۔ بعض یاتری اُن مورتیوں پر ہاتھ پھیرتے پھر اپنے سر اور آنکھوں
سے چھوتے اور روتے تھے۔ اس کی وجہ تو کچھ معلوم نہیں ہوتی۔ اکثر
نہیں بھی روتے تھے۔ مگر دیکھا دیکھی گنیش جی کے سونڈ وغیرہ پر ہاتھ
ضرور پھیر دیتے تھے۔ گو وہ مقام بہت سرد تھا تاہم جوں جوں وہ ہاتھ
پھیرتے تھے ہاتھ کی حرارت سے برف پگھلتی تھی۔ اور اُن مورتوں کے
نقش و نگار مٹتے چلے جاتے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ ابھی صبح کے آٹھ ہی
بجے تھے کہ اُن مورتیوں کے مُنہ۔ ناک اور آنکھیں وغیرہ اعضاء بہت
کچھ بگڑ چکے تھے۔ اور نندی گن کی دُم تو بالکل ہی ندارد ہو گئی تھی۔ گفا کی
قدرتی پتھریلی چھت کے اندر سے بھی کہیں کہیں پانی کے قطرے ٹپکتے تھے۔
جس سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ پہاڑ کے اُوپر یا کسی نزدیک تر حصہ میں برف

جمی ہوئی ہے۔ کبوتر بھی دکھائی دیئے مگر یہ نہیں کہ صرف ایک جوڑہ دو تین جوڑے تھے۔ نیز ادھر بھی کبوتر کی قسم کے چند جانور تھے۔ آسمان میں بھی ایک آدھ چیل اُڑتی دکھائی دی تھی۔ اُس سے بہت پرے ایک اونچے پہاڑ کی عین چوٹی پر دو ٹٹو بھی چرتے پھرتے دکھائی دیئے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ ان پہاڑوں کی دوسری طرف ضرور کوئی آبادی ہے۔ القصہ یہ سب کچھ دیکھ کر بارہ بجے کے بعد واپس پنج ترنی کے مقام پر پہنچا۔ رات کو سب قافلہ والوں نے آرام کیا اور صبح کو واپس لوٹنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ مگر واپس لوٹتے وقت اُسی راستہ سے واپس آنے کا دستور نہیں ہے۔ واپسی کا راستہ بالکل الگ اور نرالا ہے۔ جس راستہ سے ہم واپس لوٹے اُس راستہ میں ایک مشہور تالاب آتا ہے (یہ تالاب پختہ نہیں۔ صرف پہاڑوں کے درمیان پانی ٹھیرا ہوا ہے) جو ہتھیارا تالاب کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے گرداگرد پہاڑوں پر کثرت سے برف جمی ہوئی تھی۔ پانی کے اندر بھی برف نظر آتی تھی۔ پانی نہایت صاف تھا۔ یہ مقام واقعی بڑا سرد اور خوفناک تھا۔ اسی تالاب کے متعلق روایت ہے۔ کہ ایک دفعہ یہاں اچانک برف پڑ جانے کی وجہ سے سینکڑوں جانیں زائرین کی تباہ ہو گئی تھیں۔ اور اُسی دن سے اس کا نام ہتھیارا تالاب رکھا گیا۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ یہاں ذرا سا اونچا شور کرنے یا گونج دار آواز پیدا کرنے سے بارش آجاتی ہے۔ اس وقت میرے دل میں خیال پیدا ہوا۔ کہ ایسے خطرناک راستہ کی واپسی میں کونسی مصلحت تھی۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد یہ عقدہ وا ہو گیا۔ کہ اس میں یہ بہتری مد نظر ہے کہ یاتری لوگ راستوں سے واقف ہو جائیں۔ اس کے بعد میرے دل میں عجیب عجیب خیال پیدا ہوئے۔ مثلاً میں نے دل ہی دل میں

کہا۔ اگر کوئی شخص ہندوستان کے تمام تیرتھوں کی یاترا کرے۔ تو وہ ہندوستان کی زمین کے چپہ چپہ سے واقف ہو سکتا ہے۔ تیرتھوں کے مقام گویا یاتریوں کے ٹھیرنے کے پڑاؤ ہیں۔ اگر ہمارے سکولوں اور کالجوں میں یہ قید لگائی جائے یا کم از کم ایک نئی جماعت کھولی جائے جس کا مقصد یہ ہو کہ بعد پاس کرنے امتحان ایم۔اے یا بی۔اے کے ہر ایک طالب علم دو سال کیواسطے ہندوستان کے مختلف تیرتھوں کی یاترا کرے۔ اور بعد یاترا کے انکے راستوں۔ پیداوار اور دیگر ضروری حالات کے متعلق اُن کا امتحان دیا کرے تو میں نہایت وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ پھر وہ طلبا اپنے ملک کے واسطے نہایت ہی کارآمد اور مفید ثابت ہوں۔ اُن میں سردی۔ گرمی کے برداشت کرنے کا مادہ۔ دکھ سکھ سہنے کی عادت اور اپنی مدد آپ کرنے کی ہمت یہ سب کچھ خودبخود پیدا ہو جائیں۔ نیز اُن میں استقلال۔ پیدل چلنے کی مشق۔ سواری کرنے کی قابلیت اور دل میں بے خوفی وغیرہ سب ضروری باتیں پیدا ہو جائیں اُن کا تجربہ۔ اُن کی واقفیت اور معلومات بہت ہی وسیع ہوں۔ المختصر جہاں تک اس امرناتھ جی کی یاترا سے مجھے معلوم ہؤا۔ اور تو اور انسان کی زندگی بالکل سپاہیانہ بن سکتی ہے۔ اگر اُس وقت ہمارے پاس کسی بات کی کمی تھی تو صرف وردی اور سامانِ حرب کی۔ ورنہ ہماری یاتریوں کی فوج اور دوسری فوج میں کوئی فرق نہ تھا۔ ہماری فوج بھی ایک ہی مقصد کے لئے ایک ہی منزلِ مقصود پر پہنچنے کے واسطے پے درپے سرگرمی سے اپنی منزلیں طے کرتی چلی جاتی تھی۔ آندھی۔ بارش۔ کہر کچھ ہی ہو کیا مجال کہ ایک دن سے زیادہ کہیں مقام کیا جائے۔ اور جہاں مقام کیا جاتا صبح وہاں سے ضرور ہی کوچ کرنا پڑتا۔ دور سے دیکھنے سے بلحاظ قطار در قطار آدمیوں اور

سامان باربرداری کے یہی معلوم ہوتا تھا۔ کہ گویا کوئی فوج اپنا کوچ و مقام کرتی چلی جارہی ہے۔ جہاں مقام ہوتا کہیں سے دھواں اُٹھتا نظر آتا۔ کہیں کھانا پک رہا ہوتا۔ کہیں قناتیں اور خیمے ہوتے۔ کہیں چھوٹا سا بازار لگ جاتا۔ اور دوکاندار اپنے اپنے کام میں مصروف ہوتے۔ کہیں ٹٹوؤں کے ہنہنانے کی آوازیں آرہی ہوتیں۔ الغرض عجیب چہل پہل اور رونق کا عالم ہوتا۔ اگر بارش آتی تو دن ہو خواہ رات فوراً مال و اسباب کو بھیگنے اور اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے واسطے صدہا قسم کی مختلف تدابیر عمل میں لائی جاتی تھیں۔ قناتوں کے گرد پھروے وغیرہ سے زمین کھود کر پانی کے خارج کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ جب کوچ کرنا ہوتا تھا تو فوراً عارضی مکانات اکھیڑ کر سب سامان ٹٹوؤں اور مزدوروں کی پیٹھ پر رکھ دیا جاتا تھا اور روانگی شروع ہو جاتی تھی۔ میں پہلے اس قسم کی یاتراؤں کے نام سے بہت نفرت کیا کرتا تھا۔ اور ان کو بالکل فضول سمجھتا تھا۔ مگر جب میں نے اس یاترا سے یاتری کی اصلی خوبیوں کو دیکھا اور اس کی تہ میں بے شمار مفاد کو چھپا ہوا پایا تو میرا دل یاترا کی فلاسفی کا قائل ہو گیا۔ مجھے باوجود گھوڑے وغیرہ کی سواری میسر آنے کے بھی پیدل چلنے میں مزا آتا تھا۔ کبھی کبھی مجھ کو تنگ۔ پیچیدہ اور خوفناک راستوں سے گذرتے ہوئے منچوریا کی سرزمین میں جاپانیوں کا دھڑا دھڑ ابرفوں پر سے گذرنا۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر چڑھنا۔ اور دشوار گذار راہوں سے گذرنا یاد آتا تھا۔ مگر جب میں اپنی اور اپنے ہمراہیوں کی حالت کو دیکھتا تھا۔ تو بے ساختہ کہہ اُٹھتا تھا۔ کہ ہشت! کہاں بچارے ٹھگنے قد و قامت کے جاپانی منچوریا کی غیر مشہور چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر چڑھنے والے اور کہاں یہ رشیوں کی نسلیں دنیا کے مشہور و معروف ہمالہ

کی بلند سر بفلک چوٹیوں پر چڑھنے اور اترنے والے جہاں درمیان میں پہاڑ کے پہلو پر کھڑے ہو کر چوٹی کی طرف دیکھنا چاہیں تو چوٹی نظر نہ آئے۔ اور جو جھک کر نیچے کو دیکھنا چاہیں تو زمین دکھلائی نہ دے۔ اُمید ہے کہ اگر جاپانی بھی ہوتے تو ان پہاڑوں کی چڑھائی اُترائی دیکھ کر کانوں پر ہاتھ دھرتے چاروں طرف سربلند پہاڑ اور پہاڑوں کے دامنوں میں تنگ تنگ راہیں نیچے بہت دور کہیں کہیں بہتے ہوئے برفانی پانی کا دکھائی دینا جن راستوں کے اوپر سے چلنا وہاں بھی کہیں برف کہیں پتھر۔ جوں ہی کسی کا ذرا پاؤں پھسلا اور نیچے لڑھکا تو پھر استخوان تک کا پتہ ندارد۔ ایک ٹٹو جو برف کے اوپر سے چلا جا رہا تھا اور اتفاقیہ اُس کے پاؤں کے نیچے سے برف کمزور پڑ کر نکل گئی۔ تو پھر کیا وہ بہت دور نیچے ایک غار میں جا پڑا۔ جہاں تھوڑا تھوڑا برفانی پانی بہ رہا تھا۔ ایک تو یاتریوں کے لئے وہ راستہ بند ہو گیا۔ دوئم گھوڑے کی کمر ٹوٹ گئی۔ اور باوجود کوشش بسیار کے بھی وہاں سے زندہ نہ نکل سکا۔ یہ تو ایسے وقت کا حال ہے۔ کہ جب دن کی روشنی خاصی ہو چکی تھی اور بارش وغیرہ کچھ نہ تھی۔ لیکن اگر اندھیرا ہو بارش بھی اُتر آئے یا برف گرنے لگ جائے تو صدہا جانیں صرف سردی ہی کی وجہ سے راستہ میں تلف ہو جاتی ہیں۔ زخمی ہو جانا تو تمام یاتریوں کے واسطے ایک معمولی بات ہے۔ مگر واہ ری خوش اعتقادی جس کی وجہ سے لوگ دل کو سخت اور ارادہ کو مضبوط کئے ہوئے ساتھ ساتھ کوچ و مقام کرتے چلے جاتے ہیں میں نے ایک بڑھیا کو جو نہایت ہی غریب اور سواری کی استطاعت نہ رکھتی تھی اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ کہ ایک جگہ پاؤں پھسل کر گر پڑنے سے اُس کی بانہہ ٹوٹ گئی اُس کو ایک دوسری بڑھیا سفری ہسپتال میں جو مہاراجہ کشمیر کی طرف سے

یاتریوں کے واسطے ساتھ تھا اپنے ساتھ لے آئی۔ وہ بڑھیا اُس وقت کراہ رہی تھی۔ اور سخت تکلیف میں تھی۔ اُس کی ضعیف العمری کو دیکھ کر ایک پتھر دل آدمی کو بھی اُس وقت اُس کے دل میں رحم آتا تھا۔ جب ڈاکٹر نے دیکھا کہ اس کی ہڈی ٹوٹ چکی ہے اور وہ پیدل چلنے کے ناقابل ہے۔ تو اُس نے افسر کیمپ پنڈت مادھولال صاحب کو اطلاع دی اور اپنی رپورٹ میں لکھا کہ یہ بڑھیا چلنے کے ناقابل ہے۔ اس کے واسطے سرکاری خرچ سے پالکی کا انتظام ہونا چاہیئے۔ اُس وقت بڑھیا نے پالکی پر چڑھنے سے انکار کر دیا۔ اور اُسی تکلیف کی حالت میں جواب دیا۔ کہ گو میں غریب ہوں مگر میں تیرتھ کے مقام پر آکر مفت کی پالکی میں نہیں چڑھوں گی۔ اے مرحبا! بھلا جہاں اب تک بھارت میں ایسی مائیں موجود ہیں۔ کیا جاپانی فطرت اور طبیعت کے بچے پیدا ہونے مشکل ہیں؟ میں بڑے زور سے کہوں گا۔ کہ اب بھی ہندوستان میں جاپانیوں سے بڑھکر بلکہ جاپانیوں کے بھی اُستاد بچے پیدا ہو سکتے ہیں۔ مگر ہاں یہ شرط لازمی ہے کہ جہاں اعتقاد ہے وہاں علم بھی ہو۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اس کے بعد ہم چند میلوں کی سخت اُترائی کے بعد استھان مرگ پر پہنچے۔ یہ مقام بھی ایک نہایت عجیب اور قابل دید تھا اس کے متعلق بہت سی سنہری روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ مگر میں بخوف طوالت ان کے درج کرنے سے احتراز کرتا ہوں۔ پھر وہاں سے چلکر ہم اُسی دن شام کے وقت چندن باڑی پہنچے جہاں جاتی دفعہ مقام کیا تھا۔ وہاں رات گذار کر پھر صبح کو واپس ہوئے۔ تو پہل گام کے مقام پر آکر دم لیا یہاں پہنچکر سرکاری حفاظت ہمارے سر پر سے اُٹھ گئی اور ہم سب یاتری آزاد ہو کر اپنی اپنی مرضی سے کوچ و مقام کرنے لگے۔ میں وہاں سے اچھابل

کے راستے کہنہ بل کو آیا۔ اس راستہ میں پانڈوں کا (سیاہ رنگ کے پتھر کا) ایک نہایت قابل دید مندر دیکھا جو سراپا حسرت کا نمونہ تھا۔ گو ٹوٹا پھوٹا اور اُجڑا ہوا تھا۔ مگر پھر بھی اپنی ہستی کی وجہ سے زمانہ سابق کی صناعی اور ہنرمندی کا ایک قابل قدر نمونہ پیش کر رہا تھا۔ قصہ کوتاہ میں ۲۶ جولائی سنہ ۱۹۰۶ء کو سری نگر سے روانہ ہو کر ۱۰۔ اگست سنہ ۱۹۰۶ء کو واپس سری نگر میں پہنچا۔ اور اب میں کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ جن لوگوں کے دل میں قدرتی آبشاروں اور چشموں کے دیکھنے کی ہوس ہو۔ عجیب و غریب قسم کے درختوں۔ پودوں اور جڑی بوٹیوں کی تاثیرات معلوم کرنے کا شوق ہو۔ معدنیات اور کانوں کی تلاش کا عشق ہو۔ قدرت کی صناعی اور کمال کے کرشمے دیکھنے کا اشتیاق ہو۔ زعفران کی کیاریوں اور اُن کی سرور بخش مہک سے دماغ اور آنکھوں کو طاقت اور طراوت پہنچانا منظور ہو۔ سپید پیلے اور لاجوردرنگ کے پھولوں والی خودرو گھاس کے فرش مخمل کے دیکھنے کی خواہش ہو۔ نہایت عمدہ آب و ہوا میں پرورش پانے ٹھنڈے اور شیریں چشموں کے صاف شفاف پانی پینے۔ مختلف پھلوں اور میووں کے ذائقے چکھنے کی آرزو ہو۔ گھنے گھنے جنگلوں کی سیر۔ سونا پیدا کرنے والی زمین۔ سبز و خشک دونوں قسم کے سر بفلک پہاڑوں کے نظارے۔ موسم گرما میں میلوں تک کروڑوں منوں بچھی ہوئی برف۔ اور زندگی میں بہشت کا اصلی نقشہ دیکھنے کی چاہت ہو۔ تو وہ ایک دفعہ ضروری ہی کشمیر کی سیر کریں۔ اور اس علاقہ کا چپہ چپہ پھر کر دیکھیں +

محنت ذہنی

از منشی پیارے لعل شاکر میرٹھی

ذہنی محنت کی ضرورت ریاضت بدنی سے بھی بڑھکر ہے۔ محض اسی کے طفیل انسان کو درجۂ انسانیت حاصل ہوتا ہے۔ اسی کی برکت ہے کہ ہزاروں صفحۂ ہستی پر اپنا نام نامی بطور یادگار چھوڑ گئے اور سینکڑوں مسند شاہی پر متمکن ہوئے۔ یہی وہ محنت ہے جو انسان کو اکسیر اعظم بنا دیتی ہے۔ جو لوگ اس محنت کو ایک جزوی بات سمجھتے ہیں وہ درحقیقت دماغ کو عضو اعلے اور ناظم بدن بھی نہیں مانتے۔ "خارج العقل" اور "وحوش سیرت" نام رکھوا کر اپنی مستعار زندگی کو گر پڑ کر انجام تک پہنچاتے ہیں۔ بعض افراد ایسے بھی ہیں جو فقط "محنتِ ذہنی" کو ہی بُرا نہیں سمجھتے۔ بلکہ ریاضت بدنی بھی اُن کے نزدیک ایک فضول چیز ہے! جو لوگ دیدہ و دانستہ اپنے بدن کو ایسی بُری حالت (بیکار اور معطل) میں رکھتے ہیں اُن کو طرح طرح کی بیماریاں آگھیرتی ہیں۔ اور شب و روز رنج و محن میں گرفتار رہتے ہیں۔ حکیموں کے دروازوں پر چھاؤنی ڈال دیتے ہیں۔ دایم المریضوں کے رجسٹر میں ان کا نام درج رہتا ہے۔ بیماریوں کے صدمے جھیلتے جھیلتے عاجز آکر اُن کی زبان سے یہی نکلتا ہے "باز آئے ہم ایسے جینے سے" پس ہم اپنے باخبر ناظرین سے التماس کرتے ہیں۔ کہ وہ اپنے بدن اور دماغ کا جائز استعمال کریں تاکہ تندرست اور سالم العقل ہو کر دنیا میں ہوا کھانے کے دو چار دن بہ آسایش و آرام بسر ہوں +

جب کوئی ذہنی کام کیا جاتا ہے تو طبیعت میں از خود خوشی اور دلبستگی معلوم

ہوتی ہے۔ اور جب ذہن کو فارغ البال رکھتے ہیں تو بالکل سست ہی
نہیں ہو جاتے بلکہ ہر قسم کی خرابیاں اور بد اطواریاں پیش آتی ہیں۔ ذہن
ایک باغ کی مثال ہے جس میں محنت کے مطابق رونق ہوتی ہے۔ باغ
کی زمین کھودنے۔ صاف کرنے۔ پانی دینے۔ عمدہ پھول اور میوہ دار درخت
بونے سے اچھے پھل اور میوے حاصل ہوتے ہیں۔ اسی طرح عمدگی
کے ساتھ ذہنی محنت کرنے سے طبیعت میں جودت اور فراست اور عقل کو
تقویت حاصل ہوتی ہے۔ گو کیسا ہی زرخیز باغ ہو اگر اُس کو حالتِ اصلی پر
چھوڑ دیں تو تھوڑے ہی دنوں میں اُس کی ایسی صورت ہو جائیگی کہ اس پر
ہرگز "باغ" کا اطلاق نہ ہو سکیگا۔ طرح طرح خاردار درخت اُس گلزار کو ایک
مہیب جنگل بنا دینگے۔ یہی حال انسان کا ہے کہ خواہ کیسا ہی تیز طبع اور روشن
دماغ ہو اگر کماحقہ تربیت نہ پائے تو اس کی تیزی اور ذہانت سب کافور ہو جائیگی +

بلحاظ عمر کِس قسم کی ذہنی محنت کرنا زیبا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے کہ
جس کا تفصیلی جواب دینا امر مشکل ہے۔ مختصراً اتنا بتاتے ہیں کہ زمانۂ بچپن
میں طبیعت میں اکثر تیزی ہوتی ہے۔ ذہنی امور کے حل کرنے کو خود بخود
دل راغب ہوتا ہے۔ ہر ایک بات کے سمجھنے کی خواہش لگی رہتی ہے۔ یہ
کیفیت بچوں میں بخوبی دکھائی دیتی ہے کہ وہ بڑے غور سے ہر شے پر نظر
ڈالتے اور اُس کے حال سے ماہر ہونا چاہتے ہیں۔ قوت ریاضت ان میں
اس جوش سے ترقی پاتی ہے کہ اُن کے منہ سے ہر وقت "یہ کیا ہے۔ وہ
کیا ہے"۔ اور دیگر اسی قسم کے جملے سنائی دیتے ہیں۔ وہ بہت جلد جو بات
ایک دفعہ سن پاتے ہیں یاد کر لیتے ہیں۔ بات اچھی ہو خواہ بُری۔ اس سے
کچھ سروکار نہیں اُن کا ذہن فوراً قبول کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچوں

کے دل پر اثر جلد ہو جاتا ہے۔ اور جیسی صحبت یا سوسائٹی ملتی ہے ویسے ہی طور وطریق اختیار کر لیتے ہیں +

چھ یا سات برس کی عمر تک بچے کو نیک و بد کی پوری شناخت نہیں ہوتی۔ اس لئے اس سن میں بچے کے مزاج کی اسلوبیت اور ذہن کی جودت صحیح صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اس کی تعلیم کا اثر بچے کی ساری عمر کا زیور ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کا دل اور اُس کا ذہن درخت کی سبز اور ملایم شاخ کی طرح ہے کہ جدھر طبیعت چاہے موڑ لو!

اس کے بعد جوانی کا عالم آتا ہے جبکہ کل طاقتیں اپنے پورے زور کیساتھ نشو و نما پاتی ہیں۔ یہ عمر ہے کہ جس میں اُن خداداد نعمتوں سے خوب فائدہ اُٹھایا جائے تاکہ معلومات وسیع اور خیالات پاکیزہ ہوں۔ اگرچہ اس مشرقی اصول کے مطابق۔ کہ ؎

کہتا ہے ضعیفی میں یہ مجھ سے مرا کلام   تجھ پہ بڑھاپا چھایا کہ جب میں جواں ہوا

دن بدن عقل کی قوتیں بڑھتی جاتی ہیں اور تصنیف و تالیف کا کام بہترین طور پر انجام پاتا ہے مگر اطبا کے نزدیک ایام خورد سالی میں ذہنی محنت بہت کم اور ہلکی ہونی چاہیئے۔ کیونکہ اس عمر میں نظام عصبی اور ذہنی کامل اور قوی نہیں ہوتے۔ اگر اندازہ سے بڑھکر محنت کی جائے تو لاغری و ناتوانی لاحق ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح ذہن کی اصلی تیزی قائم نہیں رہنے پاتی۔ بہرحال بڑھاپے میں فکر طلب اور مشکل کام کرنا موجب نقصان ہے۔ کیونکہ اس وقت کل اعضاء بدنی و نظام عصبی گھس گھس کر کہنہ ہو جاتے ہیں۔ پس اس عمر میں صرف وہی کام کرنا چاہیئے۔ کہ جس سے ذہن پر زیادہ بار نہ پڑے اور طبیعت ہلکی پھلکی رہے اس عمر کے لئے سب سے بہتر اور ضروری مشغلہ "یاد الٰہی" ہے!!!

غمِ مادر

از منشی دوارکا پرشاد صاحب گہر لکھنوی

ہمارے مکرم دوست اور آزاد کے سرگرم سرپرست منشی دوارکا پرشاد گہر کو ان دنوں اپنی والدہ ماجدہ کی وفات کا صدمہ برداشت کرنا پڑا ہے۔ شاعر کے لئے دل کی بھڑاس نکالنے کا سہل طریقہ اشعار ہیں۔ اس لئے ذیل کی نظم میں ہمارے دوست نے اپنا غم غلط کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہمیں اپنے دوست سے دلی ہمدردی ہے۔ اور ہم دعا کرتے ہیں کہ منشی صاحب کو صبر اور ان کی والدہ مرحومہ کی روح کو خداوند کریم جنت بخشے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ایڈیٹر

اے ماں عزیز گلشنِ قدرت کہاں ہے تو | اے باغبانِ نخلِ محبت کہاں ہے تو
کیا ہوگیا وہ سایۂ رحمت کہاں ہے تو | اے لایق پرستش و عظمت کہاں ہے تو

اے رہ نوردِ عالمِ بالا چگونۂ
ما بے تو خستہ ایم تو بے ما چگونۂ

احسان تیرے خاصکر اے ماں عزیز ماں | بھولینگے ہم نہ عمر بھر اے ماں عزیز ماں
درشن تیرے ملیں اگر اے ماں عزیز ماں | چرنوں پہ ہم جھکائیں سر اے ماں عزیز ماں

ہردم تیرے سروپ کی پوجن کیا کریں
واجب ہے تیرے نام کی سمرن کیا کریں

گو ہم سے ماں تا تیرے دل میں تھی قدرتی | جو ہم پہ فرض تھی تیری خدمت نہ ہو سکی
سچ ہے کہ ہم پہ ہوگئی تو جیتے جی ستی | تجھ سا بھی جاں نثار نہ ہوگا نہ ہے کوئی

باغ جہاں میں نخلِ وفا بے نمود تھا
الفت کا صرف تیرے قدم سے وجود تھا

دنیا سے آہ تجھ کو جدا ہوتے دیکھ کر دیوار و در سے پھوٹتا ہے گھر پٹک کے سر
جس آستاں پہ تھے قدمِ پاک جلوہ گر انبار حسرتوں کا لگا ہے اِدھر اُدھر
وہ دن وہ رات اور وہ زمین آسماں کہاں
چلدیں تم آہ قابلِ تعظیم ماں کہاں

اے مہرباں انیس غم اے ماں بزرگوار بیٹوں کو دل سے کون کریگا اب آہ پیار
تو کیا اُٹھی کہ اُٹھ گیا اُلفت کا اعتبار اک مامتا رہی تیری عالم میں یادگار
مٹنے کا عمر بھر کبھی نقشِ وفا نہیں
یہ سچ ہے تجھ سے بڑھکے کوئی بھی ہوا نہیں

باغ بہشت کی جو ہوا اب خوش آئی ہے بیکنٹھ میں مگر کوئی دنیا بسائی ہے
اے ماں بزرگ شاق تمہاری جدائی ہے بیٹوں کی یاد کس لئے دل سے بھلائی ہے
دکھ ہم کو ہے یہ دل پہ یتیمی کے داغ ہیں
شب سکھ میں گذری اب تو سحر کے چراغ ہیں

بیکنٹھ میں تو آج ہے اب تو تیرا مقام اور ہم یہاں تڑپتے ہیں فرقت میں لاکلام
سر لیگا خانہ داری کا اب کون انتظام کچھ دن ابھی ضرور تھا تیرا مگر قیام
گو باپ ماں رہے ہیں کسی کے کبھی نہیں
واجب سفر کا قصد تھا تم کو ابھی نہیں

اے قابلِ پرستش و عظمت بزرگ ماں تا زیست ہم بنے رہے آنکھوں کی پتلیاں
ہو جائے کاش ایک زمیں اور آسماں پائیں گے اس جہاں میں نہ ہم تجھ سا مہرباں
کیا سلطنت بھی آگے تیرے کوئی مال ہے

نعمت کی قدر شک نہیں بعد زوال ہے

اے سرپرست ہادیٔ کامل بزرگوار ۔۔۔ اے لائق پرستش و ہمدرد و غمگسار
نیکی تری صفت تھی محبت ترا شعار ۔۔۔ آئینہ کی طرح ترے جوہر تھے بے غبار

رخ پر عیاں تھی شان بزرگی جلال کی
سن میں تھی تو سو برس کے کمی بیس سال کی

بھولی گئو کی طرح سے سیدھی مزاج کی ۔۔۔ گرہستی کی تھی فکر سدا کام کاج کی
کل کی بھی تھی خبر تجھے ہر دم جو آج کی ۔۔۔ بیٹوں کے آگے تجھ کو نہ پروا تھی راج کی

دکھ درد بانٹ لیتی تھی خود لیکے سر پہ بوجھ
جس طرح دنیا بھر کا زمیں کے جگر پہ بوجھ

ہے یاد ہم کو والدِ ماجد کا انتقال ۔۔۔ فرزند ناسمجھ تھے ہم تو غم سے تھی نڈھال
بھولی دکھ اپنا ہم پہ ترس کھا کے لامحال ۔۔۔ ہر دم تھا پرورش کا ہماری تجھے خیال

دکھ سہ کے ہم کو نازوں سے پالا بڑا کیا
بیہوش تھے جو ہوش سنبھالا بڑا کیا

دو بہنیں چار بھائی ہیں ہم تیری یادگار ۔۔۔ اور سب تیری دعا سے سمجھ دار ہوشیار
تھی خوش نصیب پاس تھے سب تیرے رشتہ دار ۔۔۔ اک میں نہ تھا فقط یہی حسرت تھی ہمکنار

کاندھوں پہ تین ہی کے گئی چار کی جگہ
ارمان ساتھ لے گئی دیدار کی جگہ

اے ماں نہ ہوگا کوئی بھی ہم سا گناہگار ۔۔۔ تو جیتے جی ستی ہوئی ہم پر ہزار بار
احساں ترے ہمارے سر آنکھوں پہ ہیں ہزار ۔۔۔ ہم فرض سے ہوئے نہ سبکدوش زینہار

حق تیرا شمہ بھر بھی نہ ہم سے ادا ہوا
سچ ہے نہ تجھ سے بڑھ کے کوئی دوسرا ہوا

سب سے عزیز میں تھا کہ چھوٹا پسر تھا میں — کم فہم تھا تو بھائیوں میں اے گہر تھا میں
دنیا کے نیک و بد سے ذرا بیخبر تھا میں — اے ماں تھا نور دل ترا لخت جگر تھا میں
گو ویسے اُنسیت تجھے یکساں سبھی سے تھی
پر سب سے بڑھکے مجکو محبت مجھی سے تھی ۱

تیرے ہی دم قدم سے ابھی تک تھا اتفاق — آپس میں بھائیوں کے نہ آیا کبھی نفاق
کوسوں خیال لے گیا اب وہ ترا فراق — اے ماں عزیز تیری جدائی نہ کیوں ہو شاق
اے چشم یاس صبر کا کوسوں پتا نہیں
تڑپا رہا ہے غم یہ کہ اُف والدہ نہیں

سر پر رہا نہ سایۂ شفقت یہ کیا ہوا — باقی رہا نہ نام محبت یہ کیا ہوا
اے لائقِ سجود و اطاعت یہ کیا ہوا — تو اپنے ساتھ لے گئی حسرت یہ کیا ہوا
تجھ کو تڑپ تڑپ کے مرا دھیان رہ گیا
دیدار بھی ہوئے نہ یہ ارمان رہ گیا ۲

ماتا! دعا کو ہاتھ اُٹھائیگا کون اب — بگڑی ہوئی ہماری بنائیگا کون اب
اے ماں ہمارے دل کو بڑھائیگا کون اب — بڑھتی ہماری روز منائیگا کون اب
کھوئیگا کون اُٹھیگا ہمارے جو سر میں درد
تسکین کون دیگا جو ہوگا جگر میں درد

اے ماں ہمیں بتا کہ وہ آخر ہے کون چیز — دنیا میں تجھ سے بڑھکے اگر دل کو ہے عزیز
کب ماں کی ممتا کو سمجھتا ہے کوئی چیز — بی بی کی اُلفت آہ ہے ادنے سی اک کنیز
مرتی ہے تو بیٹے پہ تن من کو وار کے
ہوتی ستی چتا پہ وہ ہے پت کو ہار کے

غفلت کبھی نہ کھو کے ہم اوسان بھول جائیں — اے ماں کبھی نہ دل سے ترا دھیان بھولجائیں

ممکن نہیں کہ ہم تیرے احسان بھول جائیں ایسے ہی ہوں اگر کوئی نادان بھول جائیں

اے ماں ہماری سمت سے دل تیرا صاف ہو
جو کہا سنا ہو ہمارا معاف ہو

کرتے نصیحتوں پہ تری کاش ہم عمل اور تیری ناخوشی سے نہ آتا جبیں پہ بل
واجب تھا چومتے تیرے ہر دم چرن کنول تیری دعا سے پاتے ہم اچھا ضرور پھل

خدمت جو ہے تیری وہ اطاعت خدا کی ہے
اب یہ چاہ تیری ہی رحمت خدا کی ہے

رباعیات

دنیا سے ہے آہ آج رخصت تیری رل مل کے گلے روتی ہے الفت تیری
سر پہ نہ رہا کوئی مربی اے ماں یاد آئی تیرے بعد شفقت تیری

نازوں سے پلے ہیں ہم بدولت تیری یکساں رہی عمر بھر محبت تیری
تن من سے رہی نثار ہم پر اے ماں ہم کر نہ سکے افسوس نہ خدمت تیری

ہے ماں تیرا قابل پرستش رتبا بڑھکر کوئی تجھ سے آہ ہوگا نہ ہوا
ہے بعد زوال قدر نعمت گنہر آہ اب روتے ہیں ہائے یاد کرکے کیا کیا

آزاد کی توسیع اشاعت کی کوشش ایک ایسی امداد ہے جسکے ذریعہ آپ ہمیں بلا کسی قسم کی تکلیف یا نقصان کے اپنا مشکور بنا سکتے ہیں پھر کیوں نہیں "مفت کرم داشتن والے" اصول سے فائدہ اٹھاتے ہیں

تقدیر اور تدبیر

از حکیم مظفر حسین صاحب اظہر

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

(۵)

جوئندہ یابندہ

عابد بے ریا کئی مہینوں تک قرب وجوار کے شہروں۔ قصبوں اور دیہات میں میرزا کے گم شدہ خاندان کی تلاش کرتا رہا۔ جہاں جاتا اپنا درد دل کہتا اور لوگوں کے سامنے آٹھ آٹھ آنسو روتا۔ لیکن ابھی تک اس بھاگ دوڑ کا کچھ نتیجہ نہیں نکلا۔ اور ہنوز روز اول کا مضمون ہے۔ اس بزرگ کی اُمید مایوسی سے بدلنے لگی ہے۔ اور اس کے پاک اور مقدس دل میں ایک نیا خیال یہ پیدا ہوا ہے کہ ممکن ہے "وہ سب کے سب دنیا سے سفر کر گئے ہوں"۔ یہ کیسا حیرت خیز اور درد انگیز خیال ہے۔ مگر بزرگ کا دل اس خیال پر جمتا نہیں ہے بلکہ اُس کا جی یہی شہادت دیتا ہے کہ وہ لوگ جیتے جاگتے ہیں اور کبھی نہ کبھی مل ہی رہیں گے +

یہ بزرگ ایک قصبہ میں مقیم ہے۔ اُس کی تقدیس اور بے ریائی۔ خدا رسیدگی اور بزرگی کا گھر گھر چرچا ہو رہا ہے۔ لوگ جوق جوق آتے ہیں اور اس بزرگ کے ہاتھ میں ہاتھ دیکر بیعت کرتے ہیں۔ مشہور ہے کہ یہ بزرگ روحانی فیض کے علاوہ کئی لوگوں کو دنیاوی فیض بھی پہنچا چکے ہیں۔ یعنی

جن لوگوں نے ان کے سامنے ناداری کی شکایت کی تھی۔ بزرگ کی دعا کرنے سے وہ چند روز میں ہی اس تکلیف سے نجات پا گئے۔ کئی بے اولادوں کی اولاد اور کئی مایوسوں کی امیدیں حضرت کی دعا سے پوری ہوگئیں۔ غرضیکہ ان وجوہات سے یہ بزرگ نہ صرف اس تمام قصبہ میں بلکہ قرب و جوار کے دوسرے قصبوں میں مشہور ہوئے۔ اور بہت سے لوگ فیض حاصل کرنے کے لئے باہر سے آنے لگے +

ایک روز صبح کا وقت تھا۔ بزرگ نماز سے فارغ ہوکر مصلے پر بیٹھے ہوئے تسبیح پڑھ رہے تھے۔ کہ ایک اجنبی نے آکر اپنا سر اُن کے پاؤں پر ڈال دیا۔ بزرگ نے فوراً پاؤں کو کھینچا۔ اُس شخص کو اُٹھایا۔ اور محبت سے اپنے قریب بٹھایا +

آنے والا۔ یا حضرت آپ کے دروازہ سے کوئی مایوس نہیں گیا۔ خدارا میرے حق میں دعا کیجئے۔

بزرگ۔ خدا تمہیں برکت دے گا۔

آنے والا۔ اور میری آرزو ہے کہ حضور مجھے اپنے زیر سایہ لے لیں۔

بزرگ۔ انسان کے زیر سایہ ہونا کیا۔ خدا کے سایہ میں پناہ لینی چاہئے ہم سب پر خدا کا سایہ چاہئے مگر تمہاری اس سے مراد کیا ہے۔

آنے والا۔ یا حضرت میری عرض صرف اسی قدر ہے کہ مجھے اپنے حلقہ ارادت کیشاں میں لے لیجئے! اور بس!

بزرگ۔ یعنی تم میرے مرید ہونا چاہتے ہو!

آنے والا۔ میں کم بخت تو اس قابل کہاں مگر حضور کے فیض عام نے مجھے اس درخواست پیش کرنے کی جرأت دلائی ہے اور میں امید کرتا ہوں گا

کہ آپ مجھے مایوس نہ کریں گے ؟

بزرگ ۔ نہیں میں تم کو مایوس کرنا تو نہیں چاہتا لیکن شاید تم نے میرے مرید کرنے کی شرطیں سُنی ہوں وہ بہت سخت ہیں ۔ میں پہلے اُن پر کاربند ہونے کی شرعی قسم لے لیتا ہوں تب کسی کو مرید کرتا ہوں ۔

آنے والا ۔ میں حضور کی کڑی سے کڑی شرطوں کے ماننے کو طیار ہوں مگر مجھے اس سعادت دارین سے محروم نہ رکھئے !

بزرگ ۔ از انجملہ دیگر شرطوں کے میری دو شرطیں یہ ہیں کہ انسان جھوٹ نہ بولے ۔ اور دوسرے میرے ہر حکم کی بلا چون وچرا تعمیل کرے ۔ بالکل میری ہدایت پر چلے ۔ خواہ میں ایسا حکم دوں جو عقل ۔ شرع اور دور اندیشی کے خلاف ہو ! کیا تمہیں یہ باتیں منظور ہیں ! یا کہ عذر ہے !

آنے والا ۔ مجھے سب کچھ منظور ہے ! حضور کے ہر ایک حکم کی تعمیل بلا تکلف کروں گا اور ہمیشہ سچ بولوں گا ۔

بزرگ ۔ تو مجھے مرید کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا ۔ اچھا تم اپنے حالات تو بتاؤ ؟ تمہارا ذریعہ معاش کیا ہے ! کہاں کے رہنے والے ہو ! تنہا ہو یا صاحب عیال واطفال ۔

آنے والا ۔ حضور مجھ کمبخت کے حالات ہی کیا ہیں ۔ ایک فلک زدہ مصیبت کا مارا ہوں ۔ ذریعہ معاش بھی ایسا کچھ نہیں ۔ میرے پاس ایک ٹٹو ہے ۔ وہ کرایہ پر چلتا ہے ۔ پس جو کرایہ آتا ہے ۔ اُس میں سے دو چار آنے روز کے ٹٹو کے گھاس دانے سے جو بچ رہتے ہیں اُس پر میں گزارہ کرتا ہوں قریب کے گاؤں میں لوگوں نے ترس کھا کے مجھے ایک جھونپڑی دیدی ہے وہیں معہ ٹٹو کے رہتا ہوں ۔

بزرگ۔ (کچھ چونک کر کیونکہ اُسے میرزا حشمت بیگ کے ایک بیٹے کی تقدیر کا کہ اُس کا گزارہ گھوڑوں پہ ہوگا معاً یاد آگیا) بھلا تمہارا نام کیا ہے!

آنے والا۔ حضور! لوگ مجھے حسنو احسنوا کہتے ہیں!

بزرگ۔ (کسی قدر اور چونکنا اور مسرور ہو کر) دیکھو میں تم سے سچ بولنے کا اقرار لے چکا ہوں۔ اس لئے تم اپنا پورا نام بتاؤ اور اپنے والد کا بھی!

آنے والا۔ حضور آپ تو روشن ضمیر ہیں۔ سب کچھ جانتے ہیں۔ مگر ان گڑے مردوں کو اکھاڑنے سے کیا حاصل! یا حضرت! میرے والد نے میرا نام حسن بیگ رکھا تھا۔ مگر اب تو وہی مشہور ہے جو میں نے عرض کیا۔

بزرگ۔ مگر تم نے اپنے والد کا نام نہ بتایا۔

حسن بیگ۔ اُن کا نام میرزا حشمت بیگ تھا۔ یہ سُنکر بزرگ کا شبہ یقین سے بدل گیا۔ اور خوشی کے جوش میں کھڑا ہو کر حسن بیگ سے بغل گیر ہو گیا۔ اگرچہ میرزا نے اُسکی تقلید کی۔ مگر پیر کی اس حرکت کا مطلب خاک نہ سمجھا!

بزرگ۔ تمہارے والد تو بڑے امیر آدمی تھے۔ اور تمام شہر میں اُن کے مقابلہ کا ایک بھی امیر نہ تھا مگر تم ایسے ٹوٹے حال میں ہو آخر وہ جاہ و حشمت کیا ہوئی؟

حسن۔ یا حضرت ان باتوں کو جانے دیجئے آپ سب کچھ جانتے ہیں۔ للہ مجھ فلک زدہ کی کچھ دست گیری کیجئے پچھلی باتوں کو یاد کرنے سے زخم دل ہرے ہوتے ہیں۔

بزرگ۔ شاید تم کو یاد ہو کہ جب تم چھوٹے سے تھے اور تمہارے والدین

حیات تھے - ایک فقیر تمہارے ہاں رہا کرتے تھے -

حسن - ہاں مجھے کچھ یاد پڑتا ہے -

بزرگ - وہ شخص میں ہی ہوں -

حسن نے یہ سنکر بزرگ کی بغل گیری کے راز کو سمجھا اور اُس کے دل کو قدرے اطمینان ہوا - کہ بزرگ نرا مرشد ہی نہیں ہے بلکہ اپنا ایک ہمدرد بھی ہے - ممکن ہے - کہ اب میرے دن پھر جائیں اور اس بندۂ خدا کی دستگیری میرے بگڑے کام بنا دے +

(۶)

بمے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بیخبر نبود زراہ و رسم منزلہا

میرزا حسن بیگ اپنی مفصل سرگذشت - اپنے والد میرزا حشمت بیگ کی وفات - اور اُن کی آنکھ بند ہوتے ہی اپنی آوارگی اور یاران جلسہ کی تباہ کن صحبتوں کے بد اثر کی طول طویل مگر درد انگیز داستان اپنے مرشد کامل کو سنا چکا ہے - اور حسن بیگ بیعت کر چکا ہے اور اب زمرۂ عقیدتمند و خادمان خاص الخاص سے ہے - پہلے جس قصبہ میں رہتا تھا - اب وہاں کی بود و باش بھی ترک کر دی ہے - چنانچہ رات دن اس بزرگ کے پاس رہتا ہے +

جب حسن بیگ کو بیعت کئے تقریباً ایک ہفتہ گذر گیا - تو مرشد کامل اس طرح ارشاد کرنے لگے :-

مرشد - غالباً تم اپنے قول پر قایم ہو کر میرا ہر ایک حکم بلا چون و چرا مانوگے؟

حسن۔ بیشک میں بہ دل و جان آپکے حکم کی تعمیل کروں گا۔
مرشد۔ ہاں مجھے ایسی ہی اُمید ہے۔ اچھا تو ایک کام کرو۔ اس ٹٹو کو بیچ ڈالو۔ کیوں منظور ہے نا؟
حسن۔ (چونک کر) یا حضرت اگرچہ مجھے آپ کے حکم ماننے میں ذرا تامل نہیں! لیکن آپ خیال کرسکتے ہیں کہ یہی میری اوقات بسری کا ذریعہ ہے۔ اور اگرچہ میں غریب ہوگیا ہوں لیکن میری عزت وحمیت یہ گوارا نہیں کرسکتی کہ میں اپنا بار آپ کے سر ڈالوں۔ اس لئے بہ ادب درخواست کرتا ہوں۔ کہ اگر نامناسب نہ ہو تو اِس ٹٹو کو رہنے دیا جائے۔
مرشد۔ اپنے عہد کو یاد کرو! گھبراؤ ہرگز نہیں۔ خدا کچھ بہتری ہی کی صورت پیدا کرے گا۔
حسن۔ (چار و ناچار) بہتر جو آپ کی مرضی!
مرشد۔ اچھا اس کو بازار میں لے جاکر فروخت کرو مگر پورے دس روپیہ کو فروخت کرنا۔ اس سے نہ کوڑی زیادہ لینا نہ ایک کوڑی کم۔
حسن۔ میں تو ہر ایک حکم کی تعمیل کو حاضر ہوں لیکن حضور یہ تو خیال فرمائیں کہ ایسے سڑے ہوئے ٹٹو کے کون دس روپیہ دے دیگا۔
مرشد۔ تم کو اس دلیل سے کیا مطلب۔ تم اسے بازار لے جاؤ۔ اور اس بات پر قایم رہو۔ دیکھو پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔

حسن بادلِ ناخواستہ بازار میں فروخت کے لئے ٹٹو لے جاتا ہے۔ صبح سے دوپہر تک تو لوگ اُس کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے۔ پھر کہ دن ڈھلے دو چار لوگ قیمت پوچھتے ہیں مگر دس روپیہ سنکر چونک پڑتے ہیں۔ اور حسن پر آوازہ کستے اور طنزاً فقرہ بازی کرتے ہیں۔ جس سے اُسکے

دل پر چوٹ لگتی ہے مگر خون کے سے گھونٹ پی کر رہجاتا ہے۔ ارادہ کرتا ہے کہ واپس لوٹ چلے مگر مرشد کا ارشاد دامن پکڑ لیتا ہے۔ تاہم دل میں کہتا جاتا ہے کہ لو حضرت نے آج کے کرایہ کے بھی پیسے کھوئے۔ اور لینے کے دینے پڑے۔ اسی مایوسی کے خیال میں شام ہو جاتی ہے۔ وہ معہ گھوڑے کے مرشد کے پاس پہنچکر تمام دن کا مصیبت بھرا قصہ سُناتا ہے۔ اور عرض کرتا ہے کہ یا حضرت معاف کیجئے۔ جانے دیجئے۔ مگر وہ ارشاد کرتے ہیں کہ کل پھر علی الصباح جاؤ اور امداد غیبی کے منتظر رہو اور اسے جانا پڑتا ہے +

صبح ہوئی حسن اپنے سڑے ہوئے ٹٹو کو لیکر بازار پہنچا۔ سوائے مکھیوں کے اور کوئی متوجہ نہیں ہوا۔ دوپہر ہوئی۔ دن ڈھلا اور شام ہونے آئی مگر خریداری تو کیسی کسی نے آکر آدھی بات بھی نہ پوچھی!

بالکل شام کو جبکہ حسن کو مایوسیوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اور وہ گھر کو لوٹنے پر آمادہ تھا۔ اور مرشد کو دل میں ڈرتا ڈرتا کوس رہا تھا۔ ایک شخص اُس کی طرف متوجہ ہوا۔ حسن اپنے خیالات میں کچھ ایسا محو ہو رہا تھا کہ اس کے سوال پر چنداں توجہ نہیں کی۔ اُس نے دوبارہ اس کا شانہ ہلاکر کہا! کیوں بھئی! میاں ٹٹو والے کیا اس کو بیچتے ہو!

حسن۔ (چونک کر) ہاں بیچتا ہوں؟

خریدار۔ تو بتاؤ کیا لوگے!

حسن۔ دس روپیہ؟

خریدار۔ دس روپیہ! یہ تو بہت زیادہ ہیں۔ اتنی قیمت تو کوئی نہیں دیگا

حسن۔ اس کی قیمت تو یہی ہے!

خریدار۔ اچھا آٹھ روپیہ لے لو! کیوں راضی ہو نا!

حسن ۔ نہیں جناب نہیں ۔ اس کے تو دس روپیہ ہی لوں گا ۔

خریدار ۔ اچھا بھئی ایک کام کرو کہ نہ تمہارے دس اور نہ میرے آٹھ ۔ نو روپے لے لو ۔ بس فیصلہ ہؤا ! لاؤ ! لو !!

حسن ۔ پہلے تو دل میں کہتا ہے کہ نو روپیہ ملتے ہیں لے ہی کیوں نہ لوں یہ بھی کیا اتفاق ہے ورنہ کل سے تو کسی نے نو کوڑیاں بھی دینے کا نام نہیں لیا ۔ مگر پھر سنبھلتا ہے اور کہتا ہے کہ خدا جانے مرشد کے حکم میں کیا مصلحت ہے اور نہیں معلوم کہ عدول حکمی کیا آفت لائے ۔ دل میں یہ کھچڑی پکا کر اور دل کو مضبوط کر کے کہتا ہے " نہیں جناب میں تو پورے دس روپیہ لونگا اور اس سے ایک کوڑی نہ کم لوں گا نہ زیادہ ! خوشی میں آئے لیجئے خوشی میں آئے نہ لیجئے !

خریدار ۔ اچھا اگر تم نے قسم ہی کھائی ہے تو لو دس ہی روپیہ لو !

حسن روپیہ لیکر خوشی خوشی مگر دل میں اپنے آپ کو اپنے خیالات پر ملامت کرتا ہؤا مرشد کی خدمت میں حاضر ہو کر روپیہ پیش کرتا ہے +

ابھی ابھی حسن آیا ہے اور اپنے مرشد کی خدمت میں دوسرے لوگوں کے ساتھ حاضر ہے کہ ناگہاں ایک شخص آتا ہے کہ بھئی کوئی ہمارا گھوڑا خریدتا ہے ہم بہت سستا بیچتے ہیں ۔ مرشد حسن کو ارشاد کرتے ہیں کہ بچہ بے تامل خرید لو ۔ اور بغیر کوئی بات سمجھے فوراً خریدنے پر آمادہ ہو کر بائع سے قیمت پوچھنے لگتا ہے +

حسن ۔ اچھا ہم خریدتے ہیں کہو کیا لو گے !

بائع ۔ پورے دس روپیہ نہ ایک کوڑی کم اور نہ ایک زیادہ ۔

بزرگ کے اشارہ سے گھوڑا خرید لیا جاتا ہے ۔ یہ حسن کے ٹٹو سے بہتر

ہے۔ اگلے روز مرشد ارشاد کرتے ہیں۔ جاؤ بازار میں بیچ لاؤ۔ مگر آج بیس روپیہ سے ایک کوڑی کم کو نہ دینا۔ حسن جاتا ہے اور عین شام کو بیس روپیہ کو ہی بیچ لاتا ہے۔ اور روپیہ مرشد کے سامنے لاکر ڈال دیتا ہے۔"

غرضیکہ اسی صورت سے روز ایک گھوڑا خرید ا جاتا ہے اور دوگنی ڈیوڑھی قیمت پر فروخت کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ حسن جو کبھی حسنوا مشہور تھا اب میرزا حسن بیگ نامی ایک گھوڑوں کا متمول سوداگر ہے۔ ہزاروں کا آدمی ہوگیا ہے۔ ایسا کوئی وقت نہیں ہوتا کہ اس کے اصطبل میں ہزار دو ہزار کی قیمت کا عربی گھوڑا نہ ہو مگر اس کے مرشد کا ارشاد ہے کہ گھوڑے کو خریدتے ہی فوراً منافع سے بیچ ڈالے۔ مگر اس پر بھی اُس کے اصطبل میں ایک نہ ایک گھوڑا ضرور رہتا ہے اور وہ اطمینان کی زندگی بسر کرتا ہے۔

(۷)

تدبیر کا دوسرا تیر

میرزا حشمت بیگ کا دوسرا بیٹا یعنی میرزا حسن بیگ سوداگر اسپاں کا چھوٹا بھائی احمد اس وقت اُس بزرگ کی خدمت میں حاضر ہے مگر بیچارہ بُرے حالوں ہے ایک جال اُس کے کندھے پر پڑا ہے کہتا ہے کہ دن بھر جنگل جنگل چکر لگاتا اور جال بچھاتا پھرتا ہوں۔ تب کہیں جاکر ایک دو طوطا مینا پھنستا ہے۔ جس کو بیچ کر پیٹ پالتا ہوں مگر نہ اُسے یہ خبر ہے کہ یہ بزرگ کون ہے نہ وہ اپنے بھائی کو پہچانتا ہے اور نہ بھائی اسے۔ البتہ وہ بزرگ کی کرامت بھری داستانیں سُن چکا ہے۔ اور اس لئے اُن کا دل سے

معتقد ہو گیا ہے۔ اور بیعت کرنا چاہتا ہے +

احمد۔ یا مرشد! مجھے اپنے زُمرۂ خادمین میں جگہ دیکر سعادت دارین بخشئے۔

مرشد۔ لیکن تم کو میرے حکم کی تعمیل بلا چون وچرا کرنی ہو گی۔ کیا تم رضامند ہو۔

احمد۔ بیشک! دل وجان سے آپ کا ارشاد مانوں گا۔

مرشد نے اس کا ہاتھ میں ہاتھ لیکر بیعت کی اور اسے اپنے مریدان عقیدت مند کے زمرہ میں شامل کرکے اعزاز بخشا +

احمد کو مرشد کا ارشاد ہوا ہے کہ کل جب جال لیکر جنگل کو جاؤ تو ہمیں خبر کرو ہم بھی ساتھ چلیں گے۔ کل ہوتی ہے تو مرید و مرشد دونوں جنگل کو چل دیتے ہیں۔ مرید کے کندھے پر جال ہے اور پیر کے ہاتھ میں عصا!

جنگل میں گئے اور جال لگا دیا۔ انتظار رہے کہ کوئی پرندہ آکر بیٹھے۔ مگر دوپہر ہونے کو آئی ابھی تک کوئی پرندہ نہیں آیا۔ اب دوپہر ہوئی تو دو طوطے آئے ہیں مگر مرشد نے اپنے ڈنڈے سے اُنہیں اُڑا دیا۔ جو احمد کو ناگوار گذرا اور شاید مرشد کو دل میں برا بھلا کہا۔ لیکن بظاہر خاموش ہو رہا +

مرشد نے اس کے تیور دیکھ کر کہا کہ "احمد باز کو جال میں پھانسنا ہی اُس کے سوا کوئی پرندہ آئے اُڑا دو۔ کیا کبھی پہلے بھی تم نے باز کو پھانسا ہے +

احمد۔ (مایوسی کے لہجہ میں) یا حضرت باز کیسا! کبھی اُدھر بھی نہیں آیا۔ آپ نے طوطے بھی اُڑا دیئے۔ صبح سے انتظار کرتے کرتے تو یہ اب آئے تھے۔

اب خدا جانے شام تک کوئی پرندہ آتا ہے یا نہیں +
مرشد۔ تم اپنے ارادہ کو مضبوط رکھو اگر باز آئے پھندا لگاؤ۔ اور اگر کوئی
دوپرندہ آئے تو پرواہ نہ کرو۔
احمد۔ حضرت ہماری یہ قسمت کہاں کہ باز آئے۔
(دل میں) آج مرشد صاحب ایسے ساتھ آئے کہ فاقہ کی ہی نوبت
آتی نظر آتی ہے۔ شام ہونے کو آئی ایک چڑیا تک نہیں پھانسی یا قسمت!
یا نصیب!

جب بالکل شام ہوگئی! عین مایوسی کی حالت میں باز آیا اور مرشد
کے اشارہ کے موافق پھانس لیا گیا۔ اگلے روز بادشاہ کے دربار میں پیش
ہؤا۔ اور اس کی ایک سو روپیہ قیمت وصول ہوئی۔ احمد مرشد کے پاؤں
پر گر پڑا۔ مرشد نے یہی تلقین کی۔ کہ جال روز لگاؤ۔ لیکن باز کے سوا کبھی کوئی
پرندہ نہ پھانسو بلکہ اُڑا دو۔ احمد کا یہی معمول ہے ایک باز روزانہ پھانستا
ہے اور خاطر خواہ قیمت اُٹھاتا ہے۔ اور وہ اب ایک متمول شخص ہو گیا
ہے +

(۸)

خاتمہ

حسن اتفاق سے چند روز بعد میرزا حشمت بیگ کی دختر بھی جو حسن
فروشی کی تاریک اور بدنام زندگی بسر کرتی تھی۔ اس بزرگ کے قدموں
میں آپڑی اور اُس کے ہاتھوں پر بیعت لیکر اُس کے زمرۂ مریدان میں
داخل ہوئی +

مرشد نے اُس کے تمام حالات دریافت کر کے اُس کی ایسے ہی وسایل اور طریقوں سے امداد کی جن سے کہ وہ حسن اور احمد کی کر چکا تھا اور اس طرح گو وہ اپنی اُسی تاریک زندگی میں رہی لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کی مالی حالت بہت درست ہو گئی +

کچھ مدت بعد جب یہ واقعات خواب وخیال ہو چکے تھے۔ وہ بزرگ خواب میں کیا دیکھتے ہیں۔ کہ وہی فرشتہ جس نے کبھی میرزا حشمت بیگ کی اولاد کی قسمت کا حال اس بزرگ کو بتایا تھا۔ کھڑا ہوا کہہ رہا ہے۔ کہ حضرت آپ کو ان لوگوں کی تقدیر کا حال بتا دینے کی مجھے یہ سزا ملی ہے کہ روزانہ ایک گھوڑے کا خریدار۔ ایک باز۔ اور ایک مالدار آدمی تلاش کر کے لانا پڑتا ہے۔ کاش میں ایسی غلطی نہ کرتا! مگر تقدیر!!

ہندوستان ہمارا

از شیرام شیر عطائی پوری

جنت نشاں کبھی تھا ہندوستاں ہمارا گو اب اُجڑ چکا ہے یہ بوستاں ہمارا
صنعت پہ حصر کیا تھا ہر علم میں تھے ماہر دستِ نگر تھا گویا سارا جہاں ہمارا
پیتے تھے شیر بکری سب ایک گھاٹ پانی جس وقت ہند میں تھا سکہ رواں ہمارا
اب ہو گئیں ہیں باتیں خواب و خیال ساری جب سے ہوا ہے دشمن یہ آسماں ہمارا
اک وقت تھا کہ گندم کھاتے تھے منہ بنا کر بھرتی ہیں پیٹ جو کی اب روٹیاں ہمارا

اقبال کا مقولہ کیا خوب ہے شررؔ یہ
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

سہرا مبارک

پیش کردہ پنڈت متبرج موہن دتا تریہ کیفی دہلوی

ہمارے محترم دوست پنڈت صاحب نے بموقع شادی کتخدائی کنور جسجیت سنگھ صاحب آف کپورتھلہ خلف الصدق آنریبل کنور پرتاپ سنگھ صاحب بہادر ایک سہرا پڑھا تھا جسے آزاد کے لئے عنایت فرماتے ہیں ہم دلی شکریہ کیساتھ درج کرتے ہیں

میرے نوشاہ مبارک ترے سر پر سہرا
ہو سدا عیش و مسرت کا ترے سر سہرا

کھل گئی دل کی کلی دیکھ کے سہرے کی پھبن
ہے نسیم چمن افروز معطر سہرا

گل امید ہیں یہ رشتۂ الفت میں گندھے
دیویاں سُرگ سے لائی ہیں بنا کر سہرا

موتیوں کا ہے کہ ہے موتئے کا سوچ میں ہیں
رہ گئے دیکھ کے نقاد یہ ششدر سہرا

اسکا ہر پھول بنا شاہد خوبی کا سُہاگ
تاج ہے فرق سعادت کا خوش اختر سہرا

جیغۂ و کلغی و سر پیچ نہ تھے زیب کو کم
اور طُرّہ ہوا دستار کے اوپر سہرا

پرتو روئے مصفّا سے بنا دولھا کے
صفحۂ مصحف پُر نور کا مسطر سہرا

حُسن جاں بخش کی ہے آب برستی چھن چھن
موجۂ چشمۂ حیواں ہے سراسر سہرا

رنگ سورج کی شعاعوں کا ہوا اس سے پھیکا
چمکا آب رخ روشن سے نکھر کر سہرا

سر چڑھا ہے جو یہ نوشاہ بلند اختر کے
کیوں دماغ اب نہ رکھے عرش کے اوپر سہرا

نغمۂ عیش سے گونج آج اٹھا اندر اسن
گاتے آکاش پہ ہیں پریوں کے جھرمٹ سہرا

تو ہے اُس گلشن شاہی کا نہال سرسبز
عالم آرائی کا ہے جس کے سدا سر سہرا

کاش جب جیتے زمانہ میں ہمیشہ جسجیت
باندھے اقبال کا سر تیرے مقدر سہرا

یا خدا اختر تک دو لھا لہن شاد رہیں
ختم کر کیفی مسرور دعا پہ سہرا

پولیٹکل ہولی

از منشی دوارکا پرشاد گہر لکھنوی

آج حضرت گہر کی دو نظمیں زینت اوراق آزاد ہوتی ہیں۔ یہ خصوصیت تعجب سے دیکھی جائے گی۔ کیونکہ اکثر مضامین ایک عرصہ تک ملتوی رکھے جاتے ہیں۔ مگر حضرت گہر کی دوسری نظم چونکہ وقت کا تحفہ ہے اور التواء سے اس کا لطف جاتا رہیگا۔ اس لئے اسی نمبر میں درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ایڈیٹر

قومی نفاق کا جو بجا ہر طرف بگل — اور حاسدوں نے باندھ دیئے مضحکوں کے پل
دیکھا جو گرم و نرم فریقوں میں شور و غل — ہولی نے آکے رنگ جمایا یہ صلح کل

چٹکا جو کانگریس میں تھا غنچہ نفاق کا
جوں گل کھلا وہ بنکے کنول اتفاق کا

صد شکر باغ قوم میں ہولی پھر آئی ہے — ہمدردیوں کی آج گھٹا دل پہ چھائی ہے
باد سحر کی چال میں معجز نمائی ہے — پھولوں میں رنگ رنگ کی کیا دلربائی ہے

کیا شوق وصل گل میں صبا جھوم جھوم کے
غنچوں کو پیار کرتی ہے منہ چوم چوم کے

آیا ہزار شکر زمانہ بہار کا — پہنا گلوں نے جوڑا سہانا بہار کا
غنچوں کی ہے زباں پہ ترانہ بہار کا — ہولی لٹا رہی ہے خزانہ بہار کا

پھولوں کے ہر ورق پہ زر گل نثار ہے
صحرا بھی آج رشک وہ لالہ زار ہے

جھولی بھرے گلال اُڑاتی صبا چلی　　کس ناز سے نیاز سے یہ خوش ادا چلی
دل میں نئی اُمنگ کے غنچے کھلا چلی　　کیا جھومتی پہن کے سدیشی قبا چلی

حبِّ وطن کا آنکھوں میں جلوہ کھپا گئی
قومی ترقیات کا ارگن بجا گئی

پھولے چمن میں پھول سدیشی بہار کے　　جوڑے گلوں نے پھینکے بدیسی اُتار کے
سبزے نے روپ پائے الٰہی جوبن نکھار کے　　دل کو اُبھارتے ہیں ترانے ہزار کے

انداز کچھ اداؤں میں دلبستگی کے ہیں
حبِّ وطن کے جوش میں نغمے خوشی کے ہیں

دیسی قبا پہن کے کھلے ہیں چمن کے پھول　　صدقے گلوں کے اپنے ہیں خود ہار بن کے پھول
اترائیں رنگ و بو پہ نہ غیر انجمن کے پھول　　پھولے ہیں باغ قوم میں حبِّ وطن کے پھول

آثار لب پہ غنچوں کے فرخندگی کے ہیں
یہ بندے ماترم نہیں نعرے خوشی کے ہیں

تھالے بھرے گلوں نے عبیر و گلال کے　　حوضوں کو بھر دیا شفقی رنگ ڈال کے
کیلوں نے نل لگائے سودیشی کمال کے　　بھر رکھے پیالے لالہ نے صہبائے لال کے

انداز قمقموں نے دکھائے حباب کے
پچکاریاں بنی ہیں شگوفے گلاب کے

مہرِ فلک شعاعوں کا لایا ہے بھر کے تھال　　ذرے عبیر بن کے چمکتے ہیں بے مثال
ملتی ہے رخ پہ شاہدِ گل کے صبا گلال　　کرتے ہیں چھیڑ لالہ رخوں سے پری جمال

ہر لب پہ ہر زباں پہ سہرا خوشی کا ہے
قومی ظفر نشان پھریرا خوشی کا ہے

چنبیلی خوش نصیبی پہ اترائی جاتی ہے　　ہمسایہ سے چھوئی موئی شرمائی جاتی ہے

نرگس کی آنکھ نشہ میں للچائی جاتی ہے سوسن کے لب پہ لبسکہ ہنسی آئی جاتی ہے

جھولی بھرے گلال صبا جھوم جھوم کے

غنچوں کے رخ پہ ملتی ہے منہ چوم چوم کے

اوڑھے نہال باغ ہیں بانات سرخ و سبز کیا کیا رنگے ہیں رنگ میں انبات سرخ و سبز

پیش نظر ہر اک کے ہے سوغات سرخ و سبز کھیتوں میں کھل رہے ہیں نباتات سرخ و سبز

موسم نیا بہار نئی رنگ ہے نیا

سج دھج نئی لباس نیا ڈھنگ ہے نیا

بھارت کے تن پہ قابل تحسین لباس ہے دیسی لباس کیا ہی خوش آئیں لباس ہے

پنجاب زیب تن کئے رنگیں لباس ہے بنگالیوں کے جسم پہ زریں لباس ہے

حب وطن کے جوش میں دل باغ باغ ہیں

قومی ترقیات سے روشن دماغ ہیں

سرگرم پالیٹکس میں کیا کیا ہیں ڈیلی گیٹ ہیں لبرل آج اکسٹریمسٹ اور ماڈریٹ

آزادیوں کا پہنے ہیں جامہ گریجویٹ پبلک کہیں تو ہے کہیں میٹنگ پرائیویٹ

صنعت کے گیت گاتے ہیں سب دھن میں بھاگ کی

کیا ہے سہاونی ہی خوش آیند آگ کی

حب وطن ہمارا ہے ایمان بھائیو مذہب ہمارا ہے یہی استھان بھائیو

بیحد ہیں ہم پہ ملک کے احسان بھائیو بھارت ہماری ماتا ہے اور جان بھائیو

ہاں گائیں دھن میں ہولی کے اب بندے ماترم

کہدو خوشی کے جوش میں سب بندے ماترم

اس جوش اور خروش پہ تحسین و آفرین بنگالیوں میں آج ہے کیا کیا جنون جنین

پیروں تلے سے آ گئی ہے نکل زمیں چیں بر جبیں دلوں میں ہیں سر پہ کفن جبیں

ہونا تھا ہو چکا وہ بھلا یا بُرا ہوا
بنگالی پارٹیشن کا نتیجہ بُرا ہوا

بنگالی بابو چونک کے ہُشیار ہو گئے بے جرم لیڈر آہ گرفتار ہو گئے
غفلت میں سونیوالے بھی بیدار ہو گئے روشن ترقیات کے آثار ہو گئے

کرزن کی پولیسی کی بڑی دھوم ہو گئی
تہذیب غیر قوم کی معلوم ہو گئی

بھارت میں گو کہ آج ہے ہولی کی دھوم دھام جلوہ فزا ہے صبح بنارس اودھ کی شام
ڈوبے ہوئے ہیں رنگ میں ہولی کی خاص عام سرشار ہو رہے ہیں محبت کے پیکے جام

لیکن وہ دل جو چوٹ کے صدمے اٹھائے ہیں
بچھڑے ہوئے رفیق اُنہیں یاد آئے ہیں

اے فخر قوم جانِ جہاں پیارے دینا ناتھ کیا کچھ نہ اُنس تم کو تھا ہندوستان کے ساتھ
تم نے تو ملک قوم کی خاطر بندھائے ہاتھ اور بال بچے غم میں ہوئے بیکس و ناتھ

وہ ہاتھ چومتے تھے قلم جن کی اُنگلیاں
چکی چلائیں جیل کی یہ اُن پہ سختیاں

افسانہ اُن کا ہو گیا گونگے کا خواب کیا؟ بڑھ رہے ہیں مور د قہر و عتاب کیا؟
میعاد کم نہ ہو گی سزا کی جناب کیا؟ یکساں رہیگا دور مہ و آفتاب کیا؟

ہولی بھی ایکی بیت گئی قید خانے میں
رکھی ہوئی ہے جان عزیز اور بیگانے میں

امسال سین ہولی کا کیا دردناک ہے ترکِ اجل کو چیدہ جوانوں کی تاک ہے
گندم فراق فصل میں خود سینہ چاک ہے اُڑتی زمیں پہ قحط سے غلے کی خاک ہے

مظلوم فاقہ کش کے لبوں پر ترانہ ہے

چھ سیر کا اناج ہے نازک زمانہ ہے

ہے خرچ اناج پانی کا پچیس پانچ پائیں زاید جو صرف بیس ہوئے وہ کہاں سے لائیں
چوری کریں کہ بی بی کو بچوں کو بیچ کھائیں کیا آپ کھائیں اپنے عزیزوں کو کیا کھلائیں

تہوار کی خوشی تو رہی درکنار ہے
فکر آہ خانہ داری کی گردن کا ہار ہے

مطرب سنا کوئی ہمیں پیارے وطن کا راگ دل کے سرو آنکھوں کے تارے وطن کا راگ
طاعون اور قحط کے مارے وطن کا راگ ہولی ہی کی ہو دھن میں ہمارے وطن کا راگ

سب قومی بھائی دیس کے ہولی میں راگ گائیں
خوشیاں منائیں رنگ چھڑکیں ملکی پھاگ گائیں

ہولی نے دن دکھایا ہے یہ غم بھلانے کو عیش و خوشی کے رنگ میں جلسہ منانے کو
بچھڑے ہوؤں کی یاد میں آنسو بہانے کو اور ملکی بھائیوں کو گلے سے لگانے کو

اے ہند ہند ہند کی اے پاک سرزمین
اے دلنواز دھرم کی ماتا ہے کیوں حزیں

اے بھارت آج دیس میں گھر گھر بدھائی ہے ملنے کو تجھ سے گر ترے پھر ہولی آئی ہے
ہمدردیوں کی بھائیوں میں خوشنمائی ہے باہم ہے اتفاق دلوں میں صفائی ہے

ہولی کا آنا سب کو مبارک مدام ہو
موسم سہانا سب کو مبارک مدام ہو

اے ہند آئی قوم کے گلزار میں بہار باغ امید میں ہیں اُگے پودے ہونہار
قومی ترقیوں کے ہیں آثار آشکار حب وطن کے جوش میں ہر جوش دل نثار

سب آج زیب تن کئے دیسی لباس ہیں
گاڑھے گزی کے تھان کئے اقتباس ہیں

صلح اور جنگ

از پردیسی سیلانی ایم۔اے

انقلاب وقت نے ہندوستان کی کایا پلٹ دی۔ وہ سرزمین جو شجاعت میں فرد اور بہادروں کی کان تھی۔ وہ ملک جو فن سپاہ گری کی نظیر تھا۔ آج اس قدر ڈرپوک اور کمزور ہو گیا ہے کہ بلی کی میاؤں پر شیر کی گرج کا اندیشہ ہے اور کان دبائے ہر ایک آنے والی مصیبت کا شکار ہونے کو تیار رہے کیا اس درجہ کمزوری قابل افسوس نہیں؟ کیا یہی وجہ ذلت و رسوائی نہیں؟ ہے اور ضرور ہے۔ مگر اس سے ہرگز یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ ہم آمادہ جنگ ہو کر وہی قتل و خون کا منظر پیش کر دینا چاہتے ہیں جس سے خدا خدا کر کے نجات ملی ہے۔ آہ جب ہم اس انسانی مقتل اور بے گناہوں کے خون کا خیال کرتے ہیں۔ بھائی کو بھائی کے گلے پر خنجر چلاتے دیکھتے ہیں تو ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ہمارے بدن میں سنسنی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہندوستان کے چپہ چپہ پر بہادروں کے خون کے ذرے چمکتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی مٹی میں شہیدوں کے خون کی گرمی موجود ہے مگر وقت کے ساتھ ہر ایک چیز میں تبدیلی لازمی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم بھی وقت کے انقلاب کے ساتھ اپنی خصلت اور عادت میں تبدیلی پیدا کریں۔ اور قدرت کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش کریں کیونکہ یہی ہماری نجات کا راستہ ہے ؏

خنجر اور شمشیر قتل اور خون کی لڑائی کا زمانہ نہیں۔ اب تہذیب و عقل میں جنگ ہے۔ قدرت نے ہماری رہبری کی ہے اور اس جگہ پہنچایا ہے جہاں

زرہ بکتر کی بجائے ہمارے جسم پر ریشم کے مہین کپڑے مانچسٹر کی کاریگری کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ جفاکشی کے بدلے پسینے سے بے قرار ہو جانیکی عادت ہم پر فتح پا چکی ہے۔ اور سامان جنگ کے بدلے نیزۂ قلم اور کاغذ کی ڈھال ہمارے ہاتھ میں ہے۔ یہ سامان ہے اور کہا جاتا ہے کہ ہم پر بغاوت کا بھوت سوار ہے! یہ جو کچھ سامان ہمیں ملا ہے تہذیب کی برکتیں ہیں اب عقل کی جنگ ہے اور دیکھنا ہے کہ ہمارے بزرگوں کی روح کہاں تک ہمارا ساتھ دیتی ہے۔ ہمیں انگریزی راج کی برکتوں اور عنایتوں کو ایک لحظہ کیلئے بھی نہ بھولنا چاہئے کیونکہ یہ تہذیب و ترقی اسی کا عطیہ ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اگر انگریز ہم پر فتح نہ پاتے تو ہم ویسے ہی خونخوار جاہل۔ جنگجو رہتے جیسے موجودہ تہذیب نفرت سے دیکھتی ہے ✦

لیکن کیا ہمیں ان بہادروں کو جنہوں نے اپنے ملک کے لئے خون بہایا جاہل کہنا زیبا ہے؟ ہرگز نہیں اگر ہم ایسا کہتے ہیں تو محض اس لئے کہ ہم بہادروں کے قدرشناس نہیں۔ ہم خود بہادر نہیں۔ کیونکہ جو خود بہادر ہیں وہ بہادروں کی ہمیشہ قدر کرتے ہیں۔ ہمارا اشارہ صرف اُن ناعاقبت اندیشوں کی طرف ہے جن کی خانہ جنگیوں نے آج ہندوستان کو یہ دن دکھایا۔ جب تک دنیا قائم ہے ملک پر نثار ہونے والوں کے نام ہمیشہ آفتاب بن کر چمکیں گے۔ اور ان ناعاقبت اندیش جاہلوں کی جنہوں نے اپنے ملک۔ اپنی قوم اور اپنی عزت کو برباد کیا اعمال کی سیاہی اُن چاند تاروں کے لئے گھن بنی رہیگی ✦

امن کی برکتیں لازوال ہیں وہ ملک جس میں امن ہے۔ وہ بادشاہ جس کی رعایا خوش حال ہے۔ اور وہ قوم جس کے افراد میں اتفاق ہے مبارک

ہے۔ تہذیب خواہ کتنی ہی گر جائے۔ جہالت خواہ کتنی ہی پھیل جائے ۔
غفلت خواہ کتنی ہی چھا جائیگا۔ امن کی برکتوں میں کبھی فرق نہیں آسکتا۔
لیکن دیکھنا یہ ہے کہ وہ پرشوکت چیز جس کی رہنمائی خضر کی رہنمائی کہی
جاتی ہے۔ وہ چیز جس کا سایہ ہما کا سایہ خیال کیا جاتا ہے۔ وہ چیز جسے ترقی
کی نشانی خیال کرتے ہیں کیا ہے؟ اس کے سامان کیا ہیں؟ اور اس کی
شرائط کیا ہیں؟ امن وہ نگیں ہے جسے کدورت کی خاک چمکنے نہیں دیتی
امن وہ نقش ہے جو نفرت کے تیزاب سے مٹ جاتا ہے۔ امن وہ پھول
ہے جس پر محبت و پیار کے بلبل نغمہ سرائی کرتے ہیں۔ اور عزت اور قدر کا
پانی اسے سیراب کرتا ہے +

ہندوستان جہاں اس کے بہادر اور جنگجو مشہور ہیں وہاں ان کی
برداشت کی طاقت بھی ضرب المثل ہے تحمل اور استقلال ان کا رہنما رہا
ہے۔ وہ اس وقت تک آمادہ جنگ ہو کر خون بہانا نہیں چاہتے جبتک
وہ اس کے لئے مجبور نہ کئے جائیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر کوئی ایک گال پر
تھپڑ مارے تو دوسرا گال کیونکر سامنے کر دیا جاتا ہے۔ ان کی برداشت
کہانی یا فسانہ نہیں۔ ایسے ملک اور ایسی قوم سے جن میں یہ دونوں خوبیاں
موجود ہوں بہتر تہذیب و عقل کی جنگ کی آزمائش کا موقعہ نہیں مل سکتا
اس میں اب بھی امن ہے۔ اور خدا کرے ہمیشہ تک امن رہے مگر ہمیں کیسے
امن کی ضرورت ہے؟ اگر ایسا امن مطلوب ہے کہ ہم میں جان نہ رہے
ہم میں اپنی توہین کا احساس نہ ہو اور ہمیں دنیا کی بھلائی برائی سے سروکار
نہ ہو تو ہم اسے برکت نہیں بلکہ ذلت جانیں گے۔ اس درجہ خود فراموشی
زوال اور بربادی کی علامت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح کے

امن سے بھی کشت وخون نہیں ہوتا۔ بے گناہ قتل نہیں کئے جاتے۔ مگر یہ غفلت کی نیند اُس زنگ کی طرح ہے جو لوہے کے جگر میں بیٹھکر اُسے چاٹتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ایسے بہادر ملک میں پیدا ہوں جو اپنے ملک کی توہین کو اپنی توہین جانیں۔ عزت وغیرت کا ہر دم خیال ہو۔ اور ایثار نفس کا مادہ اُن میں موجود ہو +

تقسیم بنگال کے زمانہ سے ہندوستان کی حالت میں ایک عجیب انقلاب پیدا ہوا ہے۔ اور مشرق سے مغرب شمال سے جنوب تک ہر ایک ہندوستانی اس انقلاب کو محسوس کر رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض لوگ وہ دسے زیادہ بیقرار ہوں۔ اور بعض ضبط کی طاقت رکھتے ہوں مگر یہ کہنا غلط نہیں کہ ایک ہندوستانی بھی ایسا نہیں جس پر اس انقلاب کا اثر نہ ہوا ہو۔ کہا جاتا ہے کہ اس انقلاب میں صلح اور جنگ کا سوال ہے۔ ایک فریق جنگ کے لئے خواہ وہ تہذیب وترقی کی جنگ کیوں نہ ہو آمادہ ہے اور دوسرا امن کا شیدائی ہے مگر یہاں ایک اور ضروری سوال پیدا ہوتا ہے کہ جنگ اور صلح کن میں ہوا کرتی ہے؟ کیا کوئی کمزور شخص کبھی آمادہ جنگ ہو سکتا ہے؟ کیا کسی کمزور کی صلح کی آرزو کو پورا کیا جاتا ہے؟ ہمیں افسوس کے ساتھ اسکا جواب ضمیر سے نفی میں ملتا ہے۔ کمزور ہمیشہ خطاوار۔ کمزور ہمیشہ مورد عتاب کمزور ہمیشہ تباہ کر دینے کے قابل ہوا کرتا ہے۔ تاریخ کے واقعات ہمارے قول کی تصدیق کے لئے موجود ہیں۔ پس یہ تو ثابت ہو گیا کہ ہندوستانی نہ تو جنگ کے لئے آمادہ ہو سکتے ہیں اور نہ ان کی صلح کی آرزو پوری کرنیکا خیال کسی کے لئے لازمی ٹھیر سکتا ہے اتنا ضرور ہے کہ ایک درد دل میں اُٹھتا ہے جسے روکنا اور بند کرنا ناممکن ہے +

مہذب ممالک میں (جن میں افسوس اب ہندوستان شمار نہیں کیا جاتا) جنگ کے متعلق سوال پیش ہے اور اس پر غور کیا جا رہا ہے کہ سینکڑوں بندگان خدا کا خون جو معمولی جنگوں میں بھی بہایا جاتا ہے اس کا گناہ کس کی گردن پر ہوگا۔ کیا اس وحشیانہ طریق سے کسی طرح نجات مل سکتی ہے؟ انسانی زندگی اس قدر قیمتی ہے کہ اسے یوں بے دریغ برباد کرنا عقلمندی نہیں ہو سکتی اور اس کے متعلق ایک ہیگ کانفرنس یوروپین ممالک میں مختلف تاجداروں کو آمادہ کر رہی ہے۔ اس کانفرنس کے مقاصد مختصراً یہ ہیں کہ وہ آلات جنگ جو سینکڑوں اور ہزاروں جانیں چشم زدن میں تلف کر دیتے ہیں اور جن کا مقابلہ انسانی طاقت نہیں کر سکتی استعمال نہ کئے جائیں۔ جہانتک ہو سکے بغیر جنگ کے فیصلہ ہو جانا چاہئے۔ یہ خیالات نہایت مبارک ہیں مگر ہندوستان میں جو آلات استعمال کئے جا رہے ہیں اور ہزاروں ہندوستانیوں کی بربادی کا باعث ہو رہے ہیں اگرچہ وہ آلات جنگ کی نسبت زیادہ زہر آلود ہیں اور ان کا زخم جان کے ساتھ جاتا ہے۔ کیا کوئی کانفرنس ایسی ان مہذب ممالک میں کبھی بنے گی جو ان مہلک آلات سے ہندوستانیوں کو جو بندگان خدا ہونیکا حق تو ضرور رکھتے ہیں نجات دلائے! دل آزاری۔ نفرت۔ حقارت اور حق تلفی۔ یہی زہریلے آلات ہندوستان کی بربادی کا باعث ہوئے ہیں۔ اور انہی کی شکایت ہر دم ان کی زبان پر ہے۔ وہ تیرۂ قلم اور کاغذ کی ڈھال سے انکا مقابلہ نہیں کر سکتے کیونکہ مقابلہ کرنا بغاوت ہے۔ کمزور کی اپنی محافظت بھی بغاوت ہوا کرتی ہے۔ قانون قدرت یہی ہے کہ دنیا میں وہی زندہ رہ سکتا ہے یا زندہ رہنے کے قابل ہے جو طاقتور ہے اور جس کی طاقت محسوس کی جاتی ہے۔ ناظرین حیران ہونگے کہ ہمارا مضمون کیا تھا اور ہم کیا لکھنے لگے

تھے۔ مگر جو کچھ ہم نے کہا وہ ایک جملہ معترضہ تھا اس طول طویل بحث سے صرف یہ جتلانا مطلب تھا۔ کہ

(۱)۔ کمزور کبھی آمادہ جنگ نہیں ہو سکتے +

(۲)۔ تہذیب و ترقی امن کی خواہش پیدا کرتی ہے +

(۳)۔ امن کے لئے محبت اور پیار کی ضرورت ہے +

ہندوستانیوں کی محسن پرستی زبان زد خلائق ہے اور اس کی ایک ادنے دلیل یہ ہے کہ باوجود بعض نا عاقبت اندیش حکام کے جبر اور سختی کے وہ انگریزی راج کی برکتوں کو نہیں بھولے اور جہاں ان سختیوں کی جو انہیں برباد کئے ڈالتی ہیں شکایت کرتے ہیں وہاں انکی بہت سی برکتوں کی ہر وقت تعریف کرتے ہیں جو انہیں انگریزی راج میں حاصل ہوئی ہیں اس لئے یہ خیال کرنا کہ ان میں بغاوت کا خیال پیدا ہو گیا ہے۔ ایک خوفناک نادانی ہے۔ نفرت سے نفرت اور حقارت سے حقارت کا پیدا ہو جانا لازمی ہے اور اس کی اگر کوئی شکایت ہمارے حکام کو ہے تو اس کا علاج ان کے اپنے ہاتھ میں ہے اور اس لئے یہ شکایت بالکل بے جا ہے اگر وہ چاہتے ہیں کہ رعایا ان سے محبت کرے اور وفادار بنی رہے تو یہ لازمی ہے کہ وہ رعایا سے محبت کریں۔ اگر وہ چاہتے ہیں کہ ان کے دلوں میں نفرت نہ ہو تو یہ ضروری ہے کہ وہ ان کی عزت کریں۔ ہندوستانیوں کے لئے صلح اور جنگ کا سوال ایک معمہ ہے جسے حل کرنے کے قابل وہ نہیں رہے اس کا حل گورنمنٹ کے ہاتھ میں جسے وہ اپنی مرضی کے مطابق حل کر سکتی ہے +

تہذیب و ترقی میں کہا جاتا ہے کہ ہندوستان ابھی بہت پیچھے ہے مگر ہم کہیں گے کہ وہ باتیں جن کی ابھی اور ممالک کو تلاش ہے وہ مدت سے یہاں

موجود ہیں افسوس ہے کہ ان کی قدر کرنے والے نہیں۔ ہیگ کانفرنس جس کوشش میں ہے وہ یہاں کی خصلت ہے۔ ہندوستانی امن کے شیدائی ہیں مگر افسوس کہ ان سے ایسا سلوک نہیں کیا جاتا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہماری شکایتوں کو سنو۔ ان پر غور کرو ہماری فریاد سے ہمدردی کرو مگر اس کے جواب میں وہ باغی ٹھیرائے جاتے ہیں اور انہیں ایذا پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر ان کی شکایات سُنی جائیں اور ان پر غور کیا جائے تو ہرگز ان کی فریاد کی آواز بلند نہ ہو +

ہندوستان میں جنگ یا بغاوت کا خیال ۵۷ء کے بعد ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوا تھا اور یہ خیال ان حکام کی اپنی غلط کاریوں کی تصویر تھا جنہوں نے محض سخن پروری کے لئے سینکڑوں ہندوستانیوں کی دل آزاری روا رکھی۔ ورنہ اصلیت جو کچھ تھی وہ اظہر من الشمس ہے اور اس کا تجربہ ان حکام کو بھی ہوگیا۔ تاریخ قدیم کے واقعات اس شہادت کے لئے موجود ہیں کہ ہندوستانی ہمیشہ صلح جو رہے ہیں۔ اُنھوں نے جب کبھی تیغ ہندی کے جوہر دکھائے۔ تو ہمیشہ دشمنوں سے اپنے ملک کو بچانے کے لئے ورنہ وہ ہمیشہ امن سے رہنے کو ترجیح دیتے رہے اور یہ عادت انہیں اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملی ہے۔ پس یہ ضروری ہے کہ ان کی اس خوبی سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ اور تہذیب و اخلاق کا برتاؤ کیا جائے جسے زمانہ کی ترقی کہا جاتا ہے اور جس کی اس قدر کوششیں کی جاتی ہیں +

جب کسی کے برے دن آتے ہیں تو اس کی عادت خصلت اور اعمال میں بھی اس کے مطابق فرق آجاتا ہے۔ جب ہندوستان کے بُرے دن آئے تو اُس میں خانہ جنگیاں شروع ہوئیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج اس درجہ حقیر

و ذلیل ہیں کہ غیر ممالک میں ہم معمولی انسانیت کے برتاؤ کے مستحق نہیں سمجھے جاتے۔ اب ہماری تہذیب کے ساتھ نئی روشنی اور ہمارا تجربہ آملا ہے عقلمندی اس میں ہے کہ ہم اِن سے فائدہ اُٹھائیں مگر ہم افسوس کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ معمولی باتوں کے لئے ہم آپس میں لڑے مرتے ہیں۔ کیا ان کمزوریوں کے ساتھ ہم کبھی ترقی کی اُمید رکھ سکتے ہیں ہرگز نہیں۔ اے ملک کی حقیقی بہتری چاہنے والو۔ اے ملک پر نثار ہونے والو۔ اے وطن پرستو اگر تم حقیقت میں ہندوستان کو معراج عظیم پر پہنچانا چاہتے ہو تو تمام جزوی اختلافات کو مٹا کر محبت اور اتفاق سے ملکر بہتری کی کوشش کرو۔ پرواہ نہیں کہ تمہارا عقیدہ کیا ہے۔ کوئی ہندو ہے یا کوئی مسلمان۔ کوئی عیسائی ہے یا برہمو۔ کوئی آریہ ہے یا سناتن دھرمی ملک کا کام سب کے لئے ایک ہے۔ اس کی بہتری میں سب کی بھلائی ہے۔ اس لئے کہ کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہم ملکر کوشش نہ کریں۔ ایک دوسرے کے عقاید کی عزت کرو۔ کوئی کام ایسا نہ کرو جس سے دوسرے کی دل آزاری ہوتی ہو اگر تم ایک کام نہ کرنے سے اپنے اہل وطن کو خوش کر سکتے ہو جو ملکی ترقی کا باعث ہوگا تو کیا یہ ضروری نہیں کہ تم یہ ناچیز قربانی کردو۔ اگر ان مبارک ارادوں اور اعمال کے ساتھ ملکی ترقی کا بیڑا اُٹھاؤ گے تو یہ ناممکن ہے کہ تم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو۔ کمزوروں میں کبھی صلح اور جنگ کا سوال نہیں ہوا کرتا جب تم ایک طاقت ہوگے تو تمہارے لئے بھی یہ دلچسپ و لطف انگیز سوال ہوگا۔ جسے تم خوشی خوشی حل کروگے اور ملک کی زندہ قوموں میں شمار کئے جاؤگے۔ خدا تمہارے ارادوں میں برکت دے ✚

مناظرہ

اس عنوان سے بحث طلب مضامین درج آزاد ہؤا کریں گے
ہر ایک مضمون ایک جواب اور لکھنے والے کے جواب الجواب پر
مکمل سمجھا جائے گا +

فیوڈذات کا روشن پہلو

از منشی "روشن رائے" صاحب

ملک کی ترقی کے ساتھ ساتھ قومیت یا تفریق قومیت مٹا دینے کی فکر کی جا رہی ہے۔ ملکی ریفارمروں کا عقیدہ ہے کہ ملکی ترقی کے لئے تفریق ذات کا مٹ جانا ضروری ہے ان کا یقین ہے کہ ہندوستان کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ تفریق ذات ہے مگر اس سے پیشتر کہ ہم اس مسئلہ کے متعلق کوئی فیصلہ دیں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کے روشن پہلو پر بھی نظر ڈالیں۔ اگر ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ ہندو سوسائٹی جس سے اس وقت میری مراد ہندوستانیوں سے ہے۔ میں اخلاق اور اتفاق کو قایم رکھنے والی کیا چیز تھی اور اُنھوں نے اپنے خون کو کیونکر پاک بنایا تو یہ معلوم ہوگا کہ ان سب باتوں میں بیشتر حصہ قومیت کا تھا۔ قومیت کی بنیاد کیونکر پڑی یہ معمہ بھی ہمارے مضمون پر بہت کچھ روشنی ڈالیگا +

منو دھاراج کی قابلیت اور دور اندیشی سے تو شاید کسی عقلمند کو بھی

انکار نہ ہوگا اور یہ مانتے ہوئے تفریق قومیت کو جہالت کا ثمرہ خیال کرنا افسوسناک ناقدردانی ہوگی۔ تاریخ ہمیں بتلاتی ہے کہ تہذیب وعلم کی ترقی کے ساتھ ہر ایک ملک کے باشندوں میں تدریجاً لوگ چار فرقوں میں تقسیم ہوگئے +

(۱)۔ وہ لوگ جو عالم ہوں اور مذہبی فرائض کے رہنما بنیں +

(۲)۔ وہ بہادر جو دشمنوں سے اپنے ملک کو بچائیں اور امن قائم رکھیں +

(۳)۔ وہ ہنرمند جو اپنے ملک کی ضروریات کو پورا کریں اور اہل وطن کی آسائش کے سامان بہم پہنچائیں +

(۴)۔ وہ لوگ جو چاروں فرقوں کی امداد کریں اور انہیں اپنے اپنے فرائض کو اطمینان سے انجام دینے کے قابل بنائیں +

اس قانون کو مانتے ہوئے ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑیگا۔ کہ منو مہاراج کی تفریق ذات ہندوستانیوں کے لئے جن کی تہذیب نہایت پورانی ہے۔ کوئی نئی بات نہ تھی۔ یہاں تک تو میں خیال کرتا ہوں مجھ سے میرے بہت سے اہل وطن اتفاق کریں گے۔ مگر اختلاف صرف اس بات پر ہے کہ قومیت کی فرلق بندی کی کیا ضرورت تھی؟ کیوں ہر ایک عالم شخص خواہ وہ کسی خاندان میں پیدا ہوا ہے۔ برہمن نہیں ہوسکتا اور کیوں ایک جاہل برہمن شودر کے درجے تک نہیں گر سکتا۔ اگر وہ اپنے فرائض کو انجام نہیں دیتا؟ اسکے متعلق میں صرف اس قدر کہنا کافی خیال کرتا ہوں کہ یہ بات پیشتر تھی بلکہ نئی تہذیب نے اسے کسی قدر کمزور کردیا۔ برادری کی طاقت یا رسوخ کم کرنے میں ہماری نئی تہذیب کا بہت بڑا اثر ہوا ہے۔ اور اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ پرانے عقیدوں کے مطابق کسی برہمن کا جو اپنے فرائض کو بخوبی انجام

نہ دیتا ہو اسے برادری سے خارج کر دینا وہی معنے رکھتا ہے۔ جو ناقابل برہمن کو شودر شمار کرنے سے سمجھے جاتے ہیں۔ بلکہ برادری سے خارج کر دیا جانا نیچ ذات کی برادری میں شامل ہونے سے بدرجہا زیادہ ذلت کا باعث ہوتا ہے۔ جو شخص اپنے ملک کے متعلق اپنے فرائض کو سمجھے کیا وہ اس قابل نہیں ہے۔ کہ چھوٹی چھوٹی سی برادری بھی اسے اپنا ممبر بنانے میں شرم جانے؟ کیا کوئی برادری کسی ایسے شخص کو جو اپنی برادری میں حقیر اور ذلیل جانا جاتا ہے قبول کرنے کے لیئے تیار ہوگی؟ ہرگز نہیں اور میرے خیال میں ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے کیونکہ جب فرض فراموش لوگوں کے ساتھ ایسا سلوک نہ کیا جائے ان کے راہ راست پر آنے کی اُمید نہیں کی جاسکتی ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سی اخلاقی کمزوریاں محض برادری کا رسوخ اور طاقت نہ ہونے کے باعث پیش آرہی ہیں۔ مثلاً ایک شخص شراب پیتا ہے مگر وہ اس گناہ کے لیئے اپنی برادری سے خارج نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ اہل برادری موجودہ تہذیب کے مطابق خیال کرتے ہیں کہ انہیں استحقاق نہیں اور اگر چند منچلے ایسا کر بھی بیٹھتے ہیں تو وہ شخص یہ کہکر کہ برادر برادری کیا ہے اپنی غلط کاریوں کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتا۔ اگر برادری کی آواز کوئی طاقت رکھتی ہو اور وہ اس کے اثر کو محسوس کرتا ہو تو یقیناً وہ اس عیب سے بہت جلد نجات پائیگا۔ ہمیں ہر کام اور ہر بات میں برادری کی امداد کی ضرورت ہے۔ اور اس امداد سے وہ کام ہو سکتا ہے جو سینکڑوں تقریروں۔ لاکھوں اخبارات اور ہزاروں ریفارم کی آوازوں سے نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر سودیشی کو لیجیئے۔ سودیشی میں جس قدر عمل کھانڈ کے متعلق کیا گیا۔ شاید کسی اور سودیشی چیز کے متعلق نہیں کیا گیا

وجہ اس کی محض یہ ہے کہ اس معاملہ میں محبان وطن نے برادری کی طاقت سے کام لیا اور اس طاقت سے برسوں کا کام دنوں میں ہوگیا۔ میں مانتا ہوں کہ تفریق ذات سے ترقی میں رکاوٹیں ہوں گی۔ مگر اس کے ساتھ ہی میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ برادری کی طاقت ہندوستان کے لیئے بہت بڑی طاقت ہے اور اگر مختلف برادریاں ایسی تجویزوں کو فرداً فرداً عمل میں لانے کی کوشش کریں جو ملک کے لیئے مفید ہیں تو بہت جلدی ہماری اُمیدیں بارور ہوسکتی ہیں۔ جب تک ہم میں یہ خوف نہ ہو کہ اگر ہم اپنے فرائض کو بخوبی انجام نہ دیں گے ہم اپنی برادری یا قوم کے رکن نہیں رہ سکتے۔ کسی حقیقی بہتری کی امید نہیں کی جاسکتی +

مندرجہ بالا چند سطور سے یہ تو ناظرین نے معلوم کرلیا ہوگا۔ کہ برادری کی طاقت ازبس ضروری ہے اگر کسی چیز کو مٹا دینے کی ضرورت ہے تو وہ بیرونی اختلافات بے پایاں کی ہے۔ میرا اپنا عقیدہ ہے کہ اگر ہم صرف اپنے اپنے کام کو بغیر دوسرے کے کاموں یا مقاصد کو نقصان پہنچانے کے کئے جائیں تو ہم ضرور کامیاب ہوسکتے ہیں۔ میرا اپنا یقین ہے کہ اگر ہند مسلمان کبھی بجائے ملکر کام کرنے کے فرداً فرداً اپنی قوم کی فلاح کی کوشش کریں اور کوئی بات ایسی نہ کریں جس سے دوسرے فریق کی دل آزاری یا دل آزردگی ہو ایک دوسرے کے مقاصد کی عزت کریں خواہ خود ان پر یقین نہ رکھتے ہوں تو بہت سی ملکی ترقی کی اُمید کی جاسکتی ہے۔ حقیقت میں قیود ذات سے وہ کام جو ہمیں ملکر کرنا تھا۔ سب میں تقسیم ہوجاتا ہے اور ضرورت ہے کہ ہم اپنے اپنے فرض کو انجام دیئے جائیں۔ تاکہ تمام قومیں ترقی کریں اور جب سب قومیں ترقی کرجائیں گی

تو ملک جو مختلف اقوام کا مجموعہ ہے خود بخود ترقی کی منزلیں طے کریگا +

چھوٹی ذاتوں سے نفرت کا جو برتاؤ کیا جاتا ہے وہ البتہ نہایت افسوسناک ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے سینکڑوں بھائی ہم سے چھینے جا رہے ہیں۔ شودر یا خدمت گذار قوم سے صرف وہ لوگ مراد ہے جنھوں نے اپنے اعمال اور اخلاق سے خود کو اس قابل بنایا کمزوری بھی بہت بڑا عیب ہے۔ اور اس لئے وہ لوگ جن کے دماغ کمزور تھے اور وہ لوگ جو زور بازو نہ رکھتے تھے۔ یہی اس فرقہ میں محدود کر دیئے گئے کیونکہ اگر وہ اور فرقوں کے ساتھ شامل رہتے تو یقیناً انہیں بھی کمزور اور بزدل بنا دیتے۔ ہمارا تجربہ بتلاتا ہے کہ جب سے ایسے لوگوں جن کے دل و دماغ کمزور تھے اور جن میں جسمانی طاقت بھی نہ تھی بہادر فرقہ کے ساتھ شامل ہوئے انہیں تباہ کر دیا۔ ایک قوم سپارٹنس ہوئی ہے جس میں رواج تھا کہ وہ بچہ جو کمزور پیدا ہو پیدا ہوتے ہی ہلاک کر دیا جاتا تھا۔ ظاہر میں تو یہ رسم نہایت وحشیانہ معلوم ہوگی کیونکہ ایک معصوم بچہ کا خون تہذیب و عقل کے نزدیک کبھی روا نہیں ہو سکتا۔ مگر جب ہم اس کے نتیجہ پر غور کرتے ہیں تو ہمیں ان کی دور اندیشی اور ہمیت کی بے اختیار تعریف کرنی پڑتی ہے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر ہماری قوم میں ایک فرد واحد بھی کمزور ہوا تو وہ تمام قوم کو تباہ کر دے گا۔ کمزور کی اولاد کمزور ہوگی اور اس طرح کمزور افراد کی تعداد بڑھتی جائے گی اور کمزوری تباہی کا پیش خیمہ ہے +

ہمیں یہ تو معلوم ہو گیا کہ ہندوستان میں صرف اس فرقہ کا نام شودر تھا جو جسمانی یا دماغی کمزوریوں کا شکار ہو چکے تھے اور انہیں سب

لوگ اس لئے حقیر جانتے تھے کہ وہ خود پر بھروسہ کرنے کے قابل نہ تھے۔
جو مورخین شودروں کو ہندوستان کے مفتوح اصلی باشندے بتلاتے ہیں ان کے نکتہ خیال سے بھی وہ لوگ حقیر جانے جاتے تھے۔ کیونکہ اُنہوں نے اپنی آزادی کھودی اور ایک غیر قوم کے تابع فرمان ہوگئے۔ خیر یہ سب باتیں تو مضمون کو بہت طویل بنا دیں گی غرض اس تحریر سے صرف یہ ہے کہ تفریق ذات کی بنیا د محض ناقابل آدمیوں کو علیحدہ کرنے اور باکمال ہنرمندوں کی عزت و حوصلہ افزائی کے لئے ڈالی گئی تھی زمانہ نے اِس میں بہت سے انقلاب پیدا کئے اور ممتاز ذاتوں نے جن کی خوبیاں دوسروں کو اپنا ایسا بنانے اور جن کی ان لوگوں سے جنہوں نے خود کو حقیر بنا دیا تھا نفرت انہیں ترقی کے لئے آمادہ کرنے کے لئے تھی مغرور ہو کر اپنے بھائیوں کو اپنے سے بالکل علیحدہ ہی کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نہ صرف خود گر گئے بلکہ رفتہ رفتہ ان کی جمیعت کم ہوتی گئی اور آخر کار اس قدر حقیر اور تباہ ہوئے جو ہم آج کل دیکھ رہے ہیں غیر ملکی مذاہب نے اس تفرقہ سے بہت فائدہ اُٹھایا مگر اس وقت یہ ہمارا مضمون نہیں کیونکہ کسی مذہب کو اچھا اور دوسرے کو بُرا کہنا ہمارا کام نہیں ہمارا عقیدہ ہے کہ ہر ایک مذہب میں کچھ خوبیاں ہیں جو ہر ایک شخص کو خواہ وہ کسی مذہب و ملت کا ہو سیکھنی چاہئیں۔ بعض اقوال مذاہب ایک ہی ہیں اور ہم ان سب پر متفق ہو سکتے ہیں محض تعصب سے ایک درست بات کو غلط کہنا یا ایک خوبی کو برائی جتلانا بہت بڑا گناہ ہے پس مذہب کے متعلق تو ہم کچھ کہنا نہیں چاہتے کہ ایسے لوگوں نے نئے مذہب کا رنگ و روغن چڑھا [illegible] غلط [illegible]

عقلمندی مگر ہم اس قدر کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مذہب کو وسعت دینے کے یہ ہرگز معنے نہیں کہ اس کے پیروؤں کی تعداد بڑھ جائے خواہ اس مذہب کے اقوال پر عمل نہ کرتے ہوں - ہمارا اپنا عقیدہ تو یہ ہے کہ خواہ کسی مذہب میں متعدد آدمی ہوں مگر وہ معتقد فرد ایسے ہونے چاہئیں جو اپنے مذہب کے اقوال کو بخوبی سمجھ سکتے ہوں اور نئے مذہب پر ایمان لانے سے پیشتر انہوں نے اپنے اور نئے مذہب پر بخوبی غور کر لیا ہو - جاہل مطلق لوگوں کو نئے مذہب کا جامہ پہنانا کچھ معنے نہیں رکھتا بلکہ میرا خیال ہے کہ ان کی موجودگی سے مذہب کا خاص فرقہ ہر وقت خطرہ میں رہتا ہے اور ان نافہم لوگوں کے اعمال مذہب کے سچے حامیوں کو بھی بدنام کر دیتے ہیں پس ایسے لوگوں کے تبدیل مذہب سے جن سے نفرت کی جاتی تھی تو کچھ زیادہ نقصان نہیں پہنچا - اگر کوئی قابل افسوس بات ہے تو صرف یہ کہ بعض ایسے لوگ بھی جو ملک اور قوم کے لئے واقعی مفید ہو سکتے تھے ہم سے چھین گئے اور ان کے لئے ہم جس قدر افسوس کریں بجا ہے - وہ معزز قومیں اور فرقے جو اپنے اُن بھائیوں کو اس قدر حقیر اور ذلیل جانتے تھے ان کی اپنی حالت بھی قابل غور ہے - کون نہیں جانتا کہ برہمن سے مراد آج کل باورچی ہے - چھتریوں کے لڑکے اردلی اور برتن صاف کرنے والے نوکروں کا کام کرتے ہیں - ہمیں اپنی یہ حالت دیکھ کر افسوس ہوگا اور ہونا چاہیئے - مگر صرف افسوس سے ہی کام نہیں چلتا - ضرورت تو اس بات کی ہے کہ ہم اپنے زوال کے اسباب معلوم کریں اور آیندہ احتیاط سے کام لیں - اول وجہ ہمارے قومی زوال کی یہ معلوم ہوئی کہ ہم نے اپنے بھائیوں کو حقیر جانا اور اس غرور کا نتیجہ زوال ہوا - ہمار

اپنے اعمال سے انہیں ترقی کا راستہ دکھلانا تھا مگر ہم خود بھی گمراہ ہو گئے +

(۲)۔ ہم نے احساس قومیت کو بالکل مٹا دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ہم سے اپنی خود عزت کرنے کی خوبی جاتی رہی جو ہماری قومی عزت کو قائم رکھنے کے لئے سب سے ضروری بات ہے +

(۳)۔ امداد باہمی کا طریقہ بالکل مفقود ہو گیا +

تجربہ سے فائدہ اُٹھانا اور تاریخ اور تجربہ کو اپنا رہنما بنانا دنیا کی زندہ قوموں کا دستور العمل رہا ہے اور اگر ہم ترقی کرنا چاہتے ہیں۔ تو ہمارے لئے بھی اسی اصول کی پابندی لازمی ہے۔ آج کے مضمون سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ تفریق قومیت قایم رکھتے ہوئے بھی ہمیں اپنے اپنے فریق کی بہتری کی دل و جان سے کوشش کرنی چاہیئے۔ اور یہ کوشش بالکل غیر متعلق ہونی چاہیئے۔ اگر ہم اس طرح اپنے کام کو تقسیم کر کے سرگرمی سے کرتے رہے تو ضرور ہماری طاقت متحد ہو کر بھی کام کرنے کے قابل ہو سکے گی۔ ہمیں اپنی طرز معاشرت اور اعمال سے اُن لوگوں کو جو اخلاقاً یا جسمانی طور پر کمزور ہو گئے ہیں۔ ترقی پر آمادہ کرنا چاہیئے۔ ان لوگوں کی جو حقیر اور نیچ خیال کئے جاتے ہیں۔ امداد کر کے حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے۔ اور ہماری سخت کوشش اس طرف ہونی چاہیئے۔ کہ وہ اپنے اور اپنے ملکی فرائض کو سمجھیں۔ جب وہ اس قابل ہو جائیں گے تو پھر یہ دشوار ہو گا کہ انہیں اعزاز قومیت سے محروم رکھا جائے۔ شودر یا حقیر و ذلیل ہمیں صرف ان لوگوں کو جاننا چاہیئے جو ملک کی خدمت کو اپنا فرض نہیں خیال کرتے۔ اپنی ذاتی بہتری

کے لئے اپنے بھائیوں کا گلا کاٹتے ہیں۔ ذرا سی دنیاوی عزت وشہرت
کے لئے جھوٹ بولنے سے بھی پرہیز نہیں کرتے +

منو مہاراج کے زمانہ میں بھی ضرورت کے مطابق ذاتوں کی تقسیم
ہوئی تھی۔ اب بھی ملکی ضروریات کے مطابق یہ تقسیم ضروری ہے +

(۱)۔ وہ لوگ جو ایڈیٹری کا کام اپنے ذمہ لیں +

(۲)۔ وہ لوگ جو ملک کی بہتری کی تجاویز پر عمل کرنے پر ملک
کو آمادہ کریں +

(۳)۔ وہ لوگ جو ہماری ضروریات کو پورا کریں اور ملکی صنعت
کو ترقی کردیں +

(۴)۔ وہ حقیر اور قابل نفرت لوگ جو اپنے ملک کی بربادی کرنے
والے ہیں +

اس طرح وہ لوگ ہماری نفرت کو محسوس کریں گے اور عجب نہیں
کہ جلد راہ راست پر آجائیں۔ اگر ہم برادری کی طاقت کو پھر مضبوط
بنانے کی کوشش کریں تو بہت سی کمزوریاں محض اس طاقت کی
امداد سے رفع ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ برادری کا رسوخ ہمیشہ بڑی زبردست
طاقت ثابت ہوئی +

ہندوستان کی آیندہ قوم نہ تو ایسی قوم ہوگی جس کا مذہب ایک ہو جائے
نہ ایسی قوم ہوگی جس کا طرز معاشرت ایک ہو جائے اور نہ وہ ایسی قوم ہوگی جو کسی
خاص روحانی یا اخلاقی اصول کے تابع ہو جائے ہم لوگ اپنے گذشتہ حالات کو بھول
نہ جائیں گے ہندو ہندو رہینگے اور مسلمان مسلمان (بابو بپن چندر پال)

ہولی

از ملک الشعرا منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی

پنجاب نے گذشتہ چند سال میں خاصی ترقی کی ہے ایام ہولی میں کئی مہذب جلسے ہونے لگے ہیں ہندو سبھا لاہور کی طرف سے بھی ایک جلسہ منعقد ہوا تھا جس میں حضرت افق نے یہ دلکش نظم پڑھی تھی جسے ہم نے آزاد کیلئے مانگ لیا امید ہے ناظرین دلچسپی سے پڑھیں گے۔ ایڈیٹر

اُفق سرور دلی آج کا ہے عالمگیر — نصیب عیش کے عشرت کی جاگی ہے تقدیر

ہر اک طرف نظر آتا ہے لطف سیر بہار — گلی گلی سے لیجاتا ہے گلشن کشمیر

جدھر نظر اُٹھی ہولی کا رنگ آیا نظر — کھنچی ہی سر گردوں بھی پھاگ کی تصویر

ہزارے مارتے ہیں باغ میں جو فوارے — بھرے ہے چرخ پہ پچکاریوں کو ابر مطیر

فلک کے مُنہ پہ ملا ہے گلال سورج نے — شفق نہ سمجھیں اسی نوجوان و طفلک و پیر

ہے دھوکا لوگوں کو خورشید پر غلط کہ ہے مہر — یہ قمقمہ ہے وہ جسمیں بھرا ہوا ہے عبیر

فلک پہ جیسے بغلگیر بُرج جوزا ہے — محبتوں سے گلے ملتے ہیں امیر و فقیر

اگر سپہر پہ بادل خوشی سے گرجیں گے — تو صحن باغ میں طاؤس کہہ اُٹھینگے کبیر

وہ دن ہے آج کہ چھوٹے بڑے برابر ہیں — نہیں ہے شان کی پروا کبیر ہے کہ صغیر

عدو کے دل سے بھی دھوتے ہیں غبار کو آج — بھگو کے بھیگ کے رنگوں سے لگکے ملتے کبیر

نہیں شک اسمیں کہ ہے خوش نصیب ہندو قوم — جواب اسکا نہ ابتک ہوا نہ اس کی نظیر

کچھ اس اصول پہ قایم کیا ہے یہ تیوہار — کہ بڑھ سکے اور نہیں اتفاق کی تدبیر

جو ڈالے رنگ ملے منہ پہ یا عبیر گلال — عداوتیں نہ رہیں سب بہم ہوں شکر و شیر

میں سچے دل سے ہوں ہندو سبھا کا شکر گذار — کہ اس نے ٹھیک کیا جو بگڑ گیا تھا خمیر

ماہ گذشتہ

بس نامور بزیر زمیں دفن کردہ اند
کز ہستی اش بروئے زمیں یک نشاں نماند

کاش انسان اپنی ہستی کو اس قدر جلد نہ بھول جاتا اور اسے خیال ہوتا کہ مجھے ایک دن اس شہنشاہوں کے شہنشاہ انصاف کل کے دربار میں جانا ہے جہاں میرے اعمال کا کچا چٹھا موجود ہے اور جہاں میں جھوٹ بول کر خود کو نہیں بچا سکتا۔ بلکہ میرے لئے سوائے جرم کے اقبال کے اور کوئی تدبیر اپنے گناہ بخشوانے کی نہ ہوگی۔ اگر انسانی دل میں خدا کا خوف اور اس انصاف کا خیال ہوتا تو یقیناً دنیا میں کوئی برائی نہ ہوتی مگر دنیا کی بھول بھلیاں میں اس سے بچنا دشوار ہے۔ دنیا وہ تماشہ گاہ ہے جہاں ہم یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہمارے تمام کام فانی ہیں اور ہماری ہستی بھروسہ کرنے کے لئے قابل نہیں اپنے کرتبوں میں ایسے محو ہو جاتے ہیں کہ ہمیں اپنی ہستی کی خبر نہیں رہتی۔ سینکڑوں ساتھیوں کو سفر دنیا کرتے دیکھتے اور اپنے ہاتھوں زمین کو سونپتے ہیں مگر چند گھنٹوں نہیں نہیں چند لحظوں کے بعد ہمیں ہمارے دل سے اپنی ہستی کی ناپائداری کا خیال محو ہو جاتا ہے اور ہمارے دل پر وہی خیالات پھر قبضہ کر لیتے ہیں جن سے ہم اپنی ہستی کو بھولے ہیں +

ایسی ناپائدار زندگی رکھتے ہوئے اور اپنی ہستی کو ناقابل بھروسہ جانتے ہوئے کیا ہم کسی طرح ہمیشہ کی زندگی حاصل کر سکتے ہیں؟ کیا

کسی طرح ہمیشہ کی زندگی حاصل کر سکتے ہیں؟ کیا ہم میں یہ طاقت ہے کہ وہ زندگی جو ناپائدار ہے وہ ہستی جو ناقابل اعتبار ہے۔ وہ نام جو مٹ جانیوالا ہے۔ اسے غیر فانی بنا سکیں! ہاں ہم ایسا کر سکتے ہیں۔ خدا کی بے شمار برکتوں میں سے انسان کے لئے ایک برکت یہ بھی ہے۔ اور وہ برکت صرف نیکی ہے۔ نیکی کرو۔ بندگان خدا کے ساتھ بھلائی کرو۔ کسی کی دل آزاری نہ کرو۔ اپنی ذات سے کسی کو نقصان نہ پہنچاؤ۔ اور تمہیں حیات جاودانی عطا ہوگی۔ یہاں ایک عجیب سوال ہوسکتا ہے کہ کیا برائی کرنے والے اپنے نام کو غیر فانی نہیں بناتے؟ کیا ان کا نام ہمیشہ تک زندہ نہیں رہتا؟ ہمیں اس کا جواب ہاں کے سوا اور کچھ نہیں بن پڑتا۔ مگر کیا کوئی شخص یہ گوارا کرے گا۔ کہ جب تک دنیا قایم ہے جبتک سورج نکلتا اور زمین چکر کھاتی ہے۔ جبتک نیکی کی قدر کی جاتی ہے اسکے اعمال کے لئے نفرین کی جائے اور اس کے نام پر لعنت کے تیر برسیں؟ ہرگز نہیں۔ خوفناک لعنت۔ مہیب لعنت۔ نفرت انگیز لعنت۔ دل آزار لعنت لدنے سے ادنے۔ ظالم سے ظالم شخص بھی یہ گوارا نہیں کرسکتا کہ اس کا نام لعنت کے ساتھ یاد کیا جائے +

تھوڑی دیر کے لئے گذشتہ سال کے واقعات کو آئینۂ خیال میں جگہ دیجئے۔ دیکھئے جبر اور سختی کی تصویریں کس تیزی سے اپنا کام کر رہی ہیں۔ معصوم بیگناہ کیسی سہمی ہوئی صورتوں سے مصیبتوں کا مقابلہ کر رہے ہیں اور کس حسرت آلود نگاہ سے ان صورتوں کو تک رہے ہیں جن سے انہیں رحم انصاف اور ہمدردی کی توقع تھی مگر اس کے بدلے سختی اور بیرحمی کا سلوک کیا جا رہا ہے۔ در و دیوار سے حسرت برستی ہے اور ایک مایوسی کا عالم طاری ہے۔ وقت نکل گیا اس تصویر نے ہمیں اس قدر افسردہ بنا یا کہ ہمیں اپنے تن بدن کی ہوش

نہ رہی۔ ہم نے بیہوشی کے عالم میں وہ دن گذار دیئے اور ہم سنتے ہیں کہ وہ شخص جو بڑا قابل مدبر تھا۔ وہ شخص جسے اپنی زمانہ شناسی پر ناز تھا۔ وہ شخص جو تجربہ کار کہلاتا تھا۔ وہ شخص جسے بھروسہ تھا کہ میری تجاویز امن اور انتظام قایم رکھ سکینگی اپنی تجاویز کے نتیجہ کا انتظار نہ کر سکا اور اس سفر کے لیے اس سے پیشتر ہی تیار ہونا پڑا جو سب کو درپیش ہے۔ ناظرین ہمارے ان چند الفاظ سے سمجھ گئے ہونگے کہ یہ اشارہ مسٹر ڈنزل ایبٹسن کی طرف ہے جو ہم سے جدا ہو گئے۔ وہ دماغ جس میں استحکام سلطنت کے لیے طرح طرح کے خیالات بھرے تھے ہوا ہو کر ہوائی میں ملگیا وہ ہاتھ جس نے ہندوستانیوں کے لیے مصائب کا نقشہ کھینچا ہمیشہ کے لیے سرد ہو گیا۔ وہ کان جو ہماری فریاد سننے کیلئے بھرے بنجاتے تھے ہمیشہ کیلئے بہرے ہو گئے۔ وہ آنکھیں جن سے قہر کی بجلیاں ٹپکتی تھیں ہمیشہ کیلئے بند ہو گئیں۔ اب نہ وہ سلطنت ہے۔ نہ وہ حکومت۔ نہ وہ سختی ہے نہ زبردستی۔ نہ حضوری نہ خوشامد۔ نہ غدر نہ بغاوت۔ چین سے آغوش لحد میں سوتے ہیں اور دیکھنے والوں کیلئے عبرت کی تصویر ہیں کیا ہمیں اس شخص کی موت پر جس نے ہمیں مصائب میں پھنسایا۔ ہماری فریاد کو بغاوت کا نعرہ سمجھا ہماری محبت کو نخوت جانا خوش ہونا چاہیئے؟ ہرگز نہیں ہمارا یقین ہے کہ ایک ہندوستانی کو بھی مسٹر ڈنزل ایبٹسن کی موت سے خوشی نہ ہوئی ہوگی کیونکہ ہندوستانیوں کی روحانیت مسلم ہے اور وہ کسی ایسی تبدیلی کیلئے جو دنیا میں ہر ایک کیلئے ہے خوش نہیں ہوتے۔ کیا کسی شخص کی موت قابل مسرت ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ وہ تکلیف جو سب کے لیے ہے وہ مفارقت جو ہر ایک کیلئے لازمی اور اٹل ہے کبھی مسرت کا باعث نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی خوشی ہو سکتی ہے تو صرف یہ ہے کہ اس سوح کو جسے زمانہ کے ظاہری بناؤ سنگار نے فریفتہ کر لیا تھا کو

اپنی ہستی سے غافل بنا دیا تھا زیادہ دیر تک بھول میں نہ رہنا پڑا اور وہ ان
گناہوں سے بچ گئی جن کا بھول میں ہو جانا کوئی تعجب خیز بات نہ تھی۔ اب
وہ مبارک اور پاک روح جس نے دنیا میں حکومت اور بادشاہت کی تمام
دنیاوی ترغیبوں سے بالا ہو کر اس شہنشاہوں کے شہنشاہ کے دربار میں
اپنے گناہوں کی معافی چاہتی ہے آؤ ہم سب دعا کریں کہ اسکے گناہ بخش دیئے جائیں

ہر ایک زندگی پر اگر غور کیا جائے تو کچھ سبق حاصل ہو سکتا ہے ایک غریب و ناچیز کی زندگی
بھی نصیحت کی داستان کا ورق ہے سر ڈونزل ایبٹسن کی زندگی بھی نتائج سے خالی نہیں ہو سکتی ہم اگر تجربہ
اور اگلے زمانہ کے واقعات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنی چاہیئے کیونکہ یہی ایک چیز ہے جو ہمیں ان سے مل سکتی ہے
پہلا سبق جو ہمیں اپنے مرحوم دوست کی زندگی سے ملتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی ذرا
سی کمزوری اس کی تمام شہرت و نیکنامی کو کہ...یں ملا سکتی ہے اسلئے ہماری زندگی میں ایک
بھی کام ایسا نہ ہونا چاہیئے جس کیلئے ہم نفرت سے یاد کئے جائیں اور جو ہماری تمام نیکنامیوں کو
برباد کرنیوالا ہو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہی ڈونزل ایبٹسن جو ڈائرکٹر شرشتہ تعلیم پنجاب کے عہدے پر ممتاز ہو کر
ہندوستانیوں کو ممنون احسان بنا گیا تھا اپنے دوسرے دور میں جب وہ افسر اعلے ہو کر آیا اپنی
غلطیوں کی بدولت ایسا بدنام ہوا کہ ہندوستان میں مدت تک اسکی سختی یاد رہیگی دوسرا سبق انکی
زندگی سے ہمیں یہ ملا کہ جو لوگ کسی کام کو اس پر غور کرنیکے بغیر کرتے ہیں انہیں پشیمان ہونا پڑتا ہے
مدبری اور تجربہ کاری کی یہ شرط نہیں۔ ہم نے دیکھا کہ ڈونزل ایبٹسن کو اپنے
ان احکام پر جنہیں وہ ہندوستان میں امن قائم رکھنے کے لئے ضروری خیال کرتے
تھے پشیمان ہونا پڑا اگرچہ انھوں نے اس کی تلافی کی کوشش بھی کی۔ مگر ؎

کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

اپنے ارادوں کو بدل لینا۔ اپنے احکام کو واپس لینا اور اپنے کئے پر پچھتانا اگرچہ عیب نہیں کیونکہ اپنی غلطی کو مان لینا بھی بہت بڑی خوبی ہے مگر سلطنت کے نازک کام کرنے والوں کیلئے یہ بڑی بھاری کمزوری ہے تیسرا سبق ہمیں اپنے مرحوم دوست کی زندگی سے یہ ملتا ہے کہ خوشامدیوں اور غرض مندوں کی خوشامد پر حقیقت اور انصاف کو نہ بھول جانا چاہیئے +

سر ڈینزل ابیٹسن کا زمانہ بہرحال ہمارے لئے سبق آموز تھا اور ہمیں اس کے لئے ان کا مشکور ہونا چاہیئے۔ اگر وہ سختیاں نہ کرتے اگر وہ جلا وطنی اور جیل کے احکام نافذ نہ فرماتے تو ہندوستانیوں کی ترقی کا جسکے وہ دعویدار تھے امتحان کیونکر ہوتا؟ ان کی سختیوں نے ہماری خوبیاں اور برائیاں روشن کر دیں اور ہمیں دکھلا دیا کہ قوم پرستی کی شرائط کیا ہیں۔ مرحوم دوست کی مفارقت کیا کم تھی کہ ہم پر ذکاخیل کی آفت آئی +

مثل مشہور ہے کہ مصیبت تنہا نہیں آتی۔ ہندوستان اور اس کے غریب باشندوں کے لئے روز ایک نئی آفت کا سامنا ہے قحط اس درجہ پر پہنچ گیا کہ ہم معمولی قحط کو قحط نہیں سمجھتے جبتک دس بارہ سیر کا اناج بکے ہم اس میں مگن رہتے ہیں۔ یہ کیوں اور کس لئے؟ محض اس لئے کہ ع

مشکلیں اتنی پڑی مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

مصائب نے ہمارے دلوں کو ان کی برداشت کے قابل بنا دیا جسم کا وہ حصہ جس پر متواتر چوٹیں پڑیں رفتہ رفتہ مرجاتا ہے اور پھر اس پر کسی چوٹ کا اثر نہیں ہوتا۔ یا یوں کہئے کہ خدا مصیبتیں برداشت کرنے والوں کیلئے صبر بھیجدیتا ہے ورنہ ان کی زندگی وبال ہوجاتی۔ قحط کی برداشت نے اب ہمارے دلوں کو صبر بخشا۔ وبا جس نے ہمارے سینکڑوں نہیں ہزاروں نہیں۔ لاکھوں بھائی ہم سے جدا کر دیئے۔

رفتہ رفتہ اس درجہ پر پہنچتی جاتی ہے کہ ہمیں اس آفت سے کبھی صبر آجائے اور ہم اُسے بھی اپنی زندگی کے لیئے لازم و ملزوم سمجھ لیں ان سب آفات کے ساتھ ساتھ جنگی اخراجات (اگرچہ بہت سے اور اخراجات بھی ہیں) بھی ترقی کرتے جاتے ہیں اور ہمیں اندیشہ ہے کہ اگر یہی حالت رہی تو ایک دن ہم روٹی کو بھی محتاج ہوجائیں گے۔ کہا جاتا ہے کہ فوج امن قائم رکھنے اور ہماری حفاظت کے لیئے بڑھائی جاتی ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ ہماری محافظت نہیں کرسکتی۔ مثال کے طور پر ذکاخیل کے چھاپوں کو لے لیجیے۔ پشاور میں ڈاکہ زنیاں ہوئیں لاکھوں روپیہ لوٹ کر لے گیئے اور لاکھوں ہی اس کے تدارک کیلیئے خرچ کیا گیا۔ نتیجہ کیا ہوا؟ کیا ان بیگناہ مظلوم لوگوں کا جنہیں لوٹ کر تباہ کردیا گیا۔ ان کا گم شدہ روپیہ مل گیا۔ کیا ان آفات کا ہمیشہ کیلیئے فیصلہ ہوگیا؟ ہمیں افسوس کے ساتھ اس کا جواب نفی میں دینا پڑتا ہے۔ پھر ان اخراجات کے نیچے ہمیں کچل ڈالنے کا کیا مطلب ہے؟ وہی روپیہ جو مہم ذکاخیل پر خرچ کیا گیا اگر قحط زدگان کی امداد پر خرچ کیا جاتا تو سینکڑوں جانیں بچ جاتیں۔ اگر ان سرحدی آفات کا ہمیشہ کے لیئے فیصلہ ہو جاتا تو ہم اس رقم کی جن سے ہمارے بھائیوں کی جانیں بچ سکتی ہیں پرواہ نہ کرتے کیونکہ ہم سمجھتے کہ وہ جانیں جو آئے دن سرحد پر قربان ہوتی ہیں ہمیشہ کے لیئے بچ گئیں اور یہ باوجود اس گراں رقم کے بھی مہنگا نہ تھا +

مہم ذکاخیل کا نتیجہ جیساکہ بیان کیا جاتا ہے ہمارے فرمانرواؤں کے حق میں فتح ہؤا ہوگا۔ مگر ہمیں افسوس ہے کہ ہماری بہادر گورنمنٹ کا جو شجاعت و مردانگی میں ممتاز درجہ رکھتی اور اس پر فخر کرتی ہے معراج فتح اس قدر گر گیا کہ وہ ان شرائط کی صلح کو جن پر ذکاخیل

پرست قوم سے فیصلہ ہوا فتح جانتی ہے۔ ہم تو اسے بہادری اور مردانگی کا
نمونہ خیال کرتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ اس فتح کو جسے ہماری گورنمنٹ خود
بھی حقیر جانتی ہے دل خوش کن الفاظ میں اس لئے بیان کیا گیا ہو کہ ان
کثیر اخراجات کا جو اس قحط اور وبا کے زمانہ میں ذکا خیل پر خرچ کیا گیا
کوئی پرساں نہ ہو اور ہندوستانیوں پر بہادر انگریزوں کی شجاعت کا
نقش ہو جائے۔ پہلے سوال کا جواب تو ہمارے مدبروں کا ضمیر دیتا
ہو گا البتہ دوسرے سوال کا جواب دینا ہمارا فرض ہونا چاہئے اور ہم
اس فرض کو بخوبی سمجھتے ہیں +

ہندوستانیوں پر بہادری اور شجاعت کے نقش کو زیادہ نمایاں
بنانے کی ضرورت نہیں وہ اس سے بخوبی متاثر ہو چکے ہیں اس کے
علاوہ شجاعت اور بہادری کا نقش اُن لوگوں کے لئے ہے جو باغی ہوں
یا بغاوت کے قابل ہوں جن کی وفاداری میں شک ہو اور جن کی محبت
میں نفرت کی جھلک دکھائی دیتی ہو۔ ہماری وفاداری کا ثبوت تو وہ بہادر
سپاہی ہیں جو انگریزی فتح کے لئے اپنا خون بہاتے ہیں۔ ہماری بغاوت
کے لئے سال گذشتہ کے واقعات ہیں اور ہماری محبت کیلئے سر ڈنزل
ایبٹسن کی موت پر اظہار رنج ہے اگر اس پر بھی ہماری وفاداری محبت
اور اطاعت پر شک کیا جاتا ہے تو ہم اسے خوبی تقدیر کے سوا کیا کہہ
سکتے ہیں +

لبرل گورنمنٹ پر ہندوستان کی نظریں تھیں اور ہندوستان کی
بہتری چاہنے والوں کو بھروسہ تھا کہ وہ تمام شکایات جن سے ہم نالاں
[گور]نمنٹ کے عہد حکومت میں رفع ہو جائیں گی اور اس لئے

خاص ہمارے یہاں کی مطبوعہ کتب

علمی دولت

گنج شاہگان: - معروف بہ ٹکسال
قدیم شاہانِ ایران سے لیکر آج تک کے
دنیا بھر کے بادشاہتوں ریاستوں وغیرہ
کے سونے چاندی تانبے کے سکوں کی
دونوں رخوں کی اصلی تصویر مع حال وزن
ماہیت اور ایک مضبوط فہرست سلاطین
ہندوستان و جلال الدین اکبر کے سکوں کی دی گئی ہے عطر

مخزن الفوائد: - دنیا بھر کے اوزان
ناپ تول شروع زمانہ سے اسوقت تک
کی عجیب و غریب مفید باتیں حقیقت
میں دریا کوزے میں بند ہے ۸ ر

تاج و نشان المعروف بہ تاج
الملوک دو جلد کامل دنیا بھر کی سلطنتوں
اور ریاستوں وغیرہ کے تاج و نشان قومی
مع کے پھریرے مانوگرام وغیرہ کی اصلی
تصویر و ہیئت مع ان کی رنگتوں کے
دکھائی ہے عصہ

دستار و کلاہ: - تمام دنیا کی
مختلف قسم کی پگڑی - ٹوپی - کنٹوپ
خود - شملہ - دکنی پگڑیاں - پارسیوں
کی متفرق ٹوپیاں - انگریزی مردوں
لڑکوں - لڑکیوں اور لیڈیوں کی مختلف
اوقات کی ٹوپیاں - تماشہ والوں کی ٹوپیاں
ان سب کے حالات و تصویریں ۸ ر

عدد التاریخ - معروف بہ زنبیل
تاریخی ۲ کے عدد سے دو ہزار بیس
تک کے تاریخی الفاظ فقرات محاورات
ضرب الامثال آیات حدیث نام وغیرہ
کئی لاکھ موزوں ہر قسم کے تاریخی مادے درج ہیں

کنز الطغرا: - معروف بہ نقش حیرت
قدیم و جدید ہر قسم کے تین سو نایاب
طغرے ایک ایک صفحہ پر تقطیع کلاں ۱۲ ر

ملکن بائی: - محمود اور ایک پارسی
مس کے عشق کا سچا افسانہ دلکش عبارت عالی مضمون

پانچ ہزار روپیہ انعام

ممیرے کا سرمہ

پانچ ہزار روپیہ انعام

مصدقہ جناب اسسٹنٹ کیمیکل اگزامنر صاحب بہادر گورنمنٹ پنجاب

معزز انگریزوں میڈیکل کالج کے پروفیسر نامور ڈاکٹروں والیان ریاست اور ولایت کی یونیورسٹی کے سند یافتہ یورپین ڈاکٹروں نے بعد تجربہ اس سرمہ کی تصدیق فرمائی ہے کہ یہ سرمہ امراض ذیل کیلئے اکسیر ہے ضعف بصارت تاریکی چشم دھند جالا پڑوال غبار پھولا سبل سرخی ابتدائی موتیا بند پانی جانا خارش وغیرہ معزز ڈاکٹر اور حکیم صاحبان اور دوسرے آنکھوں کے بھی اس سرمہ کا استعمال کرتے ہیں چند روز کے بعد بینائی بہت بڑھ جاتی ہے اور عینک کی کبھی حاجت نہیں رہتی قیمت فی تولہ جو ایک سال بھر کے لئے کافی ہے مبلغ دو روپیہ ممیرے کا سفید سرمہ اعلیٰ قسم فی تولہ مبلغ تیس روپیہ خالص ممیرہ فی ماشہ مبلغ بیس روپیہ مصری سرمہ فی تولہ ۳ر خرچ ڈاک بذمہ خریدار۔

المشتہر پروفیسر میاں سنگھ اہلو والیہ مقام بٹالہ ضلع گورداسپور

اس سے بڑھکر اور کیا شہادت ہو سکتی ہے

(۱) میں نے اور میرے بہت دوست متعلقین نے ممیرے کا سرمہ جو سردار میاں سنگھ اہلو والیہ نے تیار کیا ہے استعمال کیا نہایت ہی مفید پایا آنکھوں کی بیماریوں کیلئے اکسیر کا حکم رکھتا ہے آنکھوں کو تر و تازہ رکھتا ہے اور بینائی کو طاقت بخشتا ہے درحقیقت یہ سرمہ بینائی کو قایم رکھنے کے لئے بہت ہی مفید ہے میں نے اپنی عمر بھر میں اب تک کبھی کوئی دوا اس سرمہ سے بہتر نہیں دیکھی۔
راقم آنریبل نواب محمد حیات خان بہادر سی ایس آئی ڈی ایس سابق ڈویژنل جج قسمت جالندھر ممبر کونسل گورنر جنرل ہند۔

(۲) میں نے ممیرے کا سرمہ جو سردار میاں سنگھ نے تیار کیا ہے اُن مریضوں پر جن کی آنکھیں بہت کمزور اور بیمار تھیں استعمال کیا مفید پایا میری رائے میں خاص کر ان مریضوں کے واسطے جن کی آنکھوں سے پانی جاری رہتا ہو اور دھند اور غبار اور کمزوری نظر ہو تو یہ سرمہ نہایت مفید ہے راقم ڈاکٹر جلیل گھوش ایم اے ایل ایم ایس اسسٹنٹ سرجن پروفیسر میڈیکل کالج لاہور آنریری سرجن گورنر جنرل ہند

پانچ ہزار روپیہ انعام اگر کوئی ممیرے کے سرمہ کی سندات میں سے جو کہ قریباً ہزار کے ہیں ایک کو بھی فرضی ثابت کر دے تو اُس کو پانچ ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا جو لاہور کے پنجاب بنک میں اسی مطلب کے لئے پانچ ہزار روپیہ جمع کیا گیا ہے۔

پولٹیکل لٹریچر

ہندوستان میں آثار بیداری کے ساتھ یہ ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ ایک پولیٹیکل لٹریچر جو ملک میں صحیح جذبات اور جائز خواہشات پیدا کرنے والا ہو ملک کے روبرو پیش کیا جائے بہی خواہان ملک محسوس کر رہے ہیں۔ کہ محض اسی لٹریچر کی کمی ہے کہ بعض اوقات ناتجربہ کار اور منزل سیاست کی دشواریوں سے ناواقف لوگ ملک کے لئے مصائب لاتے اور ہندوستان کی ترقی میں زیادہ اُلجھن ڈال دیتے ہیں۔ آزاد کی اشاعت کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے مگر اسکے ساتھ ساتھ ہم سمجھتے ہیں کہ ملک کو اس قسم کی تصنیفات کی ذاتی لائبریری کی ضرورت ہے۔ انگریزی میں تو ایسی بہت سی کتابیں ملینگے مگر اردو علم ادب ابھی تک ان سے محروم ہے اس اہم ضرورت کو محسوس کر کے ہمنے ایسی تصنیفات جو بامذاق محبان وطن کی الماریوں کی زینت اور انکی خدمت میں باریاب ہونیکے لائق ہوں۔ اردو میں شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے اس سلسلہ میں انگریزی تصانیف کے تراجم کے علاوہ ملک کے نامور زمانہ شناس اہل قلم کی تصانیف بھی شائع کیجائینگی اور انکی اشاعت کا انتظام اچھے کاغذ صحت اور خوبصورتی کے ساتھ ہوگا اس سلسلہ کا آغاز مشہور ہندسر ہنری کوٹن کی لاجواب تصنیف

نیو انڈیا

کے ترجمہ سے ہوگا۔ اور آئندہ سہ ماہی کم ازکم سو صفحہ کی ایسی ہی تصنیف ملک کے روبرو پیش کیجائے گی۔ مگر اس سلسلہ کی کامیابی کے لئے پانچ سو ایسے محبان وطن کی ضرورت ہے جو اس سلسلہ کی مستقل خریداری منظور کریں ہم پیشگی قیمت نہیں مانگتے صرف عہ بذریعہ منی آرڈر بھیجکر نام درج کرا لیجئے اور ہر ایک تصنیف آپکی خدمت میں بصیغہ ویلیو پی ایبل بھیجی جائیگی یہ کوشش کیجائیگی کہ سال کی چاروں تصانیف کی قیمت کسی صورت میں للعہ سے زیادہ نہ ہو اس ادارہ کی کماحقہ تکمیل کیلئے محبان وطن کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے ہیبانہ مندلش سہلے آزاد مالک وایم

نئی صدی کی نئی تصنیف

اُردو شاعروں کا بسیط اور جامع تذکرہ

یہ سب کو معلوم ہے کہ وقتاً فوقتاً اُردو زبان کے شاعروں کے تذکرے لکھے جاتے رہے ہیں جن میں شعرا کا کچھ کلام اور کچھ حال درج ہے۔ مگر جتنے تذکرے اس وقت تک نکلے وہ تقریباً سب اپنی خاص وضع کے تھے ان میں سے ایسا کوئی نہ تھا کہ جو اردو شاعری کے انسائیکلوپیڈیا کا کام دے سکے۔ کہیں صرف انتخاب دواوین پر زور تھا کسی میں مدح سرائی یا ہجو سے کام لیا گیا تھا۔ کوئی تذکرہ محض خاص حیثیت کے شعرا سے مخصوص تھا۔ کوئی خاص شہر سے منسوب تھا۔ اُردو شاعری کے شائقین کو لالہ سری رام صاحب ایم اے مصنف دہلوی مقیم لاہور کا مشکور ہونا چاہیئے کہ انھوں نے اس اہم ضرورت کو پورا کیا۔ اور ۱۲ برس کی محنت شاقہ اور صرف کثیر سے ایک جامع اور بسیط تذکرہ اُردو شعرا کا تالیف فرمایا۔ جو شعرا کی کثیر تعداد۔ ان کے حالات اور سوانح عمری کے مندرجہ حال کی تکمیل مختلف اصناف کلام کے بامذاق انتخاب طرز کلام پر بصیرانہ تنقید اور دیگر اوصاف میں اپنی نظیر آپ ہے یہ تذکرہ ۲۹×۲۲ تقطیع کے قریباً تین ہزار صفحوں پر ختم ہوتا ہے بالفعل تذکرہ ہزار داستان یا خمخانہ جاوید کی اول جلد جو الف سے ب تک ردیفوں پر مشتمل ہے طیار ہوا چاہتا ہے صرف چند جز چھپنے باقی ہیں کاغذ نہایت عمدہ اور لکھائی چھپائی اول درجہ کی ہے جلد بھی نہایت نفیس ہے درخواستیں ابھی سے دھڑا دھڑ آرہی ہیں۔ خوف ہے کہ شائقین ناکام نہ رہجائیں اس لئے اعلان کیا جاتا ہے کہ جو صاحبان مذاق اس تذکرہ کو خریدنا چاہیں وہ صاحب مولف کے پاس بہت جلد درخواست خریداری بھیجدیں ایسا نہو کہ سستی سے مایوسی اوٹھانی پڑے۔ قیمت کاغذ اول مبلغ عہ، قسم دوم للعہ، دونوں قسم کے خریداروں کو مجلد کتابیں دیجائینگی محصولڈاک علاوہ۔

تاجروں کو مژدہ!

نرخ نامہ اجرت طبع اشتہار آزاد لاہور

اگرچہ جو اجرت اشتہار اب تک سوداگر صاحبان سے چارج کی جاتی رہی ہے وہ زیادہ نہ تھی لیکن اب بعض تاجروں کے اصرار سے اس میں مناسب تخفیف کے ساتھ نرخ نامہ پیش کر کے عرض کرتے ہیں کہ اب رعایت کی درخواست نہ کریں کیونکہ یہ حد درجہ کی رعایت ہے۔

جگہ	سالانہ	ششماہی	سہ ماہی
صفحہ ..	(۲۵)	(۱۳)	(۷)
نصف صفحہ ..	(۱۳)	(۷)	(۴)
چوتھائی صفحہ ..	(۷)	(۴)	(۲)

متفرق بحساب دو آنہ فی سطر فی اشاعت کے حساب سے درج ہوں گے۔

نوٹ (۱) سرورق پر اشتہار دینے کی صورت میں دس فیصدی زیادہ اجرت لیجائیگی۔

نوٹ (۲) ریپر [لفافہ کی پشت جس میں آزاد بند ہو کر روانہ ہوتا ہے] سالانہ ششماہی سہ ماہی بالترتیب [illegible] [illegible] اور [illegible] روپیہ۔

المشتہر

مینجر رسالہ آزاد سوتر منڈی لاہور

کہتی ہے ہم کو خلق خدا غائبانہ کیا

پنجابی لاہور۔ آزاد اردو میں پولیٹکل معاملات پر بحث کرنے والا واحد رسالہ ہے۔ لالہ بشن سہائے ہر مہینہ میں ملک کے نامور مستند مضامین نگاروں سے جو کسی مسئلہ پر صائب رائے دے سکتے ہیں اور قابلیت سے اپنے مضمون کو نباہ سکتے ہیں مضمون حاصل کرتے ہیں۔ آزاد پنجاب میں اپنی قسم کا اکیلا رسالہ ہے۔ اور اس زمانہ میں جب درست پولیٹکل رائے معلوم کرنا دشوار ہے۔ آزاد پبلک کی امداد اور سرپرستی کا مستحق ہے۔

انڈین ڈیلی ٹیلیگراف (لکھنؤ) آزاد میں نامی ہندوستانی مضمون لکھتے ہیں۔ چھپائی۔ لکھائی اور زبان بھی قابل تعریف ہے۔

شمس بنگالہ۔ اس میں (آزاد میں) پولیٹکل معاملات پر نہایت آزادی کے ساتھ بحث کی جاتی ہے۔ اس کا دسمبر ۱۹۰۶ء کا نمبر کانگرس نمبر کے نام سے شایع ہوا ہے اور سورت کانگرس کی قابل قدر یادگار ہے اس رسالہ کو وہ فخر حاصل ہے جو ہندوستان کے شاید ہی کسی اور اردو رسالے کو ہو۔ یعنی امریکہ کے اخبارات نے اس کے مضامین کے ترجمے اپنے کالموں میں شایع کیے ہیں ....

ملک اس رسالے کی جتنی قدر کرے کم ہے۔

ترقی۔ اس میں نہایت اعلے درجے کے اور مفید مضامین (جو ملکی اور قومی امور پر ہوتے ہیں) شائع ہو رہے ہیں ...... نظم و نثر سارے مضامین اہل ہند کی بہبودی سے متعلق ہیں ...... ملک کے

مشہور اور قابل انشاپردازوں کے مضامین درج ہوتے ہیں) ....

(اس کے مضامین) اپنی نوعیت کے اعتبار سے بے نظیر (ہوتے)

ہیں۔ رسالہ بہمہ وجوہ بہت اچھا۔ اور اپنے رنگ کا ایک ہی رسالہ ہے۔

جس کی ہر بہی خواہ ملک و قوم کو قدر کرنی چاہیئے +

بھارت متر ۔ آزاد لاہور کا ایک بہت اچھا (پولیٹیکل) ماہوار

رسالہ ہے۔ اس کی پنجاب میں بہت ضرورت تھی +

ہندوستان ۔ ایک ہی سال میں آزاد نے ہر پہلو سے کافی

ترقی کر لی ہے۔ جس کے لئے ہم ایڈیٹر صاحب کو مبارکباد دیتے ہیں +

حق پسند ۔ آزاد تعریف کا محتاج نہیں۔ اس کا ہر ایک نمبر اعلیٰ

اور عمدہ مضامین سے پُر نظر آتا ہے۔ واقعی آزاد اب پنجاب میں ایک بے نظیر

رسالہ بن گیا ہے۔ اور کم قیمت ہے +

تریبیون ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ چند ماہ میں آزاد نے بلحاظ مضامین

وظاہری خوبیوں کے نمایاں ترقی کی ہے (اس کے) مضامین مستند

اور نامی مضمون نویسوں کی تحریریں ہیں۔ ہمیں یہ دیکھ کر نہایت خوشی

ہوتی ہے۔ کہ آزاد کی زبان نہایت پیاری اور پاکیزہ ہے .... ہر ایک

مضمون نہایت قابلیت سے لکھا جاتا ہے +

آریہ مسنجر ۔ حق تو یہ ہے کہ آزاد نے ایک بہت بڑی کمی کو پورا کیا۔

اور یہ تعلیم یافتہ جماعت کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ ہم نوجوان اولوالعزم

ایڈیٹر کی کامیابی کے لئے دعا کرتے ہیں +

درخواست کرو بنام منیجر رسالہ آزاد لاہور

آزاد رہوں اور میرا مسلک ہے صلح کل

آزاد

مرتبہ بشن سہائے آزاد

جلد ۳ | اپریل ۱۹۰۸ء | نمبر ۴

فہرست مضامین

قیمت سالانہ قسم اول ۵ قسم دوم ۴ قسم سوم (بلا تصویر) ۳ معہ محصول ڈاک

بشن سہائے آزاد مالک و ایڈیٹر کے اہتمام سے آزاد پریس لاہور میں چھپکر شایع ہوا

قیمت فی کاپی قسم اول ۸ قسم دوم ۶ قسم سوم ۴

فوٹوسرز جی این بالی - اینڈ سنز راولپنڈی

Babu Bipin C. Pal.

کانگرس کنونشن

از منشی گنگا پرشاد صاحب ورما ایڈیٹر ہندوستانی ایڈوکیٹ

کانگرس کی زندگی اور موت کا سوال کنونشن کے فیصلہ پر تھا۔ اس لیئے
ملک میں نہایت بیقراری سے اس کا انتظار کیا جا رہا تھا جس سے ملکی
بیداری کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس فیصلہ کی کیفیت کانگرس کے ایک
رکن کی زبانی نہایت موثر اور دلچسپ ثابت ہو گی۔ ہماری درخواست
پر منشی گنگا پرشاد ورما ممالک متحدہ کے مسلمہ لیڈر جو اپنے صلح کل خیالات
کے لیئے ہر دلعزیز ہیں ذیل کا مضمون عنایت فرماتے ہیں منشی صاحب باوجود
کثرت مشاغل جس قدر توجہ آزاد پر فرماتے ہیں۔ اس کے شکریہ کے لیئے
ہمیں کافی الفاظ نہیں ملتے۔ ایڈیٹر

سورت کے ناخوشگوار واقعات کے بعد تمام ہندوستان کی آنکھیں
کنونشن کمیٹی کے جلسہ کی طرف لگی ہوئی تھیں جس نے زمانہ تعطیل ایسٹر
میں بمقام الہ آباد اجلاس کیا۔ بہت سے لوگ ملک کے چیدہ اصحاب میں

اختلافات دیکھکر گھبرا اُٹھے تھے۔ اور انہوں نے نیشنل کانگرس کی بیوقت موت پر ماتم بھی کر دیا تھا۔ گو آنکھیں کنونشن کے جلسہ کی طرف لگی تھیں مگر دل میں اندیشہ تھا کہ شاید ہی کوئی بات ایسی انجام پائے کہ جس سے مختلف رائے رکھنے والے لوگ باہم اتفاق کر کے آیندہ پولیٹکل کام کرنے کی رضامندی ظاہر کریں۔ مگر ہم کو خوشی ہوئی کہ یہ تمام اندیشے بیکار ثابت ہوئے ہندوستان میں ہنوز ملکی معاملات کی طرف سرگرمی کا وہ اظہار نہیں پایا جاتا جس کی ضرورت ہے مگر یہ کہنا کہ ہندوستان میں بالکل ملکی معاملات نے حس پیدا نہیں کی ہے۔ درست نہیں ہے۔ یہ نظارہ کہ اس جلتی بلتی دھوپ میں جب لوگ کاروبار چھوڑ کر گھر سے باہر نکلنا مناسب نہیں سمجھتے۔ ۵۰۰ اصحاب کا کہ جن میں سے ہر شخص بے انتہا مشاغل میں مصروف رہتا ہے اور جن میں بعض کے وقت کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ ملک کے مختلف اطراف سے صدہا میل کا سفر اختیار کر کے ایک مقام پر اس غرض سے جمع ہونا کہ سوچیں کہ کیا بہترین تدابیر آیندہ پولیٹکل کام چلانے کیلئے ہو سکتی ہیں۔ اطمینان پیدا کرنے والا نظارہ تھا۔ میوہال الہ آباد میں ذہانت۔ ملکی ہمدردی اور قومی ترقی چاہنے والوں کا منتخب مجموعہ ایک جگہ جمع ہوا تھا۔ غرض مجمع کی یہ سوچنا تھا کہ پولیٹکل کام اس طرح سے چلایا جائے کہ ملک کو پوری ترقی حاصل ہو۔ اُس کے باشندگان کی جائز شکایات سنی جائیں اور ہندوستانیوں کی عام رائے کو وہ قوت حاصل ہو کہ انتظام ملک کے ہر صیغہ میں وہ اپنا اثر دکھلا سکیں۔ ہر ایک ممبر معلوم ہوتا تھا کہ مستقل ارادہ رکھتا تھا کہ کچھ ہی ہو مگر کانگرس آیندہ ایسے اصولوں پر چلائی جائے کہ اُس کے مقاصد اور دستور العمل کی نسبت کسی قسم کی غلط فہمی نہ پیدا ہو۔

پولیٹیکل سرگرمی کے لئے ایسا سیدھا اور صاف راستہ اختیار کیا جائے۔ کہ چاہے حکامی گروہ کی جانب سے مخالفت کا طوفان بلند ہو۔ چاہے راستہ والے تماشائی سرد مہری سے پیش آئیں۔ مگر استقلال سے چلنے والے ضرور منزل مقصود پہ پہنچ جائیں +

کنونشن کے شرکا میں بہت سی باتوں کی نسبت اختلاف تھا۔ مگر اُس کے اغراض کی نسبت کسی قسم کا اختلاف نہیں پیدا ہوا۔ جو بالفاظ ذیل منضبط کئے گئے۔

"انڈین نیشنل کانگرس کے اغراض یہ ہونگے کہ باشندگان ہند کے لئے وہ طریقہ حکومت حاصل کرے۔ جو سلطنت انگلشیہ کے دوسرے خود انتظامی حصص کو حاصل ہے۔ اُن ممبران کے ساتھ برابری کے مرتبہ پر سلطنت کے حقوق اور ذمہ واریوں میں حصہ لے" +

ان اغراض کے حصول کا طرز عمل یہ قرار پایا ہے کہ جدو جہد پابندی ضابطہ کے ساتھ ہو۔ موجودہ طریقہ نظم ونسق سلطنت میں مناسب اصلاح چاہی جائے۔ قومی اتحاد پیدا کیا جائے۔ عام خدمت کا جوش بڑھایا جائے۔ ذہنی۔ اخلاقی۔ مالی وحرفتی وسائل ملک کو ترقی دی جائے۔ اور ان قوتوں کو منضبط کیا جائے +

یہ اغراض ومقاصد کانگرس نئے نہیں ہیں۔ ۲۳ سال پیشتر کانگرس کے وجود میں لاتے وقت اول پریسیڈنٹ نے اپنے مطالب صاف صاف افتتاحی تقریر میں بیان کر دیئے تھے۔ جن کی تحریر میں لانے کی اب یوں ضرورت لاحق ہوئی۔ کہ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اُس کے گرد اُس کے شرکا کا ایک گروہ ایسا جمع ہونا شروع ہوا کہ اگرچہ اس کی اس

خاطر میں شک نہ کیا جائے کہ وہ ملکی بھلائی چاہتا ہے۔ مگر جو مصلحتاً یا غلطی
سے اپنا طرزِ عمل باضابطہ جدوجہد تک پابند نہیں کرنا چاہتا۔ کنونشن
کمیٹی کا سب سے اول یہ فرض تھا کہ وہ اس معاملہ کو صاف کرے اور
ہم خیال کرتے ہیں۔ کہ اُس نے اس طرح سے صاف کر دیا ہے کہ کسی قسم
کی غلط فہمی نہیں ہو سکتی +

کنونشن کمیٹی میں صرف دو مسئلوں پر اختلاف تھا۔ بحث یہ تھی
کہ آیا ممبران کانگرس سے قبل شرکت کے دستخط کرائے جائیں۔ کہ اُن کو
اغراض کانگرس سے اتفاق ہے۔ اور یہ کہ وہ کانگرس کے دستور العمل
کی پوری پابندی کریں گے۔ ایک فریق چاہتا تھا کہ محض زبانی اظہار
رضامندی کافی سمجھا جائے۔ کسی تحریر کی ضرورت نہیں۔ دوسری طرف
اصرار تھا کہ کانگرس کے شرکا میں کوئی شخص ایسا شامل نہ ہو۔ جو کسی
وقت یہ بیان کر سکے کہ اُس نے اغراض و مقاصد کانگرس ذہن نشین
نہیں کیئے۔ اور یہ کہ کانگرس میں بیٹھ کر اُس کو اختیار رہے کہ وہ مقاصد
کانگرس کے خلاف بھی گفتگو کرے یا اُس کے دستور العمل سے انحراف
ظاہر کرے۔ بحث کئی گھنٹہ تک ہوتی رہی۔ مگر دستخط کرنے کے موافق
دلائل ایسی قوی تھیں کہ آخر کار صرف دو اصحاب کے اختلاف رائے سے دستخطوں
کی پابندی لازمی قرار دی گئی۔ دوسرا مسئلہ کہ جس پر کئی گھنٹہ بحث رہی یہ تھا۔
کہ آیا تیئیسواں جلسہ نیشنل کانگرس جس کو ڈاکٹر راش بہاری گھوش نے
بمقام سورت ملتوی کیا تھا۔ پھر طلب کیا جائے یا جدید دستور العمل کے موافق
نیا جلسہ طلب ہو۔ اس مسئلہ پر بھی فریقین نے زبردست دلائل پیش کیں۔ ایک جانب
اصرار تھا کہ وہی ڈیلیگیٹ طلب ہوں کہ جو سورت میں جمع ہوئے تھے اور

جدید دستور العمل کانگرس اُن کے روبرو منظوری کے لئے پیش ہو۔ دوسری طرف پوچھا جاتا تھا کہ اس کی کیا ذمہ واری ہے۔ کہ سورت کے سے نا خوشگوار واقعات پھر پیش نہ آئیں گے اور پھر دوسرا ہنگامہ برپا نہ ہوگا۔ ۲۳ صاحبوں نے بخلاف ۱۴۔ اصحاب کے رائے دی کہ جدید جلسہ کانگرس طلب کیا جائے۔ اور وہ تئیسواں یا چوبیسواں جلسہ نیشنل کانگرس نہ کہلائے بلکہ جدید دستور العمل کی پابندی سے اول جلسہ کانگرس کے نام سے نامزد ہو ✤

اِن اختلافی مسائل کے طے ہوجانے کے بعد ممبران نے دستور العمل کے مختلف دفعات پر غور کرنا شروع کیا۔ جو مختلف صوبہ جات کی سب کمیٹیوں نے اپنے اپنے طور پر مرتب کر کے بھیجے تھے ✤

ہر کمیٹی نے مسودہ کی طیاری میں بہت وقت صرف کیا تھا۔ لہذا تین چار گھنٹہ کے اندر دستور العمل مرتب ہوگیا۔ ہر ایک مسودہ سے جو جز و نہایت ہی عمدہ نظر آیا۔ قلمبند کر لیا گیا۔ اِس دستور العمل میں لکھا گیا ہے کہ کیونکر آل انڈیا کانگرس کمیٹی قایم ہو۔ کیونکر ہر صوبہ میں پروونشل کمیٹی وجود میں لائی جائے۔ کس طرح سے ہر ضلع میں کمیٹیاں قائم ہوں۔ کانگرس کے لئے ڈیلیگیٹ کس طرح سے منتخب ہوں۔ پریسیڈنٹ کس طرح سے نامزد ہوں۔ اور اُس کے اختیارات کیا ہوں؟ مسلمانوں اور دیگر قلیل التعداد گروہوں کے حقوق کی محافظت کا بھی مسئلہ پیش ہوا۔ کمیٹی نے قرار دیا۔ کہ جہانتک ممکن ہو۔ کانگرس کمیٹیوں میں مسلمانوں کا پانچواں حصہ ہو۔ کوئی رزولیوشن کانگرس میں مسلمان شرکا کی کثرت رائے کے خلاف نہ پیش ہو اور جو معروضات گورنمنٹ کی خدمت میں بھیجے جائیں یا دعاوی منجانب باشندگان ہند انتظام ملک میں مزید حصہ لینے کی نسبت پیش ہوں

یہ ابتدائی اصول کانگرس کا رہے کہ قلیل التعداد جماعتوں کے حقوق کی پوری محافظت کی جائے۔ اس خاص دفعہ دستور العمل سے اُن لوگوں کو جو شک کرتے ہیں کہ ممکن ہے کہ کثیر التعداد جماعتیں قوت حاصل کر کے قلیل التعداد گروہوں کے حقوق کو پامال کر دیں اطمینان حاصل ہونا چاہیئے کہ کانگرس کبھی محض خاص فرقوں کے فوائد کیلئے تحفظ کی تدابیر میں نہ مصروف ہوئی ہے اور نہ آیندہ اُن کے حقوق حصول کے لئے کوشش کرے گی +

مجھے امید ہے کہ یہ دستور العمل ہر خیال کے لوگوں کو مطبوع خاطر ہوں گے۔ ہر ایک ملکی ہمدرد ہندوستانی جو چاہتا ہے کہ رفتہ رفتہ ملک ترقی کرے۔ وہ ضوابط کانگرس سے ہمدردی ظاہر کرے گا۔ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ آخری کامیابی کا دارومدار ہماری اپنی کوششوں پر ہے۔ باضابطہ جدوجہد کے اس طریقہ کام کو پسند کریں گے کبھی کانگرس نے ضابطہ کی پابندی سے انحراف نہیں کیا۔ اب اس کا ہر ایک ممبر ذاتی طور پر ضابطہ سے پابند ہوگا۔ جن لوگوں کو باضابطہ طریقہ جدوجہد پر اعتبار نہیں ہے ان کو کانگرس کے پروگرام سے واسطہ نہ ہوگا۔ انہیں اس تحریک سے علیحدہ رہنا ہوگا۔ مگر خواہ کچھ کہا جائے ملک کو باضابطہ جدوجہد پر بھروسہ ہے جس سے گذشتہ زمانہ میں عمدہ نتائج حاصل ہوئے۔ اور آیندہ اور بھی زیادہ حاصل ہونیکی اُمید ہے +

کسی شخص کی یہ خواہش نہیں ہے کہ وہ کسی شخص کو کانگرس سے علیحدہ رکھے۔ کانگرس تمام قوم کی ہے مگر جو لوگ اُس طریقہ سے پولٹیکل

کام نہیں کرنا چاہتے جو کانگرس کے چیدہ ممبروں نے منضبط کردیا ہے جو بالکل بے لوث سوراجیہ کے خواہاں ہیں۔ جو انگریزی حکومت کے جوئے سے اپنی گردن بلا اس خیال کے علیحدہ کرنا چاہتے ہیں کہ آیا وہ خود اپنی حکومت کا پہیہ چلا سکتے ہیں۔ یا جن کو انگریزی جمہور کی نیک نیتی اور وعدوں پر بھروسہ نہیں ہے +

جو لوگ باضابطہ جدوجہد کے علاوہ دل ہلا دینے والی باتوں کے خواہاں ہیں۔ ان کو نہ تو ضلع کی۔ نہ پراونشیل۔ نہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی میں شرکت کا موقع مل سکتا ہے خواہ کچھ نقصان ہو تحریک کانگرس کو ان لوگوں سے واسطہ نہ ہوگا بلکہ اس کا کام ہوگا کہ امن وامان کی خاطر اُن کے مضر اثر کو ملک میں نہ بڑھنے دے۔ اُن لوگوں کے لئے کہ جو مقاصد کانگرس سے اختلاف رکھتے ہیں میدان کام کرنے کا وسیع ہے۔ اختلاف سے خطرہ تو اُسی وقت ہو سکتا ہے۔ جب ایک دوسرے کے خلاف اپنا جوش بیکار صرف کیا جائے۔ میدان وسیع ہے۔ کام کرنے والے البتہ تھوڑے ہیں۔ ملک کی بدقسمتی ہوگی اگر یہ تھوڑے کام کرنے والے بجائے اپنے طریقوں پر کام کرنے کے ایک دوسرے کے کام کی نکتہ چینی کریں۔ اس سے بڑھکر ملک کی بدنصیبی نہیں ہو سکتی۔ کہ ہمارے اخبارات۔ ہماری انجمنیں بحالت اختلاف ایک دوسرے کے گریبان میں ہاتھ ڈالیں۔ اور ملکی کام کو عمدہ راستہ پر نہ چلنے دیں +

مجھے اُمید ہے۔ کہ دسمبر آئندہ تک کانگرس کی تحریک عملی صورت اختیار کرے گی۔ اور جدید ضوابط سے منضبط کانگرس اسی جوش وخروش سے

اجلاس کرے گی۔ جس طرح سے اب تک کانگرس کرتی تھی۔ باشندگان ملک اُس سے اُسی طرح سے محبت کریں گے جس طرح سے اب تک کرتے رہے ہیں اور کانگرس ملکی انتظام میں نکتہ چینی اور مستعدی سے باشندگان کی تمام شکایات کا اظہار اور اُن کے حقوق کی نگہبانی آزادی سے کر کے اپنا وقار قائم رکھے گی۔ جدید کانگرس ملکی پولٹیکل تاریخ میں ایک نیا دور قائم کرے گی۔ جو ہر ایک شخص کی دعا ہونی چاہیئے کہ صرف امن و امان کا دور نہ ہو بلکہ کروڑ ہا باشندگان ملک کی راحت و خوشی اور قناعت کا دور ہو + لکھنؤ ۲۲۔ اپریل

شمس بنگالہ۔ اہل بنگال اب تک اردو کی طرف سے غافل خیال کیئے جاتے تھے اور خصوصاً مسلمانوں کیلئے تو یہ بدنما داغ سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ ہم اب تک یہ نہیں سمجھ سکے کہ مسلمانوں کو اردو سے کیا خاص نسبت ہے ہمارے خیال میں تو مسلمان اردو پر اسی قدر حق رکھتے ہیں جتنا ہندو کیونکہ جہاں عربی فارسی الفاظ نے اردو کے بنانے میں حصہ لیا ہے وہاں برج بھاشا اردو کا مخزن ہے خیر یہ زبان کے متعلق بحث ہے جس پر ہم پھر کبھی بحث کرینگے۔ اس وقت ہمیں ایک نئے علمی رسالہ کا خیر مقدم کہنا ہے جس کی اشاعت کا انتظام کلکتہ کے دو اولوالعزم نوجوانوں نے کیا ہے شمس بنگالہ علمی حیثیت سے ممتاز رسالوں میں شمار کیا جا سکتا ہے اور ہمیں یہ دیکھکر خوشی ہوئی کہ بنگال کے نامور اہل قلم نے اس کی سرپرستی سے اسے کامیاب بنانے میں مدد دی ہے ان نئے رسالوں کو دیکھکر ایک نہایت مسرت خیز نتیجہ پر ہم پہنچتے ہیں۔ کہ اب کوئی رسالہ علمی سرپرستی کی کمی سے ناکامیاب نہیں ہو سکتا۔ مولوی بدرالزمان صاحب بدر ایڈیٹر رسالہ کی کوششیں مستحق تحسین ہیں۔ لکھائی چھپائی نفیس قیمت قسم اول کے کاغذ پر للعہ ہے۔ دوم عہ سوم عہ۔ ضخامت ۶۸ صفحے۔ درخواست بنام منیجر جھاؤ تلا روڈ نمبر ۸۵ بالی گنج کلکتہ ہونی چاہیئے +

سزا و انتقام

از پروفیسر ھر گوبند پرشاد نگم ایم۔ اے

ہمارے معزز لیڈروں کو محض اصطلاحی جرائم کے بدلے طرح طرح کی سزائیں دی جاتی ہیں۔ کوڑے لگائے جاتے ہیں۔ چکیاں پسوائی جاتی ہیں۔ کولہو پلوائے جاتے ہیں۔ اور قید کی سخت بلامیں ان کو گرفتار کیا جاتا ہے۔ چونکہ ہماری گورنمنٹ عالیہ ہماری بہی خواہ ہے۔ منصف ہے۔ عالم ہے۔ فاضل ہے۔ ہماری بہبودی کو خوب سمجھتی ہے۔ ہماری قسمت کے قسام ایسے ایسے فاضل اجل قرار دیئے جاتے ہیں۔ جیسے کہ "باتیں بنانے والا" فلاسفر مسٹر مورلے۔ ہم گورنمنٹ پر معترض نہیں ہوسکتے۔ بلکہ ہم کو اس قدر عقیدتمند ہونا چاہئیے۔ کہ اگر بفرض محال گورنمنٹ پر ہم کو کوئی جائز اعتراض سوجھے بھی تو اُس کو اپنی ہی کوتاہ بینی اور کم نظری پر محمول کرکے اپنے ہی اوپر آپ عاید کریں۔ اور معزز گورنمنٹ پر ہرگز نہ جڑیں۔

ہمارے بعض فلسفی دوستوں کا مقولہ ہے۔ کہ سزا شایان شان شہنشاہی اور لایق سیاست عدالتی ہے۔ مگر انتقام ایک کمینہ فعل ہے جس کے مرتکب صرف وہ لوگ ہوسکتے ہیں۔ جو بالکل وحشی اور تہذیب سے صدہا کوس دور ہیں۔ بالکل درست اور راست ہے ہمیں بھی اس سے اتفاق ہے وہ لکھتے ہیں کہ سزا تین قسم کی ہوسکتی ہے ہ

(۱)۔ اصلاحی ؂

(۲)۔ عبرتی ؂

(۳) - معکوسی +

اول وہ ہے جس میں مجرم کو اس نیت سے سزا دی جاتی ہے کہ اسکی اصلاح ہو - اور آیندہ وہ ایک مفید اور کار آمد باشندہ سلطنت کا ہو کر رہے +

دوم - عبرتی سے مراد ہے کہ خواہ اس شخص مجرم کو فائدہ ہو یا نہ ہو - مگر اور لوگوں کو عبرت ضرور حاصل ہو - اس پر قسم اول کو اس وجہ سے فوق حاصل ہے - کہ علاوہ اس کے کہ کل جہان کو عبرت ہوجاتی ہے - اُس شخص کی اصلاح کا بھی جج کے دل میں خیال ہوتا ہے جو مجرم ہے - پس قسم اول کے ماننے والے جج کبھی فتوے موت کا صادر نہیں کرتے - کیونکہ بعد مرگ ہمارے علم الیقین میں اس کی کیا بہبودی اور برتری ہوسکتی ہے - اور کیا اصلاح اس کے چال چلن میں واقع ہوتی ہے +

قسم سوم معکوسی سزا کا یہ منشا ہے کہ مجرم کو سزا دیکر بتلا دیا جائے - کہ دیکھ کوئی جرم اس قسم کا نہیں کہ جو بلا سزا کے رہ سکے اگر چشم قانون سے پوشیدہ بھی تو کوئی جرم کرے گا تو اگر قانون کے دست دراز سے تو بچ بھی گیا تو قدرت کا زبردست پنگل تیری گردن دبوچیگا - اور کوئی گناہ بلا سزا کے نہیں رہیگا - اس میں اصلاح مجرم بھی مدنظر ہے اور دوسروں کو بھی عبرت ہوتی ہے اور علاوہ ازیں مجرم پر بھی سزا کا ایک صحیح اور فلسفیانہ اثر ہوتا ہے - مگر

اس سزا کو آپ کیا کہیں گے جو ان مختلف اقسام میں سے ایک قسم کی بھی سزا نہ ہو - بلکہ محض انتقامی سزا ہو - کوئی جرم ہوا ہو یا نہ ہوا ہو مگر سزا حاضر ہے اور سزا بھی کونسی سزا جو محض انتقام سے مملو ہو - سہو یا جرم کی

سزا اگر غلط سزا ہو۔ اور اس میں منصف کی نیت ٹھیک نہ ہو تو معلوم ہوتا ہے کہ جج خود مستحق سزا ہے۔ چنانچہ جب شاہ کابل نے طریقہ اپیل کا ذکر برٹش انڈیا و دیگر ممالک برطانیہ و مقبوضات برطانیہ کی بابت سنا تو اُنہوں نے دریافت کیا کہ "جب عدالت ماتحت کا فیصلہ بدل دیا جاتا ہے تو عدالت ماتحت کے جج کو اس کی غلطی کی کیا سزا ملتی ہے"۔ اس سے میری یہ مراد نہیں کہ میں اس ملک کو پسند کروں گا۔ جہاں فقط ایک ہی عدالت ہو اور اپیل کا دستور نہ ہو کیونکہ الانسان مرکب من الخطا والنسیان کے مصداق ایک جج کی غلطی کا صحیح کیا جانا۔ دوسرے زیادہ تجربہ کار فاضل اور عموماً معمّر جج کے ہاتھوں بہت ہی قرین قیاس ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ خواہ عدالت ماتحت ہو یا عدالت اپیل ہو اگر سزا کے اصول سے گر کر انتقامی سزا کوئی جج اس وجہ سے دے کہ جس سے پایا جائے کہ اس کے دل میں کد و کینہ ہے تو آیا وہ بھی سزا کا مستحق ہے یا نہیں؟ افسوس اس وقت ہوتا ہے کہ بجائے سزا کے ان لوگوں کو گورنمنٹ کی طرف سے انعامات ملتے ہیں۔ چنانچہ مسٹر کنگسفورڈ کو جو کلکتہ میں سودیشی مقدموں کے ایک سلسلہ کو گورنمنٹ کے موافق فیصل کر چکے ہیں۔ پانچ سو روپیہ ماہوار تنخواہ میں اضافہ دیا جانا آسانی سے نہیں بھول سکتا۔ علیٰ ہذا بلا کسی مقدمہ بلا کسی جرم و خطا معصوم لالہ لاجپت رائے و سردار اجیت سنگھ کا جلاوطن کیا جانا اور پھر بعد چھ ماہ واپس بھیجدیا جانا ہماری بالکل سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر وہ واقعی مجرم اور خطاوار تھے تو کیوں نہیں اُن کو عدالت میں پیش کر کے باقاعدہ سزا قانونی دی گئی۔ اور مجرم نہیں تھے تو موجودہ سزا کیوں دی گئی اور اگر غلطی سے دی گئی تو غلطی کرنے والے کو کیا سزا ملی؟ اگر کچھ نہیں تو

کیا یہ انصاف کا صریح خون نہیں ہے۔ جب بابو بپن چندر پال فخر ملک و سرتاج بنگال کو ۶ ماہ کی قید کی سزا دی گئی۔ تو کیا بابو صاحب کا جرم اس ہی سزا کے قابل تھا۔ وہ صریحاً کہتے ہیں کہ میں اُن مقدمات میں جن سے گورنمنٹ موجودہ کے خلاف شورش اور بداطمینانی کے پھیلنے کا اندیشہ ہو امداد دینے سے گریز کرتا ہوں۔ اس خیر خواہی کے صلہ میں ان کو چھ ما کی قید بھگتنی پڑی۔ اور اسی طرح سے ایک نہیں بلکہ بیسیوں معاملات میں ہم دیکھ رہے ہیں۔ کہ ذرا ذرا سے محض اصطلاحی جرائم کے لئے ہمارے قومی کام کرنے والوں کو اس قسم کی تعزیری اور انتقامی سزائیں دیجاتی ہیں۔ کہ انصاف کا صریح خون ہو جاتا ہے۔ اور ہم لکھ چکے ہیں کہ انتقام شایان شان عدالت برطانیہ نہیں۔ پس گورنمنٹ ہند کو بجائے انعام دینے اور حوصلہ افزائی کرنے کے اس قسم کے ججوں کی اچھی طرح سے خبر لینی چاہیئے جو ذاتیات قومی تعصبات اور گورنمنٹ کی نظر عنایات کے مقابلہ میں انصاف کی گردن پر چھری پھیر دیتے ہیں +

برخلاف اس کے ان ہی وجوہات سے اور اکثر لوگوں کو بوجہ خوشامد رنگ یا قومیت کے بڑے بڑے جرائم کے بدلے میں بھی برائے نام سزائیں ملتی ہیں تو ہماری غریب صلح پسند طبیعت بالکل پھر جاتی ہے اور ہمارا سارا اعتقاد برٹش انصاف سے یک لخت اُٹھ جاتا ہے۔ وزیر ہند۔ گورنر جنرل۔ حکام مقامی اور دیگر ماتحت حکام کو فوراً اس امر کی کوشش کرنا چاہیئے کہ اس قسم کی بدعنوانیاں نہ صرف کمیاب بلکہ نایاب ہو جائیں اور جو سزا بھی ان کی عدالتوں سے صادر ہو وہ سزا کا سچا منشا پورا کرتی ہو۔ اور اس میں انتقام کے ذلیل جذبہ کی بالکل بو نہ آتی

ہو +

یہ جملہ امور موجودہ گورنمنٹ کی بہبودی اور استقامت کے واسطے سمجھائے گئے - ورنہ ہمارا ہلال کوشش اس قسم کے ظلم وجبر کی امداد سے بہت جلد بدر کامل بنے گا - ہمیں اِن سختیوں کی بابت نہ کچھ شکایت ہے - اور نہ ہوسکتی ہے - کیونکہ ہماری قومی فضیلت ہمارے استقلال ہماری قوم پرستی - خود انکاری وخود ایثاری کا سکہ انہی ذریعوں سے نہ صرف ہم ہی پر جمتا ہے - بلکہ غیر اقوام اور خود حاکم وقت قوم کے سخت دل پر بھی بیٹھ جاتا ہے +

صاحبو جو ہلال عید ہے وہ کبھی نہ کبھی بدر کامل ضرور بنے گا - آؤ ہم سب اپنی اپنی بساط کے موافق ملکی خدمات کے چاند کو چوتھے آسمان پر لگانے کی کوشش کریں - خدا ہماری مدد کرے گا +

ترقی - پادری صاحبان کی پرجوش کوششیں ہر طرف اپنا کام کر رہی ہیں - مذہبی کوششوں کے علاوہ علمی خدمات میں بھی اُنھوں نے نمایاں حصہ لیا ہے اور نہ صرف انگریزی میں مفید کتب کی اشاعت کا انتظام کیا ہے - بلکہ ہر ایک مروجہ زبان کو اپنے علمی خزانہ سے مالا مال کیا ہے اگرچہ یہ کہنا غلط نہیں کہ جو حوصلہ افزائی گورنمنٹ کی طرف سے عیسائی صاحبان کی کی جارہی ہے اس کی توقع آیندہ میں برس تک تو اور کوئی نہیں کر سکتا اور یہ حوصلہ افزائی ان اولوالعزم حامیان مشن کی کامیابی کا راز ہے ترقی نام کا ایک علمی رسالہ لاہور کی بائیبل سوسائٹی کے اہتمام سے شائع ہوتا ہے حضرت بیلی غرجو علمی دنیا میں خاص امتیاز درجہ رکھتے ہیں اس کی ایڈیٹری کا قلمدان سنبھالے ہوئے ہیں اور اس لیئے اس رسالہ کو ہر طرح کامیاب رسالہ کہا جاسکتا ہے - رسالہ کی خصوصیت انگریزی رسالوں اور کتابوں کے ترجمے ہیں جو بجائے خود دلچسپ اور مفید ہیں - قیمت عگر بائیبل سوسائٹی لاہور کے پتہ سے درخواست کرنی چاہیئے +

یادِ وکٹوریا

از منشی تلوک چند محروم

آہ اے وکٹوریا! اے مادرِ ہندوستاں — ایک تیری ذات شفقت میں تھی مشہورِ جہاں

اس جہاں کو تو نے جنت کر دیا تھا فیض سے — اُس جہاں میں مل گئی تجھکو بہشت جاوداں

جلوہ افگن واں کنارِ چشمۂ کوثر ہے تو — سیلِ اشکِ خوں یہاں چشمِ رعایا سے رواں

نغمۂ مرغانِ جنت سے وہاں دل شاد تو — اور تیرا ہند محوِ شیون و آہ و فغاں

کس طرح ہے چین زیرِ سایۂ طوبےٰ تجھے — دور ہے تجھ سے بہت کیا شورِ آہِ بیکساں

مادرِ مشفق! ہمارا حال ابتر ہے بہت — تھام لے اپنا جگر سن لے ہماری داستاں

پھر ہدفِ تیغِ جفا ہونے لگے ہم خستہ تن — پھر مٹانے کو ہوا تیار ظالم آسماں

تیرے وعدوں پر نہیں افسوس کوئی کاربند — آہ پھر ہونے لگی ہیں بیکسوں پر سختیاں

وہ تیری نصفت شعاری ساتھ تیرے چل بسی — صاف بے انصافیاں ہیں اس کا شاہد ہے جہاں

ہم تو بندے تھے وفا کے اور محبت کے غلام — آج کوئی کاش کہ ہوتا ہمارا قدرداں

چین میں جا کر لڑے افریقہ میں جا کر کٹے — اپنے کندھے پر اُٹھا کر تیری عظمت کا نشاں

تیری مہرِ مادری پر بک گئے ہم سرفروش — اب ملک ہے سر ہمارا اور تیرا آستاں

ہو گیا دوزخ ہمارا ملک جنت سا ہمیں — سوئے جنت جب گئی تو چھوڑ کر ہمکو یہاں

جرم سنگیں ہو گیا ہے آج اظہارِ خیال — اور مہارانی بتائیں کس کو ہم رازِ نہاں

ہے مقید آہ! زندانخانۂ دل میں خیال — چھن گئیں تو نے جو بخشی تھیں ہمیں آزادیاں

ہو گئے اتنے سبک اب تیرے نازوں کے پلے — کھینچتے پھرتے ہیں زندانوں میں بھاری بیڑیاں

ق

آج دکھلا کر ہمیں تیغ و قلم وا حسرتا — زخم سے پھاہا اُٹھا کرتے ہیں نشتر زناں

پوچھتے ہیں پھر کہ ہو کس کی اطاعت کے تلے تیغ ہو تم پہ ہماری یا قلم ہو حکمراں
ہم یہ کہتے ہیں تمہیں تیغ و قلم سے کیا غرض یہ تو دونوں ہیں ہمارے اور کچھ لاؤ یہاں
یاد رکھو مادر مشفق کے وعدوں کے بغیر
ہے ہمارے واسطے ہر اک عمل آزار جاں

بلبل و نہار مسٹر وناگٹ پرشاد طالب آزاد کے ان سرپرستوں میں سے ہیں جن کی سرپرستی اسکے لئے ہمیشہ موجب فخر رہی ہے اور رہیگی۔ آپکا کلام ایک سے زیادہ مرتبہ زینت اوراق آزاد ہو چکا ہے اس لئے کسی مزید تعارف کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ آج ہم اپنے محسن کے ایک نئے ڈرامے کا مختصر حال ہدیہ ناظرین کیا چاہتے ہیں جو یقیناً ان کے لئے دلچسپ ہوگا۔ اگرچہ حضرت طالب کی طباعی کے ہم مدت سے قائل ہیں مگر جو اثر انکے اس نئے ڈرامے کو دیکھکر ہوا اس کی تصویر الفاظ میں کھینچنا دشوار ہے۔ پلاٹ اگرچہ لارڈ لٹن کے ایک ناول نائیٹ اینڈ مارننگ سے لیا گیا ہے مگر مترجم نے اس میں چند تبدیلیاں جنہیں خوبیاں کہنا چاہئے ایسی پیدا کر دی ہیں کہ اصل ناول اسکے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ ہم ابتک اس بات کے قائل نہ تھے کہ کوئی اچھا ناٹک ہندوستانی سٹیج پر لایا جا سکتا ہے کیونکہ ہمارا خیال تھا کہ ہندوستانی سٹیج کا ڈرامہ رطب و یابس سے خالی نہیں ہو سکتا مگر حضرت طالب نے ہمارے اس خیال کو غلط ثابت کر دیا شروع سے آخیر تک ایک لفظ بھی ایسا نہیں ملتا جسے بھرتی کا لفظ کہا جا سکے اور ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ وہ تمام دلچسپیاں موجود ہیں جو ڈرامے کو سٹیج کیلئے موزوں بنا تی ہیں۔ لیل و نہار کا ہر ایک سین سنسنی پیدا کر دینے والا ہے فیروز کے قتل اور شہناز کی موت کا سین ایسا دردناک ہے کہ کوئی شخص آنسو بہائے بغیر نہیں دیکھ سکتا اور ہمیں یہ دیکھکر حیرت ہوئی کہ محکمہ پولیس کے ایک افسر بھی اس سین کو دیکھکر رو رہے تھے۔ دردناک نظاروں کے ساتھ ظرافت کی آمیزش نے عجیب کیفیت پیدا کر دی ہے۔ متانت و ظرافت کو ساتھ ساتھ نباہنے میں مصنف نے کمال کیا ہے اور یہ ایسی خوبی ہے جو انگریز مصنف بھی پیدا نہیں کر سکے نیرنگی زمانہ۔ دنیاوی حرص ہوس اور نیکی کی فضیلت کی اس سے بہتر تصویر نہیں کھینچی جا سکتی۔ ہر ایک کیرکٹر بجائے خود ایک سبق ہے اشرف کی وفاداری۔ جہاں سیر کی ہوس پرستی۔ شہناز کی عصمت شعاری اور دردناک موت۔ فیروز کا ہمت اور استقلال۔ انور کا بھولا پن نہایت دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ زبان ایسی پیاری کہ پنجاب میں تو بہت کم سننے میں آئی ہوگی۔ بے تکلف۔ بے ساختہ۔ بامحاورہ اور پھر ناٹک کی قافیہ بندی کی پابند ظرافت متانت غرض کس کس کی تعریف کی جائے مختصر یہ کہ یہ ناٹک علمی حیثیت سے اپنی نظیر نہیں رکھتا اور ہم مسٹر طالب کو اس قابل فخر تصنیف کیلئے مبارکباد دیتے ہیں۔ اسکے ساتھ ہی مالک نیو البرٹ تھیٹریکل کمپنی جنہیں پنجاب میں کمپنی کو ہر دلعزیز بنانے میں جو بے نظیر کامیابی حاصل ہوئی ہے اور ان ایکٹروں کی جنہوں نے اپنے کمال فن کا سکہ اہل پنجاب کے دلوں پر بٹھا دیا ہے کوششوں کی داد نہ دینا سخت بے انصافی ہوگی۔ انور کا پارٹ جو ایک کمسن بچے نے کیا خصوصیت سے پسند کیا گیا۔ فیروز کا پارٹ نہایت خوبی سے ادا کیا گیا۔ جہاں سیر نے بے رحمی کی تصویر بننے میں کمال کیا۔ اور منشی غلام علی دیوانہ نے شرف کے پارٹ میں مستقل داد ظرافت دی۔ زنانہ پارٹ مثل افروز کا گلدم نے نہایت ہی خوبی سے ادا کیا +

ہندوستاں ہمارا

از مسٹر لاموایل صادق طالب علم

پہلا سا کب رہا ہے ہندوستاں ہمارا — بالکل بدل گیا ہے اب آسماں ہمارا
برقِ ستم سے جلتا ہے آشیاں ہمارا — نا آشنا ہے ہم سے کیا باغباں ہمارا
جنت کا تھا نمونہ یہ گلستاں ہمارا — جبتک کہ تھا نہ آیا دورِ خزاں ہمارا
کیا حال ہو گیا ہے یہ ناگہاں ہمارا — ہر روز بڑھ رہا ہے دردِ نہاں ہمارا
ہم آج ناتواں اور کمزور ہو گئے ہیں — مانے کبھی تھا لوہا سارا جہاں ہمارا
حشمت و جاہ و ثروت ہمت و زور زر ہیں — سارے جہاں میں تھا ثانی کہاں ہمارا
ایسی تو ردی حالت اپنی بنائی اس نے — دیکھیں دکھائے کیا کیا خوابِ گراں ہمارا
نالوں سے اپنے سر پہ ہم تو فلک اٹھاویں — سنتا ہے کون لیکن شورِ فغاں ہمارا
دوزخ سے بھی ہے بدتر افسوس آج یہ تو — ہندوستاں کبھی تھا رشکِ جناں ہمارا
ہم مفلسی کے باعث آہ مر رہے ہیں کیوں — کہنے کو گرچہ ہے زرفشاں ہمارا
نالہ بھی ضعف سے اب لب پر نہیں ہے آتا — کچھ چپ ہوا ہے ایسا شیریں دہاں ہمارا
کیا بات اب اگرچہ غیروں کے ہاتھ میں ہے — دنیا میں تھا کبھی تو ہندوستاں ہمارا
دشمن بھی اس کو سنکر آٹھ آٹھ آنسو روئیں — کچھ درد سے بھرا ہے ایسا بیاں ہمارا
آثار انقلابِ گردوں نہیں ہیں اچھے — مٹ جائے نہ جہاں سے یارب مکاں ہمارا

مرنے پہ بھی اے صادق عشقِ وطن رہیگا
ہوگا یہی زباں پر "ہندوستاں ہمارا"

پیرس

از بھائی پرمانند ایم۔ اے از پیرس

مبارک ہیں وہ لوگ جو اپنی زندگی قوم اور ملک کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ ایسے محبان وطن کی زندگیاں ایثار نفسی اور اولوالعزمی کا سبق ہیں اور اپنے نقش قدم پر چلنے کا جوش اور حوصلہ پیدا کرنے والی ہیں نفس کشی کے بغیر یہ امید رکھنا کہ ہمارا ملک ترقی کرے فضول ہے پنجاب کا قومی کالج ڈی۔ اے۔ وی کالج اگر مقبول عام ہوا تو اس کی وجہ محض یہ ہی نہیں کہ وہ ایک قومی کالج تھا بلکہ اس لئے کہ اس نے وہ ہونہار سپوت پیدا کئے جنھوں نے اپنی زندگیاں اسی مبارک مشن کے لئے وقف کر دیں جس کے لئے کالج قایم کیا گیا تھا اور اہل وطن کو دکھلا دیا کہ

ملک اور قوم کی ترقی کے لئے ایسی قربانیوں کی ضرورت

ہے۔ ہمارے محترم دوست اور آزاد کے سرپرست بھائی پرمانند ایم اے جنھوں نے زمانہ قیام یوروپ میں بھی باوجود سخت مصروفیت کے آزاد کی قلمی اعانت کو اپنا فرض جانا اور نہایت شوق سے اپنا فرض ادا کرتے رہے انہی ہونہار سپوتوں میں سے ہیں جن پر نہ صرف ڈی۔ اے۔ وی کالج کو بجا فخر ہے بلکہ کل ہندوستان کے لئے ان کی مبارک زندگی سرمایہ ناز ہے۔ آپ ۷۵ روپیہ ماہوار کی قلیل تنخواہ پر جو فی زمانہ بمشکل ضروریات زندگی کے لئے کافی ہو سکتی ہے کالج کا کام کرتے رہے اور اب پھر ولایت سے واپس آکر اسی تنخواہ پر کالج کے مشن شامل ہو جائیں گے۔ آپ قیام انگلستان

کے زمانہ میں نہ صرف کالج کے لئے اپنا فرض انجام دیتے رہے بلکہ اپنے پیارے
وطن کا خیال بھی ایک لحظہ کے لئے ان سے جدا نہ ہوا۔ آپ نے تاریخ ہند کے
متعلق تحقیقات کی اور اب ہمیں اطلاع دیتے ہیں کہ وہ ان معلومات کو
اردو اور انگریزی کتاب کی صورت میں جلد شایع کر دیں گے۔ یہ بیش بہا
تحفہ انگلستان سے اہل وطن کے لئے لاتے ہیں اور ہمارا یقین ہے کہ یہ تحفہ
ملک کے لئے ایک نایاب تحفہ ہوگا۔ ہم کوشش کریں گے کہ اوراق آزاد
بھی اس کے کسی حصہ سے زینت حاصل کر سکیں +

ہمارے ثنائی الملک دوست واپس آ رہے ہیں اور پیشتر اس کے کہ
یہ تحریر آپ تک پہنچے بھائی صاحب ہندوستان میں ہونگے۔ واپسی پر
آپ نے چند روز کے لئے پیرس میں قیام کیا اور اس چند روزہ قیام
میں جو کچھ دیکھا اور دیکھا جا سکا اُسے آزاد کے لئے قلمبند کیا۔ ہم دلی
شکریہ کے ساتھ اس عطیہ کو درج کرتے ہیں۔ ایڈیٹر

پیرس دنیا میں ایک بے نظیر شہر ہے۔ اس لئے اس کا اور یہاں کی زندگی
کا مختصر سا ذکر آپ کے ناظرین کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ پیرس اپنی خوبصورتی
میں لاثانی کہا جاتا ہے۔ اس کی خوبصورتی اس میں ہے کہ سارا شہر ایک خاص
وضع Design کا بنا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی سڑکیں میلوں تک
لمبی۔ سیدھی۔ فراخ اور صاف ہیں۔ بعض مقامات پر دونوں کناروں پر
درخت شہر کی خوبصورتی کو دوبالا کرتے ہیں۔ لنڈن کی طرح پیرس بھی دریا کے
دونوں طرف آباد ہے۔ اور تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر دریا کے اوپر پل
بنے ہیں۔ شہر کے اندر ایک جگہ دریا دو حصوں میں پھٹ جاتا ہے اور پھر
تھوڑی دور جا کر مل جاتا ہے۔ اس سے شہر کا چھوٹا سا حصہ ایک جزیرے کی

شکل میں واقع ہے - بمقابلہ لندن کے پیرس بہت ہموار شہر ہے - سڑکوں کے دونوں طرف پیدل چلنے والوں کے لئے بڑے فراخ راستے ہیں +

مکانات کی بناوٹ لنڈن کی زیادہ خوبصورت ہے - لنڈن میں ہر ایک گھر کے متعلق چھوٹا سا باغیچہ ہوتا ہے جو پیرس میں نہیں پایا جاتا - پیرس میں عام دستور یہ ہے کہ ہر ایک مکان کی ایک ایک منزل پر مختلف لوگ رہتے ہیں شاذو نادر ہی ایک مکان ایک شخص کے قبضہ رہایش میں ہوگا - ہر ایک مکان کے تہ خانہ میں ایک دربان اور اُس کے قبیلہ کے رہنے کا مکان ہے - جو کہ مکان کی دن رات نگرانی رکھتے ہیں - سب مکان بڑے عالی شان اور کئی منزلہ ہیں +

یہاں کے باشندے - قدوقامت - ڈیل ڈول - جسمانی بناوٹ اور لباس وغیرہ میں لنڈن سے کوئی مقابلہ نہیں رکھتے - لنڈن کے لوگ رنگ میں نہایت چمکیلے اور لباس میں نہایت شوقین ہیں اور یہاں ان دونوں باتوں کے لحاظ سے جو ایک چھوٹائی کا خیال قدرتاً لنڈن کے بازاروں میں چلنے سے ہمارے دل میں ہوتا ہے - وہ یہاں آکر بالکل دور ہو جاتا ہے رنگ تو یہاں کے لوگوں کا اتنا مدھم ہے کہ کوئی شخص بھی مجھے یہاں اجنبی نہ خیال کرتا ہوگا

کثیر التعداد آدمیوں کا سنگ ایسا ہے - جیسا کہ ہمارے ہاں ہوتیرے آدمیوں کا ہوتا ہے - لباس کے بارہ میں اتنا عرض کر دوں - کہ کوٹ اور پتلون کو درست رکھنے کے لئے خاص سانچے جن پر کہ ہمارے طلبا بھی انگلینڈ میں جا کر ایک دوگنی (قریباً تیس بتیس روپیہ) خرچ کرتے ہیں - یہاں شاید ہی کوئی آدمی استعمال کرتا ہو - کم از کم میں نے کسی دوکان پر نہیں دیکھا

یہاں کے لوگ بہت سادہ لباس پہنتے ہیں۔ اس کی شاید یہ وجہ ہو۔ کہ یہاں
پر اتنے دولت مند اور فیشن رکھنے والے اصحاب نہیں۔ جتنے کہ لنڈن میں۔
کسی درجہ تک یہ ٹھیک ہے۔ مگر اس کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ یہاں پر دولت
بمقابلہ لنڈن کے زیادہ یکساں تقسیم کی جاتی ہے یہاں پر اُس غریبی اور
بھوک ننگ کا نشان بھی نہیں جس میں کہ لنڈن کے مشرق اور جنوب کے
لاکھوں انسان مبتلا ہیں +

لنڈن میں جو دو انتہا غریبی اور دولت کی ہیں وہ پیرس میں اس قدر
نظر نہیں آتے۔ لنڈن کے شمالی حصوں میں ہزاروں کیا لاکھوں مرد عورتیں
اور بچے آپ کو ملیں گے جنہوں نے عمر بھر بدن صاف نہ کیا ہو اور کپڑے
بدلے ہوں یہ حالت پیرس میں نہیں۔ یہاں پر غریب سے غریب بچہ بھی
کم از کم صاف معلوم ہوتا ہے +

قد و قامت اور ڈیل ڈول میں یہاں کے لوگ انگریزوں سے بہت
کم ہیں۔ لنڈن کی پولیس جیسا ایک آدمی بھی یہاں پر نظر نہیں آتا۔ میرا تو
خیال ہے کہ یہاں کے لوگ قد و قامت میں اوسطاً ہم لوگوں سے بھی کم
ہوں گے۔ لیکن ان لوگوں کی خوبی ان کی ذہانت ہے۔ دماغی طاقت
میں فرانس کے لوگ یورپ میں اول درجے پر ہیں۔ تمام ترقی کی تحریکوں
میں ان لوگوں نے یورپ کی رہنمائی کی ہے +

ایک موقعہ پر یہاں ایک اخبار نے یہاں کے دس بڑے آدمیوں کے
نام دریافت کئے۔ تو اُن میں سب کے سب اعلےٰ دماغ والے اشخاص کے
نام تھے یعنی سائینس دان اور لکھنے والوں کے۔ انگلینڈ کی طرح کسی بڑے جرنیل
وغیرہ کا نام اُس فہرست میں نہ تھا۔ اس لئے تاریخی طور پر پیرس یورپ میں

میں ایک مقدس شہر سمجھنا چاہئے - یہاں پر تمام بڑے بڑے پبلک مکانات پر تین الفاظ کندہ ہیں - آزادی Liberty برابری Equality اور یگانگت Fraternity - کسی جگہ آزادی کا بت ہے اور کسی جگہ جمہوری گورنمنٹ کا جوکہ ہندوؤں کی دیوی کی طرح شیر پر سوار ہے - اور ہاتھ میں جھنڈا لیا ہوا ہے +

وہ مکانات جو شاہی خاندان کے محل تھے - آج تصویروں کے عجائب گھر ہیں - وہاں شاہی تاج پبلک کے لئے پڑا ہے - اُس تاج کے ساتھ فرانس کا سب سے بڑا ہیرا ابھی موجود ہے جوکوہ نور کی طرح ہندوستان سے لایا گیا تھا بڑے انقلاب Revolution کے نشانات کا عجائب گھر جدا ہے - جہاں پر اس وقت کے تمام مشہور اشخاص کی تصاویر - اُن کی چٹھیاں - ریولیوشن کے جھنڈے - ہتھیار - Badges اور تمام بڑے بڑے نظاروں کی تصاویر موجود ہیں - نپولین کے فتوحات کی یادگاریں ہیں - دوسری Revolution کی یادگاریں ہیں - اس خیال سے پیرس جگہ جگہ پر اُس جدوجہد کو یاد دلاتا ہے جوکہ مردوں اور عورتوں نے آزادی حاصل کرنے کے لئے کی اور جس کیلئے ہزاروں جانیں قربان ہوئیں +

ایک بڑے خوبصورت میدان میں جوکہ شہر کے مرکز میں واقع ہے - چار کونوں پر آٹھ بت فرانس کے آٹھ صوبوں کو ظاہر کرتے ہیں - ان میں سے ایک صوبہ ۱۸۷۰ء میں جرمنی نے فتح کر لیا - اُس بت پر ماتم کے نشان کی کالی جھنڈیاں لٹکائی گئی ہیں - اور اہل فرانس اپنے ملک کو ماتم میں خیال کرتے ہیں - جبتک کہ وہ حصہ جرمنی سے واپس نہ لے لیویں +

یہ عام خیال کہ اہل فرانس زیادہ تبدیلی پسند ہیں غلط ہے - یہاں بھی

انگلینڈ کی طرح دو پارٹیاں ہیں۔ وہاں لبریل اور کنسرویٹو ہیں۔ یہاں ایک بادشاہ کے حق میں اور دوسری جمہوری سلطنت کے حق میں۔ ان پارٹیوں کی جدوجہد آپس میں اسی طرح چلی آئی ہے۔ جیسی کہ انگلینڈ میں لبریل اور ٹوری کی +
عام زندگی کا پہلو یہاں زیادہ بیرونی ہے۔ تمام بڑی بڑی سڑکوں کے دونوں طرف کھانے پینے کی جگہ ہیں۔ ایک ایک ریسٹورانٹ (کھانے پینے کی جگہ) مکان کے اندر اور برآمدہ میں سینکڑوں کرسیاں اور چھوٹے چھوٹے میز پڑے ہیں۔ مرد و عورتیں آتی ہیں۔ کھایا۔ پیا۔ وہاں پر آرام کیا۔ باتیں کیں۔ اور اس طرح سے زندگی کا لطف اُٹھاتے ہیں۔ لنڈن میں زندگی کا یہ بیرونی پہلو بالکل معدوم ہے۔ وہاں پر ایک کھانے کی جگہ میں دو آدمی سال بھر تک جاتے رہیں۔ ایک دوسرے کو دیکھتے رہیں پھر بھی ایک دوسرے کا نام تک نہیں جانتے۔ اس بیرونی اور کھلی زندگی کا اثر یہ ہے کہ یہاں کے لوگ زیادہ خلیق اور ملنسار ہیں۔ انگریزوں کی سب سے بڑی خصوصیت اُن کی خاموشی اور حد درجے کا سنجیدہ پن ہے تو اہل فرانس کا بے تکلفی اور ملنساری +

سوشیل کنبہ کی زندگی میں انگلینڈ اور فرانس کا بڑا بھاری فرق ہے۔ کنبہ میں فرانس کے لوگ زیادہ ہندوستانیوں سے ملتے ہیں۔ یہاں پر گھر کے چھوٹے ممبر اور خاصکر لڑکیاں اپنے بڑوں کی سخت نگرانی میں رہتی ہیں۔ کوئی لڑکی جبتک وہ کنواری ہے اکیلی باہر نہیں جا سکتی۔ اور کسی دوسرے لڑکے کیساتھ پھرنا تو ناممکن۔ سکول میں بھی لڑکی کے ساتھ یا تو ماں جاتی ہے یا نوکرانی۔ اکیلی لڑکی کو باہر بھیجنا معیوب سمجھا جاتا ہے +

ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جتنی بہنیں ہوں ان سب کا لباس اور دوسری چیزیں ایک ہی قسم کی اور ایک ہی شکل کی ہوتی ہیں۔ اس بات کا نتیجہ یہ ہے کہ

یہاں پر لڑکی کی شادی اُس Courtship طریقہ سے نہیں ہوتی جیسی کہ انگلینڈ
میں۔ لڑکی لڑکے کی شادی عموماً ماں باپ کے اختیار میں ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہمارے
ہاں رواج ہے۔ اس طریقہ کا ممکن ہے یہ نتیجہ ہو کہ کئی شادیاں مزاج کے تہ
جاننے کی وجہ سے بہت خوشی دینے والی نہ ہوتی ہوں۔ مگر اس میں بھی کچھ شک
نہیں کہ یہاں کی لڑکیوں کی وہ قابل رحم حالت نہیں جو انگلینڈ میں ہے۔
لڑکی نوجوان سے اس اُمید پر دوستی پیدا کرتی ہے کہ وہ اُس سے شادی کریگا۔
وہ نوجوان دوسری لڑکی کو پسند کرنے لگ جاتا ہے اور اس بچاری کو مایوس ہونا
پڑتا ہے۔ یہ ناگوار مایوسی لڑکی کی زندگی کا قابل رحم پہلو ہے۔ اسکے ساتھ وہاں
پر ایک عام رواج ہے۔ کہ چھوٹے چھوٹے لڑکے چھوٹی عمر سے ہی لڑکیوں کے ساتھ
دوستی کا سلسلہ قایم کر دیتے ہیں۔ اور اس طرح دونوں طرف کے والدین کو کسی طرح
سے کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ بہر حال اس سارے سوال کے دونوں پہلو غور کے
قابل ہیں **پبلک اخلاق** یہاں پر بازاری عورتوں کیلئے لائسنس سرکار کی طرف سے
ملتا ہے۔ انگلینڈ میں قانوناً اس امر کی ممانعت ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ ایسی
حالت میں پیرس میں اُن عورات کی تعداد خاصی زیادہ ہے جن کا روزگار ہی
یہ ہو گیا ہے۔ اور جنہیں روکنا یہاں کی گورنمنٹ مناسب نہیں سمجھتی۔ برخلاف اسکے
انگلینڈ کو یہ ایک طرح سے فخر ہے کہ وہاں پر کھلے طور پر کوئی عورت اس پیشہ میں
شامل نہیں ہو سکتی۔ اسلئے لنڈن میں خراب عورتوں کی تعداد کا اندازہ لگانا مشکل ہے +

اہل فرانس کا یہ خیال ہے کہ یہ آزادی کنبہ کی پاکیزگی کو قایم رکھنے کے لئے
ضروری ہے۔ اگر یہ قانوناً جائز نہ ہو تو یہ ڈر ہے کہ برائیاں کنبہ کے اندر آگھسیں اور
قوم میں خرابی پیدا کریں۔ انگلینڈ ابھی تک اپنے قانون کو قائم رکھے جاتا ہے ممکن ہے کہ
برائی اندرونی طور پر پھیلکر زیادہ زہریلی ثابت ہو مگر کسی قسم کی خاص لسٹ قائم کرنا مشکل امر ہے +

شہید جفا

لالہ گوردس رام صاحب ساہنی مرحوم بیرسٹرایٹ لا (پیدایش جولائی ۱۸۶۵ء انتقال ۲ مارچ ۱۹۰۶ء)

از لالہ امولک رام صاحب وکیل راولپنڈی

قریب ہے یار روز محشر چھپیگا کشتوں کا خون کیونکر ۔۔۔ جو چپ رہیگی زبان خنجر لہو پکاریگا آستیں کا

پیارا گوردا س - شہید جفا گوردا س - ملک کی امیدوں کا سہارا گوردا س افسوس اب ہم میں نہیں رہا - اب وہ اس انصاف کل کے دربار میں اپنی بیگناہی کی شہادت ہے - وہ صورت جو ہمیں تسلی بخشنے والی تھی افسوس اب ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے - پیارے گورداس کی زندگی سچائی کا نمونہ اور حمیت قومی کی مثال ہے - دشمنوں نے اگرچہ تیری فانی ہستی کو مٹا دیا مگر تجھے اب وہ حیات جاودانی عطا ہوئی ہے جسے انسانی طاقت نہیں مٹا سکتی - تیرا نام جب تک زمین و آسمان قایم ہے آفتاب بنکر چمکیگا اور تیرے خون کا دھبہ تیرے دشمنوں کے دامن کے لئے ہمیشہ بدنما داغ بنا رہیگا - تیرا اس جہان فانی سے کوچ کر جانا اگرچہ ہمارے مصائب کے پیمانہ کو لبریز کر دیتا ہے - مگر ہندوستانیوں کی جان نثاری ثابت کرنے کے لئے کافی ہے - کیا اب بھی ہندوستانیوں کی جانبازی پر شک کیا جاسکتا ہے ؟ شک کرنے والے سے کہدو کہ تجھے حق شناس آنکھیں عطا نہیں ہوئیں اور اگر تیری آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں تو اس میں ہمارا قصور نہیں - طوفان مصیبت میں پیارے گورداس تم چراغ رہبری تھے اگرچہ تم ہم سے چھین لئے گئے ہو مگر تمہارا جوش اور حوصلہ

ہم میں باقی ہے - سچائی کی حمایت ہم نے تم سے سیکھی ہے - اور تم دیکھو
گے کہ تمہارے اہل وطن تمہارے سبق کے کیسے عامل ہیں - پرماتما
تمہاری روح کو شانتی دیں - اور تمہارے دشمنوں کے گناہ بخش
دیئے جائیں - ایڈیٹر

لالہ گورداس رام صاحب ساہنی مرحوم کی جو تصویر آزاد کی موجودہ
اشاعت میں ہدیہ ناظرین ہے - یہ اُن کے انتقال پر ملال سے چند ہی روز
پیشتر لی گئی تھی - آپ ایک معزز کھتری خاندان معروف ساہنی
متوطن بھیرہ ضلع شاہ پورہ میں سے تھے - آپ کے والد بزرگوار ضلع
گورداسپور میں ملازم تھے - اور لالہ گورداس رام نے ابتدائی تعلیم اُسی
ضلع کے ہائی سکول میں پائی - انٹرنس پاس کرکے لاہور گورنمنٹ کالج میں
شامل ہوئے اور وہاں بی - اے جماعت تک تعلیم ختم کرکے انگلستان
تشریف لے گئے اور بیرسٹر بن کر سال ۱۸۹۳ء میں بمقام راولپنڈی
کام شروع کیا - اس کام میں بڑی نمایاں کامیابی حاصل کی - آپ بڑے
خوش شکل - خوش پوش - خوش خور - خوش اخلاق اور ہمیشہ خوش
رہنے والے تھے - آپ کو باغ اور جانوروں کا خاص شوق تھا -
اُن کی کوٹھی کے گرد جو ہرا بھرا باغ راولپنڈی میں ہے اور
جہاں مختلف میوہ جات اور پھولوں کے درختوں میں مور اور ہرن
پھرتے نظر آتے ہیں اُن کے شوق اور مذاق کا خاصہ اندازہ بتلاتا
ہے - شروع میں اُن کی طبیعت کا میلان زیادہ تر علیحدگی اور گوشہ نشینی
کی طرف تھا - مگر جب چند احباب کے تقاضے پر وہ زندگی اختیار کی
جس کو انگریزی میں پبلک لائف کہتے ہیں اور جس سے مطلب امور

متعلقہ بہبودی قوم اور ملک میں حصہ لیتا ہے تو ہر ایک معاملہ میں جو فلاح یا اصلاح قومی اور بہتری ملک کے لئے موزوں خیال کیا گیا خوب دلچسپی سے بلا کسی قسم کی خودغرضی کے کام کیا۔ بھیرہ میں سکول کھولنے کے لئے جب تجویز پیش ہوئی۔ تو وہ تن۔ من۔ دھن سے امداد کو طیار تھے۔ راولپنڈی کی کھتری کانفرنس کو آپ کی طرف سے خاص مالی اور عملی مدد دی گئی۔ آپ آریہ سماج کے فریق۔ حامیان۔ دیانند اینگلو ویدک کالج کے اعلےٰ ارکان میں سے تھے۔ اور ہر ایک چندہ کی فہرست میں جو کسی قومی کام کی امداد کے واسطے تیار ہوئی خواہ اُس سے غرض اشاعت تعلیم تھی یا پرورش یتیماں۔ انگلستان میں اپنے وکیل کے ذریعہ اپنے دکھڑے کا رونا یا کانگڑہ کی مصیبت زدوں کی امداد۔ اور دستگیری اُن کے نام کے سامنے ہمیشہ امتیازی رقم موجود پائی جاتی تھی۔ پبلک پلیٹ فارم پر عوام کے روبرو اپنی سچی رائے کا اظہار ہمیشہ متانت اور اعتدال کے ساتھ ضرور مگر نڈر آزادی کیساتھ کیا خواہ پنجابی اخبار کی ہمدردی کا جلسہ ہو یا لارڈ کرزن کی ہتک آمیز کانووکیشن تقریر کی علانیہ تردید کی ضرورت۔ خواہ بیگار کے مظالم کی شکایت۔ خواہ نوآبادگان نہر سے عہدشکنی معرض بحث میں ہو۔ یا اہالیان بندوبست کا ظالمانہ ایزاد معاملہ کا ذکر لالہ گورداس رام صاحب مرحوم ہمیشہ آزاد اور بے خوف رائے ظاہر کرنے کو طیار تھے۔ اور آخرکار یہ بھی اُن کی بے وقت موت اور نہایت سرسبز زندگی کے انقطاع کا باعث ہوا۔ اُن کی قبل از وقت علیحدگی پر پنجاب بالعموم اور اُن کے سخت غمزدہ رشتہ داروں اور احباب بالخصوص

جس قدر رنج اور افسوس کریں کم ہے۔ راولپنڈی کے ۶ مجرمان بیگناہی میں
سے جو معہ ایک کثیر تعداد ہندو و شرفا حکام کی بیسے جا سختی۔ بے سوچ
سمجھ کارروائی۔ اور خلاف قانون عمل کے باعث ۱۵۳ - دن ۲ مئی
سے لیکر ۱۴ - ستمبر سنہ ۱۹۰۷ء تک سخت گرمی کے موسم میں جیلخانہ میں
محبوس رہے آپ ایک تھے۔ آپ کو اس گرفتاری سے تھوڑا عرصہ
پیشتر عارضہ احتراک القلب لاحق ہو گیا تھا۔ مگر آپ کے بڑے بھائی
ڈاکٹر بھگت رام صاحب ساہنی - ایم - بی چیف میڈیکل آفیسر جموں
کے مجرب اور ہمدردانہ علاج سے طبیعت رو بہ صحت تھی۔ اور بیماری
میں صریح افاقہ نظر آتا تھا۔ کہ یہ مصیبت آپڑی۔ آپ بڑے باحوصلہ
تھے ہرگز گھبرائے نہیں۔ اور گھبراتے کیوں کوئی گناہ نہیں کیا
تھا۔ مگر قانون قدرت میں کوئی چارہ نہیں۔ اس بیماری کے لئے تردد
اور مایوسی وقتاً فوقتاً طبیعت کے اعتدال کا نجاوز زہر قاتل کا حکم رکھتا ہے
بارہا ان سطور کے راقم اور انہوں نے خود سپرنٹنڈنٹ جیل اور عدالت
کے پاس اُن کی نازک حالت کا بیان کرکے اُن کو ضمانت پر رہا کر دینے
کی ضرورت ظاہر کی۔ مگر کون سنتا تھا۔ کرنیل ہنڈلی صاحب نے عدالت
میں بطور گواہ کہا کہ اُن کی دل کی بیماری ہونے کے متعلق جو تشخیص ہے
وہ غلط ہے۔ مگر آخرکار جب لالہ گوردا س رام کے انتقال کے بعد ڈاکٹر
ہنڈلی نے اُن کی لاش کا ملاحظہ کیا تو اُن کو قبول کرنا پڑا۔ کہ اُن کی
رائے غلط تھی۔ اور وہ بھی احتراک القلب جس کے وجود سے وہ انکاری
تھے مرحوم بے نظیر کی وفات کا باعث ہوا۔ ڈاکٹر ہنڈلی صاحب نے
اپنی رائے سچائی اور نیک نیتی سے قائم کی ہوگی۔ مگر تعجب نہیں اگر

کہ انتظامی حکام کے اس واویلا نے کہ سرکش محبان وطن کے ضمانت پر رہا ہونے سے سرکاری مقدمہ بگڑ جاویگا اور ہماری ضمانت کی درخواست کا مطلب یہی ہے یہ وجوہات صحیح ہیں ہا۔ ہماری شکایت کو اُن کی نظر میں مشتبہ بنا دیا ہو۔ جیل خانہ میں یہ بیماری اس قدر بڑھ گئی کہ اُس کا روکنا مشکل ہو گیا اور باوجود رہائی کے بعد بڑی مستعدی اور استقلال کے ساتھ علاج کے جاری رہنے کے اُن کی طبیعت دن بدن بگڑتی گئی۔ تھوڑی سی حرکت یا خوشی یا رنج پر اُس کے آثار موجود ہو جاتے تھے۔ مگر آفرین اے لالہ گورداس رام پھر بھی حب القومی ۲۹ فروری اور یکم مارچ کو سالانہ جلسہ آریہ سماج راولپنڈی تھا۔ آپ برابر کام کرتے رہے اور اپنے سکول کے واسطے جس کے وہ منتظم تھے بڑی ہمت سے بہت روپیہ جمع کیا۔ جس کا ایک قابل قدر حصہ اپنی جیب سے دیا تھا۔ ۳ مارچ ۱۹۰۸ء کو حسب دستور کچہری تشریف لے گئے اور چار بجے تک اچھی طرح کام کیا۔ واپسی کے وقت اپنی کوٹھی کے قریب پہنچے تھے کہ باگیں ہاتھ سے چھوٹ گئیں اور گردن گر گئی۔ لو اے مقامی حکام آپ کی ہٹ دھرمی کا نتیجہ نکل آیا۔ خاتمہ پر میں لالہ گورداس رام کی اعلیٰ مہمان نوازی اور دوست داری کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا اور جس کو ایک دفعہ بھی اُن کے ان اوصاف سے مستفید ہونے کا موقعہ ملا ہے وہ کبھی بھول نہیں سکتا +

بپن بابو کا خیر مقدم

از منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی

او تازہ آرزوں کو ساتھ لانیوالے | دل میں نئی اُمنگوں کو گدگدانیوالے
یاروں کی انجمن کی رونق بڑھانیوالے | تیرے قدم مبارک او گھر کو آنیوالے

اُجڑے ہوئے وطن کو پھر سے بسانیوالے

قید محن سے چھٹکر تو کیا وطن میں آیا | کنج قفس سے اُڑکر بلبل چمن میں آیا
بلکہ نشاطِ تازہ بزمِ کہن میں آیا | پروانہ وار اُڑتا تو انجمن میں آیا

فانوس سوز قومی پر تھرتھرانے والے

او قوم کے پیمبر او ملک کے فدائی | بھارت کی او مجسم تصویر پارسائی
ہوڑا میں کاہٹی کی تجھ کو ٹرین لائی | تقدیر نے ہمیں پھر صورت تری دکھائی

آنکھوں میں آنیوالے دل میں سمانیوالے

او خوش نصیب انجن آتا ہے تو کہاں سے | حب وطن کے نغمے گاتا ہوا زباں سے
دل ہو گداز تیری آہِ شرر فشاں سے | آتی ہے سوز اُلفت کی بو تری فغاں سے

او بندے ماترم کی سیٹی بجانے والے

ہے کرسیِ فلک سے پایہ بلند تیرا | طاؤس آسماں ہے یعنی سمند تیرا
طرز سبک خرامی ہو دل پسند تیرا | مشتاق قوم کا ہو ہر درد مند تیرا

ٹوٹے ہوئے دلوں کی ڈھارس بندھانیوالے

اتنے دنوں سے غائب اے ماہ تھا کہاں تو | پھرتا تھا جستجو میں کس کی کشاں کشاں تو
او جادۂ وفا کے شبدیز خوش عناں تو | یہ کس کو لا رہا ہے خوش خوش رواں دواں تو

انکھیلیوں کی چالوں سے دل لبھانے والے

کاوش تپ دروں کو تھی قلب ناتواں سے | اُڑتے تھے دل کے ٹکڑے نبکر شرر فغاں سے
ٹکرا رہے تھے نالے سر بام آسماں سے | تو نے ہمیں چھڑایا قید غم نہاں سے

زنداں سے او ! ہمارے ہیرو کو لانیوالے

تاریک تیرے غم میں آنکھوں میں اک جہاں تھا | قومی فلک کے تارے کس برج میں نہاں تھا
گم کردہ کارواں نوائے میر کارواں تھا | کس دشت آرزو میں بھٹکتا کشاں کشاں تھا

اہل وطن کے غم میں او ! خاک اُڑانے والے

توڑا سکوت تیرے انداز گفتگو نے | چھیڑے وطن کے نغمے مرغان خوش گلو نے
جوش کرم کے ہم کو دکھلا دیئے نمونے | ڈوبے ہوئے ہمارے بیڑے ترائے تو نے

ساحل پہ قوم کی او کشتی لگانے والے

بلبل کو گل مبارک گل کو چمن مبارک | اے شمع ! آجکو تیری ہو انجمن مبارک
حب وطن کے شیدا تجھ کو وطن مبارک | یاروں کو خیر مقدم تیرا بچن مبارک

چرنوں کے تیرے صدقے ! درشن دکھانیوالے

زبان ۔ دلی اردو کی ٹکسال ہے ۔ یہاں کے باشندے علم دوست اور اہل کمال ہیں اگر کوئی کمی تھی تو ان اہل کمال کے دماغی کمالات سے فائدہ اُٹھانیکی تھی ۔ شکر ہے کہ اس کمی کو لالہ چند و لعل رئیس اعظم دہلی نے پورا کیا اور زبان کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا ۔ زبان اردو علم ادب کے اچھے رسالوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے ۔ ایک خصوصیت جس نے ہمیں خصوصیت سے متوجہ کیا یہ ہے کہ اسکو قلمی سرپرست زیادہ تر دہلوی احباب ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ ایڈیٹر رسالہ کو اس خوبی کو نباہنے کی کوشش کرنی چاہئے اگرچہ جب زبان کی اشاعت کا اعلان کیا گیا تھا تو اسے بالکل اغلاط سے پاک رکھنے کا دعوے تھا مگر ضرورت وقت کی اثر سے دامن نہ بچا سکا ۔ ہم رسالہ کی کامیابی کے لئے دعا کرتے ہیں قیمت ۱۲ر سالانہ واجبی ہے ؎

انسدادِ غلامی

از منشی پیارے لال شاکر میرٹھی

مرنا بھلا ہے اُس کا جو اپنے لئے جیئے
جیتا ہے وہ جو مر چکا انسان کے لئے

آج وہ زمانہ ہے جبکہ بچہ بچہ بھی غلامی کے نام سے کانپ اُٹھتا ہے مگر ایک وہ زمانہ تھا جب یونان کے فلاسفر بھی غلامی کو روا رکھتے تھے۔ اُن کے نزدیک غلاموں کی تجارت اور بنی آدم کو بھیڑ بکری کی طرح خریدنا اور بیچنا اور بے زبان جانوروں کی طرح اُن کے ساتھ سلوک کرنا بے جا نہ تھا۔ رُوم میں تو یہ حال تھا کہ بادشاہ غلاموں پر اگر ناراض ہو جاتے تھے تو اُن کو کنوؤں میں پھینک دیتے تھے۔ چنانچہ وہاں کے ایک بیرحم بادشاہ کا ذکر ہے کہ اُس نے خفا ہو کر اپنے غلام ایک تالاب میں ڈالدیئے تھے کہ مچھلیوں کا لقمہ بنیں +

انگلستان کے ساحل پر اور ملکوں کے جہاز آکر لنگر ڈال دیتے تھے اور وہاں سے لوگوں کو پکڑ کر لے جاتے اور غلام بنا کر دیگر ممالک میں بیچ دیتے تھے۔ امریکہ دریافت ہونے کے بعد وہاں کے اصلی باشندوں کو پہلے پہل اہل پرتگال نے کام پر لگایا مگر بعد میں اُن کو یہ خیال پیدا ہوا کہ افریقہ کے لوگ زیادہ مضبوط اور طاقتور ہوتے ہیں۔ اس لئے اُنھوں نے فوراً وہاں سے غلام بہم پہنچانے شروع کئے۔ چنانچہ سنہ ۱۶۸۰ء سے سنہ ۱۷۰۰ء تک تین لاکھ غلام افریقہ سے جا چکے تھے۔ اور سنہ ۱۷۰۰ء سے

۱۷۸۶ء تک صرف جزیرہ جمیکا میں ۶ لاکھ دس ہزار غلام پہنچ چکے تھے علاوہ ازیں ہزارہا جانیں راہ میں تلف ہو گئی تھیں جن کا کسی کو خیال تک بھی نہ گزرا تھا +

افریقہ میں غلام حاصل کرنے کے لئے جو بیرحمی کام میں لائی جاتی تھی۔ اُس کے خیال سے بھی بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ رات کے وقت گاؤں کو آگ لگا دی جاتی تھی۔ اور جس وقت باشندے بیچارے آفت کے مارے جان بچا کر ادھر اُدھر بھاگنے لگتے تھے تو شکاری فوراً جھپٹ لیتے تھے۔ اس طرح پر ایک ایک کو گرفتار کر کے اور جہازوں پر لاد کر وطن سے دور ہزاروں کوس کے فاصلہ پرلے جا کر ڈال دیتے تھے۔ ذرا اُس عورت کے درد کا اندازہ کرنا چاہئے کہ جس کا خاوند اور اُس بوڑھی ماں کی مصیبت کا خیال کرنا چاہئے کہ جس کا لخت جگر اُس سے ہزاروں میل دور ہے اور اب اُس کا کوئی پرسانِ حال نہیں رہا۔ اُس پیر مرد کی حالت کا خیال کرنے سے سوائے آنسو بہانے کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ جو اپنے جلے ہوئے گاؤں کی راکھ پر بیٹھا ہوا خاک اُڑا رہا ہے اور اب کوئی اُس کا خبر لیوا نہیں۔ ظالموں نے گاؤں کو آگ لگا دی۔ باشندوں کو غلام بنا لیا۔ اور جنہوں نے ذرا بھی ہٹ کی یا تو اُس کو جلتی ہوئی آگ کے شعلوں میں ڈال دیا یا تہ تیغ کر دیا +

وہاں کے سرداروں کو بھی اپنے آدمی بیچکر ٹکے سیدھے کرنے کا چسکا پڑ گیا تھا۔ جب ضرورت ہوتی کسی آدمی کو پکڑ کر اُس پر جادوگری کا الزام لگا دیتے۔ اگر وہ کہتا کہ میں بےگناہ ہوں تو اُس سے کہا جاتا کہ اچھا اگر تم بےگناہ ہو تو زہر کا پیالہ نوش کر لو۔ اگر بچ گئے تو سمجھیں گے کہ

بے شک تم بے گناہ ہو۔ اگر وہ مر جاتا تو گھر کے باقی سب لوگ غلام بنائے جاتے۔ اور اگر بچ جاتا جو امر محال تھا تو اُس پر اُس کی جادوگری کا پورا یقین ہو جاتا اور پھر اُس کی دوسری طرح خبر لی جاتی +

تو گرفتار غلاموں کو سینکڑوں کوسوں کا سفر جلتی ہوئی ریت میں طے کرنا پڑتا تھا اور جو اُن میں زیادہ طاقتور ہوتے اُنہیں اپنے کندھوں پر بوجھ بھی اُٹھا کر لیجانا پڑتا تھا اور رات کے وقت جو حال انکا کیا جاتا تھا وہ ناگفتہ بہ ہے۔ ایک مضبوط لٹھ زمین میں گاڑ کر اُس کے نچلے سرے کے ساتھ غلام کے پاؤں جکڑے جاتے تھے اور اُسے چت لٹا کر دونوں ہاتھ باندھکر زنجیر کو اُس لٹھ سے باندھ دیا جاتا تھا یہیں خاتمہ نہیں بلکہ ایک لمبی لکڑی لیکر اُس کا ایک سرا تو لٹھ کے بالائی سرے سے باندھ دیا جاتا اور دوسرا زنجیر ڈال کر اُس مصیبت زدہ کی گردن میں ڈالدیا جاتا تھا جس سے وہ کسی طرح ہل جل نہ سکتا اور نہ کروٹ ہی بدل سکتا تھا +

جب ماؤں کو لیجانا منظور ہوتا تو اُن کے بچے جنگل میں پھینک دیئے جاتے اور جب سمندر کا سفر درپیش آتا تو سب مرد عورتوں کو جکڑ کر ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں ڈال دیتے کہ جہاں اثنائے سفر میں ہزاروں کا خاتمہ ہو جاتا تھا +

گرنیول شارپ

اُس زمانہ میں باشندگان انگلستان جو ویسٹ انڈیز امریکہ میں اپنے کاروبار تجارت کے واسطے رہتے تھے اور غلام رکھا کرتے تھے۔ جب اپنے وطن میں آتے تھے تو غلام بھی ساتھ لے آتے تھے۔ غلام یہاں آکر بھاگ

جاتے تھے۔ اسلئے گورنمنٹ سے انھوں نے فریاد کی اور کام کاج کے لئے وہ قانون دانوں کی مدد سے یہ فتوےٰ حاصل کر لیا۔ کہ زر خرید غلام کسی طرح آزاد نہیں ہو سکتا۔ اس طرح جب وہ بھاگ جاتے۔ تو مالک اُن کو پکڑ کر اُن کے ساتھ بڑی بیرحمی سے سلوک کرتے تھے۔ کوڑے لگاتے۔ بید مارتے اور پھر ویسٹ انڈیز میں بھیجدیتے تھے +

۱۷۶۵ء کا واقعہ ہے کہ ایک غلام مسمی سٹرانگ (شہ زور) اسی طرح انگلستان پہنچا۔ جب وہ بیماری اور ناتوانی سے کام کے بالکل ناقابل ہوگیا تو مالک نے یہ سمجھ کر کہ ع

ایسے بوڑھے بیل کو کون باندھ بھس دے

اُسے گھر سے نکال دیا۔ غلام ایک ڈاکٹر (ولیم شارپ) کے پاس پہنچا اور اُس سے اپنے مرض کا مداوا چاہا۔ اتفاق سے ڈاکٹر صاحب کا بھائی گرینول شارپ بھی موجود تھا۔ غلام کی حالت زار دیکھ کر اُسے بڑا رحم آیا۔ اور جیب سے کچھ نکال کر اُسے دیا۔ اور جب اُس کے بھائی کی مہربانی سے اُسے شفا ہوگئی تو کہیں نوکر بھی کروا دیا۔ دو سال کے بعد سٹرانگ پہلے سے بھی زیادہ تندرست اور ہٹا کٹا ہوگیا۔ یہ دیکھ کر اصل مالک کے منہ میں پانی بھر آیا اور اُسے گرفتار کر کے ساڑھے تین سو (۳۵۰) روپے کو فروخت کر ڈالا جہاز تیار تھا کہ گرینول شارپ کو خبر ہوگئی۔ اُس نے ایک فوراً لارڈ میئر آف لنڈن سے فریاد کی کہ بے اطلاع کسی آدمی کو گرفتار کر لینے کے کیا معنے۔

غرض خدا خدا کر کے اُس بیچارے کی جان شیر کے منہ سے چھڑائی۔ مگر ع

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا
پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی!

غلام خوشی خوشی گھر کو جا رہا تھا کہ راستے میں جہاز کا کپتان مل گیا۔ اور آتے ہی غلام کو کہنے لگا کہ کہو نواب کہاں جاؤ گے؟ اب تم میری ملکیت ہو۔ شارپ صاحب نے فی الفور کپتان کو ڈانٹا کہ "میں ابھی تم پر نالش دائر کرتا ہوں۔ کہ تم نے خلاف قانون سٹرانگ پر حملہ کیا ہے"۔ یہ سنکر کپتان گھبرایا اور اُسے چھوڑ کر اپنی راہ لی +

یہ پہلا ایسا موقعہ تھا کہ کسی انگریز نے ایک حبشی غلام سے اس طرح اظہار ہمدردی کیا ہو۔ مگر اس وقت سے گرینول شارپ کی طبیعت پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ غلاموں کی بہتری کا خیال اُن کی زندگی کا اصلی مقصد بن گیا۔ سینکڑوں قانون دانوں کے پاس گئے مگر کسی سے یہ مسئلہ حل نہ ہوا کہ زرخرید غلام کا حق ملکیت کس طرح زایل ہو سکتا ہے۔ آخر مجبور ہو کر گرینول شارپ آپ اپنے وکیل بنے اور قانون کا مطالعہ شروع کیا۔ دو سال کی سخت محنت اور مشقت کے بعد اُنہوں نے ایک کتاب بنام "انگلستان میں غلامی کا جواز اور انصاف کا خون" لکھی۔ اس کتاب کی ایک ایک جلد اُنہوں نے ہر ایک قانون دان کے پاس روانہ کی۔ اور اس بات کو ثابت کر دیا کہ قانون انگلستان میں کوئی دفعہ ایسی نہیں جس کی رُو سے بنی نوع انسان کا غلام بنانا جائز قرار دیا جائے +

مگر غلاموں کی ملکیت کے زایل ہونے کا سوال ابھی تک حل نہ ہوا تھا۔ آخر کار ایک حبشی غلام کا معاملہ پیش ہوا جس کی صورت واقعہ یہ تھی کہ وہ بھاگ گیا اور مالک نے پکڑ کر نہایت سنگدلی اور بیرحمی سے اُسے مار اپیٹا تھا۔ اور پھر بیچکر جزیرہ جمیکا کو روانہ کرنے کو تھا۔ شارپ نے اس کا سرانجام اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور مالک کے برخلاف ایک مقدمہ دائر

کر دیا۔ بڑے بڑے جھگڑے ہوا کر بارہ بڑے بڑے مصنف اس کے طے کرنے کو منتخب ہوئے اور انہوں نے بالاتفاق مئی ۱۷۷۲ء میں یہ رائے دی کہ غلام سرزمین انگلستان میں قدم دھرتے ہی آزاد ہو جاتا ہے!

وہ دن کیسا مبارک تھا۔ اور گرینول شارپ صاحب کو کیسی خوشی ہوئی ہوگی؟ اس کا بیان حیطۂ تحریر سے باہر ہے۔ مگر اس سے اب اُن کی سرگرم کوششیں سرد نہیں پڑ گئیں۔ بلکہ انگلستان کے غلاموں کی بہتری سے اب خود اُن کی توجہ تجارتِ غلامان کی طرف منتقل ہوگئی اور اُنہوں نے کمر ہمت باندھ لی۔ کہ ساری دنیا کو اس بے انصافی سے نجات دینی چاہیئے +

۱۷۸۳ء میں ایک جہاز افریقہ سے جزیرہ جمیکا کو روانہ ہوا۔ اس پر ۴۴۰ غلام سوار تھے۔ راستے میں پانی کی تنگی کے باعث کپتان جہاز نے یہ مناسب سمجھا کہ ۱۳۱ آدمی جو بیمار اور کمزور ہیں وہ سمندر میں پھینک دیئے جائیں۔ جہاز کے انگلستان واپس آنے پر مالکانِ جہاز نے ۴۴۰ آدمیوں کا پورا کرایہ طلب کیا۔ کیونکہ یہ قانون تھا کہ اگر کوئی غلام قدرتی موت سے جہاز پر مر جائے تو اُس کا نقصان خود جہاز والوں کو ہوتا تھا۔ غور کرنے کے قابل بات ہے کہ کپتان نے اتنے نفعے کی خاطر کس بیرحمی اور وحشیانہ سلوک سے اس قدر بندگانِ خدا کی جانیں تلف کر دیں +

گرینول شارپ صاحب کو خبر ہوئی تو اُنہوں نے اپنی پوری طاقت صرف کی اور آخرکار جرم جہاز کے کپتان پر ثابت کر کے چھوڑا

اور گو کہ اس وقت مالکان جہاز سزا پانے سے بچ گئے - مگر اتنا ہو گیا کہ پہلے تو ان کو تن تنہا بے یار و مددگار کام کرنا پڑتا تھا - اب بہت سے ہمدرد پیدا ہو گئے - اور چاروں طرف ایک جوش پھیل گیا - اور ملک ملک میں غلاموں کی حالتِ زار کی بہتری پر جان و مال کے وقف کر دینے والے بیسیوں پیدا ہو گئے - چنانچہ ۱۸۲۳ء میں ایک کمیٹی انسداد غلامی قائم ہو گئی - گرینول شارپ صاحب نے تن تنہا یہ بڑا اور پاک کام اپنے ذمے لیا - اور اپنے حین حیات میں کم از کم اتنا ضرور کر دیا - کہ انگلستان سے غلامی کا نام و نشان مٹ گیا - یہی وجہ ہے کہ وہ ہر طرح آزادیٔ غلامان کا پہلا ہیرو کہلانے کے مستحق ہیں - انہوں نے اور بھی بہت سے نیکی کے کام کیے - چنانچہ زر کثیر صرف کر کے ہر زبان میں انجیل مقدس کے نایاب نسخے منگائے اور "مجلس انجیل" کے بڑے پکے اور پرجوش مددگار اور معاون رہے - یہ صاحب بڑے علم دوست تھے - انہوں نے لنڈن میں اپنی ایک لائبریری کو تعلیم یافتہ لوگوں کی خاطر وقف کر دیا تھا +

آخر ۷۸ سال کی عمر میں ۱۸۱۳ء کو اس جہان فانی سے عالم بقا کو رحلت فرما گئے - موت کے بعد بھی اہل ملک کی قدردانی نے انہیں فراموش نہیں کیا - بلکہ "ویسٹ منسٹر ایبے" میں اُن کی یادگار قائم کی گئی +

ٹامس کلارکسن

یہ صاحب ۱۷۶۰ء میں کیمبرج شائر کے ایک گاؤں میں ایک نیک دل پادری کے ہاں پیدا ہوئے - پہلے تو تھوڑے دنوں گاؤں میں

تعلیم پائی۔ پھر کیمبرج کے مدرسۃ العلوم میں داخل ہوگئے اور اپنے آپ کو
لیاقت اور محنت کے جوہر دکھا کر ہر طرح ممتاز ثابت کیا +

اُس زمانہ میں یونیورسٹی کے وائیس چانسلر نے لاطینی زبان کا ایک
انعامی مضمون دیا کیا دوسروں کا اُن کی مرضی کے خلاف غلام بنانا
جائز ہے ؟ بی۔ اے کے ڈگری یافتہ طلباء کے لئے تجویز کیا۔ ٹامس
کلارکسن پہلے سال بھی ایک انعام مضمون لکھکر پا چکے تھے۔ چونکہ اُنہیں
اپنی شہرت قایم رکھنی تھی۔ اس لئے نہایت جانفشانی سے مطالعہ میں
مصروف ہوئے۔ یہاں تک کہ اُن کے دل میں یہ پاک خیال پیدا
ہوگیا۔ کہ غلاموں کی آزادی کے لئے کچھ کرنا چاہئے" اور یہیں سے
یہ اُن کی زندگی کا اعلےٰ ترین مقصد بن گیا۔ مضمون کی تیاری سے اُنکے
دل میں یہ بات نقش ہوگئی۔ کہ تجارتِ غلامان ایسی خرابی اور ظلم دنیا
میں اور نہیں ہوسکتا۔ اور چونکہ طبیعت کے بڑے نرم تھے اس لئے
اکثر ایام مطالعہ میں اِن مصیبت کے ماروں کی حالتِ زار کا خیال کرکے
پھوٹ پھوٹ کر اور ڈھاڑیں مار مار کر رویا کرتے تھے +

کلارکسن صاحب نے انعام جیت لیا اور گھر کو واپس ہوئے۔ مگر راستے
میں ہر وقت اُن کے دل پر یہی خیال منڈلاتا رہا اور ایسی تکلیف ہوئی
کہ بعض اوقات گھوڑے سے اُتر کر گھاس پر کسی درخت کے نیچے بیٹھ
جاتے اور زار زار رونے لگتے۔ اس وقت اُن کے دل میں یہ خیال گزرتا
تھا۔ کہ واقعی اب وقت ہے کہ ظلم کے انسداد کے لئے کچھ کیا
جائے! گو اُس وقت کلارکسن صاحب کل ۲۵ برس کے نوجوان تھے۔
مگر ہمت بھی جوان پائی تھی۔ چنانچہ وہ اِس اہم کام کے سرانجام پر کمربستہ

ہو گئے اور غلامی سے لڑائی باندھ لی ٭

پہلا کام تو یہ کیا کہ اپنے لاطینی جواب مضمون کا ترجمہ انگریزی میں کر کے شایع کر دیا۔ یہ بڑے خوش نصیب تھے کہ انہیں شارپ صاحب کی طرح تن تنہا اور بے یار و مددگار کچھ نہ کرنا پڑا۔ کتاب کے شایع ہوتے ہی "کمیٹی انسداد غلامی" کے ممبر اُن کا ہاتھ بٹانے کو آموجود ہوئے۔ اور ان کی ہمتِ مردانہ سے انسداد غلامی کی ایک سوسائٹی قایم ہو گئی۔ جن کی جان (بلکہ روح بھی) خود اُنہی کو سمجھنا چاہیئے۔ خوش قسمتی سے مددگار بھی اُن کو ولیم ولبرفورس ایسا باہمت اور دلیر شخص ملا کہ جس نے پارلیمنٹ تک میں اس مضمون کی ہوا باندھ دی ٭

کلارکسن صاحب نے سفر اختیار کیا اور گرد و نواح کے بندرگاہ چھان مارے۔ جو شخص افریقہ یا ویسٹ انڈیز سے آتا یہ اُس سے تجارتِ غلامان کی نسبت حالات دریافت کرتے اور جا جا کر جہازوں میں ان کی تحقیقات اور مشاہدہ کرتے۔ جو تکلیفات کو انہیں سہنا پڑا وہ حدِ بیان سے باہر ہیں۔ لوگ اُن پر ہنسی اُڑاتے تھے۔ اُن کے چال چلن کی نسبت بُرے بُرے خیالات پھیلاتے تھے۔ حتیٰ کہ جان سے مار ڈالنے پر بھی تیار ہو جاتے تھے۔ مگر اُن کو وہی ایک دھن تھی۔ اور ہرگز اپنے کام سے نہ پھرتے تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے راتوں کو چلکر ۳۵ ہزار میل سفر طے کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ غلاموں کی دردناک حالت دیکھ کر بدن میں رعشہ پڑ جاتا تھا۔ رات بھر نیند نہ آتی تھی اور اپنے کمرہ میں ٹہلا کرتا اور زار زار رویا کرتا تھا۔ اور عالم مایوسی میں خدا تعالیٰ سے دعائیں مانگا کرتا تھا۔ کہ "الٰہی میری کمرِ ہمت نہ توڑ اور مجھے اس غرض میں اپنی امداد عطا کر" ٭

پارلیمنٹ میں جو جدوجہد عمل میں آئی۔ اُس کا مختصر حال ولیم ولبر فورس کے حالات کے ضمن میں ہدیۂ ناظرین کیا جائے گا۔ مگر اتنا کہدینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بیس سال کی انتھک اور اٹل کوششوں کے بعد تجارتِ غلامان کی منسوخی کا مسودہ آخر ۱۸۰۷ء میں پاس ہو گیا +

کلارکسن صاحب نے ہمت نہ ہاری۔ بلکہ اُن کے حامیوں نے بھی اپنا یہ مقصد قرار دیا۔ کہ جب تک روئے زمین سے غلامی کا نام ونشان نہ مٹا دیں گے آرام نہ کریں گے۔ آخرکار انھوں نے ایک مختصر سا رسالہ شایع کیا۔ جس میں ثابت کیا کہ غلامی مسیحیت کے برخلاف ہے۔ یہاں تک کہ پچاس سال کی بڑی جانفشانی کی کوششوں کے بعد ۱۸۳۴ء میں یہ قانون پاس ہو گیا۔ کہ سرزمین علاقہ انگریزی میں غلامی موقوف کی جائے +

۱۸۴۰ء میں ایسی ایک اور بڑی مجلس قائم ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ روئے زمین سے تجارتِ غلامان کا داغ مٹا دیا جائے۔ اور کلارکسن صاحب باوجود ضعیف ہو جانے کے اُسی جوش وخروش کے ساتھ اس کے پریسیڈنٹ قرار پائے۔ کہ جسے وہ اپنی عمر کے پچیسویں سال اپنے پہلو میں دبا کر نکلے تھے۔ اُنھوں نے اپنے کام کو ایسی محنت اور جانفشانی سے سرانجام دیا۔ کہ جس سے دنیا پر ثابت ہو گیا کہ "اکیلا آدمی بھی دنیا میں کیا کچھ کر سکتا ہے" آخر عمر بھی محنت اور جانکاہی کے بعد اپنا کام سرانجام دے کر ۸۷ برس کی عمر میں خاکِ لحد پر آرام سے میٹھی نیند جا سوئے +

ولیم ولبرفورس

ولیم ولبرفورس ایک سوداگر کے گھر میں ۱۷۵۹ء میں مقام ہل میں پیدا ہوئے۔ عجیب اتفاق ہے کہ دنیا کا مشہور فاتح نپولین اور انگلستان کا مشہور جنرل ڈیوک آف ولنگٹن بھی اسی سال پیدا ہوئے تھے۔ بچپن میں بدن کے بہت نحیف تھے مگر کام میں بڑے ہوشیار اور طبیعت کے ملنسار تھے۔ سات برس کی عمر میں اپنے مقامی مدرسہ میں داخل ہوئے۔ اسی زمانہ میں ان کی آواز ایسی خوش کن اور لہجہ ایسا صاف اور تلفظ ایسا صحیح تھا کہ اُستاد انہیں میز پر بٹھا دیتا اور کہتا کہ زور زور سے پڑھو تاکہ دوسرے بچے سن کر اسی طرح پڑھنے کی کوشش کریں +

ابھی بمشکل نویں سال میں قدم رکھا ہوگا کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اور یہ لنڈن میں اپنے چچا کے سپرد ہوئے۔ چچی ان کی بڑی شریف عورت تھی۔ اور انہیں بڑی محبت سے رکھتی اور تعلیم دیتی تھی۔ ۱۴ سال کی عمر میں اُنہوں نے اس قدر مہارت زبان دانی میں پیدا کر لی کہ ایک اخبار میں ایک مضمون دربارۂ "تجارتِ غلامان" شایع کرایا +

۱۷ سال کی عمر میں دارالعلوم کیمبرج کے سینٹ جیمس کالج میں داخل ہوئے۔ وہاں انہیں بڑی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ پرلے درجے کے بداخلاق اور بدتہذیب لوگوں سے واسطہ پڑا۔ حتےٰ کہ خود اُستاد ان سے کہتے کہ "میاں تم دولتمند ہو کر کیوں اس قدر محنت گوارا کرتے ہو۔ محنت کریں تو غریب کریں کہ جن کو دال روٹی کی فکر لگی ہوئی ہے" مگر محنت اور مطالعہ اُن کی گھٹی میں پڑا تھا یہ ایسی باتوں میں کب آنے والے تھے

اور دوسری بڑی خوشی کی بات یہ ہوئی - کہ ولیم پٹ (مشہور مدبر انگلستان) کی ملاقات اِن سے یہیں ہوئی - اور یہاں تک محبت اِن سے بڑھی کہ دم واپسین تک ساتھ رہی +

اپنی عمر کے اکیسویں سال اپنے مولدہل کی طرف سے اُنہوں نے ممبری پارلیمنٹ کی کوشش کی اور کامیاب ہوئے - اُس وقت ان کی ملنساری حسن اخلاق - خوش طبعی اور خوش آوازی اس حد تک پہنچی ہوئی تھی - کہ پرنس آف ویلز تک اِن کی تقریر سننے کے شایق تھے - اِس وقت زمانہ بھر کے بُرے اور بھلے لوگوں سے واسطہ پڑتا تھا - اور اس آزمایش سے بچ کر نکل جانا بڑے جواں مرد کا کام تھا - اِن کو "قمار بازی" کی لت پڑ گئی اور اس میں ایسی مشق پیدا کی کہ ایک رات میں چھ سو پونڈ جیت لئے - مگر ہارنے والوں کی حالتِ زار اور مایوسی کو دیکھ کر اِن کے دل پر ایسا صدمہ ہؤا - کہ اُسی روز سے اُنہوں نے کان کو ہاتھ لگایا - کہ "پھر کبھی اس موذی کھیل کے پاس تک نہ بھٹکوں گا" بعد ازاں یارک شائر کی طرف سے ممبر پارلیمنٹ مقرر ہوئے - اور ان کی زندگی نے یکایک ایسا پلٹا کھایا کہ ایک عالم حیران رہ گیا - اور یہ پرلے درجے کے ایماندار - نیک طبع اور دین دار بن گئے - اس سے اُن کو بڑی تسکین حاصل ہوئی اور بہت جلد اپنی توجہ کو غلامی کے مسئلے کی طرف مبذول کیا - ولیم پٹ صاحب کی سرکردگی سے "انسدادِ تجارتِ غلامان" کا مسودہ پیش ہؤا - اور اس میں یہاں تک کامیابی ہوئی - کہ ہر ایک جہاز کے لئے تعداد غلامان کو محدود کر دیا گیا - اس وقت اُنہوں نے پارلیمنٹ میں ایسی پر زور تقریر کی کہ برک جیسے مشہور مدبر نے اُس پر کہا کہ اُس نے یونانی فصاحت کا

خاتمہ کر دیا ہے " +

اِس وقت ولیم ولبرفورس صاحب ہمہ تن اس کام میں مصروف ہو گئے اور نو گھنٹے روزمرہ مطالعۂ خط و کتابت اور سفر میں صرف کرتے۔ یہاں تک کہ پورے نو سال تک یہی جدوجہد جاری رہی۔ ہر سال یہ بل پیش کرتے اور اُس کی تائید میں ہر دفعہ ایک زبردست تقریر کرتے اور پھر ناکامی ہوتی۔ مگر ہمت ہارنے والے شخص نہ تھے۔ رو رو کر دعائیں مانگتے تھے اور کہتے تھے۔ ؎

دست از طلب ندارم تا کار من بر آید
یا تن رسد بہ مقصد یا جاں ز تن بر آید

ایام جدوجہد میں دو دفعہ یہ بل ہاؤس آف کامنز سے پاس ہو گیا۔ مگر ہاؤس آف لارڈز نے انکار کر دیا۔ اس وقت کی مایوسی کی کوئی حد نہ تھی۔ مگر یہ پھر تازہ دم ہو کر لگ جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ۱۸۰۷ء میں وہ مبارک دن آیا کہ یہ مسوّدہ پاس ہو گیا۔ اور اُن کے سر کامیابی کا سہرا بندھا۔ اس وقت پارلیمنٹ میں اس قدر تحسین و آفرین کے نعرے بلند ہوئے کہ تمام عمارت گونج اٹھی۔ اس وقت ولیم ولبرفورس صاحب خاموش بیٹھے تھے اور خوشی سے ایسے بدحواس ہو گئے تھے۔ کہ ان تعریفوں کے شور و غل کے کچھ معنے نہ سمجھتے تھے۔ آخرکار اُنھوں نے کچھ کیا تو اتنا کیا کہ خدائے تعالےٰ کے سامنے عجز سے سجدے کے لئے سر جھکا دیا اور اپنی فتح یابی کے پھولوں پر شکر گزاری کے آنسو بہائے +

۳۴ سال تک برابر یارکشائر کی طرف سے بے کھٹکے ممبر پارلیمنٹ کی۔ اور پھر بھی یہی منتخب ہوئے۔ اور اپنی جان توڑ کوششوں سے

مسودہ پاس کرایا۔ کہ جس کے رُو سے مشنریوں کو ہندوستان میں آئینی آزادی عطا ہوئی +

اِس وقت انگلستان کی اخلاقی حالت بہت پست تھی۔ شراب خوری اور لامذہبی کا بڑا رواج تھا۔ اُن کے دل میں آئی کہ اس کی بیخ کنی کرنی چاہیئے۔ چنانچہ بڑی محنت سے ایک کتاب بنام "عملی مذہب" شائع کی۔ یہ کتاب ایسی لاجواب تھی۔ کہ سات ہزار پانسو کاپیاں چھ ماہ کے عرصہ میں صرف ہوگئیں۔ مگر اس سے لوگوں کے کان کھل گئے۔ اور ہر طرف مذہب کا جوش وخروش پیدا ہوگیا۔ اور ہر طرف سے مذہب مذہب کی صدائیں بلند ہونے لگیں +

یہ صاحب ہاتھ کے بڑے سخی تھے۔ چنانچہ ایک سال میں دو ہزار پونڈ للّٰہ صرف کیے۔ اِن کا کمرہ ہر کس وناکس کے لئے کھلا رہتا تھا۔ اور جو کچھ کوئی پوچھنا چاہتا تھا بڑی محبت سے بتاتے تھے۔ اِن میں یہ بڑی خوبی تھی کہ شام کے وقت اپنے گھر کے سب آدمیوں کو جمع کر کے کسی کتاب یا مضمون کے بارے میں مختصر گفتگو کیا کرتے تھے۔ (اگر ہندوستان کے ہر ایک گھر میں ایسا ہی ہو تو مستورات کا علم کس قدر بڑھ جائے!) پھولوں کو یہ بہت چاہتے تھے اور اسی لئے اپنی عمر کے آخری حصے میں ہائی ووڈھال میں جا رہے تاکہ قدرت کے نظاروں سے اپنے دل کو تازہ اور آنکھوں کو خوش کریں +

چھ سال تک قدرت کی فریفتگیوں کا لطف اُٹھا کر ۸۴ سال کی [illegible] جولائی ۱۸۷۵ء کو ابدی آرام میں بڑے آرام اور اطمینان سے [illegible] گئے۔ [illegible] دنیا کو چھوڑنے سے پیشتر چونکہ تقاضائے عمر اور صحت

کی خرابی نے مجبور کیا کہ کاروبار ملکی سے ہاتھ اُٹھائیں۔ تو اپنا مبارک کام اپنے دوست سر ٹامس فاؤل بکسٹن کے حوالہ کرکے سبکدوش ہوگئے تھے +

ٹامس فاؤل بکسٹن

بکسٹن صاحب ۱۷۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ یہ ضلع سکس کے رہنے والے تھے۔ اِن کی ابتدائی تعلیم کا زمانہ بالکل کھیل کود میں صرف ہوا۔ مدرسہ میں داخل ہوئے تو ایک دن سبق یاد کرکے نہیں سُنایا۔ ہاں ہر قسم کے کھیل اور تماشے۔ شکار۔ مچھلیاں پکڑنا۔ اِن سب باتوں میں بڑے مشّاق تھے۔ مگر اپنی عمر کے سترھویں سال جب یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ تو ان کی طبیعت میں یکایک ایک حیرت انگیز تغیّر واقع ہوا کہ دیکھنے والے تکتے کے تکتے ہی رہ گئے +

وہ بکسٹن کہ جس کے ہاتھ میں کبھی کسی نے کتاب نہ دیکھی تھی۔ ایسا محنتی بن گیا کہ کوئی انعام۔ کوئی تمغہ اور کوئی سرٹیفکٹ نہ تھا جو اُس زمانہ میں کالج میں اس نے نہ جیتا ہو۔ اس کا بیان ہے کہ کالج میں داخل ہوتے ہی میری آنکھیں کھل گئیں میں نے دیکھا کہ ع

ماندی تو پیادہ و سواراں رفتند

جس کو دیکھتا ہوں مجھ سے کچھ زیادہ ہی جانتا ہے۔ جماعت میں الگ ندامت اُٹھانی پڑتی ہے۔ اور جگ ہنسائی الگ ہوتی ہے۔ اس وقت میں نے عہد کرلیا کہ ایک ایک لمحہ کو غنیمت سمجھوں گا۔ اور وقت فرصت کو ضائع نہیں ہونے دوں گا۔ غرض بکسٹن جس وقت کالج میں داخل

ہوا تھا۔ تو ایک بیکار۔ نکما اور کام کا چور لڑکا تھا۔ اور جب آنکھیں کھل گئیں۔ تو ہر بات میں طاق اور ہمہ صفت موصوف نکلا +

یونیورسٹی سے نکل کر ان کے پاس اتنا سہارا بھی نہ تھا کہ کچھ گزارہ کی صورت ہو سکے۔ مگر آخرکار اپنے چچوں کے ساتھ ایک کارخانے میں حصہ دار بن گئے اور اس سے کچھ تسکین ہوئی +

سنہ ۱۸۱۲ء تک انہیں مذہب کا کچھ خیال تک بھی نہ تھا۔ مگر اسی سال ایسے سخت بیمار ہوئے۔ کہ لب گور تک پہنچکر واپس آئے اور جب تندرست ہوئے تو سجدۂ شکر ادا کیا اور اُسی وقت ان کی طبیعت میں ایک عجیب تغیر واقع ہو گیا۔ اور اُنہوں نے یہ عہد کر لیا کہ اللہ کے بندوں کی بہتری کے فرائض ادا کروں گا۔ اسی زمانہ میں بچارے جلاہے بڑی مصیبت میں گرفتار تھے۔ کاروبار سب بند ہو چکا تھا اور جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ ملک کے نیک دل لوگوں نے جمع ہو کر اُن کی حالت کی بہتری کی تدبیریں کیں اور بکسٹن صاحب نے اس میں دل و جان سے سعی کی۔ چنانچہ پرنس آف ویلز (حضور ملک معظم) سے پانچہزار پونڈ کی امداد طلب کی جو منظور ہو گئی +

اس پر ولبر فورس صاحب نے ان کو بڑے زور کا "شکریہ نامہ" لکھا۔ اس وقت سے اتفاقاً ان کی توجہ جیل خانوں کی خراب حالت کی طرف مبذول ہو گئی اور موجودہ وقت کی خرابیوں کے انسداد کا بیڑا اُٹھا لیا۔ خود ملک میں پھر پھرا کر اپنے چشم دیدہ حالات کی بنا پر ایک کتاب تحریر کی۔ جس کا مضمون یہ تھا۔ کہ موجودہ قواعد جیل سے جرائم اور تکالیف کو ترقی ہے کہ تنزل؟ اس کتاب کی بڑی

تعریفیں ہوئیں۔ اور انگلستان تو کیا یورپ کی تمام زبانوں میں ترجمے کرائے
فرانس۔ ٹرکی۔ امریکہ بلکہ ہندوستان میں بھی بھجوائی گئی۔ اس وقت
خوبیٔ قسمت سے ممبر پارلیمنٹ بھی ہو گئے۔ اور پہلا کام جو اُنھوں نے
کیا وہ یہ تھا کہ مجموعہ تعزیرات پر نظرثانی کرنیکا مسودہ پیش کیا اور پیش کرتےوقت
تین گھنٹے تک ایک بڑی پرزور تقریر کی اور اس میں ثابت کر دیا کہ یہ کیا ظلم
ہے کہ انسان کی قیمتی زندگی کو ذرا ذرا سی بات پر ضائع کر دیا جائے۔ چنانچہ
ان کی اور ان کے دوستوں کی ہمت اور جانفشانی سے کل دو چار ایسے جرم
قرار دیئے گئے جن کی سزا پھانسی ہو اور باقی سب کے لئے زیادہ مناسب اور نرم
سزائیں تجویز کی گئیں۔ اس کے بعد اُنھوں نے ہندوستان میں رسم ستی کی طرف
اپنی توجہ مبذول کی۔ اور ولیم بینٹنگ صاحب کو اس مبارک کوشش میں دل و جان
سے مدد دی۔ جس سے ۱۸۲۹ء میں اس کی قانوناً بیخ کنی ہو گئی۔

مگر زندگی کا سب سے بڑا بھاری کام جو اُنھوں نے سرانجام دیا وہ یہ تھا۔ کہ
اُنھوں نے غلامی کو بالکل معدوم کر دینے کا بیڑا اٹھا لیا۔ ولیم ولبرفورس
صاحب عمر کے تقاضے اور صحت کے لحاظ سے اس قابل نہ رہے تھے کہ وہ
اُسی پہلے جوش و خروش سے اس کام پر کمربستہ رہتے اور اس لئے جب مجبوراً
اُنھیں اپنی "ملکی زندگی" سے کنارہ کشی اختیار کرنی پڑی تو بکسٹن صاحب کی طرف
اشارہ کر کے کہا کہ اب آپ یہ فرائض اپنے ذمے لیجئے! اُنھوں نے بسر و چشم
اور بدل و جان منظور کر لیا۔ اور اُسی وقت سے اپنی ساری ہمت اور سارا زور
اسی اہم کام کے سرانجام میں لگا دیا۔ جیسا کہ لوگ کہتے تھے۔ دس سال کی جان توڑ
کوششوں کے بعد ۱۸۳۴ء کی پارلیمنٹ میں یہ مسودہ پاس ہو گیا۔ کہ
انگریزی علاقہ میں غلاموں کو آزاد کر دیا جائے۔

یکم اگست ۱۸۳۴ء کو وہ مبارک دن تھا کہ نصف شب کے وقت گھنٹے پر چوٹ پڑتے ہی سب غلام اُچھل پڑے کہ الحمد للہ! برسوں کے گرفتاروں کو نجات ملی۔ گرجوں میں شکریے کے گھنٹے بجائے گئے۔ اور جزائر برطانیہ مارے خوشی کے گونج اُٹھے +

۱۸۰۸ء میں افریقہ کی حالت کی بہتری کی تجاویز عمل میں آئیں اور اس سے دوسرے ہی سال بعد فرانس۔ آسٹریا۔ پرشیا اور روس نے بھی قانون انگلستان دربارہ غلامی کو اپنے اپنے ممالک میں رواج دینا منظور کرلیا اور اس سے تھوڑے عرصہ بعد ہندوستان سے بھی غلامی مفقود ہوگئی +

سالہا سال کی محنت و مشقت کے بعد ۱۸۴۵ء میں کلارکسن صاحب ایسے کمزور ہوگئے کہ اُن کی زندگی کی کوئی اُمید نہ رہی اور آخرکار وہ اپنی خوابگاہِ آخری میں جا ہی لیٹے۔ اہل ملک نے ویسٹ منسٹر ایبے میں اُن کی یادگار قایم کی اور اُن کے ساتھ ہی غلامی اور اُس کی بیخ کنی کی جانثار کوششوں کا خاتمہ ہوگیا +

اِن کی قوت ارادہ اس درجے بڑھی ہوئی تھی کہ بیان سے باہر ہے۔ پہلے سوچ لیتے کہ یہ کام ممکن ہے اور پھر جب اُس میں لگ جاتے تو زمین و آسمان اُلٹ جائیں مگر یہ نہ پھرتے۔ ناقابل تسخیر ہمت کا یہ حال تھا کہ مایوسی ان کے پاس تک نہ پھٹکنی تھی اور محنت اور جانکاہی کی عادت اس درجہ تک تھی کہ بیان سے باہر ہے۔ ان سب کو استقلال اور مستقل مزاجی نے رونق دے رکھی تھی کہ اُن کی سب کوششوں کے سر آخرکار کامیابی کا سہرا بندھتا تھا۔ اور فتح و نصرت کے پھول برستے تھے۔ ایسے لوگ مقدس اور مبارک ہیں کہ ساری دنیا اُن کے شکریے سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہوسکتی +

شکست کانگرس

رباعیات

از منشی نادر علی خان نادر کاکوروی

کانگرس ٹوٹی مگر اب کانگرس ہر فرد ہے قوم کا اب بچہ بچہ اک بہادر مرد ہے
ٹوٹ کر گو شیشۂ دل ہو گیا ہے چور چور لیکن اس کا ریزہ ریزہ اک دلِ پر درد ہے

بکھرے اجزا مگر نہ قوت ٹوٹی پھیلے گی اور یہ جماعت ٹوٹی
ٹوٹے ہوئے شیشہ کی وہی ہے جھنکار دل ٹوٹ گیا مگر نہ ہمت ٹوٹی

سائل سر عدالت اگر داد خواہ ہے آزادیٔ رائے دے کہ غرض یہ بادشاہ ہے
لیکن غریب پر ہے بغاوت کا جرم کیوں اپنے حقوق مانگنے میں کیا گناہ ہے

یا خدا وہ دن دکھا مقصود سب کا ایک ہو دوست دشمن ایک تا اصل نیک او فاسد ایک ہو
یوں اٹھیں ہندو مسلماں گر یہ بحث ملک سب کے اغراض ایک اور سب کے مقاصد ایک ہوں

ہلا کے ہم آسماں رہینگے اٹھا کے سر پر زمیں رہینگے ہزار کوئی گلا دبائے ہمارا ہم چپ نہیں رہینگے
ہمارا ہندوستان گھر ہے نکال سکتا ہے کون ہم کو یہیں اٹھینگے یہیں کٹینگے یہیں مٹینگے یہیں رہینگے

نرم و گرم کی کشمکش

از منشی رام دیال صاحب ودیارتھی

سورت کانگرس کے افسوسناک انجام پر جو بیقراری اور اضطراب محبان وطن میں پیدا ہوا ہے اس کا اندازہ اس اشتیاق سے ہو سکتا ہے جو کانگرس کے آیندہ کام کے متعلق ملک کے ہر حصہ میں ظاہر ہو رہا ہے۔ خیالات جوش زن ہیں۔ اور لیڈران کانگرس کی بعض کمزوریوں سے ستائے ہوئے دلوں سے ایک دردناک آواز بلند ہے۔ ذیل میں اپنے محترم دوست منشی رام دیال کا عطیہ درج کرتے ہیں۔ ایڈیٹر

نہ توں دل اور پیکاں دونو پہلو میں رہے
آخرش دل بہ گیا خوں ہو کے پیکاں ہی رہا

ہندوستان کے پالیٹکس میں جو گرم عنصر کچھ دنوں سے پیدا ہو گیا ہے ہاں تو سرد عنصر ہے اس کی رگڑ اسی وقت سے جاری تھی جس سے دھیمی دھیمی چنگاریاں بنارس۔ کلکتہ۔ ناگپور۔ مدراس میں نکلتی رہیں لیکن سورت کی زبردست رگڑ میں جو شعلہ پیدا ہوا اس نے دونوں عنصروں کو الگ الگ کرکے قانون قدرت کی سچائی کا ثبوت دیا۔ سرد اور گرم فریق کے اصول و افعال یوں تو پہلے ہی صاف نظر آتے تھے۔ لیکن سورت کے واقعات نے ان کو زیادہ واضح کر دیا۔ جہاں ایک گروہ اول سے صاف بیانی۔ آزاد خیالی۔ جوش طبیعت سے ملکی محبت میں سرشار ہو کر دنیاوی نقصان اور تکالیف کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ملک میں اصلی محبت ملکی کا جذبہ پیدا کر رہا

تھا۔ ہاں دوسرا گروہ نمایش اور حکام سے حصول مراتب کی آرزو میں اپنے خیالات کو چھپاتے اور مہمل بیانی کے ذریعہ سے ملکی خیرخواہی کا کام کر رہا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا۔ کہ ملکی محبت ایک کا اصل مقصد تھا۔ اور وہ اُس پر سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار رہا۔ دوسرے کے لئے ملکی محبت اُس مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا جس کا حاصل کرنا اُس کے ذہن میں تھا۔ دونوں گروہ ایک ہی کام کرتے تھے۔ گو ایک اس کو مقصد سمجھ کر اور دوسرا حصول مقصد کا ذریعہ سمجھ کر لیکن اس وجہ سے اب تک دونوں فریق اختلاف رائے رکھتے ہوئے بھی ملکر کام کرم کرتے تھے۔ ایک فریق قدیم اور اپنے مقاصد کے مقبول ہونے کی وجہ سے کثیر اور دوسرا قلیل تھا۔ اگر ملک کی بدقسمتی نہ ہوتی تو تھوڑا بہت اختلاف رکھ کر بھی مثل سابق کام کر سکتے تھے۔ لیکن اس ملک میں بدقسمتی سے ساری باتیں ایک ہی جگہ اکٹھی ہو جانے میں تامل نہیں کرتیں۔ ورنہ اختلافات ذاتی جو حصول عزت و مراتب میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ مشترکہ فواید کے کام کرنے میں اختیار نہ کئے جاتے۔ اور وہ صرف ذاتی معاملات تک ہی محدود رہ سکتے تھے۔ لیکن ہندوستانی یہ ثابت کرتے ہیں۔ ع سینہ میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے +

سورت میں جو کچھ پیش آیا۔ اس میں بمبئی کی مہتہ پارٹی کا ہاتھ کئی سال سے کام کر رہا تھا۔ کیونکہ مسٹر مہتہ اور گوکھلے و واچا کے تعلقات مسٹر تلک اور ان کے ہواخواہوں سے اچھے نہیں تھے۔ پچھلے دنوں جب مسٹر تلک نے مقدمہ میں اپنی بے نظیر اخلاقی دلیری و آزاد خیالی سے ملکی محبت میں ایثار نفسی کا ثبوت دیا تھا۔ ملک میں ان کی اعلیٰ عزت دلوں میں گھر کرتی جا رہی تھی۔ لیکن ع

اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی

اس وقت سے ہی معتدل پارٹی سے ان کے تعلقات کشیدہ ہوگئے تھے۔ بلحاظ مسٹر تلک کی محبت قومی کے اسی وقت سے ملک میں یہ خیال تھا کہ ملک کی طرف سے ان کی اعلےٰ خدمات کا اعتراف ہونا چاہیئے۔ اسی اثنا میں بنگال میں نئی پارٹی کا ظہور ہوا۔ جو مسٹر تلک کی آزاد خیالی پر گرویدہ ہوگئی۔ اور اسی وقت سے ذاتی اختلافات کے ساتھ ساتھ اصولی اختلافات بھی بظاہر خلافت کا کام کرنے کے لئے مستعمل ہونے لگے۔ مسٹر تلک کی خدمات ملک کے اعتراف کا خیال بذریعہ بنائے جانے پریزیڈنٹ کانگرس اول اول بنارس کانگرس میں ظاہر ہوا۔ لیکن چونکہ عام طور پر مسٹر بنتہ و گوکھلے کانگرس میں بارسوخ ہیں۔ اور یہ خرابی کم و بیش ہر سوسائٹی میں موجود ہے۔ کہ بجائے عام رائے کے چند بارسوخ اشخاص کی رائے فوقیت رکھتی ہے۔ اس لئے وہاں ان لوگوں نے داؤ پیچ کھیل کر مسٹر گوکھلے کو جو اس وقت مستحق نہ تھے۔ پریسیڈنٹ کانگرس بنا دیا۔ لیکن چونکہ مسٹر تلک کی عزت کا خیال روز بروز بڑھتا رہا۔ اس لئے معتدل پارٹی نے ایک بار مسٹر تلک کو کانگرس سے قطعی نکال دینے کی تدبیریں شروع کیں۔ ۱۰۔ اکتوبر ۱۹۰۶ء کی ایک میٹنگ کا حال پنجابی لاہور مورخہ ۱۳۔ نومبر ۱۹۰۶ء میں اس طرح لکھا ہے :-

...... مسٹر ڈی۔ ای۔ واچا کے دفتر میں کل ایک کمیٹی ہوئی فیروز شاہ مہتہ پریسیڈنٹ تھے۔ بعد مباحثہ تجویز ہوا۔ کہ عام اصول کانگرس کا بنایا جاوے۔ کہ جو شخص کانگرس کے لئے خطرناک ہو وہ تین چوتھائی ممبران کی رائے سے نکال دیا جاوے گا۔ اور بمبئی کی اسٹینڈنگ کمیٹی کو یہ اختیار

ہونا چاہیئے۔ کہ جو شخص کانگرس کے لیئے خطرناک ہے وہ نکالا جاوے۔
...... ایک ترمیم اس قسم کی اور پیش ہوئی کہ دیگر صوبوں کی کمیٹیوں کو بھی
خاص حالتوں میں خاص شرائط کیساتھ ایسا اختیار دینا چاہیئے۔ لیکن کثرت رائے
سے یہ ترمیم منظور نہیں ہوئی ...... دوسری تجویز ہوئی کہ بال گنگادھر
تلک اول وہ شخص ہے۔ جو کانگرس ڈیلیگیٹ ہونے کے ناقابل ہے
ایک ممبر نے کہا کہ اس کارروائی سے کانگرس کا نقصان ہوگا نہ کہ مسٹر تلک
کا۔ اس کو تحکمانہ طریقہ پر چپ رہنے کا حکم دیا گیا اور اس کے چپ نہ ہونے
پر کمرے سے باہر نکال دیا گیا۔ .... آخر میں لالہ لاجپت رائے
اور بپن چندر پال کے نکالنے کی تجویز ہوئی۔ وجوہات پورے طور پر
تحقیق نہیں ہوئیں۔ مسٹر تلک اس لیئے ناقابل بیان کیئے گئے۔ کہ وہ
قید ہو چکے ہیں اور اُن کا دماغ صحیح نہیں ہے .... +

مسٹر گوکھلے نے بھی کلکتہ کانگرس سے پہلے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ
وہ اور مسٹر تلک ایک پلیٹ فارم پر کام نہیں کر سکتے۔ سچائی گو پہلے کمزور
رہتی ہے۔ لیکن بعد میں قدرت بھی سچائی کی طرف ہوتی ہے۔ اور
اس کی طاقت بڑھتی رہتی ہے۔ یہی اصول شروع سے اخیر تک اس
معاملہ میں بھی کام کرتا رہا۔ کلکتہ کانگرس میں بنگال کی جانب سے مسٹر تلک کے
پریسیڈنٹ بنانے کا مسئلہ پیش ہوا۔ اور اس پر سخت ایجی ٹیشن ہوا۔ لیکن
اس وقت بنگال میں بھی ماڈریٹ وایکسٹریمسٹ فرقہ بندی بڑے زور سے ہو رہی
تھی۔ اس لیئے کچھ نئی پارٹی کی کوششیں۔ کچھ فرقہ بندی کا جھگڑا
کچھ بنگال کے لیڈروں کی ذاتی چشمکیں مل کر اس سوال کو تاریکی سے باہر
لانے میں سدراہ ہوئیں۔ اس طرح یہ دوسری زیادتی تھی۔ جو جناب مہتہ کی

اے روشنئی طبع تو برمن بلا شدی

اس وقت سے ہی مہتہ پارٹی سے ان کے تعلقات کشیدہ ہوگئے تھے۔ بلحاظ مسٹر تلک کی محبت قومی کے اسی وقت سے ملک میں یہ خیال تھا۔ کہ ملک کی طرف سے ان کی اعلےٰ خدمات کا اعتراف ہونا چاہیئے۔ اسی اثنا میں بنگال میں نئی پارٹی کا ظہور ہوا۔ جو مسٹر تلک کی آزاد خیالی پر گرویدہ ہوگئی۔ اور اسی وقت سے ذاتی اختلافات کے ساتھ ساتھ اصولی اختلافات بھی بظاہر خلافت کام کرنے کے لئے مستعمل ہونے لگے۔ مسٹر تلک کی خدمات ملک کے اعتراف کا خیال بذریعہ بنائے جانے پریزیڈنٹ کانگرس اول اول بنارس کانگرس میں ظاہر ہوا۔ لیکن چونکہ عام طور پر مسٹر مہتہ و گوکھلے کانگرس میں بارسوخ ہیں۔ اور یہ خرابی کم وبیش ہر سوسائٹی میں موجود ہے۔ کہ بجائے عام رائے کے چند بارسوخ اشخاص کی رائے فوقیت رکھتی ہے۔ اس لئے وہاں ان لوگوں نے داؤ پیچ کھیل کر مسٹر گوکھلے کو جو اس وقت مستحق نہ تھے۔ پریزیڈنٹ کانگرس بنا دیا۔ لیکن چونکہ مسٹر تلک کی عزت کا خیال روز بروز بڑھتا رہا۔ اس لئے مہتہ پارٹی نے ایک بار مسٹر تلک کو کانگرس سے قطعی نکال دینے کی تدبیریں شروع کیں۔ ۱۰۔ اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ء کی ایک میٹنگ کا حال پنجابی لاہور مورخہ ۱۳۔ نومبر سنہ ۱۹۰۶ء میں اس طرح لکھا ہے:۔

...... مسٹر ڈی۔ اے۔ واچا کے دفتر میں کل ایک کمیٹی ہوئی فیروز شاہ مہتہ پریزیڈنٹ تھے۔ بعد مباحثہ تجویز ہوا۔ کہ عام اصول کانگرس کا بنایا جاوے۔ کہ جو شخص کانگرس کے لئے خطرناک ہو وہ تین چوتھائی ممبران کی رائے سے نکال دیا جاوے۔" اور بمبئی کی اسٹینڈنگ کمیٹی کو یہ اختیار

ہونا چاہیئے۔ کہ جو شخص کانگرس کے لیئے خطرناک ہے وہ نکالا جاوے۔

...... ایک ترمیم اس قسم کی اور پیش ہوئی کہ دیگر صوبوں کی کمیٹیوں کو بھی خاص حالتوں میں خاص شرائط کیساتھ ایسا اختیار دینا چاہیئے۔ لیکن کثرت رائے سے یہ ترمیم منظور نہیں ہوئی ...... دوسری تجویز ہوئی کہ بال گنگادھر تلک اول وہ شخص ہے۔ جو کانگرس ڈیلیگیٹ ہونے کے ناقابل ہے ایک ممبر نے کہا کہ اس کارروائی سے کانگرس کا نقصان ہوگا نہ کہ مسٹر تلک کا۔ اس کو تحکمانہ طریقہ پر چپ رہنے کا حکم دیا گیا اور اس کے چپ نہ ہونے پر کمرے سے باہر نکالدیا گیا۔ .... آخر میں لالہ لاجپت رائے اور بپن چندر پال کے نکالنے کی تجویز ہوئی۔ وجوہات پورے طور پر تحقیق نہیں ہوئیں۔ مسٹر تلک اس لیئے ناقابل بیان کیئے گئے۔ کہ وہ قید ہو چکے ہیں اور اُن کا دماغ صحیح نہیں ہے .... +

مسٹر گوکھلے نے بھی کلکتہ کانگرس سے پہلے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ اور مسٹر تلک ایک پلیٹ فارم پر کام نہیں کر سکتے۔ سچائی گو پہلے کمزور رہتی ہے۔ لیکن بعد میں قدرت بھی سچائی کی طرف ہوتی ہے۔ اور اس کی طاقت بڑھتی رہتی ہے۔ یہی اصول شروع سے اخیر تک اس معاملہ میں بھی کام کرتا رہا۔ کلکتہ کانگرس میں بنگال کی جانب سے مسٹر تلک کے پریسیڈنٹ بنانے کا مسئلہ پیش ہوا۔ اور اس پر سخت ایجی ٹیشن ہوا۔ لیکن اس وقت بنگال میں بھی ماڈریٹ و ایکسٹریمسٹ فرقہ بندی بڑے زور سے ہو رہی تھی۔ اس لیئے کچھ نئی پارٹی کی کوششیں۔ کچھ فرقہ بندی کا جھگڑا کچھ بنگال کے لیڈروں کی ذاتی چشمکیں مل کر اس سوال کو تاریکی سے باہر لانے میں سدراہ ہوئیں۔ اس طرح یہ دوسری زیادتی تھی۔ جو جناب مہتہ کی

بنگال میں آکر ماڈریٹ سے سرزد ہوئی۔ چونکہ دومرتبہ عام رائے صرف ذاتی وجاہت کی وجہ سے پس انداز کردی گئی۔ اس لئے معاملہ زیادہ تیز ہوتا گیا۔ لیکن باوجود اس قدر ایجی ٹیشن کے جو دو برس سے ملک میں ہوتا تھا ناگپور میں بھی ماڈریٹ لیڈران نہیں سنبھلے۔ اور اپنی تعداد کثیر کے زعم میں عام رائے کو پس انداز کرتے ہوئے ڈاکٹر راش بہاری گھوش کو نامزد کر دیا۔ اس کا جو نتیجہ ناگپور میں ہوا پوشیدہ نہیں ہے کہ مقامی لیڈران کے اختلافات اور سخت ہو گئے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ قابل افسوس امر ہے کہ کانگرس جیسے تعلیم یافتہ و ملکی خیر خواہی کا دم بھرنے والے مجمع میں پریسیڈنٹی جیسی نمائش کے لئے عرصہ تک کشمکش رہے۔ اور برسوں تک مضامین لکھے جائیں۔ لیکن یہ غلط نہیں ہے کہ مسٹر تلک نے خود کبھی پریسیڈنٹی کے لئے خواہش نہیں کی۔ مگر وہ پبلک جوش کو جو نہ صرف مہاراشٹر میں بلکہ بنگال۔ پنجاب۔ صوبہ متوسط میں بھی مسٹر تلک کی ہردلعزیزی کی وجہ سے ان کی عزت کے بارے میں ہے کیا کر سکتے تھے تاہم انہوں نے ناگپور کا جھگڑا دیکھ کر کیسری میں یہ تجویز پیش کی کہ بابو سریندرناتھ بینرجی جن پر دونوں پارٹیوں کو اعتبار ہے۔ اور جو آدھے آدھی دونوں طرف ہیں۔ پریسیڈنٹ بنا دیئے جاویں۔ یہ واقع اس امر کے لئے کافی ہے کہ مسٹر تلک ملکی محبت میں کس قدر سرشار ہیں۔ اور نمائش سے کس قدر لاپرواہ ہیں۔ ایکسٹریمسٹ نے ہرچند چاہا کہ کانگرس ناگپور میں ہو اور سب انتظام ماڈریٹ کے اختیار میں رہے۔ لیکن چونکہ مختہ پارٹی کی آرزوئیں ناگپور میں پوری نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس لئے نام نہاد۔ "آل انڈیا کانگرس کمیٹی" اپنے گھر کی گئی۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کیا تھی؟

اُس کے شریک کس حد تک ملک کے قایم مقام شمار کیئے جا سکتے تھے؟ کانگرس کو خلاف رائے ملک کے اُس مقام سے جو اجلاس کانگرس میں عام رائے سے تجویز ہؤا تھا۔ پانچ اشخاص کو منتقل کرنیکا کس حد تک اختیار حاصل تھا؟ یہ ایسے سوالات ہیں کہ جو کارروائی پڑھنے پر تعجب میں ڈالتے ہیں۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے ممبران کسی پبلک میٹنگ میں منتخب نہ ہوئے تھے۔ کوئی شخص بنگال اور پنجاب سے شریک نہیں تھا۔ سات ممبران میں سے مسٹر تلک اور کھاپرڈے لیڈران ایکسٹریمسٹ دونوں کانگرس کے منتقل ہونے کے خلاف تھے۔ لیکن باوجود ان تمام صورتوں کے اور ایکسٹریمسٹ کی باربار آہ وزاری کے کانگرس شاہانہ حکم سے سورت کو جو ایکسٹریمسٹ سے امن کا مقام تھا۔ منتقل کی گئی۔ اس پر ایکسٹریمسٹ کا ارادہ تھا کہ ان کی کانگرس الگ ناگپور میں ہی ہو۔ لیکن مسٹر تلک نے اُس وقت بھی یہ نصیحت کی :۔

"مجوزہ مقام پر اس مرتبہ ایکسٹریمسٹ کو شریک ہونا چاہیئے۔ کیونکہ قومی مجلس کو نقصان پہنچانا نئی پارٹی کا منشا نہیں ہے۔" (کیسری) +

کانگرس کے منتقل ہونے پر عام اعتراض ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن نہیں ہؤا۔ اور اس طرح یہ چوتھی زیادتی تھی۔ جو تمام ایکسٹریمسٹ کو اور خصوصاً مسٹر تلک کو ذلیل کرنے کے لیئے اختیار کی گئی۔ لیکن غنیمت تھا۔ اگر اب بھی ماڈریٹ لیڈران اپنی زیادتیوں کو سمجھتے اور عام رائے کو کچلنے کی غلطیوں پر غلطیاں نہ کرتے۔ اور جہاں ہمیشہ اپنی آرزو کے مطابق کام کرتے تھے۔ وہاں ایکسٹریمسٹ کی آرزوؤں کا بھی کچھ لحاظ رکھتے۔ اور وہ نصیحت جو ایکسٹریمسٹ کو کی جاتی تھی۔ کہ پریسیڈنٹی جیسی ذاتی عزت کے لیئے جھگڑنا فضول ہے۔ خود اپنے لیئے موزوں سمجھتے۔ اور ایکسٹریمسٹ کی آرزو کے مطابق مسٹر تلک یا لالہ

لاجپت رائے کو پریسیڈنٹ کانگرس بنا دیتے تو کیا ہرج تھا۔ لیکن نصیحت صرف دوسروں کے لئے ہوتی ہے۔ اور طاقت کا نشہ بغیر زبردست طاقت کی ٹکر لگے ہوئے اُترا نہیں کرتا۔ کچھ ملک کی بدقسمتی۔ ماڈریٹ نے سورت میں بھی ڈاکٹر راش بہاری گھوش کو پریسیڈنٹ نامزد کیا۔ ڈاکٹر صاحب ممدوح کی قانونی قابلیت چاہے کیسی ہی بے نظیر ہو۔ اور وہ وکالت میں زیادہ روپیہ حاصل کرنے۔ اور ممبر کونسل ہو جانے سے گورنمنٹ میں کیسے ہی بارسوخ ہوں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب موصوف وہ شخص ہیں جو کانگرس میں پہلی مرتبہ کلکتہ کانگرس میں دکھلائی دیئے تھے۔ اور وہ بھی زبردستی۔ یعنی جب کلکتہ والوں نے ان کو دولتمند اور حکام میں بارسوخ و ممبر کونسل سمجھ کر خواہ مخواہ اسپشن کمیٹی کی پریسیڈنٹی پر رکھ دیا۔ آئی ہوئی دولت و عزت چھوڑنا محال ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو مجبوراً کانگرس میں بحیثیت پریسیڈنٹ کمیٹی آنا پڑا۔ پبلک خدمت کے لئے پہلی دفعہ ڈاکٹر صاحب اس وقت آئے تھے جب لارڈ کرزن نے ہندوستانیوں کو جھوٹا کہا۔ اور پبلک نے ممبر کونسل و بارسوخ سا آدمی سمجھ کر اُس جلسہ کا پریسیڈنٹ ڈاکٹر صاحب کو کیا۔ اُسی تقریر میں ذیل کے فقرے اُنھوں نے اپنی زبان سے فرمائے تھے جو ان کی پبلک لائف پر روشنی ڈالتے ہیں ؎

۔۔۔۔۔۔ پہلی بات جو مجھے اپنے متعلق کہنی ہے۔ وہ یہ ہے کہ میں ایسے جلسوں کا کیا ایک جلسہ کا بھی پیرو نہیں ہوں ۔۔۔۔۔۔۔ یہ بھی نہایت سنجیدگی سے اقرار کرتا ہوں کہ میں کانگرس کے مباحثوں میں کبھی کوئی حصہ نہیں لیتا۔ میں نے آج تک کبھی لوگوں کے خیالات بدلنے میں بھی کوئی کوشش نہیں کی ۔۔۔۔۔۔۔۔ +

یہ الفاظ دلچسپی سے بار بار پڑھے جانے کے قابل ہیں۔ ان الفاظ سے معلوم ہوگا۔ کہ سب سے بڑے ماڈریٹ لیڈر صاحب نے ملک کے لئے سوائے اس کے کونسی خدمت کی ہے۔ کہ تمام عمر میں قانونی قابلیت حاصل کر کے روپیہ حاصل کیا۔ اور ممبر کونسل بنا دیئے گئے۔ یا آخری خدمت ملک وہ چند الفاظ ہیں جو پریسیڈنٹی کانگرس پر نامزد ہونے کے بعد قانونی جلسہ ہائے باغیانہ کے پاس ہونے کے وقت کونسل میں فرمائے تھے۔ جس میں ایکسٹریمیسٹ کو برسانی کیڑے اور دیاخبر بتلایا گیا ہے۔ بہرحال پریسیڈنٹی کانگرس کا اصول اب صاف ہوگیا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ خادمان ملک کے لئے نہیں بلکہ ممبران کونسل اور حکام میں رسوخ رکھنے والوں کے لئے ہے۔ اور چونکہ ممبران کونسل میں بھی اول مستحق وائسریگل کونسل کے ممبران ہیں۔ اس لئے آنریبل ہرکشن لال تو بمقابلہ لالہ لاجپت رائے ابھی دور ہیں۔ کیونکہ مسٹر گوکھلے و ڈاکٹر گھوش تو ہو چکے ہیں۔ اب نمبر آنریبل مادھولال کا ہے۔ لیکن ان میں ایک نقص ہے۔ کہ ایکسٹریمیسٹ کو گالیاں نہیں دیتے۔ اس لئے غالباً سب سے بہتر مستحق سرہارو ے ایڈمسن کو (کانگرس تو بدقسمتی سے بند ہوگئی) اب کنونیشن میں پریسیڈنٹ بننے کے لئے منتظر رہنا چاہیئے۔ ع

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

سورت میں ڈاکٹر صاحب کے پریسیڈنٹ کانگرس نامزد ہونے پر ایکسٹریمیسٹ ماڈریٹ صاحبان کی وسعت خیالی کا اندازہ کرنے کے لئے کہ آیا واقعی پریسیڈنٹی کانگرس خادمان ملک کی خدمت کے اعتراف کیلئے ہے یا ممبران کونسل کے لئے۔ سب سے بڑے خادم ملک لالہ لاجپت رائے کو پیش کیا۔ لیکن ماڈریٹ اور خصوصاً ہتہ پارٹی کانگرس کو اپنی ملک خیال

کر رہے تھے - ایسی باتوں کی کیا پرواہ ہوسکتی تھی - باوجود اس کے کہ ایک میجسٹریٹ کہتے تھے کہ ہماری آرزوؤں کو کچل کر تم آرام سے نہ سو سکو گے لیکن

پرتھیا پائے کاے مدھ نہیں

یعنی طاقت کا نشہ کس کو مدہوش نہیں کرتا ہے - ماڈریٹ لیڈران پر بھی قابو یافتہ بارسوخ ہونے کی طاقت کا نشہ بری طرح سوار ہؤا - اور انہوں نے زیادتیوں پر زیادتیاں کرتے ہوئے بھی پرواہ نہیں کی - سورت میں ماڈریٹ اور خصوصاً مہتہ پارٹی نے نہایت اشتعال انگیز کارروائیاں کیں - مہتہ پارٹی نے گجراتیوں کو ان کے پرانے اختلافات مرہٹوں کے یاد دلا کر مسٹر تلک اور مرہٹوں کے خلاف بھڑکایا - جن کا ثبوت وہ تحریر ہے جو ایک گجراتی روزانہ اخبار میں شایع ہوئی - اور بعد میں عام طور پر کانگرس میں بطور اشتہار تقسیم کی گئی +

سورت کے باشندو اب وقت آگیا ہے - کہ تم اپنا فرض ادا کرو - اور اُس حملے سے بچنے کی کوشش کرو - جو تمہارا منہ کالا کرنے کے لئے کیا گیا ہے .... کیا تم ثابت کروگے کہ سورتی بزدل و نامرد ہیں - سیواجی نے سورت کو دو دفعہ لوٹا اور چلتے وقت کہہ گیا تھا - کہ تیسری مرتبہ پھر آگر لوٹوں گا - وہ تو تیسری مرتبہ نہ آسکا - اب تلک اُس کا اوتار بنکر آیا ہے - اور تمہارے ناک کان کاٹنے والا ہے - اس لئے اُٹھو اُٹھو اس کا مقابلہ کرو +

اِدھر مدناپور کی کانفرنس سے بنگالیوں کے اختلافات تیز ہو رہے تھے - دوسری جانب مسٹر ایڈمسن نے ڈاکٹر گھوش و گوکھلے کے کان میں پھونک ماردی تھی - اُدھر ٹائمز ماڈریٹ کو اکسا رہا تھا - کہ ایکسٹرمیسٹ سے الگ ہو جانے پر برٹش سلطنت میں حقوق کے دروازے تمہارے لئے کھل جائیں گے -

عوام عام طور پر لیڈر کے خیالات کے قدم بقدم چلتے ہیں۔ اس لئے عام آدمی جو تہ کے حالات سے واقف نہ تھے۔ وہ فرقہ بندی کے اختلافات میں محو تھے فرقہ بندی کے اختلافات نے ذاتی تفرقات سے ملکر خطرناک سنجیدہ صورت اختیار کر لی۔ اور سورت میں بسم اللہ ہی غلط ہوئی۔ کہ ماڈریٹ اور ایکسٹریمسٹ میں استقبالیہ کمیٹی کی جانب سے یہ تمیز کی گئی۔ کہ قیام و مہمان داری میں ایکسٹریمسٹ کو تکالیف دی گئیں۔ جہاں کہا جاتا ہے کہ مسٹر مہتہ شاہانہ طور پر بنگلہ میں فروکش تھے۔ ایکسٹریمسٹ پارٹی کے لیڈران تلک و کھاپرڈے آربندا گھوش معمولی خیمہ جات میں زمین پر سوتے تھے۔ جو کہ اہل سورت کے خلاف اخلاق ہونے کے علاوہ اصول مہمان داری کے بھی خلاف تھا۔ پریذیڈنٹ کی اسپیچ جس میں عموماً لیڈران کانگرس کے مشوروں ورائے کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ ایکسٹریمسٹ سے پوشیدہ رکھی گئی۔ جس میں شبہ تھا اور وہ صحیح تھا۔ پریسیڈنٹ صاحب کی اسپیچ میں ذیل کے الفاظ سے یہ صاف ہو جائیگا کہ آیندہ ایکسٹریمسٹ کو کانگرس میں کس حیثیت سے رکھنا منظور تھا۔

نئی پارٹی کے عروج سے کئی اصلاحوں میں پس وپیش ہو رہی ہے .... ہر عقلمند آدمی اس پارٹی کے طریق کو ناپسند کرتا ہے۔ اگر گورنمنٹ ماڈریٹوں کو اپنی طرف کرے اور ملک کو آہستہ آہستہ سیلف گورننگ سٹیٹ بننے کے لئے تیار کرے جو انگلینڈ کے زیر سایہ رہے۔ تو ہم نئی پارٹی کا نام ونشان تک مٹا دیں گے۔ جس سے وہ منحوس سایہ جو ملک کی آئینہ قسمتوں کو گھیرے ہوئے ہے بہت جلد دور ہو جائیگا گورنمنٹ نیک نیتی سے ریفارم چاہنے والوں اور گورنمنٹ سے متنفر غیر ذمہ وار شور مچانیوالوں میں امتیاز نہیں کرتی وہ (ماڈریٹ)

جو انگریزی راج کو یہاں مستحکم کرنے کی خاطر اہل ہند کو حکومت میں
زیادہ حصہ دیئے جانے کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اُن کو اُن فتنہ گردوں
میں شامل سمجھا جاتا ہے۔ جو انگریزوں کو ملک سے باہر نکالکر سمندر
میں دھکیل دینا چاہتے ہیں .... کانگریس کی
بنیاد کانسٹی ٹیوشنل لائن پر رکھی گئی تھی۔ اور اگر نئی پارٹی اُن اصولوں
اور طریقوں کو ناپسند کرے اور ملکر کام نہ کر سکے تو کانگریس میں انکے
واسطے جگہ نہیں ہے۔ وہ اپنا کام علیحدہ کر سکتے ہیں........
اگر نئی پارٹی نہ مانے تو علیحدگی لازم ہے۔ کانگریس اپنے کانسٹی ٹیوشنل
لائنوں پر ہی کام کرے گی +

یہ خیالات کانگریس کے پریسیڈنٹ کے ہیں۔ جو گورنمنٹ سے حقوق
دلانے کا دعوے کرتے ہیں۔ لیکن خیریت سے یہ ہے چندی اسپیچ پریذیڈنشل
سپیچ نہ ہو سکی۔ مسودہ رزولیوشن جو کانگریس سے پیشتر شایع ہو جایا کرتا تھا
امسال ۲۹ دسمبر (روز اول اجلاس کانگریس) کے ½ ۲ بجے سے پہلے
شایع نہ کیا گیا۔ (مسٹر گوکھلے بھی اپنی چٹھی میں تسلیم کرتے ہیں) لیکن اخبار
ایڈووکیٹ کو ایک روز پہلے بھیج دیا گیا۔ حالانکہ ایکسٹریمسٹ کئی روز سے
غل مچا رہے تھے۔ کہ امسال رزولیوشنوں میں اس طور سے رد و بدل کرنی
منظور ہے کہ ایکسٹریمسٹ کے اصول بیدردی سے کچلے جائیں۔ اور کانگریس
حکام کی مرغوب طبع بنائی جاوے۔ بعد کو یہ سچ ثابت ہوا۔ کہ سوراجیہ۔
بائیکاٹ۔ سودیشی۔ نیشنل ایجوکیشن کے رزولیوشنوں میں اس طرح ترمیم
کی گئی ہے کہ ایکسٹریمسٹ کے اصول ناجائز قرار دیئے جائیں یعنی سوراجیہ میں یہ ترمیم
کر دی گئی۔ کہ وہ دیگر حصص برٹش حکومت (خواہ ان کی حکومت ہندوستان

سے بھی بدتر ہو) کی طرح سے ہو۔ بائیکاٹ اول تو رکھا نہیں گیا تھا لیکن بعد میں صرف
بدیشی مال تک کے لئے قائم رکھا گیا۔ نیشنل ایجوکیشن سے یہ شرط جو پارسال
تھی اُڑا دی گئی۔ کہ تعلیم قوم کے ہاتھوں میں ہو۔ سودیشی میں سے یہ کال
دیا گیا کہ نقصان اٹھا کر بھی جاری رہے۔ غرض معرکہ کے مضامین جو ۲۲
برس کی محنت کے بعد کانگرس کلکتہ میں حاصل ہوئے تھے۔ ترقی
معکوس کا نظارہ پیش کیا گیا۔ اس طرح سے ایکسٹریمسٹ کے اصول بیدردی
کے ساتھ کچلنے کا ارادہ کیا۔ ایکسٹریمسٹ نے اس پر بھی ہر چند یہ چاہا کہ رزولیوشن
بجائے مسٹر گوکھلے کی رائے سے مرتب ہونے کے ایک منتخب کمیٹی کی
رائے سے مرتب ہوں۔ جس میں پانچ ماڈریٹ ممبر اور پانچ ایکسٹریمسٹ
ہوں یا کم ہوں۔ لیکن یہ تجویز نظر انداز کر دی گئی۔ صلح کے لئے مسٹر تلک
نے خود ماڈریٹ کیمپ میں جا کر اپنے خیالات ظاہر کئے۔ جن کو اکثر
ماڈریٹ نے پسند کر کے اتفاق ظاہر کیا۔ مسٹر تلک نے ڈاکٹر رُدر فورڈ۔
و پروفیسر گجر۔ لالہ لاجپت رائے کی معرفت کئی مرتبہ صلح کے لئے سلسلہ
جنبانی کی اور ظاہر کیا۔ کہ اگر رزولیوشنز میں نامناسب ترمیم نہ کی جائے۔ اور
مثل سال گذشتہ کے رکھے جائیں۔ تو وہ مخالفت نہ کریں گے۔ ورنہ
پریسیڈنٹ کے ہی انتخاب سے مخالفت کی جائے گی (لالہ لاجپت رائے
سے ملاقات ہونا تو مسٹر گوکھلے کو تسلیم ہے) لیکن ایسی دھمکیاں۔ بے تاج
بادشاہ مہتہ (اُن کے پیرؤں کے الفاظ ہیں) و گوکھلے پر کیا اثر ڈال سکتی
تھیں۔ اس کی بجائے ماڈریٹ لیڈران نے ملکر ایک ضابطہ بنایا۔ جو
کانگرس میں شایع کیا گیا۔ جس کا منشا یہ تھا۔ کہ آیندہ صرف وہی لوگ
ڈیلیگیٹ کانگرس ہو سکیں گے۔ جو مجوزہ اصولوں پر دستخط کریں۔ اور

اس طرح نومبر ۱۹۰۶ء کی تجویز عمل میں لائی گئی - اور خریداری ضمیر کا یہ
عجیب طریقہ نکالا گیا - اپنی ضمیر فروشی کی توقع ایکسٹرمسٹ میں محال تھی -
اسی لئے ان سے جنگ کی تیاریاں شروع ہوئیں - بد معاش کرایہ پر لا کر
پنڈال میں تعینات کئے گئے - جس کی بابت سیکرٹری پنڈال نے اس طرح
تسلیم کیا ہے - کہ اُن کو ٹھیکہ دار پنڈال نے بغرض حفاظت تعینات کیا تھا
پریسیڈنٹ صاحب نے پولیس کو ایکسٹرمسٹ کی گرفتاری کے لئے تعینات
کر دیا - جو بعد میں کالکٹر سورت کے تار بنام وائسرائے سے بالکل صاف ہو گیا
ہے - مہتہ پارٹی اپنی تعداد بڑھا کر جنگ کی تیاریوں میں مشغول تھی - بمبئی
سے ڈیلیگیٹ لائے جا رہے تھے - سیکرٹری مسٹر واچا گھر کے تھے - سادے
فارم رکھ دیئے گئے - کہ ان پر دستخط کر کے بلا دقت داخل کانگرس ہوں جن
لوگوں نے کانگرس کو دیکھا ہے وہ واقف ہیں کہ کانگرس پنڈال میں ہمیشہ
ایک چبوترہ بنتا ہے - جس پر پریسیڈنٹ و لیڈران کانگرس بیٹھتے ہیں - اور
اب تک مسٹر تلک بھی لیڈران میں شمار ہو کر اُسی پر بیٹھا کرتے تھے لیکن
امسال مسٹر تلک اور تمام لیڈران ایکسٹرمسٹ کی ذلت کرنے کے لئے
ان کو نیچے معمولی ڈیلیگیٹوں میں جگہ دی گئی - یہ حیرت خیز بات تھی کہ ایک
سال میں مسٹر تلک کی حالت میں یہ تبدیلی کیسے آ گئی تھی - حالانکہ مسٹر مہتہ
وہ شخص ہیں جن کی بابت یہ دعوے صحیح طور سے کیا جا سکتا ہے - کہ
آج تک اُنہوں نے کبھی کبھی کانگرس میں آنے کے یا پریسیڈنٹ کارپوریشن
بمبئی ہو سکنے کے اور کوئی خدمت ملک اگر کی ہو تو کوئی ماڈریٹ بتلائے
سوا اس کے کہ کانگرس کی بدولت تقاری کی شہرت پا کر بیرسٹری سے
روپیہ حاصل کیا - اور چند عزتیں حاصل کیں - علی ہذا مسٹر واچا محب وطن گو کھلے

کی بابت ابھی ملک سے فراموش نہیں ہوا ہوگا۔ جنہ پچھلے دنوں اپنی تقریروں کی بابت گورنمنٹ سے معافی مانگ کر اخلاقی جرأت دکھلائی تھی۔ اور اس صلہ میں ممبری کونسل حاصل کی تھی مسٹر تلک کی بابت خود ماڈریٹ مفسر ہیں +

ان کی علمی قابلیت کا اب تک تمام ملک میں سکہ جما ہوا ہے۔ انکا مخالف سے مخالف اُن کے ذاتی اوصاف کی تعریف کرتا ہے (ایڈووکیٹ لکھنؤ) +

یہ کارروائی دراصل خلاف اصول جاری تھی۔ اور کوئی طریقہ اس صفت کے جانچنے کے لئے نہ تھا۔ جس کے بموجب کوئی شخص اس چبوترے پر بیٹھنے کا مستحق ہوسکتا تھا۔ صرف سوخ یافتہ اصحاب چاہے جس کو بٹھاویں۔ اور چاہے جس کو نکال دیں۔ اس طرح خود ساختہ لیڈر آپ ہی اپنی عزت کرتے رہے۔ لیکن جب تک اس میں اتفاق رہتا ہے کارروائی خواہ کسی طریقہ پر کی جاوے۔ قاعدہ معلوم کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ لیکن قواعد کی جانچ اختلاف رائے کی حالت میں ہوتی ہے۔ مگر اس بارے میں بھی شل قاعدہ انتخاب پریسیڈنٹ کے قواعد نامکمل ثابت ہوئے۔ ایسی ہی اور زیادتیاں ایکسٹریمسٹ نے ضبط کے ساتھ اس خیال سے برداشت کیں تھیں۔ ع

تیغ جفائے یار سے دل منہ نہ پھیر لو
پھر منہ وفا کو ہم سے دکھایا نہ جائیگا

لیکن ان کو اپنے اصول کا خون اور ضمیر فروشی منظور نہیں ہوسکتا تھا۔ جس کے لئے انہوں نے قید کی تکلیفیں برداشت کیں۔ دنیاوی عزت و حشمت کو خیرباد کہدیا۔ جب صلح کی کوششیں ناکامیاب ثابت ہوئیں۔ تو ۲۶ تاریخ کو ایکسٹریمسٹ نے جب انتخاب پریسیڈنٹ کے رزولیوشن

سے اختلاف کیا۔ گو اس سے نتیجہ سوائے ماڈریٹ کے خیالات کو رد کرنے
کے اور کچھ نہ تھا۔ کارروائی دوسرے روز کے لئے ملتوی ہوگئی۔ اب
وقت غنیمت تھا۔ گر ماڈریٹ لیڈران خمار سے چونک کر ایکسٹریمسٹ کی
صلح کی کوششوں کا خیال کرتے۔ لیکن بجائے اس کے شام کو مہتہ صاحب
کے بنگلہ پر میٹنگ کی گئی۔ اور مسٹر تلک کو کانگرس سے نکالنے کا تصفیہ
کیا گیا۔ پولیس بلائی گئی۔ ایکسٹریمسٹ و النشیر بالا وجہ یکدم موقوف کر دیئے گئے۔
دوسرے روز ایکسٹریمسٹ نے زبان تک نہیں ہلائی۔ مسٹر تلک نے تحریری
اطلاع دیدی تھی۔ کہ پریسیڈنٹ کے رزولیوشن سے اختلاف کرتے
ہوئے میں التوائے کانگرس کی تجویز پیش کروں گا۔ مسٹر تلک کی
نیک نیتی اس سے ظاہر ہے۔ کہ وہ پھر بھی صلح کی کوششوں میں سرگرم
تھے۔ کہ اس طرح کانگرس ملتوی ہوکر فریقین کے لیڈراس میں صلح کن اصولوں
پر آجائیں گے۔

کیوں نہ ٹھیریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم
آپ اُٹھالاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

لیکن مسٹر تلک پر پلیٹ فارم کی طرف سے جاتے ہوئے شرم کے نعرے
بلند کئے گئے۔ اور خلاف قاعدہ بولنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ یہ درست نہیں
ہے کہ مسٹر تلک کو بولنے کا حق نہیں تھا۔ اور مسٹر گھوش کا روکنا جائز تھا
وجہ اس کی یہ ہے۔ کہ انتخاب پریسیڈنٹ کی بابت ہی تمام جھگڑا تھا۔ اور
جب بموجب قاعدہ واقعی طور پر پریسیڈنٹ اجلاس کانگرس میں منتخب ہوتا
ہے۔ تو مسٹر تلک اپنی رائے ظاہر کرسکتے تھے۔ اور جبکہ ایک بڑے گروہ
نے ان کو پریسیڈنٹ تسلیم نہ کیا تھا۔ مسٹر گھوش صحیح طور سے پریسیڈنٹ

تسلیم نہیں کئے جا سکتے تھے۔ اور اُن کا حکم بحیثیت پریسیڈنٹ قابل پابندی نہ تھا۔ اور نہ مسٹر گھوش کو کوئی حق تھا کہ مسٹر تلک کو روکتے۔ اسی اثنا میں مسٹر تلک پر جوتا پھینکا گیا۔ اور ان پر کرسی وغیرہ سے حملہ کیا گیا۔ دو ایک والنٹروں نے مسٹر تلک کو زبردستی ہٹانیکا ارادہ کیا۔ کہا جاتا ہے۔ کہ جوتا ایکسٹریمسٹ نے پھینکا تھا۔ لیکن جب ماڈریٹ اخباروں کے اس بیان کو دیکھا جاوے۔ کہ محض ڈیلیگیٹ اس قدر برافروختہ ہوئے کہ اُنھوں نے چاہا کہ مسٹر تلک کو گردن پکڑ کر باہر نکال دیں۔ لیکن اجازت نہیں دی گئی۔ تو یہ صاف ہو جاتا ہے۔ کہ جوتا مسٹر تلک کی طرف پھینکا گیا۔ لیکن قدرت کا کرشمہ کہ یہ عنایت جہاں سے آئی تھی انہیں کو واپس ہو کر باعث اعزاز ہوئی۔ چاہ کن را چاہ درپیش۔ اس قابل نفرت کارروائی کے بعد کوشش کی گئی کہ مسٹر تلک اور ان کے ساتھی گرفتار کئے جائیں۔ لیکن مسٹر تلک ایسے شخص نہیں ہیں جن کی طرف معمولی پولیس مین تو کیا اعلےٰ افسر بھی نظر اٹھا کر دیکھ سکے۔ مقصد ماڈریٹ کے لئے مسٹر تلک کے فدائی کافی تھے۔ اس لئے یہ منصوبے خاک میں مل گئے۔ اور اس طرح عین نوجوانی میں جبکہ ملک کی اُمنگیں اس سے لپٹ رہی تھیں سرد لوگوں نے کانگرس کو ٹھنڈا کر دیا"۔

اس کے بعد بھی مسٹر تلک نے اس کارروائی پر اُس تقریر میں جو نیشنلسٹ کانفرنس میں کی گئی۔ یہ کہا:۔

اس کارروائی کا مجھے سب سے زیادہ افسوس ہے۔ لیکن ہم کیا کریں۔ مجبور تھے۔ ہمارے لئے کوئی چارہ نہیں تھا۔ بہتر ہو کہ چالیس پچاس آدمیوں کی ایک کمیٹی بنائی جاوے جن کا یہ فرض ہو کہ دونوں فریقوں کی خواہشات کا لحاظ رکھ کر اتفاق کرا دیں ورنہ دونوں کا نقصان ہے...... ۔

برخلاف اس کے مسٹر گھوش نے ٹائمس کے نامہ نگار سے کہا۔ کہ

اس امر سے کہ کانگریس کے ٹکڑے ہو گئے۔ وہ خوش تھے۔ جلدی یا دیر میں یہ ہونے کو تھا۔ اچھا ہوا۔ کہ وہ جلد ہو گیا۔ اور وہ ایکسٹریمسٹ کا ناسور جو کانگرس کی عملی ترقی میں ہارج تھا ختم ہو گیا۔ گرم پارٹی کے لوگ تعداد میں بہت کم ہیں۔ اور وہ یہ جانتے ہیں۔ کہ ان کی سرکش تجاویز جو انکے سردار پیش کرتے ہیں مانی نہیں جا سکتیں +

مسٹر فیروز شاہ مہتہ نے حسب ذیل رائے ظاہر کی :۔

اُن کو یہ پہلے معلوم ہو گیا تھا۔ کہ کانگرس کا تقسیم ہونا جب تک کہ کانگرس گرم گروہ کے حسب دلخواہ نہ چلے ضرور ہے۔ سرگرم گروہ کی خواہشات ناممکن اور ایسی ہیں۔ کہ جن کو کانگریس کے لوگوں کی کثیر تعداد عمل میں لانا نہیں چاہتی...... مسٹر تلک کا رسوخ غیر احاطہ کے لوگوں میں ابتک اس وجہ سے تھا۔ کہ وہ کسی نہ کسی طرح کانگرس میں شامل ہے اور اب جبکہ وہ کانگرس سے الگ ہو گئے ہیں۔ لوگوں پر ان کی حقیقت صاف ہو جائیگی نرم پارٹی نے مسٹر تلک کے ساتھ جسمانی قوت کام میں لانے کی بڑی غلطی جس کے خواہشمند تھے نہ کی۔ اور اس طرح اُنھوں نے سارا بار تقسیم کانگرس کا مسٹر تلک پر رکھا ہے +

ماڈریٹ اخبار بھی صاف کہتے ہیں۔ کہ "اچھا ہوا جو فاسد مادہ جسم کے اندر پیدا ہو گیا تھا۔ اس کو شگاف دیکر نکال دیا گیا" ایسے ارادوں اور خیالات پر ماڈریٹ صاحبان کی یہ جرأت قابل تحسین ہے۔ کہ واقعات صورت پر غلط بنا تیوں سے رنگ چڑھا کر مسٹر تلک اور ایکسٹریمسٹ پر الزام لگایا جاتا ہے۔ اول اول گو ماڈریٹ نے غلط بیانی پھیلا کر پبلک کو مغالطہ میں

رکھنا چاہا۔ لیکن آخر سچائی ظاہر ہو گئی۔ اس گرما گرمی میں یہ دلچسپ نظارہ ہے۔ کہ بعض انصاف پسند ماڈریٹ بھی سورت میں ماڈریٹ کی تباہیوں کے ...ف ہو گئے۔ سچ یا لاہور۔ امرت بازار کا۔ ہندوستان کی آئیں اس کا اچھا ثبوت ہیں۔ سورت کے شرمندہ کن واقع کے بعد تمام لیڈران کی بلا لحاظ ایکسٹریمسٹ اور ماڈریٹ ہونے کے یہ منشا تھا۔ کہ بلا لحاظ اصولی اختلاف رائے کے واقعات کا انصاف سے اظہار کیا جاتا اب اگر اس واقعہ سے عبرت حاصل کی جاوے۔ کہ جن حکام کی رضا جوئی کیلئے اس قابل یادگار واقع کی بنیاد رکھی گئی۔ ان کے خیالات کے عکس کا حسب ذیل سارٹیفکٹ پانیر دیتا ہے +

ماڈریٹ وایکسٹریمسٹ جو اپنے خیالات کو معمل اور پیچدار الفاظ میں بیان کرکے ظاہر میں وفاداری دکھلاتے ہیں +

یہی سب سے بڑا مخالف ایکسٹریمسٹ کو ان کی آزاد خیالی کے عوض حسب ذیل سرٹیفکٹ دیتا ہے :۔

ایکسٹریمسٹ وہ ماڈریٹ ہیں۔ جو اپنے خیالات کو سچائی۔ آزادی۔ جرأت سے ظاہر کرتے ہیں +

میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے بعض جگہ خلاف مصلحت صاف بیانی سے کام لیا ہے۔ ~

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

بلحاظ گذشتہ حیرت خیز واقعات کے خصوصاً اس وجہ سے کہ میں اس رائے سے متفق نہیں ہوں۔ کہ واقعات کو چھپانے سے آئندہ کوئی بہتر نتیجہ نکل سکتا ہے

یہ غیر مناسب نہیں سمجھتا ہوں۔ کہ گذشتہ واقعات کی صحیح وجوہات معلوم کرکے آیندہ کام کرنیکے واسطے ایک سبق حاصل کیا جاوے اور خواہ دونو فریق الگ الگ کام کریں یا متفق ہو کر یہ ضروری ہے۔ کہ ان صورتوں سے بچنے کی کوشش کی جائے۔ جو پچھلی مرتبہ خرابی کا باعث ہوئیں۔ اس وقت غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ دونوں فریق کے لیئے الگ الگ کام کرنے میں زیادہ بہتری ہے ملک ہے یا ملکر کام کرنے میں۔ ایکسٹریمسٹ نے باوجود ان زیادتیوں کے نہایت وسعت خیالی سے شروع سے یہ خواہش ظاہر کی ہے ہیں۔ و پیش نہیں کیا۔ کہ متفق ہو کر کام کیا جاوے اب جبکہ مسٹر تلک نے بھی تجیبہ کانفرنس میں اس مضمون کا رزولیوشن پاس کیا ہے کہ "بہتر ہے دونوں پارٹی متفق ہو کر کام کریں۔ تو پچھلے واقعات کی تلافی کا ... بہترین موقع کو نہیں کھونا چاہیئے۔ اور یہ کہکر مزید اشتعال دلانا سخت نامناسب بلکہ خلاف واقعات ہی ہے کہ پہلے ہی کیوں نہ ایسا خیال کیا گیا۔ کیونکہ دراصل ایکسٹریمسٹ نے زیادتیوں پر زیادتیاں اس خیال سے برداشت کیں کہ بہبودی ملک میں خلل نہ پڑے۔ لیکن جب کوئی چارہ نہ رہا تب وہ طریقہ اختیار کیا گیا جو کمزوروں کو اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ماڈریٹ خواہ ابتک اس خیال میں ہوں کہ وہ حکام کی نظر دیکھتے ہوئے چند جزوی رعایات حاصل کرکے بڑی کامیابی حاصل کرینگے لیکن زمانہ آئیگا کہ ان کے اس خیال کو اسی طرح غلط ثابت کریگا جس طرح اس خیال کو کہ ایکسٹریمسٹ کی آرزوؤں کو کل کردہ کوئی بہتر نتیجہ پیدا کر سکتے ہیں۔ سورت کے واقعات نے غلط ثابت کیا اب جب ماڈریٹ کنونشن ہونیوالی ہے۔ ملک یہ توقع رکھ سکتا ہے کہ ایکسٹریمسٹ کی خواہش پر ماڈریٹ کیا رائے ظاہر کرتے ہیں ورنہ زمانہ اچھا استاد ہے وہ سب درست بنا دیگا اور اس وقت معلوم ہو گا کہ کون غلطی پر تھا اور کون راستی پر۔

ہاں اگر ہے یہ نے نسیان سہی   انتظار اور بھی باقی ہو تو یہ بھی سہی

مناظرہ

اس عنوان سے بحث طلب مضامین درج آزاد ہوا کریں گے۔
ہر ایک مضمون ایک جواب اور لکھنے والے کے جواب الجواب پر مکمل سمجھا جائے گا +

طالب علم اور ملکی خدمت

از ڈاکٹر شاما چرن ورما

ہمارے لایق دوست منشی "روشن رائے" نے ایک مضمون عنوان بالا سے ماہ جنوری سنہ رواں کے "آزاد" میں لکھا ہے +

آپ نے اختصار سے یہ امر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ طلباء کو ملکی خدمت میں حصہ لینا چاہئے۔ اور سبب یہ لکھا ہے کہ علم کی تحصیل سے عمل مراد ہے۔ پھر یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ گو آج کل کی ہوا کے مطابق ہر ایک ملکی و دیگر کام پولیٹیکل رنگ میں ظاہر کیا جا رہا ہے۔ تاہم طالب علموں کے لئے ملک کی خدمت کرنا لازمی بات ہے۔ آپ نے اس قدر نصیحت بھی کی ہے۔ کہ ان طالبانِ علم کو رائے زنی یا تجویز پیش کرنی نہ چاہئے۔ بلکہ جو بزرگانِ قوم و رہبرانِ ملک فرماویں اُس کی تکمیل اُن پر فرض ہے +

یہاں تک منشی صاحب کی رائے کو بطور تمہید پیش کر کے راقم اپنی رائے ظاہر کرتا ہوا چند اعتراض پیش کرتا ہے۔ جو ناظرین کے غور و خوض کے قابل ہے ؎

در میان قعر دریا تختہ بندم کردہ
باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

ست یقیناً ہمارے دوست نے یہ مراد لی ہے کہ جب ایک شخص ایک ملک[1] میں
پیدا ہؤا ہے۔ تب اُس کو ملکی خدمت میں ضرور حصہ لینا چاہیئے۔ جیسے کہ دریا
میں جاکر دامن کا تر ہو جانا ضروریات سے ہے۔ مگر شاعر کا مطلب یہ نہیں ہے
کیونکہ اگر آپ کشتی یا جہاز میں سوار ہیں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ کا دامن
بھیگ جاوے۔ اور نہ یہ عقلمندی کی بات ہے۔ کہ اگر دامن نہ بھی تر ہوتا
ہو تو بھی کوشش کرکے اُس کو بھگو لیا جاوے۔ ہاں اگر آپ کو بلا کسی مدد
کے گہرے پانی میں گھسنا پڑے تو ضرور کپڑے بھیگ جاویں گے۔ کہ جن کی
حفاظت کی آپ شاذ ہی کوئی تدبیر کرسکتے ہیں۔ غرض یہ کہ ملک میں پیدا ہونا اُسی
وقت سے اُس کی خدمت لازم کر دیتا ہے۔ یہ لایعنی امر ہے۔ اور اگر لابد ہے
تو خود بخود وہ ایسا کرائیگا +

اس کے بعد شیخ سعدی صاحب شیرازی کے چند اشعار درج کئے ہیں +

علم چنداں کہ بیشتر خوانی   گر عمل در تو نیست نادانی
چارپائے بر و کتابے چند   نے محقق بود نہ دانشمند

ان اشعار سے مضمون نویس صاحب نے علم کی تحصیل کے ساتھ ساتھ اُس پر

---

[1] ڈاکٹر صاحب نے ہمارے خیال میں شعر کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ ہمارا
خیال ہے کہ منشی صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جب ہمارے طالب علموں کو تعلیم اس قسم کی
دی جاتی ہے۔ کہ ملکی خدمت کو ہر ایک اہل ملک اپنا فرض جانے تو پھر وہ کیونکر باز
رہ سکتے ہیں۔ ایڈیٹر

عمل بھی کرتے جانا مراد لیا ہے۔ مگر در اصل مطلب سعدی دیگر است۔ یعنی جو پڑھے اُسے گننا تو ضروری کام ہے مگر شیخ صاحب نے یہ ہرگز نہیں فرمایا۔ کہ عالم طالب علمی میں ہی عمل بھی شروع کر دیا جاوے بلکہ مطلب یہ ہے کہ عالم باعمل ہونا چاہیئے۔ نہ کہ طالب باعمل +

تحصیل علم ایک بات ہے اور اُس پر عمل دوسری۔ مگر دونوں الگ تھلگ ہیں۔ مطلب یہ کہ وقت تحصیل عمل فرض نہیں ہے۔ بلکہ تکمیل پر تعمیل ہونی چاہیئے۔ اُس وقت اگر معلومات پر عمل نہ کیا جاوے تو اُس کی تحصیل لاحاصل ہے اسی موقع کے لئے سعدی صاحب نے فرمایا ہے۔ کہ ع

گر عمل در تو نیست نادانی

جیسے۔ کہ ع

چارپائے برو کتابے چند

غرض ایک ساتھ دونوں کام نہیں ہونے چاہئیں۔ کیونکہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔ ورنہ یا تو میان کی خیر نہیں یا تلوار کی۔

ہاں طلباء کو یہ ضرور لازم ہے۔ کہ جو کتاب پڑھیں اُسکے مضمون کو ذہن نقش ضرور کرتے جاویں۔ بلکہ اُس کے متعلق اپنے تمام زمانہ طالب علمی میں ہر مصنف کے خیالات کو بھی ایک جگہ نوٹ کرتے جائیں۔ اور بعد تکمیل تعلیم کے اُس پر بحث کرکے دیکھو کہ علم بے بحث درست نہیں ہوتا۔ اپنی آخری رائے قایم کریں۔ اور تب اُس کے عامل ہوں +

پڑھنے کے ساتھ اُس پر عمل اس وجہ سے نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ

(۱)۔ جو بات آج پڑھائی گئی ضروری نہیں۔ کہ وہ تمام و کمال آج ہی بتلائی جا سکے۔ پھر اس ادھورے علم پر عمل کرنا قرین مصلحت ہرگز

نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اغلباً خطرناک ہوگا +

(۲)۔ دو جیش۔ آج ایک صاحب کی رائے پڑھنے میں آئی۔ تو ممکن ہے۔ کہ کل دوسرے اور تیسرے شخص کی رائے سامنے آویں۔ کہ جو پہلی سے مختلف مگر بہتر ہوں۔ یا پہلی سے اُن میں کچھ عمدہ اضافہ ہو۔ اب اگر پہلی پر ہی عمل کر لیا گیا تو اختلاف رائے کے فائدہ اور اُن پر اپنی رائے قائم کرنے سے محروم رہجانا ضروری امر ہے۔ یہ بھی درست نہیں ہے +

ایک اور دلیل یہ پیش کی گئی ہے۔ کہ ہر ایک اثر کے درجے ہوتے ہیں کہ جو بتدریج گھٹتے گھٹتے زایل ہو جاتے ہیں۔ مگر جب مزید تحصیل ہو رہی ہو تو گھٹاؤ کیونکر ہوگا۔ کیا ضروری بات ہے کہ شروع سے ہی زوال شروع ہو جائے! نہیں بلکہ پیشتر ترقی اور کمال کا درجہ ہوتا ہے۔ بعدۂ تنزل ممکن ہے وہ بھی اُس حالت میں کہ جب کسی امر کا مطالعہ ترک کر دیا جاوے۔ طالب علم تو کسی علم کی ترقی پر ہوتا ہے نہ کہ فوراً علم حاصل کیا اور اس سے تارک بن بیٹھا۔ کیا عالم طالب علمی ہی میں مطالعہ کتب بند کر دیا جاتا ہے؟ اگر ایسا ہو تو وہ زمانہ فراغت ہوگا نہ کہ طالب علمی کا +

بیشک انگریزی تعلیم کا اثر ملکی یا قومی خدمت کے بار کو اپنے کندھوں پر لینا ہوا ہے۔ مگر طلبار کا فرض صرف اس سے باخبر ہو کر اُس پر عزم بالجزم کر لینا ہے نہ کہ اُسی وقت سے اُس پر عمل شروع کر دینا۔ مبادا ایسا کرنے سے تعلیم میں رخنہ پڑے +

جو بیجا اعتراض وائیس چانسلر صاحب کی بجا نصیحت پر کیا گیا ہے اُسکے ہاتھ صرف اس قدر کہا جاتا ہے کہ گو رہنمایان قوم کے پیرو کار لازمی طور پر تجربہ کار اور پختہ مغز نہ ہوتے ہوں۔ تاہم تحصیل علم جیسے ضروری کام سے فارغ البال نو

ہوتے ہیں اس لیئے ان کا پولیٹیکل کاموں میں شریک ہونا جائز اور طلبار
کا ناروا ہے۔ ہمارے لایق ہونہار مضمون نگار صاحب نے اس معقول
اعتراض کا جواب کہ" اگر طلبار پولیٹیکل سرگردانی میں رہے تو پڑھائی ہو چکی
یہ لکھا ہے کہ جو شخص وقت اور فرصت کا عذر پیش کرتے ہوئے خدا کی بندگی
نہیں کرتا۔ وہ روز قیامت کو کبھی بخشا نہیں جا سکتا اور چونکہ ملکی خدمت
خدا پرستی سے کسی طرح کم نہیں۔ تو وقت اور فرصت کا عذر کر کے ملکی بہتری
میں نہ شامل ہونیوالا کبھی قابل معافی نہیں ہو سکتا۔ میں اس کے جواب میں
یہ کہوں گا۔ کہ کیا تحصیل علم ملکی خدمت نہیں ہے؟ بلکہ اس سے بڑھ کر یہ خدا پرستی
کیا خدا شناسی ہے۔ جیسا کہ سعدی صاحب کا قول ہے۔ کہ

بے علم نتواں خدا را شناخت

اب جائے غور ہے کہ ایک طالب علم علمی مشاغل میں مصروف ہونیکے باعث
پولیٹیکل تحریک میں حصہ نہ لے تو اس کی مغفرت ہوگی یا نہیں؟ علاوہ اس کے
اگر اس کی عمر وفا کرے گی تو بعد تعلیم وہ ملکی کاموں میں بخوشی ہاتھ بٹائیگا ۔
اس کی ممانعت نہیں کی جاتی +

دراصل طلبار کو نہ تو پولیٹیکل رہنمائی کرنی چاہیئے اور نہ اس کام میں حصہ
لینا چاہیئے۔ بلکہ اُن کو اپنے والدین اور معلم پر اپنی خوراک اور پوشاک وغیرہ کے انتظامات
چھوڑ دینے چاہئیں۔ اب ان بزرگان کا کام ہے کہ وہ بدیشی چیز کو گھر میں آنے ہی
نہ دیں۔ اس حالت میں طالبعلم خودبخود سودیشی تحریک پر چلیگا۔ بفرض محال اگر وہ
بدیشی چیز کی خواہش ظاہر کرے تو والد۔ والدہ یا معلم کا فرض ہے کہ اُسے پراثر الفاظ
میں نصیحت کریں۔ کہ ایک طالب علم کو خواہشات سے مبرا ہونا چاہیئے اور سعادتمند
لڑکے لڑکی کو اپنے بڑوں اور اُستاد کا تابع فرمان۔ ورنہ ــــ ٥

جن مانی نہ بڑوں کی سیکھ
اُن مانگی لے کھپر بھیک

اس حالت میں اگر کوئی صاحب طلبا سے سوال کریں کہ تم دیسی پوشاک پہنتے ہو اس لئے پولیٹکل تحریک میں شامل اور گورنمنٹ کے خلاف ہو تو وہ معقول جواب دے سکتے ہیں۔ کہ اُن کی پوشش وغیرہ اُن کے بزرگوں کی مرضی پر منحصر ہے۔ لہٰذا اس میں بُرائی بھلائی کے ذمہ وار وہ ہیں۔ نہ کہ ہم +

تعلیم کے بارہ میں بھی طلبا کو کچھ بھی نہ کہنا چاہئے۔ بلکہ سب کچھ اپنے سرپرستوں پر چھوڑ دینا لازم ہے۔ کیونکہ خود مضمون نویس صاحب رہنمائی اور تجاویز کا پیش کرنا طلبا کا کام نہیں بتلاتے ہیں۔ تعجب ہے کہ ایسا خیال رکھتے ہوئے ہمارے طالب علم مضمون نویس صاحب خود تجویز کیوں پیش کرتے ہیں +

آخر میں چونکہ مضمون نگار صاحب ہندو معلوم ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اُن کی تحریر اور فرضی نام سے روشن ہے۔ لہٰذا ہم رشیوں کے زمانہ کی رسم تعلیم کا ذکر کرینگے کہ جو زمانہ بیداری تھا۔ پرانی کتب (منوسمرتی وغیرہ) اور مذہب ہنود کے واقف کاران سے معلوم ہو سکتا ہے کہ بچپن میں اولاد کی تربیت زیادہ تر والدہ پر اور کسی قدر والد پر منحصر تھی۔ بعدہٗ بغرض حصول تعلیم گھر سے باہر درویشانہ صورت میں اُستاد (گرو) کے یہاں بھیجدیا جاتا تھا۔ کہ خانہ داری کے ہر کام سے الگ اور معلم کی مرضی پہ کام کرے۔ زمین پر سووے۔ بال نہ بنا وے۔ بہت تھوڑے اور ضروری سادہ کپڑے پہنے۔ اور معمولی غذا کھا وے۔ نیز خودی کو مارنے کی غرض سے اُس کا فرض تھا کہ آبادی سے (بھکشا) مانگ لایا کرے +

اب ناظرین خود سمجھ لیں گے کہ طلبا کو پولیٹکل باتوں میں دلچسپی لینا چاہئے نہیں ہم منشی روشن رائے صاحب کے جواب کے منتظر ہیں +

ماہ گذشتہ

عجب دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد
وگر دم درکشم ترسم کہ مغزِ استخواں سوزد

سال گذشتہ مصائب کا سال تھا اگرچہ اطمینان کی صورت اسکے اختتام کے زمانہ میں پیدا ہوگئی تھی اس سے امید کی جاتی تھی کہ سال حال امن و راحت کا سال ہوگا غریب ہندوستانی مصائب کا مقابلہ کرتے کرتے تھک گئے تھے اور ان میں کسی نئی آفت کا مقابلہ کرنے کی سکت نہ رہی تھی مگر قدرت کا امتحان آسان نہیں جو لوگ اس امتحان میں پورے اترتے ہیں ان پر زمانہ کی کوئی تبدیلی اثر نہیں کرسکتی اسلئے ہم سمجھتے ہیں کہ ہندوستانیوں کو ان مصائب کا ہمت اور استقلال سے مقابلہ کرنا چاہیے کیونکہ ان مصائب کے پردہ میں انکی کامیابی ہے۔

سال کا آغاز ہوتے ہی قحط کا سامنا ہوا۔ بھوکوں مرنے کیلئے ڈیڑھ ہاتھ کا کلیجہ چاہیے۔ مگر ہندوستانی اسے بھی کھیل سمجھتے ہیں اور لنگوٹی میں پھاگ کھیلنا انہیں خوب آتا ہے جس کشادہ پیشانی سے انہوں نے اس طوفان مصیبت کا مقابلہ کیا اور کررہے ہیں وہ انکے استقلال اور ہمت کا کافی ثبوت ہے مگر کیا اس برداشت اور تحمل کا یہ نتیجہ ہونا چاہیے کہ ان پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ کیا اس انکساری کا یہ نتیجہ ہونا چاہیے کہ انہیں کچل ڈالنے کی کوشش کی جائے۔ کیا اس فاقہ کشی میں یہ امداد ہونی چاہیے کہ صحرا کے تنکے جنہیں انہوں نے اپنے گرد اسلئے جمع کرلیا ہے کہ جیتے جی ہی کھال میں بھوسہ بھرلیں چھین لیے جائیں۔ صاف سخت سے سخت دل بھی یہ گوارا نہیں کریگا۔ مگر رحم اور انصاف کمزور لوگوں کیلئے نہیں ہے۔ قانون قدرت طاقت ہے اور اسلئے کسی کمزور کو زمانہ کی سختیوں کی شکایت نہیں کرنی چاہیے۔ انقلاب کی تصویر ہندوستانیوں غریب ہندوستانیوں کا شکستہ پہلو میں دل کی

بجائے ایک پتھر کی سل ہوتی تاکہ تم میں احساس مصیبت نہ ہوتا +

ہمارا مضمون ابتک ایک معمہ ہے جس کا حل نہایت رنج دہ اور افسردہ کر دینے والا ہے مگر کیا ہماری خاموشی ہماری تکلیفوں کو کم کر دیگی ؟ ضمیر اسکا جواب نفی میں دیتا ہے اگر ایسا ہوتا تو جو کوششیں حکام کی طرف سے ہماری آواز کو بند کرنے کیلئے کی گئیں وہ ضرور کامیاب ثابت ہوتیں مگر ہم دیکھتے ہیں کہ جس قدر ہماری آواز کو دبایا گیا اسی قدر مصائب بڑھتی گئیں جن دنوں پنجاب میں پنجابی کا مقدمہ ہونیکے بعد بغاوت کے جھلاوے کو ٹھیوں کے گرد اپنی ڈراونی صورتیں بنا بنا کر دکھا رہے تھے اور انکے مقابلہ کیلئے سنگین تیاریاں کی جا رہی تھیں تو یہ ایک عام خیال تھا کہ اگر یہ غلط فہمیاں دور ہو گئیں اور نتیجہ تسلی بخش ہوا تو آیندہ یہ ناگوار صورت پیدا نہ ہوگی۔ گورنمنٹ انگلشیہ جو غیر معمولی طور پر دوراندیش کہلاتی ہو اس تجربہ سے فائدہ اٹھائیگی مگر نتیجہ کیا ہوا وہی بےچینی چاروں طرف پھیلی ہوئی ہو اور اب اس بےچینی کا حلقہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ ڈر ہے کہ کہیں ہندوستان سے باہر بھی اسکا اثر نہ پھیلے +

ایک زمانہ تھا کہ ہندوستانی خودغرض تھے یا یوں کہئے کہ انکے طرز معاشرت نے انہیں ایک دوسرے سے اس قدر دور رکھا تھا کہ ان میں ایک دوسرے کی مصائب میں شریک ہونیکا دستور نہ تھا۔ وہ خیال کرتے تھے کہ انسانی فرض صرف یہی ہے کہ اپنی اور اپنے بال بچوں اور زیادہ سے زیادہ اپنے رشتہ داروں کی محافظت کرے اور انکے دکھ درد کا شریک ہو۔ اگر ان کا اپنا صوبہ آرام سے بسر کرتا تھا تو وہ تمام ہندوستان کو خوشحال سمجھتے تھے شاید موجودہ ادبار اسی غفلت کا نتیجہ ہو۔ زمانہ نے اپنا ورق پلٹا اور اب وہ وقت ہے کہ اگر ملک کے ایک گوشہ میں ایک فرد واحد بھی تکلیف محسوس کرتا ہے تو تمام ملک اسکے لئے بےچین و بیقرار نظر آتا ہے یہ آثار بیداری ہیں جسکے لئے ہم انگریزی تعلیم و تہذیب کے شکرگذار ہیں مگر کیا اس تہذیب و ترقی کی غرض یہ تھی کہ ہم آزادی کی برکتوں سے آشنا ہو کر جبر اور سختی کی قیود کو زیادہ رنج سے محسوس کریں اور وہ تہذیب و ترقی جسے ہم برکت سمجھتے تھے ہمارے لئے آفت ثابت ہو ؟ ہرگز نہیں ہمیں انگریزی عدل و انصاف

پر بھروسہ ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ تمام تکلیفیں یا تو بعض ناعاقبت اندیش حکام کی غلطیوں کا نتیجہ ہیں یا گورنمنٹ اس غلطی کی مرتکب ہو رہی ہے جسکا انسان سے ہو جانا کوئی تعجب خیز بات نہیں مگر افسوس اس وقت ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ تجربے سے فائدہ نہیں اُٹھایا جاتا اور جو غلطی ایک مرتبہ کی جاتی ہے بجائے اُسکی تلافی کے اسی کو بار بار دُہرایا جاتا ہے اور اگر ہم اس کیلئے آواز بلند کرتے ہیں تو وہ بغاوت خیال کی جاتی ہے جب واقعات کی یہ صورت ہو تو آخر اسے کوئی کیا سمجھے؟

پنجاب میں جس بغاوت کا اندیشہ تھا وہ غلط ثابت ہوا واقعات کچھ اس طرح روشنی میں آئے کہ ایک تجربہ کار مدبر سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ ان واقعات سے سبق حاصل کرے اور آئندہ ایسی غلطی اس سے نہ ہونے پائے اور یہ امید گورنمنٹ انگلشیہ سے اسکے سابقہ طریق سلطنت پر بھروسہ رکھتے ہوئے رکھنا کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ ان حالات کی روشنی میں تناولی کے بلوے کے واقعات غیر معمولی طور پر افسوسناک نظر آئینگے +

جب ہم بلوے کی وجوہات معلوم کرتے ہیں تو ہمیں سخت افسوس ہوتا ہے اور ہم تعجب کرتے ہیں کہ قوم پرست انگریزوں سے ایسی غلطی کیونکر ظہور میں آسکتی ہے اور انکا ایسا کرنا آیا غلطی کہا بھی جا سکتا ہے یا ہم یہ سمجھ لیں کہ دیدہ دانستہ ایسا کیا گیا تفصیل واقعات تو ناظرین تک اخبارات کے ذریعہ پہنچ چکی ہوگی اور انہیں معلوم ہو گیا ہوگا کہ بنائے فساد سودیشی اور انگریزی جہاز ران کمپنیوں کا تجارتی جھگڑا تھا ہر ایک عقلمند شخص جب یہ وجہ معلوم کرتا ہے تو حیران ہوتا ہے کہ گورنمنٹ کا اس تجارتی مقابلہ میں دخل دینا کیا معنے رکھتا تھا۔ اگر قومی محبت نے جوش کیا اور ان کی حمایت قومی حمیت کیلئے ضروری سمجھی گئی تو پھر ہندوستانی اسکے لئے کیوں قصوروار ٹھیرائے جاتے ہیں کیا انکے پہلو میں انسانی دل نہیں ہے؟ کیا وہ دنیا میں پائمال کرنے کیلئے پیدا کئے گئے ہیں؟ ہم جانتے ہیں کہ یہ جو کچھ ہوا غیر ذمہ دار حکام کی طرف سے ہوا۔ اس کیلئے ہم گورنمنٹ کو صرف اس قدر قصوروار جانتے ہیں کہ وہ ایسے لوگوں کے سپرد سلطنت کا مشکل کام کر دیتی ہے جو ذرا ذرا سی باتوں پر تعصب سے مغلوب کر دئے جاتے ہیں اور اپنے طرز سلطنت سے ناحق گورنمنٹ کو بدنام کرتے ہیں +

بنائے فساد صرف یہ بیان کی جاتی ہے کہ سودیشی جہاز ران کمپنی کی موجودگی سے انگریزی کمپنی کو نقصان پہنچا تھا۔ سودیشی کمپنی والے اپنے ہموطنوں میں ہر طرح سے یہ کوشش کرتے تھے کہ وہ انکے جہاز پر سوار ہوں۔ اور اس کیلئے تقریر کا سلسلہ بھی جاری تھا انگریزی کمپنی کی طرف سے کوشش کی گئی کہ اس کمپنی کو نقصان پہنچایا جائے اور اسکے مالکوں کو تکلیف دی جائے تاکہ وہ اپنے اہل وطن میں اپنی کمپنی کی سرپرستی کی تحریک کر سکیں اور اس طرح انکی کمپنی منافع میں رہے۔ تقریر کو ذریعہ بغاوت بتانا ایک معمولی بات ہے اور اہل پنجاب کے لئے اس کی تشریح کی ضرورت نہیں کیونکہ انہیں کافی سے زیادہ تجربہ ہو چکا ہے کہ کیونکر کوئی تقریر بغاوت کا اعلان ٹھیرائی جا سکتی ہے +

تجارتی مقابلہ کوئی نئی بات نہیں ہر ملک میں یہ موجود ہے اور مختلف سوداگر اپنے کاروبار کی ترقی کیلئے مختلف طریقہ عمل میں لاتے ہیں۔ ہمیں ایک واقعہ یاد ہے کہ ولایت میں ایک ستیہ ایک دوائی فروش اور درزی کا جن کی دوکانیں بالمقابل تھیں کسی وجہ سے جھگڑا ہو گیا۔ دوائی فروش نے طاقت کی دوائی کا اشتہار نہایت تکلف سے شایع کیا اور اسے دعوے تھا کہ اسکی دوائی نہایت زود اثر اور اکسیر ہے۔ درزی نے محض اس دوائی فروش کو چھیڑنے کیلئے فوراً ایک اشتہار کفن کے عنوان سے شایع کر دیا اور بیان کیا کہ اسکے یہاں کفن نہایت اچھے تیار ہوتے ہیں اور خصوصاً ان لوگوں کیلئے زیادہ موزوں ہیں جو کمزوری کی بیماری سے مرتے ہیں صرف اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ اپنی دکان کے سامنے ایک کفن بھی لٹکا دیا جس پر لکھا تھا "پھر مجھے خریدو"۔ دوائی فروش کی دوکان پر لکھا تھا۔ "طاقت کی دوائی خریدو" اب اس سے زیادہ صدمہ پہنچانیوالا مقابلہ کونسا ہو سکتا ہے دوائی فروش کہتا ہے "طاقت کی دوائی خریدو" اور درزی کہتا ہے کہ "پھر کفن خریدو" یعنی دوائی کھاتے ہی تمہیں کفن کی ضرورت ہوگی مگر کیا اس تجارتی چھیڑ چھاڑ کا یہ نتیجہ ہوا تھا کہ گورنمنٹ نے درزی یا دوائی فروش کا گلا دبایا ہو؟ ہرگز نہیں بلکہ کچھ عرصہ بعد ان میں کسی طرح خود صلح ہو گئی تھی یہ تو ایک ایسا مقابلہ تھا جس میں مقابلہ کرنیوالے ہم پیشہ نہ تھے۔ ہم پیشہ لوگوں میں ہمیشہ ہی ایسا نیکی کوشش ہوتی ہے اور یہ بات ضرور تعجب خیز ہے کہ گورنمنٹ ان تجارتی مقابلوں میں بھی محض اس لئے دخل اندازی کرے

کہ ان میں سے ایک فریق ان کا ہم قوم ہے ✤

ہندوستانی اور انگریزی تجارت کا مقابلہ ہی کیا۔ کہاں وہ تجارت جو آج ایک عظیم الشان
سلطنت کی بنیاد ہے اور کہاں وہ تجارت کہ جسکا آغاز پچاس برس کی تحریک کے بعد ہوا ہے اور اس کی
سرپرستی کیلئے ملک کو متوجہ کرنیکی ضرورت ہے۔ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہ ہوگی جسے اپنے بھلے برے
کی تمیز نہ ہو مثل مشہور ہے "دیوانہ بکار خویش ہشیار" مگر ہندوستانی ہیں کہ انہیں اس معمولی حمیت
ملکی کیلئے بھی تحریک کی ضرورت ہے ایسی کمزور کوششوں کو پامال کرنیکی کوشش کرنا انگریز تاجروں
کے شایان شان نہیں اور گورنمنٹ کا اس میں دخل اندازی کرنا سخت افسوسناک ہے تناولی کے فساد کا
نتیجہ خواہ ایسا دردناک ہو جیسا کہ یہ حادثہ ہے مگر ان چار بندگان خدا کا خون کس کی گردن پر ہوگا
جو پولیس کی بندوق پر قربان کئے گئے۔ کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ ان نا عاقبت اندیش حکام کو
جن کی غلطیوں اور تعصب کی بدولت یہ حادثہ وقوع میں آیا عبرتناک سزائیں دیجائیں تاکہ دوسرے
اس سے سبق حاصل کریں؟ مگر ایسا نہیں ہوگا کیونکہ وہ فرمانروا قوم میں سے ہیں اور انکی ہر ایک غلطی نظرانداز کرنیکے قابل ہے
اگر اس فساد اور خون پر بھی آیندہ اچھی صورت ہوجائے اور حکام اس تجربہ سے اپنے طرز عمل میں
تبدیلی کرلیں تو سمجھنا چاہیئے کہ کوئی بڑا نقصان نہیں ہوا۔ ہم ان چار بیگناہوں کے خون کو بھی بھول
جائینگے۔ فاقوں مرتے ہوئے ہندوستانیوں کی امداد نہیں کی جاتی تو کم از کم ان کی کوششوں کو
تو نہ کچلا جائے جو وہ اپنی زندگی کیلئے کر رہے ہیں فاقہ کشوں سے روٹی چھین لینا حد درجہ کی سختی ہوگی۔
جسکی توقع ایک عادل گورنمنٹ سے نہیں کیجاسکتی۔ جاہل سے جاہل بھی پیٹ پالنے کی کوشش کرتا ہے
اور جو شخص اسے بھوکوں مارنا چاہتا ہے اسے وہ حقارت سے دیکھتا ہے تناولی کے بلوے میں گورنمنٹ
کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ زیادہ تر غیر تعلیم یافتہ لوگ شامل تھے اور وہ بھی محسوس کرتے تھے کہ
ہماری تجارت کو اگر نقصان پہنچا تو ہمیں روکھی سوکھی سے بھی جواب ملیگا اور اسلئے وہ یا تو وہ تنہا ان سے
مقابلہ کیلئے نکل پڑے مگر کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا۔ ان کا مقابلہ گورنمنٹ کے مقابلہ میں کیا ہوسکتا
تھا اسلئے اگر حکام تناولی بلوہ میں اپنی فتح سمجھیں تو وہ پورے طور پر اسکے مستحق ہیں لیکن اس قسم کی فتح

امن قائم نہیں رکھ سکتے جو نئی تہذیب و ترقی کی سلطنت کے لئے ضروری ہے گورنمنٹ کو اس ضروری معاملہ پر ایک غائر نظر ڈالنی چاہیئے اور اس بے چینی کے رفع کرنیکی بہت جلد کوشش کرنی چاہئے کیونکہ رعایا کی بے چینی سلطنت کو کمزور بناتی ہے اور ان کا اطمینان سلطنت کے استحکام اور ترقی کا ذریعہ ہے اطمینان کیلئے محبت کی ضرورت ہے اور محبت محبت سے پیدا ہوتی ہے نہ کہ نفرت سے ع

لطف کن لطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش

یہ عجیب اتفاق ہے کہ کانگریس کا پہلا دور ختم ہوتے ہی اُس شخص کی زندگی کا خاتمہ ہوا جسے کانگریس کا سب سے بڑا مخالف کہنا غلطی نہیں اور جسکے عہد میں کانگریس قایم کی گئی۔ کیا قدرت نے یہ ضروری سمجھا کہ کانگریس میں اختلافات کا خاتمہ ہوتے ہی سر آکلینڈ کالون ممالک متحدہ کے لفٹنٹ گورنر بلسیں جو کانگریس کو ایک باغی گروہ خیال کرتے تھے اور مسلمانوں کو ہمیشہ اس سے علیحدہ رہنے کی ہدایت کرتے تھے۔ جس زمانہ میں کانگریس کا آغاز ہوا اس وقت شاید آپ کا یہ خیال وقعت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہو مگر اب جبکہ کانگریس کا کام بخوبی روشنی میں آچکا ہے اور پورانی وضع کے وہ لوگ بھی جو ؎

خلاف رائے سلطاں رائے جستن   بخونِ خویش باید دست شستن

کے قائل تھے اپنے حقوق کی محافظت کیلئے ایک قومی انجمن کی ضرورت کو محسوس کرنے لگے ہیں اور خود مسلمانوں میں بھی اس قسم کی ایک انجمن قائم ہو گئی ہے یہ چال تفرقہ اندازی کی چال سمجھی گئی ہے اور وہ لوگ جو ذرا بھی کسی معاملہ پر غور کرنا چاہتے ہیں اور تعصب کے جوش میں بے سوچے سمجھے کسی معاملہ پر رائے نہیں دیا کرتے سمجھ گئے ہونگے کہ صاحب مرحوم کا نمبر شاید ان لوگوں میں اول ہوگا جو ہندوستان پر کامیابی سے حکومت کرنے کیلئے یہاں کی مختلف قوموں کا نفاق ضروری سمجھتے ہیں اگر مرحوم دوست کا خیال نیک نیتی پر مبنی تھا تو اُنہوں نے ضرور مسلم لیگ کو بھی شک کی نظر سے دیکھا ہوگا کیونکہ کانگریس اور مسلم لیگ کے مقاصد میں کچھ فرق نظر نہیں آتا۔ بہرحال ان کی وفات ہمارے لئے باعث رنج ہے کیونکہ ایک تلخ مخالفت کا بیان کا راز ہے دوسرے مرحوم سید مرحوم کی نشانی تھے یہ آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ سید کانگریس کے سرگرم حامی ہوتے ہوئے کانگریس کے مخالف بن گئے اور اس طرح دو ہمسایہ قوموں میں ایک ایسے نفاق کا بیج بویا گیا جسکے کرشمے ہم آجتک دیکھ رہے ہیں اور جسنے یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں کہ ہماری ترقی کو ایک صدی پیچھے پھینک دیا +

اگر مرحوم صاحب بہادر یہ سمجھتے کہ تعصب دل رکھتے تھے تو فرد کانگریس کے مداح ہونگے یہ اور بات ہے کہ بات نباہنے کیلئے خیالات کی تبدیلی ظاہر نہ کی جاسکے اور انہیں افسوس ہوگا کہ اُنھوں نے سرسید ایسے پرجوش فدائے ملک و قوم کی کوششوں کو ایک مفید کام سے باز رکھا اور عجب نہیں کہ جنت میں جب سید سے ملاقات ہو تو وہ اپنی غلطی کو تسلیم کریں اور سید کی روح ہماری ہمسایہ قوم کی رہنمائی کرے کیونکہ اس میں ان کی اپنی بھلائی ہے +

ممیرے کا سرمہ

پانچہزار روپیہ انعام — پانچہزار روپیہ انعام

مصدقہ جناب اسسٹنٹ کیمیکل اگزامینر صاحب بہادر گورنمنٹ پنجاب

معزز انگریزوں میڈیکل کالج کے پروفیسروں نامور ڈاکٹروں و الیان ریاست
اور ولایت کی یونیورسٹی کے سندیافتہ یورپین ڈاکٹروں نے بعد تجربہ اس سرمہ کی تصدیق
فرمائی ہے کہ یہ سرمہ امراض ذیل کیلئے اکسیر ہے ضعف بصارت تاریکی چشم ۔ دھند ۔ جالا ۔
پڑوال ۔ غبار ۔ پھولا ۔ سبل ۔ سرخی ۔ ابتدائی موتیا بند ۔ پانی جانا ۔ خارش وغیرہ معزز ڈاکٹر
اور حکیم بجائے اور ادویہ کے آنکھوں کے مریضوں پر اس سرمہ کا استعمال کرتے ہیں چند روز کے
بعد بینائی بہت بڑھ جاتی ہے اور عینک کی بھی حاجت نہیں رہتی قیمت فی تولہ جو سال بھر
کیلئے کافی ہے مبلغ دو روپے ممیرے کا سرمہ سفید سرمہ اعلیٰ قسم فی تولہ مبلغ تین روپیہ خالص ممیرہ
فی ماشہ مبلغ بیس روپیہ مصری سرمہ فی تولہ ۴ر خرچ ڈاک بذمہ خریدار +

المشتہر پروفیسر میا سنگھ اہلوو الیہ مقام بٹالہ ضلع گورداسپور

اس سے بڑھکر اور کیا شہادت ہوسکتی ہے

(۱) میں نے اور میرے بہت سے دوست متعلقین نے ممیرے کا سرمہ جوکہ سردار
میا سنگھ اہلووالیہ نے تیار کیا ہے استعمال کیا نہایت ہی مفید پایا آنکھوں کی بیماریوں کیلئے
اکسیر کا حکم رکھتا ہے آنکھوں کو تر و تازہ رکھتا ہے بینائی کو طاقت بخشتا ہے
درحقیقت یہ سرمہ بینائی کو قائم رکھنے کیلئے ہی مفید اور زود اثر
ہے آجتک کبھی کوئی دوا اس سرمہ سے بہتر نہیں دیکھی + راقم
آنریبل نواب محمد حیات خان بہادر سی ایس آئی ڈی ای
ایس سابق ڈویژنل ڈسٹرکٹ جج قسمت جالندھر ممبر کونسل گورنر جنرل ہند

(۲) میں نے ممیرے کا سرمہ جوکہ سردار میا سنگھ نے تیار کیا ہے
ان مریضوں پر جنکی آنکھیں بہت کمزور اور بیمار تھیں استعمال کیا مفید پایا
میری رائے میں خاصکر ان مریضوں کیواسطے جنکی آنکھوں سے پانی جاری رہتا
ہے اور دھند اور غبار اور کمزوری نظر ہو یہ سرمہ نہایت مفید ہے +
راقم ڈاکٹر برج لعل گھوش رائے بہادر ایل ایم ایس اسسٹنٹ
سرجن پروفیسر میڈیکل کالج لاہور حال آنریری سرجن گورنر جنرل ہند

انعام پانچہزار روپیہ اگر کوئی ممیرے کے سرمہ کی سندات میں سے جوکہ قریب بیس ہزار کے ہیں ایک کو بھی فرضی ثابت کردے تو اسکو پانچہزار روپیہ انعام دیا جائیگا جو لاہور کے پنجاب بنک میں اسی مطلب کیلئے مارچ ۱۹۰۲ء میں جمع کیا گیا ہے

نئی صدی کی نئی تصنیف

اردو شاعروں کا بسیط اور جامع تذکرہ

یہ سب کو معلوم ہے کہ وقتاً فوقتاً اردو زبان کے شاعروں کے تذکرے لکھے جاتے رہے
ہیں جن میں شعرا کا کچھ کلام اور کچھ حال درج ہے۔ مگر جتنے تذکرے اس وقت تک نکلے
وہ تقریباً سب اپنی خاص وضع کے تھے۔ ان میں سے ایسا کوئی نہ تھا کہ اردو شاعروں کے
انسائیکلوپیڈیا کا کام دے سکے۔ کہیں صرف انتخاب دواوین پر زور تھا کسی میں مدح سرائی
یا ہجو سے کام لیا گیا تھا۔ کوئی تذکرہ محض خاص حیثیت کے شعرا سے مخصوص تھا۔ کوئی
خاص شہر سے منسوب تھا۔ اردو شاعری کے شائقین کو لالہ سری رام صاحب ایم۔ اے
مصنف دہلی مقیم لاہور کا مشکور ہونا چاہیئے کہ انہوں نے اس اہم ضرورت کو پورا کیا اور ۱۲
برس کی محنت شاقہ اور صرف کثیر سے ایک جامع اور بسیط تذکرہ اردو شعرا کا تالیف فرمایا
جو شعرا کی کثیر تعداد۔ انکے حالات اور سوانح عمری کے مندرجہ حال کی تکمیل مختلف اصناف
کلام کے باذاق انتخاب طرز کلام پر بصیرانہ تنقید اور دیگر اوصاف میں اپنی نظیر آپ ہے یہ
تذکرہ ۲۹+۲۲ تقطیع کے قریباً تین ہزار صفحوں پر ختم ہوتا ہے بالفعل تذکرہ ہزار داستان
یا خمخانہ جاوید کی اول جلد جو الف سے بانک ردیفوں پر مشتمل ہے طیار ہوا چاہتا ہے صرف چند
جز چھپنے باقی ہیں کاغذ نہایت عمدہ اور لکھائی چھپائی اول درجہ کی ہے جلد بھی نہایت نفیس ہے
درخواستیں ابھی دھڑا دھڑ آ رہی ہیں خوف ہے کہ شائقین ناکام نہ رہ جائیں اس لئے اعلان کیا
جاتا ہے کہ جو صاحبان مذاق اس تذکرہ کو خریدنا چاہیں وہ صاحب مولف کے پاس بہت جلد
درخواست خریداری بھیج دیں ایسا نہ ہو کہ سستی سے مایوسی اٹھانی پڑے قیمت کاغذ اول مبلغ صہ
قسم دوم للعہ دونوں قسم کے خریداروں کو مجلد کتابیں دی جائیں گی محصولڈاک علاوہ +

کہتی ہے ہم کو خلق خدا غائبانہ کیا

آریہ سماچار کانپور - آزاد پنجاب کا باتصویر رسالہ فی الحقیقت ایک ممتاز پولیٹیکل رسالہ ہے اردو دان پبلک میں پولیٹیکل صحیح مذاق پیدا کرنیکی خواہش اور کوشش کیلئے آزاد کے لائق ایڈیٹر تحسین کے مستحق ہیں - آزاد ملکی مسایل پر آزادی سے لیکن متانت اور اعتدال کے پہلو سے بحث کرتا ہے اس کا دسمبر سنہ ۱۱ء کا نمبر جو کانگریس نمبر کے نام سے موسوم کیا گیا ہے قابل پڑھنے کے ہے - ڈاکٹر راش بہاری گھوش اور مسٹر واچا کی عکسی تصاویر اور کئی قابل قدر مضامین نظم و نثر سے اس نمبر کو زینت دی گئی ہے جائے اعزاز بجا طور پر فخر الملک لالہ لاجپت رائے صاحب کے مضمون افسانہ برہما کو دی گئی ہے جو اُن کی ایام جلا وطنی کی تصنیف ہے - اس مضمون میں نہایت دلکش پیرایہ میں برہما کی ابتدائی تاریخ اور اُس کی پولیٹیکل حالت کے انقلاب کا ذکر کیا گیا ہے - علاوہ اسکے اور بھی دلچسپ مضامین ہیں - بھائی پرمانند جی کا ہندوستانی طلبہ انگلینڈ میں اور منشی گنگا پرشاد صاحب ورما کا مضمون کانگریس کا مستقبل اور ایڈیٹوریل مضمون دلّی سنہ ۱۸۵۷ء کا رقیب خصوصیت سے قابل پڑھنے کے ہے ۔

آریہ مسافر جالندھر - آزاد تھوڑے ہی عرصہ میں رسالہ اپنے لائق اور پرشارتھی ایڈیٹر مہاشہ بشن سہائے جی کی انتھک کوششوں سے اس قابل ہو گیا ہے کہ بلا مبالغہ اسکا شمار اُن گنتی کے مخزنوں میں ہو سکتا ہے جو کہ اردو دان پولیٹیکل دنیا میں خاص وقعت اور قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں آزاد نام کا ہی آزاد نہیں بلکہ اُس کی سپرٹ بھی آزادانہ معلوم ہوتی ہے - دسمبر سنہ ۱۹ء کا نمبر معلوم ہوتا ہے کہ خاص تیاری سے نکالا گیا ہے کیونکہ علاوہ لکھائی چھپائی کی نفاست اور ضخامت بجائے ۸۰ صفحوں کے ۱۱۰ صفحہ کی ہونیکے مضامین کی عمدگی و ترتیب کے لحاظ سے بھی ہماری رائے میں یہ نمبر سابقہ سب نمبروں سے بڑھ چڑھ کر نکلا ہے تو سبھی مضامین لائق و نائق پولیٹیکل و دیگر قابل مضمون نگاروں کے پر زور قلم سے نکلے ہوئے ہیں لیکن سب سے پہلا مضمون افسانہ برہما جو لالہ لاجپت رائے جی نے اپنے ایام جلاوطنی میں مانڈلے قید کے عالم میں بیٹھ کر لکھا تھا بڑا ہی سبق آموز اور عبرت انگیز ہے ۔

تاجروں کو مژدہ!

نرخ نامہ اُجرت طبع اشتہار آزاد لاہور

اگرچہ جو اجرت اشتہار اب تک سوداگر صاحبان سے چارج کی جاتی رہی ہے وہ زیادہ نہ تھی لیکن اب بعض تاجروں کے اصرار سے اس میں مناسب تخفیف کے ساتھ نرخ نامہ پیش کرکے عرض کرتے ہیں کہ اب رعایت کی درخواست نہ کریں کیونکہ یہ عمدہ درجہ کی رعایت ہے +

جگہ	سالانہ	ششماہی	سہ ماہی
صفحہ	صعہ (۴۵)	عہ (۱۳)	مہ (۷)
نصف صفحہ	عہ (۱۳)	مہ (۷)	للعہ (۴)
چوتھائی صفحہ	مہ (۷)	للعہ (۴)	۸ عکر (۲۰)

متفرق۔ بحساب دو آنہ فی سطر فی اشاعت کے حساب سے درج ہونگے +

نوٹ ۱۔ سرورق پر اشتہار دینے کی صورت میں دس فیصدی زیادہ اُجرت لیجائیگی +

نوٹ ۲ ریپر (لفافہ کی پشت جس میں آزاد بند ہوکر روانہ ہوتا ہے) سالانہ ششماہی ۔ سہ ماہی بالترتیب عہ ۳۰ ۔ عہ ۱۲ اور مہ روپیہ +

المشتہر

منیجر رسالہ آزاد لاہور

تمام ہندوستان بھر میں صرف

دیش اپکارک ہی

ایک ایسا طبی اخبار ہے جو
ہفتہ وار چھپتا ہے اور سب سے زیادہ
چھپتا ہے قیمت سالانہ ہے شاہی عہ
سہ ماہی ۱۲ نمونہ مفت ملتا ہے اگر آپنے
ابھی تک نہیں دیکھا تو ایک کارڈ
لکھ دیجئے تو یہ بھی بھیجا جاویگا۔

اے ضعف و دیگر امراض کے مریضو!

اگر تم مختلف علاج کرا کے مایوس بھی ہو چکے ہو۔ تو
بھی تم مجھ کو صرف ایک کارڈ لکھو میں تم کو وہ وہ
نصیحتیں کروں گا اور نسخے بتاؤں گا کہ تم پھر سے
مرد تندرست اور جوان بن سکو گے!

(صرف نام مرض اور اپنا نام اور
مفصل پتہ خوشخط لکھ دیں)

خط وکتابت و تار کا پتہ "امرت دھارا" لاہور

ٹھاکر دت شرما وید مالک "دیش اپکارک" کارخانہ امرت دھارا و چوک متی لاہور

اگر

آپنے رسالہ "آب حیات"
(رجسٹرڈ) جو امرت دھارا
(رجسٹرڈ) کی تعریف میں
ہے ابھی تک نہ
دیکھا ہو تو اسکے
بھیجنے کے واسطے
بھی لکھ دیجئے گا!

ملنے کا پتہ

William Wilson & Son
25 A.B. Church St London E.C.

یوروپین ایجنسی

(قایم شدہ ۱۳۱۴ء)

ہر قسم کی برطانی اور یوروپ کے دیگر ممالک کی اشیا کی فرمایش نہایت ارزاں نقد قیمت پر جلد تعمیل ہوتی ہے جس میں ذیل کی اشیا شامل ہیں :-

بوٹ جوتے اور چمڑہ کیمیائی اور ہر قسم کی ادویات کمی اور کانچ کے برتن سائیکلیں - موٹر گاڑیاں اور ان کے کل پرزے ہر قسم کے کپڑے ٹوپیاں اور پیوند کاری کے اسباب اپٹی سامان عطریات کاغذ قلم دوات دھات کے ظروف کلیں اور دھات - جواہرات - برتن اور گھڑیاں مصوری اور عینک سازی کے سامان کھانے کی چیزوں اور روغن کشی کے ذخیرے وغیرہ وغیرہ کمیشن دو روپیہ سیکڑہ سے پانچ روپیہ سیکڑہ تک تجارتی کمیشن بھی لیا جاتا ہے - اصلی بیجک یا سیاہہ بھی مہیا کیا جاتا ہے خاص قیمت یا سات درخواست پر بھیجے جاتے ہیں نمونہ کے بکس ۱۰ پونڈ سے زاید کے روانہ ہونگے معاملہ طے ہو جانے پر اور چیزیں بھی فروخت کر سکتے ہیں +

لنڈن ڈائرکٹری

سالانہ شایع ہوتی ہے

ساری دنیا کے سوداگروں سے ہر قسم کے اسباب کے لئے انگریزی دستکار اور بیوپاریوں سے براہ راست تعلق پیدا کرنیکا ایک اچھا ذریعہ ہے لنڈن اور اسکے آس پاس کی کافی تجارتی معلومات کے علاوہ اس میں ایک فہرست غیر ممالک سے بیوپار کرنیوالے تاجروں کی مع ان اشیا کے جو وہ جہازوں میں بھیجتے ہیں اور ان نوآبادی بیرونی بازاروں کے جہاں انکی اشیا پہنچتی ہیں مع فانی جہاز کی راہ بقید ان بندروں کے جہاں سے وہ گذرتے ہیں انکی رفتار کا ایک صحیح اندازہ بھی دیا ہوا ہے صوبوں کے مشہور دستکار اور بیوپاریوں وغیرہ کی تجارتی نوشتہ جس ممالک متحدہ کے خاص خاص صوبوں کے مقامات اور تجارتی مرکزوں سے متعلق ہے ایک نسخہ اس ڈائرکٹری کا جو حال ہی میں شایع ہوا ہے بیس شلنگ بذریعہ ڈاک ادا ہونے پر محصول بھی ادا کر دیا جائیگا بیوپاری جنکو ایجنٹوں کی انائیونکی تلاش ہی اپنے تجارتی کارڈ ایک پونڈ (۱۵ روپیہ) دیکر اور بڑے اشتہارات ۳ پونڈ (۴۵ روپیہ) دیکر شایع کرا سکتے ہیں +

پولیٹیکل لٹریچر

ہندوستان میں آثار بیداری کے ساتھ یہ ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ ایسا پولیٹیکل لٹریچر جو ملک میں صحیح جذبات اور جائز خواہشات پیدا کرنیوالا ہو ملک کے روبرو پیش کیا جائے۔ بہی خواہان ملک محسوس کر رہے ہیں کہ محض اسی لٹریچر کی کمی ہے کہ بعض اوقات ناتجربہ کار اور منزل سیاست کی دشواریوں سے ناواقف لوگ ملک کے لئے مصائب لاتے اور ہندوستان کی ترقی میں زیادہ الجھن ڈال دیتے ہیں۔ آزاد کی اشاعت کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے مگر اسکے ساتھ ساتھ ہم سمجھتے ہیں کہ ملک کو اس قسم کی تصنیفات کی ذاتی لائبریری کی ضرورت ہے انگریزی میں تو ایسی بہت سی کتابیں ملیں گی مگر اردو علم ادب ابھی تک ان سے محروم ہے اس اہم ضرورت کو محسوس کر کے ہم نے ایسی تصنیفات جو بامذاق محبان وطن کی الماریوں کی زینت اور انکی خدمت [illegible] ہونیکے لایق ہوں۔ [illegible] میں شائع کرنیکا ارادہ کیا ہے اس سلسلہ میں انگریزی تصنیفات کے تراجم کے علاوہ ملک کے نامور زمانہ شناس اہل قلم کی تصانیف بھی شائع کی جائیں گی اور ان کی اشاعت کا انتظام اچھے کاغذ صحت اور خوبصورتی کے ساتھ ہوگا۔ اس سلسلہ کا آغاز مشہور ہندو سر ہنری کوٹن کی لاجواب تصنیف

نیو انڈیا

کے ترجمہ سے ہوگا۔ اور آیندہ سے ہر ماہ کم از کم سو صفحہ کی ایسی ہی تصنیف ملک کے روبرو پیش کیجائیگی مگر اس سلسلہ کی کامیابی کے لئے پانچ سو ایسے محبان وطن کی ضرورت ہے جو اس سلسلہ کی مستقل خریداری منظور کریں ہم پیشگی قیمت نہیں مانگتے صرف بذریعہ منی آرڈر بھیجکر نام درج کرا دیجیے اور ہر ایک تصنیف آپکی خدمت میں بصیغہ ویلیو پے ایبل بھیجدی جائیں گی یہ کوشش کی جائیگی کہ سال کی چاروں تصنیفات کی قیمت کسی صورت میں للعہ سے زیادہ نہ ہو اس ارادہ کی کماحقہ تکمیل کیلیے محبان وطن کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔ نیاز مند لبھ سہائے آزاد مالک و ایڈیٹر

گذشتہ جلدیں

باوجود احتیاطاً غیر معمولی طور پر زیادہ جلدیں چھپوا لینے کے آزاد کے جنوری - فروری اور مارچ ۱۹۰۷ء کی ایک کاپی نہیں بچی - اور اہل ملک کی طرف سے برابر اب تک ان کی مانگ چلی آتی ہے - کیونکہ احباب مکمل فائل رکھنا چاہتے ہیں - اس تجربہ سے فائدہ اٹھا کر اپریل ۱۹۰۷ء سے اور بھی زاید کاپیاں چھپوائی گئیں جن کی متعدد جلدیں باقی ہیں - جو احباب آزاد کے جنم دن سے اس کا مکمل فائل رکھنا چاہتے ہیں وہ جلد درخواست کریں ورنہ پھر ہاتھ نہ آئیں گی - جنوری - فروری اور مارچ ۱۹۰۷ء کے پرچوں کا بھی دوسرا ایڈیشن پانچ سو درخواستوں کے جمع ہو جانے پر تیار کرایا جائیگا +

نو پرچوں کا سٹ قسم اول ۳ +

" " قسم دوم ۲ +

" " قسم سوم ۸/ +

محصولڈاک بذمہ خریدار +

المشتہر

منیجر آزاد لاہور

آزاد کا کانگریس نمبر

اپنی خوبیوں کے لئے کافی شہرت حاصل کر چکا ہے اسکی

صرف پچیس کاپیاں

باقی ہیں۔ حالانکہ ایک ہزار زاید چھپوائی گئی تھیں۔ جو صرف نئے خریداران کو مفت دی جائیں گی ÷

کانگرس نمبر مُفت

حاصل کرنا خوش نصیبی ہے۔ اور اس سے محروم رہنا اپنے دماغ سے ظلم کرنا ہے۔ جلدی کیجئے تاکہ مایوس نہ ہونا پڑے ÷

المشتہر

منیجر آزاد لاہور

آزاد رہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل

آزاد

ایڈیٹر بشن سہائے آزاد

جلد ۳ | مئی سنہ ۱۹۲۸ء | نمبر ۵

فہرست مضامین

تصویر - لالہ لاجپت رائے

قیمت سالانہ قسم اول ۳ قسم دوم ۲ قسم سوم (بلا تصاویر) ۱ معہ محصول ڈاک

بشن سہائے آزاد مالک و ایڈیٹر کے اہتمام سے آزاد پریس لاہور میں چھپ کر شائع ہوا

خدا کا شکر اور احسان ہے

کہ آزاد کی تیسری جلد بھی بخیر و خوبی تمام ہونے کو ہے۔ اس عرصہ میں جو غیر معمولی کامیابی آزاد کو اپنے مقاصد میں ہوئی۔ وہ ہمارے معزز سرپرست اہل قلم کی لگاتار و ناتھی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ کاش اہل ملک بھی آزاد کی ترقی کے لئے اسی قدر کوشش کرتے جتنی اہل قلم اسے دلچسپ بنانے کیلئے کرتے ہیں۔ تو ہمیں اہل ملک کے مذاق پر حرف گیری کا موقعہ نہ ملتا۔ قدردانی کا بہترین طریقہ توسیع اشاعت ہے جس سے ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ خریداران آزاد غافل ہیں +

اب نئی جلد کا آغاز ہونے کو ہے جون کا رسالہ شایع ہوتے ہی تیسری جلد تمام ہوگی۔ یہ موقعہ ہے کہ گذشتہ لاپرواہی اور غفلت کی تلافی کی جاسکے۔ دیکھنا ہے۔ کہ کتنے محبان وطن اپنے خادم کی اعانت کو اپنا فرض خیال کرتے اور اسے بجالاتے ہیں +

نیازمند

بشن سہائے آزاد مالک و ایڈیٹر

آثار زمانہ

از پروفیسر دیوان چند ایم۔ اے

آج کا ہندوستان وہ ہندوستان نہیں جو دس سال پہلے تھا اہل ہند کی زندگیوں میں زمانہ کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ اور وہ محسوس کر رہے ہیں کہ زندگی ایک جدوجہد ہے۔ اور وہ شخص جو اس میں کامیاب ہونیکے لایق ہیں کامیاب ہوتے ہیں۔ ہر ایک طبقہ کے لوگوں میں حرکت دکھائی دیتی ہے۔ اور اگر پانچ سال پہلے یہ کہنا درست تھا کہ ہندوستانیوں کا اعلےٰ معراج نروان ہے تو آج یہ کہنا بالکل غلط ہے +

میں عموماً پڑھنے یا پڑھانے سے ذرا فرصت پاتا ہوں تو شہر کو چھوڑ کر باہر چل دیتا ہوں۔ اور میں محسوس کر رہا ہوں کہ میں آثار زمانہ کو اچھی طرح نہیں دیکھتا۔ اور نہ ہی مجھے اس کے لئے بہت افسوس ہوتا ہے۔ میں زمانہ کی موجودہ رفتار کے متعلق کچھ کہنے کے ناقابل ہوں۔ ہندوستان جدید کی حالت کا درست اندازہ کرنا بھی میرے لئے مشکل ہے۔ لیکن کمزور بینائی کا

انسان بھی موٹی چیزیں دیکھ سکتا ہے۔ اسی طرح میں بھی باوجود اپنی لاپرواہی کے ان آثار کو دیکھ سکتا ہوں جو سوسائٹی کے ہر طبقہ اور ہر ایک طبقہ کے کثیر التعداد انسانوں کے چہرے پر ہویدا ہیں +

سب سے پہلے جو بات جدید ہندوستان میں دیکھنے والے کو دکھائی دیتی ہے۔ اِس وقت کی

پولیٹیکل لہر

ہے۔ جس طرف دیکھیں لوگ پولیٹیکل معاملات میں دلچسپی لیتے دکھائی دیتے ہیں۔ کوئی موجودہ روش کے حق میں ہے کوئی برخلاف۔ لیکن بہت کم تعلیم یافتہ ایسے ہونگے جو موجودہ پولیٹیکل حالات کو نظرانداز کر سکتے ہیں اور اس سے کچھ سروکار نہیں رکھتے +

اخبارات کی طرف دھیان کریں تو پتہ لگتا ہے کہ جو اخبارات پولیٹیکل معاملات سے تعلق نہیں رکھتے ان کا کام دن بدن زیادہ محدود ہوتا جاتا ہے۔ اور ان کی ترقی مسدود۔ ایک کثیر تعداد اخباروں کی شروع سے لیکر آخیر تک پولیٹیکل معاملات سے پر ہوتی ہے۔ بعض اخبارات جو مذہبی تھے یا سوشیل ریفارم کو ہی مقصداعلےٰ بنائے ہوئے تھے۔ مجبور ہو گئے ہیں کہ وہ پبلک کے پولیٹیکل چسکہ کو بھی تسکین دینے کا سامان بہم پہنچائیں۔ اس سے بڑھکر اس لہر کے زبردست ہونیکا ثبوت کیا ہوگا کہ بہت سے لوگ جو پولیٹیکل معاملات پر رائے زنی کے نااہل ہیں۔ یا پولیٹیکل کام کرنیوالوں کے حلقہ میں داخل نہیں ہو سکتے۔ اُنہیں دقت محسوس ہوتی ہے کہ لکھیں تو کس مضمون پر لکھیں۔ میں نے خود آزاد میں لکھنے کے لئے کئی مرتبہ مضمون

کی بے فائدہ تلاش کی ہے +

یہ ہلچل کن اسباب کا نتیجہ ہے؟ اس سوال کا جواب کئی دفعہ مختلف اخبارات اور رسالوں میں ملک کے اہل الرائے لوگ دے چکے ہیں - ایک باعث یہ ہے کہ اس وقت

ہندوستانی اخبارات

ایک طاقت بن گئے ہیں - ہندوستانی اخبارات کا ملک میں ایک طاقت بن جانا کسی حد تک پولیٹکل لہر کا موجب ہے - اور کسی حد تک اس کا نتیجہ بھی ہے - ابھی بہت عرصہ نہیں گذرا کہ ہفتہ واری اخبارات کی اشاعت بہت کم ہوتی تھی - چار چار سو کی تعداد میں چھپنے والے کامیاب اخبار سمجھے جاتے تھے اب ایسے اخبارات تو کسی گنتی میں ہی نہیں - پنجاب میں اردو پولیٹکل پریس کی ترقی میرے دوست لالہ دینا ناتھ سابق ایڈیٹر ہندوستان کے نام کیساتھ وابستہ ہے +

ایک دفعہ مجھے اُنہوں نے کہا کہ وہ تین آدمی دن رات ہندوستان کو قابل قدر پرچہ بنانے کی کوشش کرتے تھے - اور وہ خوش تھے کہ پبلک میں اخبار بینی کا مذاق پیدا ہو رہا ہے - چنانچہ اس روز کے متعلق اُنہوں نے کہا کہ ۵۰۰ نئے خریداروں نے ہندوستان کا سرپرست ہونا منظور کیا - وہ دن کوئی خاص دن نہیں تھا - اور لالہ دینا ناتھ نے قابل معافی فخریہ لہجے میں کہا - "میرا خیال ہے - ہندوستان میں اس وقت کوئی اخبار نہیں جسے ایک معمولی دن میں ۵۰۰ خریدار ملتے ہوں" ہندوستان کے علاوہ اور ہفتہ واری اخبار بھی ورنیکیولر میں اچھی حالت میں ہو گئے ہیں - انگریزی اخبار

کی حالت بھی پہلے سے بدرجہا بہتر ہے۔ ماہواری رسالے جو اُردو میں اُس وقت نکلتے تھے وہ صرف ایک ہی قسم کے ہوتے تھے۔ ایک دو مصرع طرح دیئے جاتے تھے۔ اور معمولی پایہ کے شاعر عشقیہ شعر ان میں لکھا کرتے تھے۔ آجکل کے ماہواری رسالے قابل قدر ہیں۔ اور ملک کی تعلیم یافتہ پارٹی نے ان کو اپنے خیالات کے اظہار کرنے کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ دس سال پہلے اردو اخباروں کے ایڈیٹر قصبہ فلاں۔ تحصیل فلاں۔ ضلع فلاں کے پٹواری کی تبدیلی اور ایک مکان گرنے کا مفصل حال شائع کرنا کافی دلچسپ اور ضروری مصالح۔۔۔ جانتے تھے۔ آج عموماً ورنیکولر پریس کے ایڈیٹر قابل آدمی ہیں۔ اہل ملک کی تطرولہ میں

تعلیمی کام

کی قدر و منزلت پیدا ہو جانا ایک اور دل خوش کن نشر ہے جو ہر ایک شخص کو دکھائی دیتا ہے۔ اہل اسلام مغربی تعلیم کے دلدادہ ہو رہے ہیں۔ پنجاب میں سکھ صاحبان بھی تعلیمی کام بڑھانا چاہتے ہیں اور صوبہ کے مختلف حصوں میں سکول کھولنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بنگال اور دیگر صوبجات میں قومی درس گاہیں بن رہی ہیں۔ آریہ سماج کی پیدایش سے تعلیمی کام مقدس کام سمجھا گیا ہے۔ چند سال ہوئے جبکہ قسمتی سے آریہ سماج کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ چونکہ دیانند اینگلو ویدک کالج ایک فریق کے متعلق ہو گیا۔ دوسرے فریق نے اپنی کامیابی کے لئے ضروری سمجھا کہ آریہ سماج کے تعلیمی کام کو لوگوں کی نظروں سے گرایا جاوے۔ بعض معزز ممبروں نے مغربی تعلیم کے خطرناک نتیجوں سے پبلک کو آگاہ کیا۔ بعضوں نے فتوے دیا کہ آریہ سماج

کو تعلیمی کام سے کوئی تعلق نہیں۔ ملک اور قوم کی خوش قسمتی ہے کہ آج وہ فریق بھی تعلیمی کام کو ایسی عزت سے دیکھتا ہے جس عزت سے آریہ سماج کے سارے ممبر تفرقہ سے پہلے دیکھتے تھے۔ گورو کل کانگڑی کی موجودہ حالت سے اس جوش کا اندازہ لگ سکتا ہے جو اس پارٹی کے ممبروں میں تعلیمی کام کے لئے ہے +

کتنی خوشی کی بات ہے کہ لالہ رلا رام جی اور رائے ٹھاکر دت جی جو کچھ عرصہ پہلے یونیورسٹی تعلیم کے برخلاف اور آریہ سماج کے تعلیمی مشن کے برخلاف اتنا کچھ کہتے اور لکھتے تھے آج خود ایک سکول (گورو کل گوجرانوالہ) کو جو انٹرنس تک تعلیم دیتا ہے چلا رہے ہیں +

سناتن دھرم سبھا کے ممبر بھی ایک کالج بنانا چاہتے ہیں۔ یہ مانا کہ ان کا سکول بھی فی الحال تسلی بخش حالت میں نہیں۔ اور یہ بھی مانا کہ دو تین ہزار جمع کر لینا بھی ایک کالج کے لئے تیاری نہیں کہا جا سکتا۔ مگر اس سے کم از کم پتہ لگ سکتا ہے کہ ان میں تعلیم کا شوق ہے۔ برہمن کانفرنس کا گوجرانوالہ کے اجلاس میں ایک کالج برہمنوں کے لئے قائم کرنے کا فیصلہ کرنا اور ایک ہزار روپیہ نقد جمع کر لینا بھی کافی معنے رکھتا ہے +

جس تعلیم یافتہ آدمی کی مالی حیثیت اُسے اجازت دیتی ہے۔ وہ اپنے بچوں کو اعلےٰ تعلیم کیلئے یوروپ۔ امریکہ اور جاپان بھیجتا ہے۔ اب ایسے طالب علموں کی تعداد بہت بڑھ رہی ہے۔ یہ امر خاصکر قابل ذکر ہے کہ جہاں پہلے عموماً وہ اصحاب جایا کرتے تھے جن کے لئے یہاں وکیل بننا مشکل ہوتا تھا اب فاضل گریجوایٹ بھی بکثرت جاتے ہیں۔ اور فقط بیرسٹر بننے کے لئے نہیں بلکہ صنعتی اور تجارتی تعلیم کے حاصل کرنیکے لئے بھی +

تعلیمی کام کس وقعت سے اب دیکھا جاتا ہے اس کے متعلق یہ۔
بات اور کہنا ضروری ہے اور بس۔ سرمہ بیچنے والے۔ ہارمونیم ایجاد مرمت
کرنے والے۔ جوانی کی غلط کاریوں کی دوائیاں بیچنے والے۔ اخباروں
میں اشتہار دیتے وقت اپنے آپ کو پروفیسر ظاہر کرتے ہیں کیونکہ انہیں
یقین ہے۔ کہ اب گانوں کے گنوار بھی لفظ پروفیسر کو عزت کی نگاہ سے
پڑھتے ہیں۔ جو تبدیلیاں

سوشیل زندگی

میں ہوئی ہیں۔ وہ بھی قابل ذکر ہیں۔ اہل ہند عموماً اور ہندو خصوصاً اس بات
کے لئے مشہور ہیں کہ لکیر کے فقیر ہیں۔ پرانے رسم ورواج کو چھوڑنا وہ
ہتک سمجھتے ہیں۔ ہندوؤں میں چونا جائز قومی غرور تھا۔ وہ دور ہو رہا ہے۔
اور یہ ایک نہایت ہی مبارک اثر ہے۔ بہت عرصہ نہیں گذرا جب ہندو
بہت سے کاموں کو نیچ کام سمجھتے تھے اور اگر ان میں سے کوئی ایسے کاموں
کے کرنے کی جرات کرتا تھا تو اُسے برادری سے خارج کر دیتے تھے۔ مگر
اب ہندو محسوس کرنے لگے ہیں کہ خواہ کوئی کام بھی دیانتداری سے کیا جائے۔
قابل عزت ہے۔ کیا یہ امر قابل غور نہیں کہ لاہور میں اور بیرونجات میں
بھی اعلٰے ذاتوں کے تعلیم یافتہ ہندو بوٹ بنواتے اور بیچتے ہیں۔ درزیوں
کا کام کرتے ہیں اور ان کاموں کے کرنے میں عار نہیں سمجھتے۔ اہل ہنود
فقط بعض پیشوں کو ہی رذیل نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کاموں کے کرنیوالوں
کو بھی نہایت رذیل خیال کرتے تھے اور ان کے ساتھ مل بیٹھنا بھی گوارا
نہیں کرتے تھے۔ آج زمانہ نے انہیں سکھا دیا ہے کہ اگر وہ ایسی لاپرواہی

جاری رکھیں گے۔ تو ان کی ہستی معرضِ خطر میں ہے۔ ہندوؤں کی چھوٹی ذاتیں اُٹھنے کی کوشش کر رہی ہیں اور ایک حد تک اونچی ذاتیں اس کوشش میں ان کی مدد کرتی ہیں۔ ایسے بیجا قومی غرور کے ٹوٹنے کا ایک نتیجہ یہ ہُوا ہے کہ جو ہندو اپنے آبائی مذہب کو چھوڑ گئے تھے۔ انہیں پھر واپس لینے پر قوم تیار ہو گئی ہے۔ آریہ سماج کی کوششیں

شدھی

کے بارے میں کامیاب ہوتی نظر آتی ہیں۔ ہندوؤں میں شدھی کا رواج نہ فقط ان کے لئے ہی مفید ہے بلکہ غیر قوموں کے لئے اور کل ملک کے لئے بھی +

ہندو ہمیشہ مذہبی آزادی کے حق میں رہے ہیں۔ ان کا عام مقولہ ہے کہ [illegible] بھائی ہیں۔ اس لئے اگر کوئی شخص گائیتری کی جگہ کلمہ پڑھتا اور اہلِ ہنود کی سوشیل زندگی کی جگہ مسلمانی سوشیل زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ تو اس کے رستے میں مزاحم ہونا غیر ضروری ہے۔ اسی خیال سے ان میں مذہبی برداشت بہت ہے۔ ہندوستان کے لئے وہ وقت مبارک ہوگا۔ جب ہندوستان کی دو بڑی قومیں ملکر کام کرنا سیکھیں گی۔ اور وہ وقت جبھی آسکتا ہے جب مسلمانوں میں بھی ہندوؤں کی مذہبی آزادی کی سپرٹ اور برداشت کی طاقت آجائے۔ دوسرے ضلعوں میں مسلمان بھی ہندوؤں کی طرح رام اور رحیم کو بھائی سمجھنے لگیں۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں جب کلکتہ میں کانگرس منعقد ہوئی تھی۔ تو عیسائی صاحبان نے ایک مضمون چھپوا کر عام طور پر کلکتہ کے مسلمانوں میں تقسیم کیا تھا۔ جس میں ظاہر

کیا تھا کہ انہیں ہندؤں کی شدھی کی تحریک سے پوری ہمدردی ہے۔ کیونکہ جو لوگ عیسائی مذہب میں رہنا نہیں چاہتے۔ بہتر ہے کہ وہ اس مذہب کو چھوڑ دیں۔ اگر ہندوانہیں واپس نہ لیں تو یہ فاسد مادہ عیسائی مذہب کو فائدہ پہنچانے کی جگہ اُسے ضرور نقصان پہنچائے گا۔ ممکن ہے مسلمان صاحبان اس راز کو سمجھ جائیں اور شدھی کو مذہبی آزادی کا ایک ذریعہ خیال کر کے خوش ہوں۔ کہ اس ذریعہ سے وہ نومسلم جن کا دل اسلام میں نہیں اسلام کو چھوڑ سکتے ہیں۔ اور اس طرح اسے نقصان سے بچا سکتے ہیں +

مسلمانوں کی بھی سوشیل زندگی میں تبدیلیاں ہوئی ہیں جو قابل ذکر ہیں۔ کئی تعلیم یافتہ مسلمان اب کثرت ازدواج کے مخالف ہیں۔ لاہور کا **اورینٹ بنک** ظاہر کرتا ہے کہ کس طرح مسلمان زمانہ کی لہر سے متاثر ہوئے ہیں۔ بچارے مُلّا زور سے وعظ کرتے ہیں کہ سود دینا اور سود لینا دونوں ناجائز ہیں۔ مگر ملک کی تمدنی حالت انہیں مجبور کرتی ہے کہ دقیانوسی خیالات کو خیرباد کہکر جدید زندگی میں حصہ لیں۔ ملک کی مختلف قوموں کا رجحان **مذہبی پرچار** کی طرف بھی بڑھ رہا ہے۔ اگرچہ یہ سب سے زبردست جذبہ نہیں۔ لیکن بذات خود اس میں ترقی ہو رہی ہے۔ اس کا اثر عیسائی صاحبان پر کیا ہوا ہے؟ اب لوگ اپنے مذہبی کتب کی تعلیم کو سمجھنے لگے ہیں۔ اور لوگوں نے محسوس کیا ہے کہ ان کی مذہبی ضروریات پورا کرنے کے لئے کافی مصالح ان کے گھر میں موجود ہے +

عیسائی صاحبان جو پہلے اہل ہنود پر مذہبی حملے کرتے تھے - اب اس طریقہ کو بدل رہے ہیں - اب ان کا زور سکولوں اور کالجوں پر - یتیم خانوں اور شفاخانوں پر لگ رہا ہے - اب ان کے لکچرار اہل ہنود سے اپیل کرتے ہیں - کہ وہ اپنے مذہبی تجربوں سے بائیبل کی تعلیم کو مکمل کریں - اب انہیں سوجھنا ہے - کہ ہندو مذہب میں بھی سچائی موجود ہے - اور وہ بائیبل کی تعلیم سے بہت کچھ ملتا ہے - اب صلح کی پالیسی ہے نہ کہ جنگ کی - یہ صلح مذہبی پرچار تک محدود ہے - کام کرتے ہوئے بعض اوقات مقابلہ ہو جاتا ہے - اور اس وقت عیسائی صاحبان حکام کی مدد لینے میں دریغ نہیں کرتے ہندو خوش ہیں - کہ عیسائی اس کا اثر نہیں سمجھ سکتے +

شیر ببر - پنجاب میں سکھ صاحبان غیر معمولی طور پر ترقی کر رہے ہیں - سکھ ایجوکیشنل کانفرنس کے پہلے اجلاس کی کامیابی ان کی قومی بیداری کا ثبوت ہے - سکھ صاحبان میں ایک اردو اخبار کی ضرورت بڑی مدت سے محسوس ہو رہی تھی - اور ان کیلئے اس ترقی کے زمانہ میں یہ ضروری تھا - کہ ایک ایسا اردو اخبار ان کے خیالات کا پلیٹ فارم بنے - اس کمی کو سردار سادھو سنگھ صاحب جو ایک اولوالعزم اور پرجوش محب قوم و ملک ہیں - اور جن کی تحریر پر اثر ہے پورا کیا ہے - اگرچہ سردار صاحب اخبار کی ایڈیٹری کے میدان میں پہلی مرتبہ اُترے ہیں - مگر آپ کی تحریر میں متانت اور تجربہ کاری کا رنگ موجود ہے - اخبار کا مقصد سکھ قوم کی خصوصاً اور سا اہل ملک کی عموماً خدمت ہے - ہم اپنے نئے ہمعصر کا نہایت خوشی سے خیر مقدم کرتے ہیں +

دیسی چیزوں کا استعمال

از مسٹر بی۔ این ولیش

ہندوستان میں جب سے سودیشی کا چرچا زور شور سے پھیلا ہے۔ یعنی جب سے کہ تقسیم بنگال عمل میں آئی۔ اور ایسے ہی پے در پے ہندوستانیوں کے اخلاق وجذبات پر زبردست حملے ہوئے۔ یہ عالمگیر آگ ہر فرد بشر کے دل میں خواہ وہ کسی مذہب۔ ملت۔ قوم و فرقہ کا ہو۔ اگر اُس کو اپنے ملک مادر ہند سے کچھ بھی اُلفت ہے۔ اور اپنی قوم سے کچھ بھی حب ہے مشتعل ہوئی۔ شاید یہ کہنا تو نادانی اور غلطی ہوگی کہ یہ تحریک مذکورہ بالا زمانہ ہی سے ظہور میں آئی۔ لیکن اس سے کسی کو بھی انکار نہیں۔ کہ اس کا سحر ہندوؤں کے دلوں کو تسخیر کرنے میں تب ہی سے کامیاب ہوا۔ اور تب ہی سے اس کو اہل الرائے اہل ملک نے ممتاز مسایل میں شمار کیا۔ اور اہل قلم نے اس کو اپنے قلم کی جولانگاہ بنایا ہے۔ ورنہ پیشتر تو یہ صرف آتش خوابیدہ کی طرح کسی کسی گوشہ میں سُلگ رہی تھی۔ اور اس کا عام احساس نہ تھا۔ تب سے اس کے ضمن میں جن جن اشیاء پر خاص طور سے زور دیا گیا وہ بدیشی کپڑے۔ بدیشی شکر اور بدیشی نمک سے دست کش ہونا۔ اور سودیشی پارچہ۔ سودیشی شکر اور سودیشی نمک کا استعمال ہے +

بدیشی پارچہ کو ترک کرنے میں اور سودیشی پارچہ کے استعمال میں جس قدر ترقی ہوئی۔ اُس کے شاہد دیسی و ولایتی اخبار ہیں۔ اور سرکاری اعداد سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اس میں اہل ہند کو خاص کامیابی ہوئی۔ علاوہ بریں بہت سے کارخانہ پارچہ کے بڑے بڑے پیمانوں پر ملک میں

نکل گئے۔ اور روز بروز کھل رہے ہیں۔ اور جو پیشتر سے موجود تھے اُن کے کاروبار میں ایک غیر معمولی حصہ ترقی ہوئی۔ اور ہزارہا کم بضاعت لوگ جن کو اس فن سے لگاؤ تھا۔ وہ پرانے اور نئے طریقوں پر سرگرم کار ہوئے۔ مگر اس میدان میں باہمت اہل دولت کے آگے بڑھنے کی اب بھی سخت ضرورت ہے۔ کیونکہ کارخانہ جات میں اس قدر ترقی ہونے کے باوجود بھی اب تک ملک کی مانگ پورا کرنے کے لیے کافی سامان نہیں ہے۔ اور میرے خیال میں تو اگر سوتی کپڑا بننے والی کلیں صرف دھوتی جوڑے ہی تیار کریں۔ اور کسی قسم کا کپڑا نہ بنیں تو بمشکل تمام اس ضرورت کو پورا کر سکیں گی جس سے کہ چوتھائی ضرورت بھی پوری نہیں ہوتی۔ علاوہ اس کے اور بہت سی باتیں کپڑے ہی کے متعلق ہیں۔ کہ جن کو اب تک چھوا بھی نہیں گیا۔ مثلاً چھپائی یا رنگنے کا کام جو کہ ابھی تک قطعی غیر ممالک کے ہاتھ میں ہے۔ جس کا ایک نمونہ بھی ولایتی چھینٹ کے طریقہ پر اب تک عوام کے سامنے پیش نہیں کیا جا سکا اور جسکے بغیر وہ اہل ہند بھی جن کو سودیشی کا خیال ہے اپنا گذر نہیں کر سکتے۔ اور محو آرایش ہو کر ولایتی چھینٹ پر ہاتھ ڈال ہی بیٹھتے ہیں کیسا ضروری کام ہے +

دویم سب سے بڑا اور اہم مسئلہ شکر کا ہے جو کہ ایک بسیط بحث کا محتاج ہے اول اول جب بدیشی شکر کے استعمال کے مضر اثرات اہل ہند کو بتلائے گئے۔ اور ان پر کیا تمدنی۔ کیا طبی۔ کیا دھارمک طریقہ پر اس کے نقصانات پورے طور پر واضح کر دیئے گئے تو عوام کی طرف سے خاطر خواہ سلوک جو عمل میں آنا چاہیئے تھا آیا۔ یعنی اس کا استعمال ترک ہونے لگا۔ چنانچہ سال گذشتہ کا اہل ہند کا ضبط قابل تحسین ہے۔ کہ ایک بڑی تعداد غیر ممالک کی شکر کی آمد میں کمی ہوئی۔ مگر امسال کچھ تو امساک باراں سے نیشکر کی پیداوار کم

ہوئی۔جس سے دیسی شکر گراں ہوگئی۔دویم اہل ثروت کی کم توجہی سے جنہوں
نے سود خوری اپنا پیشہ اور دولت کو زمین دوز کرنا اپنا دستور بنا رکھا ہے۔اور
جو کارخانہ وکلیں جاری کرنا اپنی کم عقلی و کم ہمتی سے ایک جیلخانہ اور جان کا
جنجال سمجھتے ہیں۔ورنہ موجودہ کش مکش کے زمانہ میں کیا دس پانچ کارخانہ
شکر سازی کے نہیں کھلنے چاہئیں تھے۔دیسی شکر کو گراں بنا دیا۔اس
پر دشمن ملک کم فہم ہندوستانیوں نے جن کی عقل رسا اس پستی کے زمانہ میں
اپنی قوم کو مکاری و دھوکہ سے ٹھگنے میں خوب ہی زور دکھلاتی ہے۔اور
جن کی کمائی کے وسائل صرف ایسے ہی ناجائز طریقے ہیں متعدد کارخانے
کھول دیئے۔جن میں دن رات ہزار ہا من ولایتی شکر کو کوٹ پیسکر اُس میں
قدرے دیسی شکر اور روڑی ملا کر اور شیرہ ڈال کے تنکے ڈالکر بالکل دیسی شکر کے
مشابہ ہی نہیں بنایا جاتا بلکہ ایسا ملایا جاتا ہے جس کو پشتینی شکر ساز شکر فروش وحلوائی
تک پہچاننے میں قاصر رہتے ہیں۔اور اس ہی پر اکتفا نہیں کیا جاتا۔بلکہ اُس کو
ایسی ایسی شکر کی منڈیوں کے اسٹیشنوں سے لادکر فروخت کے لئے بھیجا
جاتا ہے۔کہ جہاں کی شکر اپنی نفاست۔عمدگی و دیسی پن میں آپ ہی اپنی
نظیر ہے۔اور اس طرح اُس کو وہاں کی پیداوار سے موسوم کر کے گاڑھا
نفع غریب ہندوستانیوں سے وصول کیا جاتا ہے۔یہ توچشم دید حالات
ہیں کہ جو بے کم وکاست ہدیہ ناظرین ہیں۔سننے میں تو یہاں تک آتا ہے۔
کہ رس کو پکاتے وقت۔تو وہ شکر یہ نخ وراب بنانے میں بھی ولایتی شکر
کا ضامن دیہاتی وکسان لوگ اپنے نفع کی خاطر دینے لگے ہیں۔جس کی
روک تھام اگر ابھی سے نہ ہوئی۔تو یقین واثق ہے۔کہ چند ہی روز میں کوئی
مٹھائی دیسی دستیاب نہ ہوسکے گی۔کہ جس میں وہ مکروہ و ممنوعہ دفعہ صحت

اجزا نہ ہونگے۔ جن کو کیا مسلمان۔ کیا ہندو۔ کیا عیسائی سب ہی بُرا سمجھتے ہیں۔ خاص مظفر نگر شہر میں کئی کم حیثیت ہندو پیشہ جن کی معاش دیگر وسایل سے تھی۔ جب سے اس ادھرم وقوم فروشی کے کام میں مشغول ہوئے ہیں صاحب زر بن گئے۔ آہ وہ ہندو۔ وہ شاستروں کے ماننے والے ہندو۔ دھرم کے لئے جان تک کو نہ سمجھنے والے ہندو۔ چھوت چھات کے شیدائی ہندو۔ وہ ہندو جن کا دھرم مانس کے دیکھنے تک سے بھرشٹ ہو جاتا تھا۔ وہ مانس کو مٹی کے نام سے پکارنے والے ہندو۔ آج اُن کی یہ حالت ہے۔ کہ ہڈی۔ پیشاب۔ کھنڈار۔ وغیرہ سے صاف کی ہوئی شکر کوشادی۔ بلکہ اور سب ہی دھرم کے کاموں میں استعمال کرتے اور دوسروں کو کراتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے۔ کہ متمول لوگ شکر سازی کی طرف دھیان دیں۔ محض اپنے نفع ہی کی خاطر نہیں بلکہ دھرم کے نام پر قوم اور ملک کے نام پر۔ اور کسانوں کو شکر سازی کے آسان وارزان اور عمدہ طریقے سکھلا دیں۔ جس سے کہ ولایتی شکر کا استعمال جو کہ دبا کی طرح پھیلتا جاتا ہے۔ بند ہو جاوے +

سوم نمک ہے۔ جو کہ ہر انسان ہی کے لئے بلکہ ہر ایک جاندار کی خوراک کا ضروری جزو ہے۔ ہندوستان میں مختلف جگہ کئی قسم کا نمک ہوتا ہے۔ ایک تو جو پہاڑی کان سے نکلتا ہے۔۔ دویم سانبھر جھیل کا نمک۔ سوئم۔ ساحلِ سمندر پر آب شور سے بنایا جاتا ہے۔ علاوہ ان کے دیگر اقسام کے نمک بھی ہوتے ہیں۔ مگر زیادہ تر مذکورہ بالا نمک ہی کھانے میں استعمال ہوتے ہیں +

ہم گورنمنٹ عالیہ کے از حد شکر گذار ہیں۔ کہ اس نے عنایت خسروانہ

سے نمک کا ٹکس ہلکا کرکے رعایا پروری کا ثبوت دیا۔ مگر اس پر بھی موجودہ ٹکس۔ کرایہ ریل و باربرداری کے خرچہ سے دیسی نمک اس قدر گراں ہو جاتا ہے۔ کہ کلکتہ میں یہ ہمبرگ ولورپول کے نمک سے ارزانی میں مقابلہ نہیں کرسکتا۔ مگر شکر کا مقام ہے۔ کہ اہل بنگال سے جو سودیشی تحریک کی حمایت میں تن۔ من۔ دھن سے کوشاں ہیں۔ اور ہر تکلیف کو اس کے لئے برداشت کرنے کو تیار رہیں۔ اس کا واسطہ پڑا ہے۔ جو کہ بڑی خوبی سے اس کو نباہ رہے ہیں۔ ورنہ دیگر حصص ہند کے باشندوں سے تو وہی امید کی جاسکتی تھی۔ جو کہ دیگر سودیشی اشیاء کے استعمال میں ظہور میں آئی۔ اب دیسی نمک کی ارزانی کے صرف یہی وسایل ہیں۔ کہ ہماری گورنمنٹ اس پر سے محصول کا بار بالکل ہٹا دے۔ اور ریلوے جات ہند اس کے کرایہ کے نرخ میں خاص رعایت کردیں۔ ؎

جو نعمت عشق کی چاہے تو راحت جان ایذا کو
عصا پیچھے دیا پہلے جلا یا دست موسیٰ کو

آئیڈیل۔ اردو زبان کی خوش قسمتی سے اس کے سرپرستوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اور ملک کے ہر حصہ سے بیش بہا تصانیف کا اضافہ ہو رہا ہے۔ دہلی کے علم دوست رئیس اور وہاں کے نئے اردو رسالہ زبان کے مالک لالہ چندو لعل صاحب نے مشہور ہندوستانی ریفارمر سوامی دویکانند کے گرو پرم ہنس۔ رام کرشن جی کی سوانحمری تحریر فرمائی ہے۔ تصنیف بجائے خود اپنی تعریف ہے۔ چھپائی۔ لکھائی نہایت عمدہ۔ قیمت ۶ر جو نہایت کم ہے۔ منیجر زبان دہلی کے پتہ سے مل سکتی ہے ✦

شہنشاہ اکبر اعظم کا پیام

ہندو مسلمان کے نام

از سید محمد فاروق صاحب

نصیحتے کمنت بشنو و بہانہ مگیر
کہ ہرچہ ناصح مشفق بگویدت بپذیر

مجھے اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے تین سو سال سے بھی کچھ زیادہ دن ہو گئے ہیں۔ اس عرصہ میں مجھے جس قدر جسمانی اور روحانی تغیرات وتبدلات سے سابقہ پڑا۔ اُس کا بیان اس جگہ عبث ہے۔ لیکن میں اس بات کا تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمام جھگڑوں اور جھمیلوں کے باوجود مجھے تمہارا خیال ہر وقت رہا۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی بے نظیر تصنیف گلستاں میں ایک دلچسپ حکایت لکھی ہے کہ کسی شخص نے سلطان محمود کو خواب میں دیکھا کہ اُس کا سارا جسم مٹ گیا ہے مگر آنکھیں بدستور قائم ہیں اور اپنی مملکت کے انقلاب کو حسرت کے ساتھ دیکھ رہی ہیں۔ بعینہ یہی حال میرا ہے مرنے کے بعد بھی مجھے تم لوگوں سے وہی تعلق ہے جو زمانہ حیات میں تھا۔

اپنی زندگی میں میں نے جو کوششیں تم دونوں کے لئے کیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ جب میں بعد وفاتِ والد مرحوم کلانور میں تخت نشین ہوا تو تم دونوں کے دل ایک دوسرے سے متنفر تھے۔ تم دونوں میں مغائرت

مذہبی نے نفاق پھیلا رکھا تھا۔ مجھے اپنی سلطنت کی یہ دورنگی پسند نہ آئی۔
میں نے تم دونوں کو ملایا۔ اور اس طرح ملایا کہ تم دونوں یک جان ودو قالب
ہو گئے۔ تمہارے اوضاع واطوار۔ خیالات ومقالات میں کوئی فرق نہ باقی
رہا۔ جب میں نے مذہب کو تم دونوں کے میل جول میں حارج پایا تو مذہب
الٰہی قائم کر کے تسبیح اور زنار کو ایک کر دیا۔ تم ہی کہو کہ میں نے تم دونوں
کے اتفاق واتحاد کی کوشش میں کونسی بات اٹھا رکھی۔ انصاف سے
دیکھو تو میں نے وہ کیا جو مجھے ایک حد تک نہ کرنا چاہیئے تھا۔ لیکن کیا میں نے
یہ سب کچھ ذاتی فائدہ کے لئے کیا تھا؟ خود غرضی کا الزام تو مجھ کو شاید تم
میں سے کوئی نہ دے گا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ تمام کوششیں جو محض ملک
کی خاطر تھیں۔ میں نے اپنی غور بین طبیعت سے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ جب تک
ہندو مسلمان متفق ومتحد نہ ہوں گے اور ہندوستان سے پھوٹ دور نہ
ہوگی۔ ممکن نہیں کہ میری حکومت کی جڑ مستحکم ہو سکے۔ اور میری مملکت
میں رعایا کو پوری پوری آزادی اور پورا پورا امن حاصل ہو سکے۔ اسی
وجہ سے میں نے اپنی تمام عمر دونوں کو باہم وابستہ کرنے میں صرف
کر دی اور خدا کا شکر ہے کہ میری کوششوں کا نتیجہ میری زندگی میں
نکل آیا۔ مجھے امید تھی کہ میرے بعد میرا لگایا ہوا درخت تم دونوں کی
آبیاری سے پھلتا پھولتا رہیگا۔ لیکن جب میں ہندوستان کی موجودہ
انقلابی کیفیت کو دیکھتا ہوں تو میرے سینے پر سانپ لوٹنے لگتا ہے اور
رنج ومایوسی سے میرا دل بیتاب ہونے لگتا ہے +

تم دونوں کے نفاق انگیز افعال وسکنات کی اطلاع مجھے عالم بالا میں
صحیح صحیح پہنچتی رہتی ہے لیکن میں یہاں سے تمہارے لئے کچھ کر نہیں سکتا

ابھی کل فیضی - ابوالفضل - ٹوڈرمل اور راجہ مان سنگھ کے ساتھ صحبت گرم تھی - اتفاق سے اثنا رگفتگو میں تم دونوں کی نااتفاقی کا ذکر آگیا جس کو سُنکر ہم سب آبدیدہ ہو گئے - اور بالخصوص میری تو رنج وغم سے یہ حالت ہوئی کہ بیان سے باہر ہے +

نفاق وتعصب کے مضر نتائج اگر تم دونوں کی ذات تک محدود ہوتے تو کچھ بات نہ تھی - لیکن غضب تو یہ ہے کہ تمہاری لڑائیوں اور جھگڑوں کی وجہ سے ہندوستان تباہ وبرباد ہوتا جارہا ہے اور اُس کے سرسبز ہونیکی بظاہر کوئی اُمید نظر نہیں آتی +

تمہاری گورنمنٹ نے تم کو جو آزادی دے رکھی ہے اور تمہاری ضروریات پوری کرنے پر جس طرح آمادہ نظر آتی ہے اُس کا مبارک اثر تو یہ ہونا چاہیئے تھا کہ تعلیم وتربیت کی بدولت تم میں روشن خیالی پھیلتی اور باہمی اتفاق واتحاد کی جڑ مضبوط ہوتی - لیکن جب آدمی کے بُرے دن آتے ہیں تو ساری تدبیریں اُلٹی پڑ جاتی ہیں +

کیا تہذیب وشائستگی اسی کا نام ہے کہ تم باہم لڑو - نئے نئے جھگڑے نکالو اور آپس میں کٹ مرنے کے سامان پیدا کرو - ہندوستان مفلس ہوتا جاتا ہے - ہر سال لاکھوں نفوس بندگان خدا سے قحط وطاعون کی نذر ہوتے ہیں لیکن تم لنگوٹی میں پھاگ کھیلتے ہو - اور اپنی کھال میں مست ہو - تم رفتار زمانہ سے بالکل بے خبر ہو - نہیں جانتے کہ دنیا کی مہذب اقوام نے کس قدر ترقی کی ہے اور تم اُن سے کتنے پیچھے رہ گئے ہو - کاش تم اپنی موجودہ قابل افسوس حالت پر تھوڑی دیر غور کرتے اور سمجھتے کہ تمہیں کیا ہونا چاہیئے تھا اور کیا ہو +

جس زمانہ میں یورپ کی وہ قومیں جو آج کل مہذب و متمدن ہونے کی مدعی ہیں وحشیانہ زندگی بسر کرتی تھیں۔ ہندوستان والے آسمانِ فضل وکمال کے ستارہ بنے ہوئے تھے۔ اگر تمہاری قومی ترقی اپنی معمولی رفتار سے چلی جاتی تو کیا تم آج اس ذلیل وپست حالت میں ہوتے؟ نہیں بلکہ اوروں کے لئے شاہراہ علم وہنر کے راہبر اور ہادی ثابت ہوتے اور دوسری وحشی وجاہل قومیں تم سے ہدایت پاتیں ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

تم دیکھو کہ مہذب اقوام عالم میں تمہارا کیا رتبہ ہے۔ مجھے اگر افسوس ہے تو یہ ہے کہ جس قوم کو میں سبوں کی سرتاج دیکھنا چاہتا تھا وہی آج سب سے زیادہ گری ہوئی ہے۔ تمہیں منصفی کرو کہ مجھے یہ دیکھ کر صدمہ ہونا چاہئے یا نہیں کہ میں نے تمہاری بہتری کے لئے جو کوشش کی تھی وہ تمہاری بدولت رائگاں گئی۔ مجھے اپنی اس ناکامی کا جب خیال آتا ہے تو دل پر عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے +

تم نے میری سرگرم مساعی اور بےلاگ کوششوں کی کچھ قدر نہ کی تم نے میری محبت اور شفقت کی رتی برابر پروانہ کی۔ مجھے تم سے اس کی سخت شکایت ہے اور بجا شکایت ہے۔ لیکن اس شکایت کے معنے یہ نہیں ہیں کہ اب مجھے تم سے کوئی واسطہ نہیں۔ بےشک ایک حیثیت سے مجھ سے تمہیں کوئی تعلق نہیں رہا۔ کیونکہ اب میں وہاں ہوں جہاں سے تمہارے لئے کچھ نہیں کرسکتا۔ جائے عبرت ہے کہ جس شخص نے تمہاری خدمت میں اپنی ساری زندگی کاٹ دی ہو۔ آج وہ اس طرح بےدست وپا لاچار ہے۔ موت نے مجھے تم سے جدا کر دیا ہے اور مجھ میں اور تم میں زمین وآسمان کا

فاصلہ ہے نہ میں اب وہ تمہارا شہنشاہ اکبر ہوں نہ تم میری وہ فرمان پذیر اور حلقہ بگوش رعایا۔ لیکن میرا دل اب تک وہی ہے۔ اُس میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔ اسی دلی تعلق کی وجہ سے میں تمہاری حالت کو دیکھ کر جی ہی جی میں کُڑھتا رہتا ہوں +

اگر تم نے میرا بتایا ہؤا راستہ نہ چھوڑا ہوتا۔ میرے قایم کردہ اُصول نہ توڑے ہوتے اور آج تک میری نصیحتوں پر کاربند رہے ہوتے تو غیر ممکن تھا کہ اس طرح اور اس قدر جلد قعرِ مذلت میں گرتے۔ میں نے تمہیں باہمی میل جول اور ہمدردی آمیز اُخوّت کا سبق پڑھایا لیکن تم نے اُسے جلدی بھلا دیا +

یاد رکھو کہ تمہاری موجودہ نکبت و افلاس کی ذمہ وار تمہاری نااتفاقی ہے۔ اگر تم نے آپس میں اتفاق رکھا ہوتا تو اتنے حقیر نہ ہو جاتے۔ تم خود خیال کرو تو معلوم ہو جائے گا کہ جب سے تم میں پھوٹ پھیلی تمہاری حالت روز بروز ردی ہوتی گئی۔ اور سخت تاسف کا مقام ہے کہ تم اب بھی نہیں سنبھلتے +

دیکھو جس راستے پر تم چل رہے ہو وہ منزلِ مقصود سے کوسوں دور ہے۔ اس کجراہی سے تم کامیاب نہیں ہو سکتے۔ جس مقصد کے لئے تمہارے لیڈر اور رہنما مصروف و سرگرم ہیں وہ اُس وقت تک نہیں حاصل ہو سکتا تا وقتیکہ تم دونوں خلوص نیت کے ساتھ ایک دوسرے کا ہاتھ نہ بٹاؤ گے اور ایک دوسرے کے ساتھ سچی ہمدردی اور برادرانہ محبت کا برتاؤ نہ کرو گے۔ یقین جانو کہ یہی کلید ہے قومی ترقی کی اگر یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

تم اگر والد مرحوم (ہمایوں بادشاہ) کی حالت کا موازنہ کرتے تو تمہیں معلوم

ہو جاتا۔ کہ شیر شاہ سے اُن کے شکست کھانے اور سلطنت ہاتھ سے نکل جانیکے کیا اسباب تھے۔ برخلاف اسکے میں نے حکمرانی کا گُر پہلے ہی سمجھ لیا تھا میں نے ہندو مسلمانوں کا تفرقہ دور کر کے دونوں کو ملا دیا اُسکے بعد امن و امان کیساتھ بلا کسی خرخشے کے حکومت کی۔ اس قسم کی نظیریں تم کو تاریخ عالم میں بہت سی مل سکتی ہیں۔ تم اُن سے نتیجہ اخذ کر سکتے ہو۔ اب اگر تم کو اس دنیا میں رہکر اپنے ملک کے لئے کچھ کرنا منظور ہے تو پہلے اتفاق و اتحاد پیدا کرو۔ اسکے بغیر مسابقت اقوام عالم کی تمنا اور سعی فضول ہے۔

نہیں اپنے ملک کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا ہے حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک تم نے کچھ کیا ہی نہیں۔ تمہاری گردن پر ہندوستان کے سینکڑوں حقوق ہیں اور اُنکے پورا کرنیکے تم ذمہ وار ہو۔ یہ کہنا محض ابلہ فریبی ہے کہ صرف ہندو یا محض مسلمان ہندوستان کے باشندے ہیں۔ ہندو مسلمان دونوں کی حالت یکساں ہے۔ دونوں فاتح قوم کی حیثیت سے ہندوستان میں داخل ہوئے اور دونوں اب ہندوستان کو اپنا وطن بنائے ہوئے ہیں ہندو اگر مسلمانوں کو غیر سمجھتے ہیں تو سخت غلطی ہے اور مسلمان اگر ہندوؤں کو اجنبی خیال کرتے ہیں تو حماقت ہے ایک ملک میں رہکر ایک گورنمنٹ کی رعایا بنکر اور ایک قانون کے پابند ہو کر بھلا ہندو مسلمان کس طرح جدا ہو سکتے ہیں۔ اسلئے اے ہندو مسلمانو اگر تم ہندوستان کے واقعی خیر اندیش ہو اور تم اُس کو اپنا وطن سمجھ اُسکی خدمت کو فرض عین جانتے ہو تو میری نصیحت سنو اور اپنے سابق حکمران جو تم کو اپنی اولاد سے بڑھکر عزیز رکھتا تھا اُسکی باتوں پر کان رکھو یقین مانو کہ وہ تمہیں صرف تمہاری بھلائی کیلئے سمجھاتا ہے۔ نفاق و بغض سے کنارہ کرو۔ باہمی مخالفت و عداوت کا خیال دل سے نکال دو۔ آپس میں محبت اور یگانگت بڑھاؤ۔ باہم ہمدردانہ اور دوستانہ برتاؤ کرو اور دیکھو کہ اسکے نیک اثرات سے تم کو کیا کیا منفعت پہنچتی ہے۔ ۵

کہتا ہوں ہندو و مسلماں سے یہی — اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو
لاٹھی ہے ہوائے دہر پانی بن جاؤ — موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

بریڈلا کانگریس ہال لاہور

از منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی

اہل پنجاب کے جوش اور حمیت ملکی کا اندازہ بریڈلا ہال کی خستہ حالت سے ہو سکتا ہے۔ اتنا بڑا صوبہ پنجاب اور اس میں بڑے بڑے دولتمند ملک و قوم پر نام کو مرنے کے لئے تیار اور قومی مندر کی یہ حالت! آخر اس جوش کو کوئی کیا سمجھے؟ یہی کہ اہل پنجاب صرف غل مچانا جانتے ہیں۔ ہمارے دوست منشی درگا سہائے سرور نے اس قومی مندر کی دردناک تصویر ذیل کی نظم میں کھینچی ہے۔ ایڈیٹر

آہ! اے شعلہ فروش گرمی سوز نہاں
آہ! اے تفسیدہ برق جفائے آسماں

آہ! اے دود چراغ کشتۂ بزم نشاط
آہ! اے خاکستر پروانہ آتش بجاں

آہ! اے مشت غبار کاروان آرزو
آہ! اے موج شرار نالۂ آذر فشاں

آہ! اے صد داغ حسرت خوردۂ سوز دروں
آہ! اے ہال! آہ اے جولانگہ برق تپاں

ذرہ ذرہ ہے ترا اک مجمر انگر فروش
سو شرار آرزو ہیں راکھ میں تیری نہاں

آہ! اے تعمیر حسرت! کس نے پھونکا ہے تجھے
تیری ہر خشت کہن ہے وقف سوز امتحاں

کیوں تری آہوں سے اڑتے ہیں شرار سوز غم
کوندتی ہیں کیوں تری قلب جگر میں بجلیاں

اے قتیل سوز غمہائے نہاں! اے تفتہ دل!
سوزش غم سے زباں پر کیوں ہے اف! اف! الاماں

کیوں شب غم میں ہیں لب نالہائے گرم گرم
اٹھ رہا ہے کیوں دل مضطر سے آہوں کا دھوں

کیا کسی کے شعلۂ الفت نے پھونکا ہے تجھے
جل رہا ہے کیوں رنگ شمع مغز استخواں

تیرا ملبوس کہن ہے کس کے ماتم میں سیاہ
کس کے غم میں آہ! ہے تاریک آنکھوں میں جہاں

سوگواروں کی سی کیوں یہ وضع کی ہے اختیار
رخ پہ کیوں بکھرے ہوئے ہیں گیسوئے عنبر فشاں

تیری ہر منزل ہے ماتم خانۂ صد آرزو
آہ! اے نقشِ طلسم انقلاب آسماں

آہ! اے نقشِ وفا! اے یادگارِ کانگریس!
اپنے بانی کا ہے تو اک فرسودہ نشاں

ہے سوادِ شامِ غم اب منظرِ دیوار و در
ہائے! وہ صبحِ تمنا کی سپیدی اب کہاں

وہ دلآویزی کہاں اب بیل بوٹوں میں ترے
ہے ترے اک اک ستوں پر نخلِ ماتم کا گماں

اب کہاں ہے تیرے محرابوں میں وہ دلکش ادا
اب وہ سیاحوں سے ابرو کے اشارے ہیں کہاں

فاختہ کی اب کہاں کوکو ترے مینار پر
ہے ترے کھنڈروں میں اب زاغ و زغن کا آشیاں

قالبِ بیجاں ہے اب تو ہائے اے تعمیرِ غم
ناامیدی کا ہے پتلا ذرہ ذرہ میں نہاں

تجھ پہ مایوسی سے اب اثر کی پڑتی ہے نگاہ
مسخ صورت ہوگئی ہے تیری اے جانِ جہاں

کیا خبر تھی آتشِ سوزانِ کیں میں ہے تری
جلکے ہو جائیگی مشتِ غبارِ ناتواں

یاد آیا ہے کہ تھی تو اک طلسمِ دل ربا
ہائے وہ دن تیرا ہر گوشہ تھا بزمِ دلستاں

آہ! وہ تعمیرِ دلکش! وہ ترے نقش و نگار
ہائے! وہ دیرینہ شوکت اف! وہ تیری عزِّ عالیشاں

کل کا قصہ ہے کہ تھی تو مرجعِ افرادِ قوم
کانگرس کا تھا تری چوٹی پہ لہراتا نشاں

کس مپرسی کو ہے عالم میں کھڑی یا آج تو
چارہ گر کوئی نہ ہے بالیں پہ کوئی نوحہ خواں

دیکھکر تجھکو مسافر پھیر لیتے ہیں نظر
سب کی آنکھوں میں کھٹکتی ہے تو اے آرامِ جاں

تیری کایا کیں پلٹ دی انقلابِ دہر نے
دوست دشمن ہوگئے اور مہرباں نامہرباں

تیری ویرانی پہ پگھلے کیا کسی کا آہ! دل
اب گلوں میں شعلۂ جانسوزِ الفت ہے کہاں

المدد! اے ساکنانِ خطۂ پنجاب! حیف
بزمِ ہستی سے مٹا جاتا ہے اک قومی نشاں

دیکھئے کس دن یہ اجزائے پریشاں جمع ہوں
قالبِ نو میں ڈھلیں کس دن یہ مردہ ہڈیاں

توہماتِ قدیم کی کہانیاں

از سید راحت حسین صاحب بی۔اے

نوع انسان جب عالمِ ہستی میں آیا تو قدرت نے اُس کی رہنمائی کے لئے عقل عطا فرمائی۔ اس نورانی جوہر سے انسان نے صحیفۂ کائنات کا مطالعہ شروع کیا۔ لیکن ابتدا میں اُس کے دماغی قویٰ نرے کمزور اور خام تھے۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اُس نے دریافتِ حقیقت میں سراسر مغالطہ اور دھوکا کھایا۔ بعد کو جب بار بار کے مشاہدات اور تجربات نے اُس کی قوت ادراک کو مدد دی اور دماغی قوتیں حالتِ نمو سے ترقی کو پہنچیں۔ تو اُس کا عمل کامل ہوتا گیا۔ قدرتی واقعات کے ظہور میں اُس نے ایک نظم معین پایا۔ اسباب اور ربط کو اُس نے جانا۔ اور قانون قدرت کے پوشیدہ اسرار کھلتے گئے۔ غرض اُس طریقہ سے اُس وقت تک اُس کے علم کا دائرہ بہت کچھ وسیع ہو چکا ہے +

تاریخ بنی آدم اس بات کو بتاتی ہے۔ کہ ابتدا میں انسان محض وحشی اور ناشائستہ تھا۔ نہ رہنے کو گھر۔ نہ کھانے کو غذا۔ جانوروں کے ساتھ جو خدا کی زمین پر قابض تھے درخت کے جوف اور کوہ و بیابان میں رہتا صحرائی درخت کے گرے پڑے پھل اور کیڑے مکوڑوں کو کھا کر اپنی زندگی بسر کرتا تھا غرض ادنےٰ قسم کے حیوانات کی طرح انسان ایک ذلیل مخلوق تھا۔ آخر ضرورت اُس کی معلم بنی اور وہ اکّا دکّا کام کی بات سیکھنے لگا۔ لکڑی۔ پتھر یا مردہ جانوروں کی ہڈیوں کا اُس نے ہتھیار بنایا۔ اور درندہ گزندہ جانوروں

کے حملوں سے عاجز آ کر اُن کے مقابلہ کے لئے اُٹھ کھڑا ہؤا۔ اپنے بودے ہتھیار سے صحرائی جانوروں کا شکار کر کے اُن کا گوشت کھاتا اور موسموں کی سختی سے بچنے کے لئے اُن کی کھال کو زیب بدن کرتا۔ مختصر یہ کہ وہ حیرت انگیز ترقی کرتا گیا۔ یہاں تک کہ اُس نے جانوروں کا پالن اور زراعت کے کام سیکھے۔ مویشیوں کے چارہ کی فکر ہوئی۔ اور وہ شاداب چراگاہوں کی جستجو میں ایک میدان سے دوسرے میدان اپنا ٹانڈا ساتھ لئے ہوئے پھرا کرتا۔ رفتہ رفتہ وحشی خانہ بدوش انسان ایک باہنر کسان بن گیا۔ اور جتھہ باندھ کر ایک ساتھ رہنے لگا۔ اب جب پیٹ بھرا اور اطمینان کی صورت نظر آئی تو عقل کا نورانی جوہر جس کو قدرت نے اُس کی رہنمائی کے لئے عطا فرمایا تھا لگا جگمگانے۔ فطرت کے رنگا رنگ عجائبات کو مشاہدہ کر کے حیرت ہوئی اور جی ہی جی میں سوچنے لگا کہ یہ کیا ہے اور وہ کیا ہے۔ زمین کیونکر بنی۔ اور اس پر طرح طرح کے جانور اور بھانت بھانت کے ساگ پات کیوں وجود میں آئے۔ چاند اور سورج کیا ہیں۔ ہوا کیوں چلتی ہے بجلی کے چمکنے اور بادل کے گرجنے کی وجہ کیا ہے۔ غرض ان سوالات نے تمام نوع انسان کو جو کرۂ ارض کے مختلف حصوں پر آباد تھے سخت حیرت میں ڈال دیا۔ ہر ایک قوم نے اپنی اپنی عقل کے مطابق تعجب انگیز قدرتی واقعات کی توضیح کے لئے ایک نہ ایک وجہ قرار دی اور اس طرح آسانی سے اپنے جی کی تشفی کر لی۔ لیکن تم جانو کہ اُس وقت عقل حیوانی کے سوائے اُن کے دماغ میں اور کیا دھرا تھا۔ فہم اور ادراک نے ابھی آنکھ کھولی تھی۔ اور قوائے دماغی کی نشو ونما اب شروع ہوئی تھی۔ ان مشکل پیچیدہ خیالات کی کشمکش نے وحشی انسان کے کمزور دماغ پر غیر معمولی دباؤ ڈالا۔ اور اُس کی دماغی قوتیں اُس کی

تاب نہ لا سکیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دریافت حقیقت میں سب کے سب نے دھوکا اور مغالطہ کھایا۔ یہ کہانیاں جن کو میں یہاں بیان کرنے والا ہوں انسان کے اُنہیں ابتدائی خیالات کی یادگاریں۔ جو اس وقت اکثر شایستہ اور تربیت یافتہ قوموں کے ہاں اعتقاد اور تعظیم کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں +

تحقیقات سے ثابت ہے کہ جب تک انسان کے قوئے دماغی کی کامل ترقی اور پوری اصلاح نہیں ہوتی۔ اس میں حیرت کے ساتھ نرمی اعتقاد کی اک نرالی خصوصیت ہوتی ہے۔ محالات عقل کو وہ ممکن جانتا ہے۔ اَن ہونی باتوں کو بلا تامل مان لیتا ہے۔ آفتاب کا مغرب سے طلوع ہونا اُس کے نزدیک کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ غرض اس طرح کی بھولی بھالی قوت متخیلہ بچوں کے دماغ میں آج بھی موجود پائی جاتی ہے +

نسل بنی آدم نے جب اول اول مشاہدہ اور تحقیقات کے گہوارہ پر قدم رکھا۔ تو اُس کے سارے قوئے دماغی ناقص اور کمزور تھے۔ حواس ظاہری نے اس عالم کے گوناگوں مظاہر قدرت کی طرف توجہ تو دلائی اور اُن کو دیکھ کر اُس کو حیرت بھی ہوئی۔ لیکن نہ اُس کے پاس دریافت حقیقت کے وسائل موجود تھے نہ اُس کی عقل میں دلائل و براہان سے صحیح نتیجہ معلوم کرنے کی قوت تھی۔ جو بات اُس کی عقل میں آئی اُس کو اُس نے صحیح جانا۔ اور اس طرح کارخانۂ قدرت کے مشکل مسائل پر غور و خوض کرتے ہوئے اپنے جی کی اُپج سے طرح طرح کی دلچسپ کہانیاں بنائیں جن کو سن کر ایک تربیت یافتہ مہذب قوم دلچسپی کے ساتھ خندہ زن ہوتی ہے۔ لیکن اکثر ہمارے خوش عقیدہ لوگ جو شایستگی کے کل مدارج طے کر چکے ہیں۔ وہ

آج بھی ان کہانیوں کو صحیح مانتے ہیں - اور وحشی انسان کی جدت اور طباعی پر سر دُھنتے ہیں +

انسان نے عالم توحش میں جو پہلا دھوکا کھایا ہے وہ یہ ہے - کہ اُس نے دنیا کی کل بیجان چیزوں کو ذی حیات تصور کیا ہے - زمین - آسمان - درخت - پتھر - چاند - سورج - ستارے - کل چیزیں اُس کے خیال میں ایک زندہ آدمی ہیں - کوئی ایسی شے نہیں جس میں انسانی خصائل اور جذبات موجود نہ ہوں - لیکن یہ بیجان چیزیں کس طرح کی انسان ہیں؟ یہ بھی وحشی اور غیر مہذب ہیں - اِنکے جذبات تمدن طرز معاش ناشایستہ اور بیہودہ ہیں - وجہ یہ کہ وحشی انسان کی دماغی قوتیں اپنی حالت سے بہتر حالت کا کسی طرح تصور نہیں کرسکتی تھیں +

ہوا کو وحشی قوموں نے پہلے ایک زندہ آدمی خیال کیا تھا - لیکن بعد کو یہ سمجھا کہ وہ روپ بدل کر ایک خوبصورت پرند بن گئی - مصر میں یہ حکایت مشہور ہے - کہ ایک روز ناگاہ کسی شخص نے ہوا کو دیکھا کہ وہ آدمی کی شکل میں ایک وادیئے پر فضا کی سیر کر رہی ہے - یہ دیکھ کر اُس نے چاہا کہ اُس کو ایک پتھر پھینک کر مارے لیکن تم جانو کہ ہوا کب چوٹ کھا سکتی تھی - آن کی آن میں وہاں سے چلتی پھرتی نظر آئی اور دیکھنے والا حیران رہگیا - آرین یہ بیان کرتے ہیں کہ افواج میمون کا جنگی سپہ سالار ہوا کا اک منچلا بہادر فرزند تھا - یونانیوں نے رخش بادپا کی نسل کا سلسلہ ہوا کے ساتھ جوڑا ہے - اہل چین اور روم نے آسمان کی تمکنت اور شوکت دیکھ کر اُس کو ایک جلیل القدر آدمی سمجھا - اور اس خیال کی یادگار ابھی تک وہاں کے مذہبی عقاید میں شامل ہے - آسمان کے جگمگاتے تاروں

کو وحشی قبایل نے زندہ اور مردہ آدمی خیال کیا ہے۔ غرض اسی طرح کی ہزاروں کہانیاں ہیں +

غیر مہذب قوموں نے جس طرح بیجان چیز کو ذی حیات خیال کرنے میں غلط فہمی کی ہے۔ اسی طرح زمین کے جانوروں کو جن کی صحبت میں اُس نے ایک مدت تک اپنی زندگی بسر کی تھی زندہ انسان تصور کرنے میں دھوکا کھایا ہے۔ کسی قوم نے جانوروں کو اپنا عزیز شمار کیا ہے۔ کسی کا یہ خیال ہے۔ کہ انسان اور جانور دونوں نوع واحد ہیں۔ محض اشکال جداگانہ ہیں۔ جن کا تبدیل ہوجانا ایک ادنی سی بات ہے۔ آدمی سے جانور اور جانور سے آدمی بن جانے کی حکائتیں سینکڑوں موجود ہیں جو اُس وقت تک مہذب اور شایستہ لٹریچروں میں بار بار دہرائی جاتی ہیں +

اب میں یہاں پر دنیا کے ہر گوشہ کی رہنے والی قوموں کے قدیم وحشیانہ خیالات کی کہانیاں شروع کرتا ہوں۔ لو سنو۔ نوردے میں ریچھ ایک مرد عاقل اور مہذب مشیر تصور کیا جاتا ہے۔ ہر شخص اپنے گاڑھے وقت میں ریچھ کے پاس سچے خلوص کے ساتھ باادب حاضر ہوتا ہے۔ اور اُس کی رائے دریافت کرنے کا فخر حاصل کرتا ہے ایسے محترم اور عاقل مشیر کا مرنا ایک جانکاہ صدمہ ہے۔ ریچھ کی لاش پر ماتم کرتے ہیں۔ اور اُس کو نہایت تزک و اہتمام سے دفن کرتے ہیں +

دنیا میں بہت سی ایسی قومیں موجود ہیں۔ جو اپنے کو کسی ایک خاص جانور کی نسل تصور کرتی۔ کوئی قوم اپنے کو ہرن۔ اور کوئی مچھلی کی اولاد کہتی ہے۔ کوئی اپنے خاندان کا سلسلہ کچھوے۔ گرگٹ۔ باز یا کبوتر سے

ملاتی ہے۔ یہ خیالات محض تشبیہہ و استعارہ نہیں ہیں۔ بلکہ جو قبیلہ اپنے
کو کسی جانور کی اولاد میں شمار کرتا ہے وہ سچ مچ اپنی رگوں میں اُس جانور
کا خون تصور کرتا ہے۔ اور اسی وجہ سے جو لوگ ایک خاص جانور کی
نسل سمجھے جاتے ہیں۔ وہ آپس میں شادی نہیں کر سکتے۔ اور نہ اُس
جانور کا گوشت کھا سکتے ہیں۔ اسٹریلیا میں ایک حیرت انگیز نئی بات
یہ ہے۔ کہ وہاں کا ایک قبیلہ جو اپنے کو جانوروں کی اولاد کہتا ہے۔ اُس
کے خالہ زاد یا ماموں زاد بھائیوں کو دیکھو تو وہ اپنے کو کسی درخت یا پہاڑ
کی نسل میں شمار کرتے ہیں +

سواحل اسٹریلیا سے گذر کر برّاعظم افریقہ اور امریکہ پر نظر ڈالو۔ تو
وہاں بھی اسی طرح کے خیالات کی جھلک نظر آتی ہے۔ تاریخ ہم کو
بتاتی ہے۔ کہ ان ممالک میں اُس وقت تک سینکڑوں ایسے قبایل
موجود ہیں۔ جو ادنےٰ قسم کے جانوروں کو اپنا عزیز بتاتے ہیں۔ ممنوعات
شادی کے لئے وہاں جو جو قوانین مقرر ہیں۔ اُن پر غور کرنے سے اس
خیال کی پوری پوری تصدیق ہوتی ہے۔ ہندوستان اور عرب کو دیکھو
تو وہاں بھی یہی تماشا نظر آتا ہے۔ اوڑیا یا مندراجی قوموں کے سینکڑوں
خاندان مختلف قسم کے جانوروں کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔
جس جانور کے نام سے جو خاندان مشہور ہے وہ اُس جانور کا گوشت کھانا
حرام مطلق جانتا ہے۔ اوڑیسا میں کچھوے یا ادو کے گوشت کھانے کی ممانعت
اسی اصول کے مطابق ہے۔ غرض اس طرح کے توہمات کی نظیریں دنیا کے
ہر حصے میں پہلو بہ پہلو نظر آتی ہیں +

میں اوپر لکھ آیا ہوں۔ کہ ہر ملک کے خانہ بدوش وحشی انسان نے

جانوروں کو زندہ آدمی تصور کیا تھا۔ مسئلہ تناسخ اس خیال کی ایک مٹی ہوئی یادگار ہے جو اُس وقت تک دنیا کی مہذب قوموں کے ہاں نہایت پاک اور سچے جذبہ کے ساتھ صحیح تصور کیا جاتا ہے۔ آدمی کے جانوروں کے قالب میں بدل جانے کی ہزاروں دلچسپ حکائتیں ہیں۔ اسکاٹ لینڈ کی یہ مشہور کہانی ہے۔ کہ وہاں کوئی بڈھی ساحرہ رہتی تھی جو اکثر خرگوش کی شکل میں شاداب مرغزاروں میں سیر کے لئے جایا کرتی تھی ایک روز اتفاق سے اُس کو کسی شکاری نے دیکھ لیا اور اس کو خرگوش سمجھ کر گولی چلائی۔ خرگوش کے جس عضو میں گولی بیٹھی تھی۔ ساحرہ کا وہی عضو زخمی پایا گیا امریکہ کے کسانوں کے ہاں بھی یہ کہانی مشہور ہے۔ لیکن وہ اپنی ساحرہ کو ایک پرند کے روپ میں اُڑتے ہوئے بیان کرتے ہیں۔ جاپان کے باشندے اس بات کے قائل ہیں۔ کہ مرنے کے بعد اُن کی روحیں لومڑی بن جاتی ہیں۔ مصر اور ہندوستان کے رہنے والے اعتقاد کرتے ہیں کہ جب انسان مرجاتا ہے تو اُس کی روح پھر حیوانات کے قالب میں زمین پر نمودار ہوتی ہے۔ میکسیکو کے مورخین بیان کرتے ہیں۔ کہ وہاں کے عام لوگوں کا یہ خیال ہے۔ کہ جب کوئی حاملہ عورت مرجاتی ہے۔ اور اُس کی لاش دفن کرنے میں مذہبی رسمیں پوری پوری نہیں برتی جاتیں۔ تو اُس کی روح جانور کے قالب میں زمین پر ماری ماری پھرتی ہے۔ اور جب کوئی طفل شیرخوارہ مرجاتا ہے تو اُس کی روح چوہیا بن جاتی ہے۔ ہندوستان میں بہتیرے ایسے خاندان ہیں جن کا یہ عقیدہ ہے۔ کہ جب کوئی آدمی سانپ کے سونگھنے سے مرجاتا ہے تو اُس کی روح سانپ بن کر اپنی پیاری اولاد کی حفاظت کے لئے ہمیشہ آیا

کرتی ہے *
دنیا کے مشہور جادوگروں کی نسبت یہ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ وہ انسان کو جانوروں کی شکل میں تبدیل کر دینے پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ فرانس کا ایک مستند نامہ نگار لکھتا ہے۔ کہ لاپ لینڈ کی جادوگرنیاں آدمی کو بلی بنا دیتی تھیں۔ اور وہ خود بگلا۔ کوا۔ باز یا شاہین کی شکل میں ہوا میں پرواز کرتی ہوئی سیر کے لئے جایا کرتیں تھیں۔ ہندوستان کی ڈائنیں اِس وقت بھی چھوٹے بچوں کو مردہ کر کے جلایا کرتی ہیں۔ اور انسان کو حیوان بنا دینے پر قادر سمجھی جاتی ہیں۔ آدمی کا مسخ ہو کر پتھر یا جانوروں کی شکل میں تبدیل ہو جانا امریکہ اور آسٹریلیا کی مہذب قوموں میں اعتقاد کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ نیوزی لینڈ اور جزائر انڈمن کے رہنے والے یہ خیال کرتے ہیں کہ جب آدمی مرجاتا ہے تو اُس کی روح اُسی جانور کے روپ میں نمایاں ہوتی ہے جس کی وہ اولاد میں ہے۔ مصر میں مردوں کے لئے یہ دعا کی جاتی ہے کہ خدایا تو اُس کی روح کو پوری آزادی عطا فرما تاکہ وہ جس جانور کی شکل کو پسند کرے اُس کو آسانی سے اختیار کرے *

قدیم توہمات کی جیتی جاگتی یادگار جو ابھی تک دنیا کے خوش عقیدہ لوگوں کے ہاں صحیح مانی جاتی ہے۔ وہ بھوت اور چڑیل کی دلچسپ داستانیں ہیں اس کی حکائتیں اس کثرت سے موجود ہیں کہ اُن کے یہاں پر تذکرہ کرنیکی ضرورت نہیں۔ مرجانے کے بعد انسان کی روح بھوت بنکر قایم رہتی ہے۔ کبھی جانوروں کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ کبھی نظروں سے غائب رہتی ہے اور کبھی اپنی ڈرانی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ جدید فلسفہ نے اِن توہمات

کے راز کو دریافت کرنے میں بلا کی تحقیقات کی ہے جن کو بیان کرنے کے لیئے
ایک جداگانہ مضمون کی ضرورت ہے۔ یہاں پر صرف خیالات باطل کی کہانیاں
بیان کرنی ہیں سو ان کو سنئے۔ بھوت کے جو لوگ عامل ہیں وہ اُس کو بلا سکتے ہیں
اشارہ پاتے ہی بھوت ناک سے بھن بھن بولتا ہوا حاضر ہوتا ہے۔ جو خدمت کہو
انجام دیتا ہے۔ جس انوکھی چیز کی خواہش کرو چشم زدن میں لا دیتا ہے ۔
پھول۔ لونگ۔ مٹھائیاں برساتا ہے۔ ناچتا ہے۔ گاتا ہے۔ اور پھر رفوچکر
ہوجاتا ہے۔ قطب شمالی کے باشندوں کا یہ اعتقاد ہے۔ کہ بھوتوں کو زمین
کی آب و ہوا پر پوری قدرت حاصل ہے۔ چاہے تو آن کی آن میں گھنگھور گھٹا
جم کر آئے۔ بجلی چمکے۔ پانی برسے۔ طوفان آئے اور کیا نہ ہو +

اب اُن کہانیوں کو سنئے جو نوع انسان کے وجود میں آنے اور زمین
کے پیدا ہونے کی توضیح کے لیئے بیان کی جاتی ہیں۔ جزیرۂ اسٹریلیا کی
قومیں یہ خیال کرتی ہیں۔ کہ زمین کو ایک دیوتا نے جو کُل پرندوں کا خالق
ہے پیدا کیا ہے۔ اس کی حکایت یوں ہے۔ کہ ایک قدرتی مرغ زار
تھا۔ دیوتا نے جس کا نام پنجل تھا۔ جب چڑیوں کو پیدا کیا تو طائران
خوش الحان کے رنگا رنگ نغموں سے تمام مرغ زار گونج اُٹھا ۔
چڑیوں نے اپنے خالق کی حمد و ثنا کا راگ گایا۔ یہ دل آویز آواز اُس کو
بہت پسند آئی اور اُسی خوشی میں آکر اُس قدرتی مرغ زار کی مٹی کو تراش
تراش کر زمین بنائی۔ کوئی قوم یہ بیان کرتی ہے۔ کہ سارے عالم کا پیدا
کرنے والا ایک ننھا سا کیڑا ہے۔ اُس کی قدرت جوش میں آئی اور کہا کہ ایک
عالم پیدا ہو اور یہ تمام عالم پیدا ہوگیا۔ دوسری قوم اس حکایت سے اختلاف
کرتی ہے۔ اُس کا بیان ہے کہ ننھے کیڑے نے زمین کو اپنی کارگیری سے

بنایا ہے۔ کسی وحشی قوم نے یہ خیال کیا کہ زمین پانی سے پیدا ہوئی ہے۔ کسی
نے زمین کے پیدا ہونے کی یوں حکایت بیان کی ہے کہ قدرت نے فضائے
آسمانی سے ایک حور کو اُچھال دیا۔ وہ گرتے گرتے آخر کو ایک سمندر کے کچھوے
پر جا پڑی۔ اور ان دونوں کے ملنے سے زمین پیدا ہوئی۔ شمالی امریکہ کی بسنے
والی قومیں یہ بیان کرتی ہیں۔ کہ تمام عالم پانی پانی تھا۔ اور اس پر ایک
قدرتی جزیرہ تیر رہا تھا جو کہ بعد کو بڑھتے بڑھتے زمین بن گیا۔ کوئی قوم یہ بیان
کرتی ہے۔ کہ قدرت نے ایک مکڑی کو حکم دیا کہ وہ تمام جال بُن دے بعد کو
زمین اور اُس کی رنگا رنگ مخلوق اُس جال سے پیدا ہوئی۔ لیکن اہل افریقہ
اس حکایت سے اختلاف کرتے ہیں اور اُن کا خیال ہے کہ ایک مکڑا تھا
جس نے زمین کو بنایا۔ کولمبیا کی رہنے والی قومیں دوسری حیرت انگیز کہانی
بیان کرتی ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ ابتدا میں سوائے ایک اُدو کے جو
اُس پانی میں رہتا تھا تمام عالم میں کوئی شے موجود نہیں تھی۔ اُدو اپنی غذا
کی تلاش میں سمندر کی تہ میں غوطہ لگایا کرتا اور جب اُس کے منہ میں کیچڑ بھر
جاتا تو پانی سے اُبھر کر اُس کو اُگل دیتا۔ یہ مٹی تھوڑی تھوڑی جمع ہوتی گئی
اور آخر کو پانی پر ایک جزیرہ بن گیا اور اس سے زمین پیدا ہوئی۔ ایک قوم
جو شائنی کے نام سے مشہور ہے یہ کہتی ہے کہ زمین پر ایک کتا رہتا تھا۔ جس
میں یہ قدرت تھی کہ جب وہ چاہتا انسان کے قالب میں آجاتا۔ اور ایک نہایت
ہی شکیل اور خوبصورت جوان بن جاتا۔ زمین پر رہنے والے دیوؤں کو اُس
کتے پر شک آیا اور اُنھوں نے اُس کو چیر پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا
اِن ٹکڑوں سے زمین کی طرح طرح کی مخلوق وجود میں آئی ؛
نیوزی لینڈ کی رہنے والی قوم جو اپنے خیالات کی پاکیزگی پر فخر کرتی ہے یہ

اعتقاد کرتی ہے کہ ابتدا میں کوئی شے موجود نہ تھی۔ تمام فضائے آسمانی میں ایک خوفناک گھنگھور تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ بعد کو قدرت کاملہ کے حکم سے سارا عالم عدم محض سے وجود میں آیا اور دنیا کے طرح طرح کے جانور اور درخت پیدا ہوئے۔ اہل یونان نے یہ رائے قائم کی ہے کہ زمین اور آسمان کی آپس میں شادی ہوئی اور اس سے تین اولاد پیدا ہوئیں۔ چونچال بچے جب جوان ہو کر پروان چڑھے تو اپنے ماں باپ کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا اور زمین آسمان جو پہلے زن وشوہر تھے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ بحر جنوبی کے جزیروں میں زمین آسمان کی شادی کا ہونا ایک پاک اور صحیح خیال تصور کیا جاتا ہے +

ہندوستان کی آرین قوم کے خیالات جن سے وید اور پران کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ دلچسپ ہیں۔ رگ وید کے نویں اشلوک میں یہ لکھا ہے کہ پروشا ایک عظیم جثہ ذی حیات تھا۔ دیوتاؤں نے اس کے اعضا کے ٹکڑے پرزے اڑا دیئے۔ ان ٹکڑوں سے مختلف ذات کے لوگ اور طرح طرح کی مخلوق پیدا ہوئی۔ دوسری حکایت یوں بیان ہوتی ہے کہ برہما نے اپنے منہ سے ایک ایسی زبردست پھونک ماری کہ اس سے ہزاروں دیوتا پیدا ہو گئے۔ ان میں سے ایک دیوتا نے جو صنعت اور کاریگری کا دیوتا ہے زمین اور آسمان کو پیدا کیا۔ ایک اور داستان خلقت یہ بتاتی ہے کہ زمین کو ایک دیوتا نے جس کا نام اتلایت تھا پیدا کیا ہے۔ یہ داستان اُدو اور کچھوے کی حکایت سے جس کو اوپر لکھ آیا ہوں بہت ملتی جلتی ہے۔ آرین قوم نے زمین کے گوناگون جانور اور درخت کے وجود میں آنے کی یوں توضیح کی ہے۔ کہ ایک ذی حیات جس کا نام پرَاشا ہے خدا کی زمین پر تن تنہا تھا۔ خدا کی قدرت سے اس کا جسم واحد دو قالب میں بدل گیا۔ اس میں ایک ... ی

اور دوسرا میاں بنا۔ بیوی نے میاں کو اپنا خالق سمجھ کر اُس کے ساتھ اختلاط کو گناہ تصور کیا اور وصل سے انکار کیا۔ جس طرح یونانیوں کے ہاں نمپس زُٹیس کی گود سے نکل بھاگی تھی اسی طرح پروشا کی بیوی اُس کے پرشوق آغوش سے مچلکر بھاگی۔ میاں نے جان توڑکر بیوی کا پیچھا کیا۔ بیوی یہ دیکھ کر زمین پر لوٹ گئی اور ایک جانور کا قالب بدلکر بھاگی اور اس طرح وہ مختلف حیوانات کا روپ بدلتی ہوئی بھاگتی چلی۔ لیکن میاں کو بھی یہ نسخہ معلوم تھا۔ بیوی نے جس جانور کی شکل اختیار کی میاں بھی وہیں لوٹ پوٹ کر اُس جانور کا نر بن گیا۔ غرض اس طرح ان دونوں کے وجود سے زمین کے طرح طرح کے حیوانات وجود میں آئے۔ دوسری حکایت یوں ہے کہ تمام عالم ایک انڈے سے پیدا ہوا ہے جو ہمیشہ سے خود بخود موجود تھا +

یورپ کی ایک کہانی اور سن لیجئے اسکانڈی نیویا کے رہنے والے یہ بیان کرتے ہیں کہ دنیا میں برف کے سوا اور کوئی چیز موجود نہ تھی۔ اس قدرتی برف کے پگھلنے سے پانی بنا اور اس سے ایک عظیم جثہ قوی ہیکل ذی حیات جس کا نام جابیر تھا پیدا ہوا اور اُس کے پہلو سے ایک عورت پیدا ہوئی۔ بر نامی ایک اور دوسرا دیوتا تھا جو گائے کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔ اُس کے تین فرزند ہوئے ان لڑکوں نے جو بہت بہادر اور توانا تھے ساتھ ملکر جابیر کو مار ڈالا۔ اور اُس کے گوشت سے زمین پیدا کی خون سے زمین پر دریا اور سمندر بہائے۔ ہڈیوں سے پہاڑ بنائے اور بال سے زمین کے گوناگوں نباتات اُگائے +

ایک اور قوم نے آدمی کے پیدا ہونیکی کہانی یوں بیان کی ہے۔ کہ ایک دیوتا جس کا نام میٹو تھا زمانہ ابد سے گہری نیند سو رہا تھا۔ جب اُس کی آنکھیں کھلیں تو اس نے اپنے آپ کو تن تنہا پایا اُس نورانی تنہائی سے اس کا جی گھبرانے لگا۔ اس نے اپنے پہلو سے ایک گوشت کا ٹکڑا کاٹا اور اُس کو خاک

پیدا ہو گئی ہو۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ کنوارپن کی زندگی اب وبال جان ہو گئی۔
صبح اُٹھا۔ ناشتہ کیا۔ ورزش کی۔ غسل کیا۔ ملبوس ہؤا۔ اور کچہری کی راہ لی۔
دن بھر مقدموں کی جھک جھک پٹ پٹ۔ وکیلوں کی ہیچ پیچ اِدھر اُدھر اگر کے
چار بجے گھر آئے اِتو کیا۔ بس ہم ہیں اور ہمارا گھر۔ یا نوکر چاکر۔ جن سے ایک
دفعہ ہنس کر بات کر لو تو بس سر پر ہی چڑھ جاتے ہیں۔ کتابیں پڑھو تو دن بھر
کی دماغی کوفت کے بعد دماغ صحیح کام نہیں کرتا۔ باہر ملاقات کے کمرے
میں بیٹھو تو اہل غرض سچی جھوٹی خوشامد سے دماغ چاٹ جاتے ہیں۔ اور پھر
تم جانتے ہی ہو۔ ع

سلام روستائی بے غرض نیست

ملنے ملانے جاؤ تو اس دنیا میں طرح طرح کے لوگ ہیں۔ سرکاری ملازمین
تو عموماً میری ہی طرح مبتلا ہیں۔ پھر اپنے افسروں کے ہاں جاؤ تو ادب۔ تعظیم۔
جی۔ جناب۔ درست۔ بجا ارشاد ہؤا کہکر چلے آؤ۔ اور خوشامدیوں میں نام
لکھواؤ۔ اپنے ماتحتوں کے ہاں جاؤ۔ تو لوگ کہیں کہ اپنی عزت رکھنی نہیں آتی
دوسرے پھر وہی بناوٹی تعریف اور چاپلوسی۔ برابر والوں سے ملو تو وہ اپنے
اپنے رنگ میں مست ہیں۔ ایک صاحب ہیں وہ بی شیدا کے فدائی ہیں۔ کبھی
دیکھو تو راگ رنگ ہیں اور کبھی جو تم پیزار۔ اب یا تو خود بھی اُن جیسے بن جاؤ۔
اُن کے رنگ میں رنگے جاؤ۔ اُن کے جھگڑے فیصل کراؤ۔ بیچ بچاؤ کراؤ۔
ایک سے بھلے بنو تو دوسرے سے بُرے۔ یا اگر اُن کے شغل کے ایک رُکن نہ
بنو تو وہ تم سے ایسے بھاگیں گے کہ جیسے توبہ سے شیطان اور اگر اُن کے شریک
حال ہوتے ہو تو نہ صرف عادت بگڑتی ہے اور بدنامی ہوتی ہے۔ بلکہ یہ جو تھوڑا
بہت چین اور بعض وقت سکوت اور تنہائی کی راحت ہوتی ہے۔ اُس سے

بھی گئے۔ یعنی کبھی کچہری میں "بی شیدا جان" کا رقعہ پہنچا کہ "تمہیں میری جان کی قسم کچہری سے سیدھے میرے ہاں آنا۔ میں عجب مصیبت میں پھنس گئی۔ اور یہ کرتوت سب آپ کی۔ نہ تم اُس دن ملاپ کراتے نہ آج کو یہ نوبت پہنچتی"۔ یہ نہیں تو رات کو بارہ بجے خود حضرت ہی نے آن جگایا۔ کہ چلو آج بڑے زور کا مجرا ہے۔ سب جمع ہو گئے ہیں۔ تمہارا ہی انتظار ہے۔ غرضیکہ عیاش مزاج لوگوں کی صحبت میں یہ مصیبت اور دوسروں کے پاس جاؤ تو بعضے تو ایسے ہیں کہ وہ اپنے پیشے کے ذکر کرنے سے کبھی نہیں تھکتے۔ پولیس مین ہیں تو سُنیئے فلاں سپاہی کو یوں گالی دی۔ ڈھکے سارجنٹ کو یوں قید کرا دیا بڑے صاحب تک کی سفارش نہیں چلی۔ فوج مین ہیں تو بس قواعد۔ پریڈ۔ مصنوعی جنگ۔ اجیٹن صاحب۔ رسالدار صاحب۔ کپتان صاحب کے نام سُن لو۔ اور ان کے جھگڑے سُنتے جاؤ۔ کوئی صاحب ریل کے محکمے میں یا تار میں نوکر ہیں۔ تو تھری اَپ اور فائیو ڈاؤن۔ اور ڈی ٹی۔ ایس نے وائر کیا میں نے ٹی۔ ایس کو فارورڈ کیا کے جملے سن لو۔ اسی طرح انجنیری محکمے والا اپنے ایس۔ ای۔ اور اِی۔ اِی کے قصے سناتا ہے۔ اور میں نے اس کلورٹ کے لئے ڈی۔ او میں انڈورس کیا۔ اور وہ آرچ ایسی تھی۔ اور وہ گرڈریوں تھا۔ اور فلاں لیول صحیح تھا یا غلط تھا۔ غرضیکہ اینٹ۔ پتھر۔ روڑا۔ مٹی۔ بس یہی سُن لو۔ ضلع کی کچہری والے ڈپٹی کمشنر اور ڈسٹرکٹ جج اور چیف کورٹ اور اپیل اور استغاثہ اور جرم اور دفعہ کے لفظوں سے ناک میں دم کر دیتے ہیں۔ اب بھلا بتاؤ کہ کسی سے کیا ملیں اور کیا کریں۔ کیا نہ کریں۔ ہم لوگوں میں کس قدر عیب ہے۔ کہ اپنے عہدے اور اپنی شخصیت میں تفاوت قائم نہیں رکھ سکتے۔ کچہری میں تحصیلدار ہیں تو گھر میں بھی تحصیلدار ہیں۔

محلے والوں کے لئے بھی تحصیلدار ہیں۔ اور دوستوں کے لئے بھی تحصیلدار ہیں +

میں کیا کہتا تھا۔ اور کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ میرا مطلب یہ تھا۔ کہ اس فرعونیت اور شیطانیت کی بھی حد ہوتی ہے۔ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ انسان سب لہو و لعب و لغویات سے نہ صرف تھک جاتا ہے بلکہ عاجز آجاتا اور اس کا دل سکون اور راحت کا متلاشی ہوتا ہے۔ اس کو کسی نرم اور لوچدار شے کی ضرورت ہوتی ہے کہ جس کے اثر سے اُس کی دُرشتی پر۔ اُس کے ناتراشیدہ پن پر رندہ ہو +

میں اپنی کہتا ہوں۔ کہ جب میں دوستوں کی دوستی۔ عزیز و اقارب کی یگانگت و محبت اور دشمنوں کی دشمنی سے تھک جاتا ہوں۔ تم "تھک جاتا ہوں" کے لفظ پر چونکو گے مگر میں نے یہ لفظ بہت بامعنی لکھا ہے۔ پیارے امین معاف کرنا۔ تم بھی دوست ہو۔ مگر سچ یہ ہے کہ دوستی۔ رشتے داری۔ دشمنی سب میں ایک پہلو خود غرضی۔ دنیاداری اور مطلب پرستی کا ایسا نکلتا ہے۔ کہ انسان کا جی کھٹا ہو جاتا ہے۔ پھر ہر شخص کو اپنا آپا لگا ہوا ہے۔ کیوں نہ خود غرض ہو۔ خود غرضی ایک طرح مجبوری ہے مقصد تنازع البقا ہے۔ کیوں کوئی اپنی خوشی یا راحت کا مدار دوسرے پر رکھے۔ کوئی آپ کے لئے وقف نہیں ہے۔ کہ ہمیشہ آپ کی دلجوئی میں لگا رہے۔ آپ کے دُکھ سُکھ میں شریک ہو۔ کسی پر آپ کیوں بھروسہ کریں کہ وہ آپ کے بھید اپنے ہی تک رکھے۔ دوست۔ احباب۔ ماں۔ بھائی۔ بہن سب دوسرے تعلقات سے ایسے جکڑے ہوئے ہیں کہ ایک موقعہ پر تم سے بیوفائی کرنے کے لئے مجبور ہیں۔ اس کشاکش میں اگر کوئی

مونس و غمخوار اور سچا محرم راز ہو سکتا ہے تو وہی جس کو تم اگر اپنا بہترین حصہ دیگر کہو تو بجا ہے۔ انسان اگر مراد ہے مجموعۂ زن و شوہر سے (کیونکہ بغیر عورت و مرد کے انہماک باہمی کے انسان انسان نہیں ہو سکتا) تو میاں بیکا نصف ٹکڑا ہے اور بیوی بھاری نصف حصہ ہے۔ غم و رنج میں زیادہ حصہ لینے والی راحت و خوشی میں کم شریک ہونے والی۔ میاں کو آدمی بنانے والی۔ بچوں کو پالنے والی۔ گھر کو گھر بنانے والی۔ سوائے بیوی کے اور کوئی ایسی ذات ہے۔ جو ان خوبیوں سے منصف ہو؟ بتا اے میرے حسن پرست عاشق مزاج۔ مگرمس صفت دوست بتا سوائے بیوی کے ہے کوئی دوسری عورت (اور بیوی بھی ہندوستانی بیوی) جو تیرے عیش کو اپنے عیش پر ترجیح دے۔ تیری راحت کو اپنے آرام پر مقدم سمجھے۔ خود موٹے چھوٹے میں گذر کرے۔ تجھ کو نانا شاہ بنائے رکھے۔ انکسار کی تصویر! ایثار نفس کی مورت! مہر و وفا کی دیبی! اگر کوئی عورت ہو سکتی ہے تو بیوی ہو سکتی ہے +

آراستہ بنگلہ۔ خوشبو سے مہکتا ہوا چمن۔ نوکر چاکر گاڑی گھوڑے بغیر اس ایک عنصر راحت بخش کے باعث سرگرانی ہیں +

تم خوش نصیب ہو کہ اسی قید تنہائی سے آزاد ہو گئے۔ اس فقرے پر تم ہنسو گے مگر نہیں۔ شادی کو جو لوگ قید کہتے ہیں وہ آزادی اور پابندی کے مفہوم کو اچھی طرح نہیں سمجھتے۔ آزادی کے معنے اگر اس بے لگام برسات کے گدھے کے ہیں جو ہری ہری گھاس کی کیاریوں میں کلیلیں مارتا پھرتا ہے اور کبھی گھاس میں منہ مارتا ہے۔ کبھی ہیچوں ہیچوں کرتا ہے۔ مگر جب اس کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ اتنی ساری گھاس کس طرح ختم کردوں گا۔ تو اس کی

بھوک اڑ جاتی ہے۔ اگر آزادی کے یہ معنے ہیں تو یہ آزادی گدھوں ہی کو مبارک رہے۔ اصل آزادی کی بنیاد پابندی پر ہے۔ ایک دوسرے کے حقوق کی نگہداشت رکھ کر اپنی خوشی کے مالک ہونا سچی آزادی ہے۔ شادی میں بیوی کے حقوق کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ لوگ اس کو پابندی یا قید کہتے ہیں۔ مگر اس پابندی سے سچی آزادی پیدا ہوتی ہے۔ اس سے تمہاری منتشر قوتیں ایک جگہ مجتمع ہو جاتی ہیں۔ تم ایک ہی منزل کے سالک ہو جاتے ہو۔ تمہارا مقصد زندگی قائم ہو جاتا ہے۔ اور اُس کے حصول کی یکسوئی کے ساتھ کوشش میں مصروف ہو جاتے ہو اور یہی صورت دنیا میں کامیابی اور ترقی کی ہے . . . . میں پھر خیالات کی رو میں بہ گیا۔ تمہیں تمہاری شادی شدہ زندگی پر مبارکباد دیتا تھا۔ ایسا تم معلوم ہوتا ہے۔ اپنی اس نئی زندگی کی قدر نہیں کرتے۔ تعجب ہے۔ ایک دفعہ مجھ کو یاد ہے۔ جب ہم تم کشمیر گئے تھے تو تمہارے خیالات اس بارے میں مجھ سے متفق تھے۔ مگر جیسے میں نے پہلے لکھا ہے۔ تمہاری طبیعت ہمیشہ سے متلون واقعہ ہوئی ہے۔ تمہاری زندگی ایک تیتری کی سی زندگی رہی ہے۔ اس لئے یکجائی اور یکسوئی تمہارے لئے بہت مشکل ہے اور غالباً یہی وجہ ہے۔ جو تم شادی کر کے بہت خوش نہیں معلوم ہوتے۔ ممکن ہے کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہو۔ اس کے رفع کرنے کی صورت یہی ہے کہ تم اپنی نئی زندگی کے تجربات سے آگاہی بخشو۔ والسلام اب صبح ہونے آئی اور آنکھوں میں کچھ نیند بھی معلوم ہوئی ہے۔ لو رخصت!

تمہارا

کمال

"دارالمحن" یکم جنوری دہلی

عزیز دوست کمال۔ خط تمہارا موصول ہوا۔ مفصل جواب تو پیچھے دوں گا۔ پہلے نئے سال کی مبارکباد تو لے لو۔ میرے لئے تو یہ سال اس نئی زندگی کی ایک مزید تفسیر کا ایک نیا باب ہوگا۔ یعنی تمہارا عاجز دوست اب صاحب اولاد ہوگیا۔ یا اگر اسی مطلب کو عورتوں کی زبان میں ادا کیا جاوے تو یہ کہنا چاہئے۔ کہ تمہاری بھاوج کے دل بہلانے کو خدا نے ایک کھلونا بھیجدیا (دل بہلانے کو یا جی جلانے کو یہ تو بعد میں معلوم ہوگا) دیکھا کمال۔ جس شخص کو تم حقیر لڑکا سمجھتے تھے۔ جس پر چھچھورے پن کا الزام لگاتے تھے۔ وہ اب ایک بچے کا باپ ہے۔ آج سے تم اس کی عزت کرنی شروع کردو۔ خیر یہ تو مذاق کی باتیں ہیں۔ اب تم اپنے خط کا جواب سنو۔ اول تو اس وقت کی ہی کیفیت سن لو۔ مجھے کالج جانا ہے۔ بیکن اور ہیملٹ کا مطالعہ کرنا تھا۔ کیونکہ یہ دونوں کتابیں آج جماعت میں شروع کرانی تھیں۔ مگر اول رات سے تو بیگم صاحب کی طبیعت درست نہ تھی۔ بارہ بجے سے درد شروع ہوئے اماں جان اور پھوپی جان اور خالہ جان غرضیکہ سارے کا سارا کنبہ جو مہینہ بھر سے اس وقت کے انتظار میں ہمارا مہمان تھا۔ آکر کمرے میں جمع ہوگئے۔ صبح کے تین یا چار بجے بچہ ہوا۔ اُس وقت سے اس وقت تک ڈولی پر ڈولی اُتر رہی ہے۔ مجال ہے جو یہ تانتا ایک لمحے کے لئے تھم جائے۔ رشتے۔ کنبے کی عورتیں تو ایک طرف رہیں۔ محلے اور پڑوس کی عورتیں بھی آن دھمکی ہیں۔ آج ثابت ہوا کہ اس شہر میں مردوں کی نسبت عورتوں کی آبادی شاید دس گنی زیادہ ہوگی گھر میں نوکر ماماؤں کی چیخم دھاڑ اور اُن کے بچوں کے رونے کے غل میں کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ اس پر طرہ یہ کہ زنانی ڈیوڑھی کی طرف بھانڈوں

نے الگ طبلے کھڑ کانے شروع کئے ہیں۔ اور "کس کے ہوا بیٹا" کی کرخت آواز اور "دل پہ وحشت کا تقاضا ہے نکل جانے دو" کی بوسیدہ لے سے کان کے پردے الگ پھٹے جاتے ہیں۔ اب بھی اگر یہ غلغلۂ شادمانی فرشتے نہ سنیں تو بھانڈوں کا قصور نہیں۔ مجھے تو یہ ڈر ہے۔ کہ کہیں فرشتے صاحب اس پیش از وقت خوشی سے جلکر بچے کی قسمت میں رنج اُٹھانا نہ لکھدیں۔ میری مصیبت تو ظاہر ہے۔ کہ تنہائی کا امن تو بجائے خود رہا۔ کتابوں کے ضروری مطالعہ کا موقعہ نہیں۔ اب کالج جاؤں گا کتابیں تو کیا پڑھاؤں گا۔ شادی شدہ زندگی کی فلوسفی پر البتہ لکچر دیدوں گا +

برادرم تم کو نیند نہ آنے کی شکایت ہے۔ اور یہاں یہ رونا ہے کہ جب سے بیگم صاحبہ کے عزیز واقارب آئے ہوئے ہیں نیند بھر کے سونا نصیب نہیں ہوا۔ غضب ہے نا۔ رات بھر تو بچوں کی چائیں چائیں میں نیند نہیں آسکتی۔ صبح جو سونے کا وقت ہوتا ہے۔ تو حضرت قبلہ خسر صاحب اُٹھا دیتے ہیں کہ نماز نہیں پڑھتے تو اُٹھ تو بیٹھو۔ یہ برکت کا وقت ہوتا ہے اسوقت سونا نحس ہے۔ اب تو یہ عالم ہے کہ پلنگ پر لیٹا اور آنکھیں پٹ سے بند ہوئیں۔ اگر اس کو تم شادی کی برکت سمجھو تو بے شک یہ برکت تو مجھے آجکل حاصل ہو گئی ہے +

پیارے دوست شادی بھی اُنہی چیزوں میں سے ہے۔ جو ؏
خوشتر آید در حدیث دیگراں

واقعی تم اپنی زندگی کی تنہائی کو میری زندگی سے مقابلہ کرتے ہوئے زیادہ تکلیف دہ پاتے ہوگے۔ اور دور سے میری زندگی تم کو قابل رشک معلوم ہوتی ہوگی۔ مگر اس کی حقیقت۔ ؏

دل من داند و من دانم و داند دل من

شادی کے دن سے آج تک کا سارا قصہ لفظ بہ لفظ سناتا ہوں۔ اس سے تم خود نتیجہ نکال لینا کہ تمہاری تنہائی قابلِ رشک ہے یا میری دوبالا زندگی۔

شادی کے زمانے میں تو رسم و رواج باعث حجاب ہوتے ہیں۔ اس کے بعد جاڑے جاڑے تو یہ حال رہا کہ دن بھر ہمیں یہ نہیں معلوم کہ بیوی کون ہے اور بیوی یہ نہ جانے کہ میاں کون۔ رات ہوئی اور جب سب سونے والے ہوئے تو جس طرح مرغیوں کو خانے دڑبے دڑبے کرتے ہیں۔ ہم کو بھی ایک کابک میں بند کر دیا جاتا تھا۔ شرم و حیا ہندستانی شریف عورتوں کا ایک ایسا جوہر ہے جس کی وہ ضرورت سے زیادہ پرورش کرتی ہیں۔ چنانچہ اُن کے کھولنے میں بہت سی دقتیں پیش آئیں۔ خدا خدا کرکے کئی مہینے کی کوشش کے بعد اتنا ہوا کہ وہ مجھ سے بات چیت کرنے لگیں۔ جب تک وہ شرماتی تھیں۔ تو آدھی آدھی رات اسی جھک جھک میں گذر جاتی تھی کہ تم بات کیوں نہیں کرتیں۔ آخر جب میں نے اس پر متواتر زور دیا کہ شاید تم کو مجھ سے نفرت ہے جو تم نہیں بولتیں تب بولیں اور بولیں تو ایسی بولیں کہ مجھے لاجواب کر دیا۔ یعنی کہنے لگیں آخر میں کیا باتیں کروں۔ میں بھی پریشان ہوا کہ سچ تو ہے دو نئے شخصوں میں جو ایک دوسرے کے گھر کے حالات سے بھی واقف نہیں کیا باتیں دلچسپی کی ہو سکتی تھیں۔ میں نے اپنی جنس کی عادت کے موافق اُن کے حسن و جمال کی تعریف میں اول تو سلسلۂ گفتگو نکالا۔ دو ایک دن کے بعد یہ بھی ختم ہوگیا۔ پھر اُن کی تعلیمی حالت کے قصے شروع کئے۔ پھر

کچھ میاں بیوی کے تعلقات پر لکچر دیئے۔ غرضیکہ بولنے والا زیادہ تر میں ہی ہوتا تھا۔ وہ بچاری بس ہاں ہوں کر دیتی اور چپ ہو رہتی۔ میں بھی دل میں سوچتا کہ آخر وہ بات بھی کرے تو کیا کرے۔ خیر میں نے سوچا۔ کہ جب تک دونوں بے تکلفی کے ساتھ علیحدہ مکان میں دن رات ساتھ نہ رہینگے سلسلہ گفتگو کے لئے مضمون ملنے مشکل ہیں۔ جاڑا بھی ختم ہونے آیا۔ گرمی میں کنبے کے مکان میں نئے میاں بیوی کا رہنا اُن کے لئے بے لطفی سے خالی نہیں اور اوروں کے لئے بے شرمی و بے حیائی ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے قدیم مکان دارالامن کو آراستہ پیراستہ کیا اور شادی کے پانچ مہینے بعد بیگم صاحب کو اپنی ملکہ اور اس مکان کی مالکہ یعنی صاحبۂ خانہ بنا کر لا بٹھایا۔ آہ کمال نہ پوچھ اُس دن مجھے کس قدر خوشی کی بے چینی تھی۔ میرا وہ مکان جس کو میں نے برسوں کی محنت سے کل کا کیا تھا اور جس پر مجھے ایک طرح کا ناز تھا شادی ہونے سے کچھ دن پہلے سے مجھے سونا سونا سا معلوم ہوتا تھا۔ آج وہ دن تھا۔ کہ یہ کمی بھی پوری ہونے والی تھی۔ پھر مجھے جتنی بھی خوشی ہو تھوڑی تھی۔ میں تم کو یہ سب باتیں اس لئے سُنا رہا ہوں کہ تم یہ نہ سمجھو کہ میں شادی کرنا نہ چاہتا تھا۔ اس لئے شادی کے بعد میری زندگی تلخ ہو گئی۔ نہیں میں خود تمہاری طرح خیالی دنیا کی بلند پروازیوں میں اُڑا اُڑا پھرتا تھا۔ مگر ؎

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

خیر تو اب سنے جائیے۔ ہاں تو بیگم صاحب دارالامن میں آگئیں۔ اُن کے ساتھ اُن کی والدہ بھی آئی تھیں۔ مگر دو دن رہ کر تشریف لے گئیں۔ صرف ایک ددا اور ایک مغلانی اور دو مامائیں رہ گئیں۔ پہلی دقت یہ واقع ہوئی۔

کہ یہ لشکر خدامہ چاہتا تھا کہ جہاں بیگم رہیں ہم بھی وہیں رہیں۔ اور میرے ہاں نوکروں کی جگہ بالکل علیحدہ ہے اور میں خود ان کو دور رکھنا چاہتا تھا۔ مگر بیگم نے سونے کے کمرے کے پیچھے جو کپڑے بدلنے کا کمرہ تھا۔ اس کو خالی کرا دوا اور مغلانی کے لئے اس میں جگہ کر دی۔ رات کو اوپر کوٹھے پر بیگم کو ڈر لگتا تھا۔ لہذا مغلانی اور دوا کا پلنگ پاس ہی بچھتا تھا۔ جب میں آ جاتا۔ تو وہ الگنی کے اس طرف پردے کے پیچھے ہو جاتیں۔ میں نے بہتیرا چاہا۔ کہ یہ "پس پردہ" کی چخ دور کر دوں۔ مگر بیگم کا ڈر ایسا تھا کہ میری نہ چل سکی۔ اس "ڈر" سے یہ نہ سمجھنا کہ بیگم سے میں ڈرتا تھا۔ بلکہ وہ خود ایسی ڈرپوک تھیں کہ ایک دن اوپر سے بلی کود دی تو وہ ایسی چیخیں کہ محلے والے جاگ پڑے ہوں گے۔ پاس تھی مسجد وہاں بعض وظیفہ گزار رات کو قرآن شریف یا وظیفہ وغیرہ پڑھتے تو اس کی آواز مسجد کے گنبد میں سے گونج کر آتی۔ اس سے بیگم صاحب ڈرتی تھیں کہ یہ تو کوئی جن قرآن پڑھتا ہے۔ اُس دوا اور مغلانی نے اُلٹا اور بہکانا شروع کیا اور یہ پٹی دی کہ یہ تو مکان ہی منحوس ہے اس کو چھوڑ دو۔ یہاں جھگڑے کی بنا شروع ہوتی ہے۔ ان کی تو ایک بات اور ضد ہوئی۔ اور مرا برسوں کا بنا بنایا گھر بگڑتا تھا۔ غرضیکہ مدتوں اس پر بحث رہی آخر شروع وہ اپنے میکے چلی گئیں اور میں نے خسر صاحب سے ترکیب سے کہلا بھیجا کہ اس دفعہ دوا اور مغلانی کی ضرورت نہیں ہے۔ خیر آپ کے جو آئیں تو۔ اور یہی گُم تھا پہلی دفعہ تو وہ مہمان تھیں یعنی کھانا وغیرہ باہر باورچی پکاتا تھا "نیکر و" میرا بائے (Boy) نکلا لکلایا کھانا اندر لے آتا تھا۔ سوائے دو ایک دفعہ مغلانی کے کھانے پر جھگڑا ہونے کے اور سب خیریت رہی مگر اس دفعہ بیگم صاحب نے کہا کہ باہر پکنے میں خرچ بھی زیادہ ہے اور کھانا بھی اچھا نہیں ملتا۔ میں نے بھی سوچا کہ واقعی عورتیں ہی اس کام کو خوب سمجھتی

ہیں۔ یہ کام ان کے ہی زیر تحت ہونا چاہئے۔ چنانچہ کھانا پکانے والی ماما رکھی گئی۔ کھانا گھر میں پکنا شروع ہوا۔ اب سنئے کہ صبح اُٹھتے ہی منہ دھونے سے پہلے میرا معمول تھا کہ جاڑوں میں چاء اور نیم بریان انڈے اور توس کھاتا تھا۔ گرمی میں چائے کی بجائے دودھ پیتا تھا۔ جس دن ماما آئیں۔ اُس دن بیگم نے خود میرے لئے تکلیف فرمائی۔ انڈے نیم بریان کیا بریان سے بھی زیادہ تاؤ کھا گئے تھے۔ کرچھے کا بچا ہوا میلدار گھی اُس پر اور ڈال دیا گیا تھا۔ توس اتنا موٹا اور بھدا کٹا تھا کہ ہاتھی کا روٹ معلوم ہوتا تھا۔ ایک طرف سے وہ بھی جل گیا تھا۔ ایک طرف بالکل کچا تھا۔ پھر اس پر غضب یہ ہوا۔ کہ چھری سے جو میں نے کاٹا اور منہ تک نوالہ کانٹے میں لایا تو پیاز کی سخت بو۔ منہ سے کچھ بولوں نہیں مگر حیران۔ کانٹے کو سونگھا تو بو نہ تھی۔ معلوم ہوا چھری میں تھی۔ چھری کے دستے سے میرے ہاتھ میں بھی پیاز کی بو ہو گئی۔ پوچھا تو پتہ چلا کہ ماما نے اس سے پیاز کتری تھی۔ بیگم نے احتیاطاً اس کو بہت کچھ دھویا بھی تھا۔ مگر میری ناک کا قصور تھا کہ پھر بھی بو آ ہی گئی۔ خیر یہ تو پہلے دن کا واقعہ ہے۔ پھر کسی دن چاء ایسی تیز کر دی کہ جوشاندے کا مزا آنے لگا۔ ایک دن جب لپٹن چاء کا ڈبا ختم ہو گیا۔ تو بیگم نے چپکے سے دو پیسے کی پنساری کے ہاں سے منگا کر پکوا دی۔ نہ پوچھو کہ کیسی طبیعت جلی ہے۔ کسی دن شکر میلی ہوتی تھی۔ تو کسی دن چاء کی پیالی عمدہ طرح صاف نہ ہوتی تھی۔ جب میری شکایت بڑھنے لگی۔ تو اُدھر سے یہ تقاضا شروع ہوا۔ کہ اس موئے فرنگیوں کے ناشتے کو چھوڑ ہی دو نا۔ صبح ہی اپنے حلوا پوری ہوا۔ سموسے ہوئے۔ دودھ جلیبیاں ہوئیں بس ناشتہ کر لیا۔ گرمیوں میں اولے کا شربت۔ ستو۔ برف

یہ چیزیں مفرح ہوتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ بادام پسوا کر پی لئے۔ اب میں کیا کرتا۔ لاچار میں نے اپنے دل میں کہا۔ کہ بخشو بی بلو ٹی۔ چو ہا لنڈورا ہی جیئے گا۔ مجھے تمہاری تلواپوری اور سموسے نہیں چاہئیں۔ میں باہر مردانے میں ہی ناشتہ کیا کروں گا۔ یہ پہلی وجہ ہوئی گھر سے باہر جانے کی اور رفتہ رفتہ پلنگ بھی باہر چلا گیا +

اب ذرا ذرا سے قصے کیا کیا لکھوں یاد بھی تو نہیں سب ہے۔ کبھی میرے کپڑوں کی دھلائی پر جھگڑا اٹھا۔ کہ کالر اور قمیضوں کی دھلائی اتنی کیوں دی جاتی ہے۔ ایک دن کا ذکر سنو کہ میں اپنے پڑھنے کے کمرے میں تھا۔ بیگم دیکھتا نہیں۔ دھوبی جو آیا۔ تو ملازم نے گھر میں کہا کہ صاحب کے جو کوئی کپڑے اندر ہوں وہ بھیج دو۔ بیگم نے فوراً ماما کو بھیجا کہ جا موئے دھوبی سے کپڑے کی دھلائی چکا لے۔ وہ تو یونہی بے پوچھے گچھے دھلائی دیدیتے ہیں۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ شام کو جو میں گھر میں گیا تو بڑی فتحمندی کے لہجے میں بیگم صاحبہ نے فرمایا۔ کہ دیکھا تم دھوبی کو ہمیشہ سات روپیہ سینکڑہ دھلائی دیتے تھے۔ ہم نے دو پیسے کپڑے پر چکا لیا۔ میں گھبرا گیا۔ کہ میری سات سات روپے کی قمیضوں کا خون کرایا۔ دھوبی کو بلا کر پوچھا تو معلوم ہوا۔ کہ وہ یہ سمجھا ماما اپنے کپڑوں کی دھلائی چکا رہی ہے۔ تو اُس نے دو پیسے کپڑا کہہ دیا +

ایسی ایسی اور ہزاروں باتیں ہیں۔ بس کیا کیا لکھوں یہ سمجھ لو۔ کہ زنانہ گھر بھی میں نے مردانے مکان کی طرح آراستہ کیا تھا۔ مگر پلنگوں پر سے مسہری اُٹھ گئی۔ کہ اس میں بیگم کا جی گھبراتا تھا۔ تابوت معلوم ہوتا تھا کمرے میں دروازوں کے پردے اُتار دیئے گئے۔ کہ مفت میں کواڑوں

سے پھٹتے تھے اور آتے جاتے بالیوں مین الجھتے تھے - میزیں - کوچیں اور اس کے نیچے کی قالین سب اٹھا دیئے گئے - اب کمرے میں دری بچھی ہوئی ہے - آدھے میں چاندنی ہے - برآمدے کی دری اٹھا دی گئی - وہاں بوریئے ہی پر قناعت ہے - پنکھا اور پنچا کیا گیا - کیونکہ دوپہر کو نیچے ہی سویا جاتا ہے - غرضیکہ بیگم نے اپنے آرام کے مطابق گھر کر لیا - جس کا نام میں نے دارالامن سے دارالمحن کر دیا ہے - مگر میرا چین - آرام سب گیا الٹی - بے چینی اور الجھن ہو گئی - مگر شریف آدمی سوائے صبر کرنے کے اور کیا کر سکتا ہے - لہذا میں نے بالکل رہنا سہنا باہر اختیار کر لیا ہے - کبھی ہفتے عشرے میں ایک دفعہ گھر کا پھیرا کر لیا کر لیا - ورنہ وہ بھی نہیں - مگر یہ طریق بیگم کو ناگوار نہیں - کیونکہ وہ اپنے گھر میں بھی یہی دیکھتی آئی ہیں - مرد باہر ہی رہا کرتے ہیں - گھر گھسنے مرد جورو کے مزدور کہلاتے ہیں - جو بہت بیگم مجھ پر لگوانی پسند نہ کرتی تھیں - قصہ مختصر شادی تو ہماری ہو گئی - مگر بیوی گھر میں خوش اور ہم باہر خوش - جو آرام اور راحت ہم بیوی سے چاہتے تھے وہ میسر نہیں - ہاں قطع نسل نہ ہو گی - چنانچہ آج کا اودھم جس کا اس خط کے شروع میں ذکر ہے - اس امر کا عملی ثبوت ہے - والسلام +

تمہارا محب صادق

امین

ایک پرجوش دل

از خواجہ محمد عبد الرؤف صاحب عشرت لکھنوی

اے مرے پرجوش دل سرچشمۂ رحمت ہے تو — کچھ عجب برکت ہے تجھ میں کچھ عجب نعمت ہے تو

اے مرے پرجوش دل ساری ترقی تجھ سے ہے — نور آنکھوں میں ہے تو اعضا میں چستی تجھ سے ہے

عالمِ اسباب پر گر غور سے ڈالو نظر — تو زمانہ جوش کا اُس میں بھی ہے کچھ مستتر

دیکھنا ہیں تم کو نیچر کی اگر فیاضیاں — صفحۂ تاریخ دیرینہ کے ڈھونڈو کچھ نشاں

اک زمانہ تم کو پھر ایسا وہاں مل جائے گا — جس میں دولت تھی محبت اور قومی جوش تھا

آج دنیا میں جو اک اچھا ہے جیتا انتظام — غور سے دیکھو تو ہے یہ جوش کا سب اہتمام

باغ کو اُس وقت دیکھو جبکہ ہو وہ جوش پر — غنچے ہنستے جاتے ہیں اٹھلاتی ہے بادِ سحر

جوش میں اکثر سپاہی کھیلتے ہیں جان پر — جوش میں ایجاد کرتے ہیں نئی انجینیر

جوش میں آتا ہے جب شاعرِ نازک خیال — قوتِ تخیل سے کرتا ہے اظہارِ کمال

جوش میں آتے ہیں جب ہم فلسفی و منطقی — بات جو کرتے ہیں منہ سے کر دکھاتے ہیں وہی

جوش میں آتے ہیں جب اہلِ کرامت نامدار — اُن کے اک اک فقرہ پر ہوتے ہیں صدہا دل نثار

اپنے قومی جوش کی آتی ہے جس دم ہم کو یاد — اشکباری کرتے ہیں کچھ دیر تک ہم نامراد

آج آنکھوں سے نہاں ہے آہ وہ دلکش چمن — دل سے لیکن مٹ نہیں سکتی وہ قومی انجمن

وہ بھی کیا دن تھے ہمارے خون میں جب جوش تھا — تھی حمیت قوم میں جو شخص تھا ذی ہوش تھا

آہ وہ دن جبکہ قومی زندگی کا تھا شباب — آہ وہ دن جبکہ تاباں قوم کا تھا آفتاب

ہم کہاں ہیں وہ ترقی کا زمانہ کیا ہوا — درہم و برہم ہمارا کارخانہ کیا ہوا

بے حمیت ہو گئے ہم پست ہمت ہو گئی — اتفاق قوم کی برباد دولت ہو گئی

رنج و غم اور دنیا

از منشی ضیاء الحسن صاحب علوی

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں غالب

تمدن و تہذیب۔ ترقی و عروج کے وسیع ہال میں آرزوؤں کے پھول پچی کاری کا کام دے رہے ہیں۔ ارادہ۔ آرزو۔ امید۔ ناکامیابی یہ چند الفاظ ہیں۔ جن پر انسانی ترقی کی بنیاد قائم ہے اور انہیں کی بدولت انسان غار وحشت و مصیبت سے نکلکر میدان ترقی و تمدن میں قدم زن ہوتا ہے۔ ہماری تمام ترقیوں کا دارومدار ہمارے کسی گذشتہ ارادہ یا حوصلہ پر ہوتا ہے۔ اور یہ آرزوئیں اور حوصلے ہمیشہ کسی خوشی کے حاصل کرنے اور رنج کے دفع کرنے کی بنا پر ہیں۔ کیونکہ انسانی فطرت کا اقتضا یہی ہے کہ وہ خوشی کو حاصل کرے یا اس کے حصول کی کوشش کرے۔ لیکن اگر غور کی نظر ڈالی جاوے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ کیا المی جذبات سے نجات بھی ملسکتی ہے؟ نہیں کبھی نہیں۔ رنج و الم و خوشی و مسرت یہ لفظ گو علیحدہ خیال کئے جاتے ہیں۔ اور ان میں ظاہر میں بیّن فرق نظر آتا ہے۔ مگر یہ ایک دوسرے سے اس قدر مرابط ہیں۔ کہ بڑے بڑے حکما اس کے انکشاف سے عاجز ہیں۔ حتےٰ کہ ایک فرقہ کی رائے یہ قرار پائی ہے کہ لذت اور الم کے درمیان کوئی درمیانی واسطہ ہی نہیں۔ انسان ہمیشہ غم کی حالت میں رہتا ہے۔ اور لذت اسی غم کے ازالہ کا نام ہے۔ جو خود سریع الزوال ہوتی

ہے۔ لہذا ہر خوشی کے بعد جو بہت جلد مٹ جاتی ہے۔ الم و رنج کے پیچھے پیچھا کرتے ہیں گو اس کا احساس بوجہ طبیعت کے عادی ہو جانے کے ہمیں نہ ہوتا ہو۔ اس تمام تمہید کا نتیجہ صرف یہ نکلتا ہے۔ کہ زندگی اور غم دونوں ایک دوسرے سے اس قدر ملے جلے ہیں۔ کہ ایک کا دوسرے سے انفکاک محال ہے۔ شاعر نے مذکورہ بالا شعر میں اسی فلسفہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ موت کے بغیر غم سے نجات مشکل ہے۔ سچ ہے انسان اپنی ترقی کے ہر قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہے اور پیچھے گر پڑتا ہے۔ لیکن باوجود ان تمام ذلتوں کے پھر بھی وہ ہمیشہ اسی کی کوشش کرتا ہے۔ کہ میں معراج تمدن کے سب سے اعلٰے زینہ پر پہنچ جاؤں۔ اور جس قدم پر وہ پہنچ جاتا ہے۔ تو اس کی بلند پروازی اور ترقی کر جاتی ہے۔ اور جب اس کے تمام قوے تھک کر صورت حال میں مایوسی ظاہر کرنے معلوم ہوتے ہیں۔ اس وقت بھی وہ اپنی ہوس پرستی سے باز نہیں آتا بلکہ اس سے اور آگے بڑھنے کی کوشش کئے جاتا ہے۔ گو وہ کتنے ہی عیش اور فضول ہی کیوں نہ ہو۔ اس کا سبب یہی ہے۔ کہ جس منزل ترقی پر وہ پہنچتا ہے اس سے آگے بڑھنے کا حوصلہ اس کے دل میں آپ سے آپ پیدا ہو ہی جاتا اور ہر وقت اسی تردد و تفکر میں مبتلا نظر آتا ہے۔ کہ اس حالت سے آگے بڑھوں اور ترقی ہو۔ وہ اپنی موجودہ حالت سے کبھی بھی خوشی کا کوئی حصہ نہیں لیتا۔ ہاں گذشتہ حالت اس کے آیندہ حوصلوں کو مدد ضرور دیتی ہے۔ لہذا آیندہ کی اُمید اور گذشتہ حالت کی یاد اور حوصلہ افزائی اسے دنیا میں بیکار ثابت کرتی ہے۔ کوشش تو وہ یہ کرتا ہے۔ کہ چین و آرام سے گذرے۔ مگر کشتی بیچ نے بے چینی اور تکلیف ہے وہ بزور اس کی کوشش کرتا ہے کہ کشاکش ہائے

وجود سے نجات حاصل کرے۔ اور اطمینان اور سکون سے زندگی بسر کرے
لیکن نجات بغیر موت کے دشوار نہیں بلکہ محال ہے۔ زندگی کے جھگڑے
اُسے کب چھوڑتے ہیں وہ انہیں لاکھ چھوڑنے کی کوشش کرے ؎

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعی آزادی
زنجیر موج دریا کو کہاں فرصت روانی کی

دنیا اور بقا کی تدابیر یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ہزار اس سے ہٹو۔
اور اپنے کو اس راستہ سے علیحدہ کرو۔ مگر کاشتس اپنا فعل ضرور کریگا۔
اس کی لعن طعن سے نجات پانا مشکل ہے۔ وہ لوگ جو اس بات کے مدعی
ہیں کہ انسان دنیا میں بھی خوشی سے رہ سکتا ہے۔ ذرا آنکھیں کھولیں او
دیکھیں۔ کہ وہ کس غلطی میں مبتلا ہیں۔ انسان کے پاس کون سے ایسے
ذرایع ہیں۔ کہ جن سے اصل خوشی حاصل کرے۔ کونسا اس کا زمانہ ہے جس میں
اس کی روح چین پاتی ہو۔ مسئلہ تنازع البقاء Struggle for
Existence) پر جن لوگوں نے غور کیا ہے وہ تمدن کی بناء اسی
مسئلہ کو قرار دیں گے۔ مگر تمدن کے معنے جو وہ سمجھتے ہیں یعنی بنی نوع انسان
کا ایک دوسرے کی مدد کرنا اور اس مدد کے واسطے وہ مناسب ذرائع استعمال
کرنا جو ان کے اس فعل کو آسان کردیں۔ کبھی حقیقی لذت اور خوشی کے
حصول کا سبب نہیں ہوسکتے۔ کیا یہ ممکن ہے۔ کہ انسان کسی زمانہ میں تمام
رازہائے قدرت سے مطلع ہوجائے۔ اور ان کو اپنے کارآمد بنانے کی
فکر سے بھی فارغ ہوجائے۔ گو یہ انسانی نیچر کے اقتضاء کی وجہ سے ممکن
بھی ہو۔ مگر اس اقتضاء کے خلاف عملدرآمد کرنا بھی تو تکلیف دہ اور موجب الم
ہے۔ غرض کسی صورت سے بھی راحت و آرام و مسرت انسان کو نہیں

نصیب ہو سکتی - اس کے ثبوت میں میں ذیل کا واقعہ نقل کرتا ہوں۔ گو اس وجہ سے کہ انسانی فطرت کا اقتضا ترقی اور عروج ہے - یہ تشبیہ خام نہیں ہو سکتی۔ مگر تاہم اس کے علاوہ اس میں بہت سی مناسبتیں ہیں +

چند جوگی تھے جو بے فکری سے بسر کرتے تھے۔ اور خوب طیار اور موٹے تازے ہو گئے تھے - ایک روز چند احباب کا ایک مختصر سا جلسہ جمع تھا اُدھر سے یہ جوگی نکلے - لوگوں نے ان کی فربہی کے بارے میں چہ میگوئیاں کرنا شروع کیں - اور یہ کہا کہ یہ فقیر اور جوگی ہو کر اس قدر موٹے کیوں ہیں ایک صاحب نے ان میں سے کہا - کہ ٹھیرو میں ان کو دبلا کر دونگا - اس بنا پر اس نے ان کی دعوت کی - اور خوب لذیذ کھانے پکوا کر ان کے سامنے رکھے انہوں نے ان غذاؤں کو بیحد شوق سے کھایا - اور اس کے بعد رخصت ہو گئے - چند دن کے بعد اسی دوست نے اپنے دوسرے احباب کو بلا کر ان جوگیوں کو دکھایا - دیکھا تو وہ تن و توش ندارد - پوچھا کہ آخر اس کا کیا باعث ہے - دوست نے جواب دیا - کہ میں نے ایک حکمت عملی سے ان کی یہ حالت کر دی - یہ ہمیشہ کم درجہ کی غذا استعمال کرتے تھے - اور اسی سے خوش تھے - کیونکہ اُنھوں نے اعلےٰ درجہ کی غذائیں چکھیں بھی نہ تھیں - لیکن میں نے ان کی اس روز دعوت جو کی تو اس میں بہت اعلےٰ درجہ کے کھانے تھے - اب ان کو ان کھانوں کے حاصل کرنے کی فکر دامنگیر ہے جس نے ان کو اس قدر گھلا دیا ہے - ان کو اپنا پہلا کھانا اچھا معلوم ہی نہیں ہوتا +

اسی طرح انسان بوجہ اپنے ترقی کن قوے کے ایک حالت سے دوسری

حالت کی طرف تدریجی ترقی کرتا ہے۔ اور موجودہ حالت اسے ناگوار ہوتی ہے تمام عمر حصول لذت میں صرف ہوجاتی ہے۔ مگر شاہد مقصود پاس نہیں آتا۔ کتنا قابل قدر اور ''قابل عمل اور سچا یہ متبرک قول ہے۔ کہ الدنیا دارالمحن'' بس حقیقی لذت و مسرت دوسرے ہی عالم کے واسطے ہے یہاں اس کا ایک عشر عشیر بھی نہیں۔ یہ دل خوش کن خیال تو ان لوگوں کا ہے جو کسی دوسرے عالم کی وجود کے قایل ہیں۔ لیکن وہ لوگ جنہیں اس عالم کے عدم وجود سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ کسی لذت کو نہ مانیں گے انکے نزدیک لذت کوئی چیز موجود نہ ہونی چاہیئے

اگر انسانی فطرت پر غور کرو تو تمہیں صاف یہ نظر آویگا کہ یہاں بھی ہم کو اسی لذت کی جو ہمیں دوسرے عالم میں حاصل ہوگی پرتو نظر آتے ہیں۔ یعنی جسمانی لذت پر ہم روحانی لذت کو ترجیح دیتے ہیں۔ شیخ نے اشارات میں ایک اشارہ خاص اس مسئلہ کی فلاسفی کا قرار دیا ہے۔ اس نے اس کی بہت سی مثالیں دی ہیں۔ کہ جسمانی لذت پر روحانی لذت کو انسان بالطبع ترجیح دیتا ہے اس نے جو مثالیں دیں وہ کسی قدر طویل اور دقیق ہیں۔ امام رازی نے شرح میں بہت سی مثالیں اس مسئلہ کی نقل کیں ہیں جو آسان سہل ہیں مثلاً وہ لکھتے ہیں۔ کہ تم ایک وقت شطرنج کھیلتے ہو اور بھوک بھی معلوم ہوتی ہو تو تم شطرنج کے شوق میں کھانے کو بھول جاؤگے اور بغیر بازی ختم کئے نہ اٹھوگے یہ کیوں؟ محض اس لئے کہ شطرنج سے جو لذت حاصل ہوتی ہے وہ روحانی ہے۔ اور کھانے سے جو لذت حاصل ہوگی وہ جسمانی ہے۔ حقیقی لذت کا انہیں کو امیدوار رہنا چاہئیں۔ جنہوں نے اپنے نفس ناطقہ کو رہبر نہیں قرار دیا ہے۔ یا جسمانی لذت کو روحانی لذت کو ترجیح ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت ٹھیک فرمایا ہے۔ کہ الدنیا سجن المؤمن ✦

بناء فساد

از راجکمار پرتھوی سنگھ ورما اف سکیت

غیر ذمہ وار اخبارات اگر یہ لکھیں۔ کہ "جو ہمارے ساتھ نہیں ہے وہ ہمارا دشمن ہے"۔ تو کسی حد تک قابل معافی ہو سکتا ہے۔ لیکن ذمہ دار گورنمنٹ ایسا نہیں کہہ سکتی +

گورنمنٹ خدا اور آدمی دونوں کے آگے ذمہ وار ہے۔ کہ وہ پوری ہمدردی سے اپنی تئیں کروڑ رعایا کو جو اُس کے سپرد ہے خوش کرے۔ اور اِس پاک فرض کو گورنمنٹ صرف پبلک رائے پر غور کرنے اور اُس کی شنوائی اچھی طرح سے کرنے سے ہی انجام دے سکتی ہے۔ تاکہ مندرجہ بالا مسئلہ پر جبکہ کوئی خاص نا اتفاقی حکام اور رعایا کے درمیان ہو عملدرآمد کیا جا سکے۔ بمبے کے ناخوش گوار حادثہ پر گورنمنٹ اور رعایا ایک ہی رائے رکھتی ہے۔ یعنے دونوں اس بدقسمت حادثہ کو نظر حقارت سے دیکھتے ہوئے چاہتے ہیں۔ کہ اس کا خاتمہ ہی کر دیا جانا بہتر ہے۔ لیکن وہ اسباب جو اس کی جڑ میں کام کر رہے ہیں۔ اور جن کا یہ آغاز ہے ان کی بابت گورنمنٹ و رعایا کی ایک رائے نہیں ہے جو امر درحقیقت قابل افسوس ہے +

چونکہ مرض کے اصلی اسباب کو شناخت کئے بغیر اُس کا اُکھاڑنا کسی طرح بھی ممکن نہیں اسلئے جب تک گورنمنٹ و رعایا کا اتفاق اسباب کی شناخت پر نہ ہو جاوے کیسے علاج کی امید کی جا سکتی ہے +

(۲) ایک بڑی حد تک اینگلو انڈین اخبارات کی رائے ایسے حادثات کی

نسبت حکام کی رائے کا فوٹو کہلا سکتی ہے - اور یہ ظاہر ہے کہ یہ اخبارات اِس تمام الزام کا بوجھ غریب ہندوستانی "ایجیٹیٹرز" کے سر مڑھتے ہیں - ایسے اخبارات کا یہ دعوے بے دلیل ہے - کہ "اس قسم کے حادثات کی ذمہ دار یا تو دھواں دھار تقریریں ہیں یا ہندوستان کے اخبارات کی اشتعال انگیز تحریریں" - اور اس کا علاج اینگلو انڈین اخبارات ایک زبان ہو کر یہ بتلاتے ہیں - کہ لیکچراروں کی زبان بند کی جاوے - جس سے نہ تو وہ اپنے خیالات پلیٹ فارم پر ظاہر کر سکیں اور نہ ہی دیسی اخبارات کے ذریعہ ظاہر ہیں ذمہ دار حکام کا بھی اس رائے سے اتفاق معلوم ہوتا ہے - بلکہ حکام اس خیال سے بھی اس رائے کو زیادہ تر پسند کرتے ہیں - کہ وہ جہاں خود تمام ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاویں گے - وہاں ساتھ ہی اس موجودہ کشمکش کا بوجھ دوسروں کے سر مڑھنے کا موقعہ ملیگا +

لیکن ہندوستان کی رعایا کے ذمہ دار وکیل موجودہ حالت کو اور ہی نظر سے دیکھتے ہیں - ان کا خیال ہے کہ اگر گورنمنٹ نے عام رائے کی پرواہ کی ہوتی اور سخت قانون پاس نہ کئے ہوتے اور جس کی "لاٹھی اُسی کی بھینس" کی پالیسی کو عمل میں نہ لایا ہوتا تو آج کہیں "مفسدوں" کی قوم کا پتہ نہ لگتا - اگر یہ لوگ کہیں کہیں پائے بھی جاتے - تو اُن کی ہستی ایک بے اثر اور ناکارہ ہستی ثابت ہوتی - ایجیٹیٹروں نے گورنمنٹ کی سخت اور ناجائز قوانین اور جابر پولیسی کی کھلے اور جائز طریق پر رعایا کے خیال کے موافق نکتہ چینی کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کیا - ان پبلک وکیلوں نے کبھی شخصی جذبات کو اپیل نہیں کی کہ وہ قانون توڑ کر آزادی حاصل کرے - اُنہوں نے صرف دو اعلےٰ طریق پبلک کو بتلائے کہ وہ اول تو گورنمنٹ عالیہ سے اپنی شکایات کو دور کرنے کی غرض سے

عرض داشت بھیجیں۔ اگر کامیابی نہ ہو۔ تو بغیر توڑے کسی قانون کے وہ ان کے گھر کا انتظام کرتے ہوئے اپنی مدد آپ کریں۔ اور ساتھ ہی اُنہوں نے دوستانہ اطلاع گورنمنٹ کو اِس امر کی بھی دے دی۔ کہ اگر رعایا کی شنوائی نہ ہوئی۔ اور ان کی جائز شکایات کو دور نہ کیا گیا۔ تو خفیہ مجلسیں ملک میں قائم ہو کر خرابی کا باعث ہوں گی +

ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں مسٹر آر۔ سی۔ دت کو پیش کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ ایجیٹیشن کے محسوت سیاسیے پاتا خیال کئے گئے ہیں۔ اور گورنمنٹ اُنہیں ایجیٹروں کے دائرہ میں شامل نہیں کرتی ورنہ وہ ہرگز انہیں "ڈلیسنٹر می لیزلیشن کشن" کا ایک ممبر مقرر نہ کرتی۔ ہم یہاں پر اُن کی رائے ظاہر کئے دیتے ہیں۔ جو کہ ریوٹرسے بذریعہ تار ہندوستان میں پہنچائی ہے +

"لنڈن ۱۱ مئی"

"مسٹر رومیش چندر دت نے دوران ملاقات میں کہا کہ انارکیزم کی ترقی کے اسباب پہلے ہی دیکھنے میں آتے تھے۔ یہ اُس خیال کا کہ گورنمنٹ موجودہ پولٹیکل مسئلوں کا حل نہیں کرتی۔ لابدی نتیجہ ہے۔ جبتک کہ ایک وسیع پیمانہ پر سیلف گورنمنٹ ہندوستانیوں کو نہیں دی جاتی۔ جرم بڑھتا جاویگا" +

ہندوستان میں ایک بھی ایسا تعلیم یافتہ شخص نہ ملیگا۔ جس کا اس رائے سے پورا اتفاق نہ ہو۔ ایسی حالت میں گورنمنٹ کا کیا فرض ہے؟

گورنمنٹ اس معاملہ میں ہندوستانیوں سے ایک رائے نہیں ہوسکتی کیونکہ اگر گورنمنٹ ہندوستانی رائے کو مان لے تو قدرتاً اسے اپنی سخت اور ناجائز پالسی کو بناء فساد قرار دینا پڑے گا۔ مگر ساتھ ہی واقعات موجود ہیں۔ اور یہ رائے محض ہندوستانی ایجیٹروں کی ہی نہیں ہے۔

بلکہ ڈاکٹر راش بہاری گھوش اور مسٹر دت جیسے گورنمنٹ کے حامی بھی ایک زبان ہو کر پکارتے ہیں۔ کہ گورنمنٹ کا عام رائے کو نہ سننا ہی اس خرابی کا باعث ہے +

اخبارات یا لیکچرار شکایات کو پیدا نہیں کرتے بلکہ اُن کو ظاہر کرتے ہیں۔ اِن جھگڑوں کو پیدا کرنے والے گورنمنٹ اور اُس کے ماتحت حکام ہیں۔ اگر گورنمنٹ چاہتی ہے۔ کہ سپیکر یا لیکچرار کے منہ کو بند کرے۔ تو یہ کام زبان بندی کے قانون پاس کرنے سے کبھی نہیں ہو گا۔ بلکہ عام تکالیف کو دور کرنے سے +

ہمیں ذرا خبر نہیں۔ کہ گورنمنٹ کس طرح اس خطرناک تحریک کا خاتمہ کرنا چاہتی ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ستانے سے کام نہ چلیگا۔ گورنمنٹ نے بارہا اس کا تجربہ کیا ہے۔ اور آخر کار اس نے اِس خوفناک تحریک کو پیدا کر ہی ڈالا۔ اِس پالیسی کو صرف ناکامیابی کا ہی سامنا نہ کرنا پڑا۔ بلکہ یہ ایک ایسی خطرناک تحریک کی بنیاد ڈالنے کا باعث ہوئی۔ جس سے ہر بہی خواہ ملک و گورنمنٹ کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ کیا اب گورنمنٹ نرم پالیسی کا تجربہ کرے گی؟ ہم چاہتے ہیں۔ کہ گورنمنٹ اِس پالیسی کو کہ عام رائے کو غور سے سننا اور جائز شکایات کو دور کرنا اور رعایا کو ملک کے انتظام میں کافی حصہ دینا کام میں لا کر اِس خطرناک تحریک کو بیخ و بن سے اُکھاڑے گی۔ اگر یہ پالیسی بھی انارکیزم کو جڑ سے اُکھاڑنے میں کامیاب نہ ہو۔ تو گورنمنٹ پھر سے سخت پالیسی اختیار کر سکتی ہے +

انقلاب ہستی

"انسانی تہذیب و ترقی کی رہنمائی کرنے والا یہ اٹل قانون ہے۔ کہ جب کمزور اور زبردست قومیں ایک عرصہ تک شیر و شکر رہیں۔ اور ان کے تعلقات کشیدہ ہو جائیں۔ تو اس کا باعث ہمیشہ زبردست قوم کی سختی یا غلطی ہو گا۔ گلیڈسٹن +"

بنگالیوں کی سی بزدلی میں بدنام قوم کا موجودہ طرز عمل خواہ کتنا ہی تعجب خیز اور حیرت انگیز کیوں نہ ہو۔ مگر تجربہ کی آنکھ اور تاریخ کی عینک سے دیکھنے والے کے لئے یہ واقعات بالکل معمولی ہیں اور وہ انہیں ذرا بھی غیر متوقع خیال نہیں کرتا۔ بم سازوں کی سازش اور بے گناہ خواتین (مس اور مسز کینیڈی) کی موت سے جہاں امن کے شیدائیوں کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ اور وہ ان لوگوں کو جنہوں نے یہ غضب ڈھایا نفرین کرتے ہیں۔ وہاں انہیں تنگ آمد بجنگ آمد کی مثال ضرور یاد آ جاتی ہے اور انصاف مجبور کرتا ہے۔ کہ وہ ان حاکموں کے لئے بھی نفرت کے کلمات زبان پر لائیں۔ جن کی حکمت عملیوں (اگر نا عاقبت اندیشیوں کی بجائے یہ لفظ استعمال ہو سکتا ہے) نے یہ روز بد دکھایا +

واقعات کی طرف سے آنکھ بند کر لینا۔ فریاد سننے کے لئے بہرے بن جانا۔ اور اظہار وفاداری کو بغاوت سمجھنا گو ظاہر میں آسان معلوم ہو گا اور ہندوستان کو شہر خموشاں خیال کرنے والے شاید ایسا کرنے میں اپنی فتح خیال کرتے ہوں گے۔ مگر عقلمند کبھی بھی اس بات سے انکار نہیں کر سکتے

کہ ہر ایک چیز کا نتیجہ دنیا میں اٹل ہے۔ اور اس کے خلاف عمل میں نہیں آسکتا یہ اور بات ہے کہ وہ آہ جو درد بھرے دل سے نکلے زود اثر نہ ہو مگر یہ قانون قدرت ہے اور اسے کوئی انسانی طاقت نہیں مٹا سکتی۔ کہ اس آہ کا اثر ہو گا +

تقسیم بنگال کے زمانہ سے جو آگ اہل بنگال کے دلوں میں بھڑک رہی تھی۔ اگر اس کو فرو کرنے اور محبت او ہمدردی کا پانی ڈالنے کی کوشش نہیں کی گئی تو کیا اس کا یہ لازمی نتیجہ نہیں تھا کہ لوگوں کی بے چینی حد سے گذر جائے خصوصاً اس وقت جبکہ ہمدردی کی بجائے سختی کا برتاؤ کیا جاتا ہو؟ ان حالات و واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہر ایک انصاف پسند یہ کہنے کے لئے مجبور ہوتا ہے کہ اہل بنگال اس افسوسناک واقعہ کے ذرا بھی ذمہ وار نہیں ٹھہرائے جا سکتے بلکہ یہ کلنک کا ٹیکہ ان حکام کے ماتھے پر لگنا چاہیے جو یہ کہتے ہیں کہ سختی اور زبردستی کی پولیسی امن قایم رکھ سکتی ہے۔ اور ہندستانیوں کو قبضہ میں رکھنے کے لئے یہ پالیسی بہترین پالیسی ہے +

جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کے ہر گوشہ سے حقیقی وفاداران سلطنت برابر یہ چلا رہے تھے کہ اگر ہندوستانیوں کی آواز کو بند کیا گیا اگر ان کے قلم اور زبان پر قانون کا قفل لگانے کی کوشش کی گئی۔ اگر ان کی فریاد نہ سنی گئی تو خفیہ انجمنیں قایم ہوں گی اور وہ جو کچھ کریں گی وہ خوفناک انتقام ہو گا۔ تو ہمیں ان افسروں کی زمانہ شناسی اور مدبری کے لئے افسوس کرنا پڑتا ہے۔ جن کے ہاتھوں میں ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ ہندوستانیوں کی طاقت برداشت ضرب المثل ہے۔ تاریخ ہمارے قول کا بہترین ثبوت ہے۔ یہ کبھی بھی نہیں ہوا کہ ان پر کوئی ظلم کیا گیا ہو

اور انہوں نے ایک عرصہ تک رحم اور ہمدردی کی امید میں اس کی پرواہ نہ کی ہو۔ دور نہ جایئے موجودہ واقعات کو ہی لے لیجئے تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ ہماری طاقت برداشت وہ جوہر ہے جس کی قدر کرنا ایک عادل اور مہذب گورنمنٹ کا فرض ہے۔ پنجاب اور بنگال میں سڈیشن کے وہم میں جو سختیاں سال گذشتہ میں کی گئیں اور عتاب شاہی کے گنہگاروں کو جو سزائیں دی گئیں۔ جب ہم ان کا مقابلہ سول ملٹری گزٹ کے اسسٹنٹ ایڈیٹر مسٹر سٹرلنگ جنہوں نے ایک غریب ہندوستانی کو قید ہستی سے نجات دی اور مسٹر مور جنہوں نے عصمت کی دیوی ایک ہندوستانی عورت کو بے حرمت کیا سے کرتے ہیں۔ تو ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان سریع سختیوں کے ہوتے ہوئے جس تحمل اور عقلمندی سے ہندوستانیوں نے کام لیا۔ اور جس عقیدتمندی سے انگریزی عدالتوں کے انصاف پر بھروسہ رکھا وہ ہر طرح قابل تعریف ہے۔۔ اگر اس وقت بھی ہماری تکلیف اور مصیبت کا خیال کیا جاتا اور یہ سمجھتے ہوئے۔ کہ ع

آخر ہم بھی زباں رکھتے ہیں

آیندہ طریق سلطنت میں تبدیلیاں کی جاتیں جو حقیقت میں قصوروار تھے۔ انہیں بلالحاظ رنگت عبرتناک سزائیں دی جاتیں تو آج وہ افسوسناک نظارہ پیش نظر نہ ہوتا جسے ہندوستانی اور گورنمنٹ دونوں افسوس سے دیکھتے ہیں +

آزادی کی تمنا اور سوراجیہ کی آرزو ہندوستانی دلوں میں پیدا ہو چکی ہے۔ وہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ تہذیب یافتہ قوموں کو اپنا وقار قایم رکھنے کے لئے کن باتوں کی ضرورت ہے۔ وہ سمجھتے ہیں۔ کہ

کشمکش زمانہ میں کون لوگ عزت و آبرو کے ساتھ زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ ترقی کی اس منزل پر ان سے یہ امید رکھنا۔ کہ اپنی بے عزتی گوارا کریں گے وہ سریح بے انصافیاں دیکھیں گے اور خاموش رہیں گے۔ غلطی ہے آخر ہمارے پہلو میں بھی گوشت اور خون کا دل ہے برف کی قاشں نہیں۔ ہم نے آزادی کی آب وہوا میں پرورش پائی ہے۔ تعلیم نے ہمارے حقوق ہم پر واضح کر دیئے ہیں۔ ہماری گذشتہ عظمت ہمیں ہمارا مستقبل روشن دکھلاتی ہے۔ اور ابھی تک ہم میں یہ امید زندہ ہے کہ وہ زمانہ آئے گا۔ جب ہمارا عروج کا آفتاب جو انقلاب زمانہ کی بدلی میں چھپ گیا ہے روشن ہوگا۔ اور اس کی روشنی سے تمام دنیا منور ہوگی +

ایک طرف تو یہ امید افزا نظارہ موجود ہے۔ دوسری طرف قحط وبا۔ طاعون اور اس پر عتاب شاہی ہمیں مایوس کر رہا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آزادی ہمارے لئے مصائب لیکر آئی۔ کیونکہ اگر موجودہ آزادی کو آزادی کہا جا سکتا ہے تو ہم اسے برکت نہیں بلکہ آفت جانتے ہیں ۔ حکام وقت کی پالیسی میں تبدیلی پیدا ہوچکی ہے۔ زمانہ ہمارے لئے ناموافق ہے۔ اس وقت ہم میں جو آزادی کی اُمنگ پیدا ہوگی ۔ وہ یقیناً ہمارے لئے مصیبت ہے۔ کیونکہ ہم اس کی برکت سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ بلکہ اس کی برکتوں کو دیکھ کر ترستے ہیں۔ جو ہمارے لئے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ غرض یہ وقت ہمارے لئے نہایت نازک ہے۔ ایک طرف امیدیں ہیں۔ جو حوصلہ افزا ہیں۔ دوسری طرف واقعات ہیں جو حوصلہ شکن ہیں۔ ایسے وقت پر ہماری ملکی زندگی اور موت کا سوال ہے۔

اور عقلمندی اسی میں ہے۔ کہ ہماری زبان سے ایک لفظ بھی ایسا نہ نکلے جس پر
بخوبی غور نہ کیا گیا ہو۔ یہاں ایک اور جملہ معترضہ کہنے کی ضرورت ہے۔ ہندستان
پر خواہ کتنی ہی ادبار کی گھٹا چھا جائے۔ آفتیں ٹوٹیں اور بے انصافیاں ہوں
وہ کبھی بھی کشت وخون پر آمادہ نہ ہوں گے۔ ہم نے ابھی کہا تھا کہ ہندیوں کی
طاقت برداشت ضرب المثل ہے۔ اور یہ اُن کا وہ جوہر جس کی مثال دنیا میں
نہ ملے گی۔ اس لئے کوئی شخص بھی کسی ایسی تحریک سے جس سے امن عامہ میں
خلل آئے۔ ہمدردی نہیں رکھتا۔ اب تہذیب وترقی کی جنگ ہے۔ اور
اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستانی بھی اس میں شامل ہیں۔ اور
ہندوستانیوں ہی پر کیا منحصر ہے۔ ہر ایک تہذیب یافتہ قوم اس جنگ میں
شامل ہے۔ اور ہونا چاہئے۔ مگر یہ کہنا سخت غلطی ہے۔ کہ ہر ایک قوم میں
سب کے سب دیوتا ہوتے ہیں۔ کسی بھلے چنگے کو خواہ دق کیا جائے اور
اسے اس قدر ستایا جائے۔ کہ وہ عاجز آجائے۔ اور وہ انتقام پر مجبور نہ ہو۔ اگر
وہ ناعاقبت اندیش حکام جو بم کے سے افسوسناک حادثہ کا باعث ہوئے۔ ذرا
بھی عقلمندی سے کام لیتے۔ اور غریب ہندستانیوں کو اس بیرحمی سے نہ
ستاتے کہ وہ اس وحشیانہ حرکت کے لئے مجبور ہوں یا گورنمنٹ ان کے اس
ظالمانہ فعل کی تائید نہ کرتی۔ تو یقیناً یہ افسوسناک حادثہ ظہور میں نہ آتا۔ جو کچھ
ہو چکا اب اس کا واپس ہونا ناممکن ہے۔ جبر اور سختی کا جو تیر غصہ کی کمان
سے نکل چکا وہ واپس نہیں آسکتا۔ اب ضرورت ہے تو اس بات کی کہ جو
زخم اس تیر سے لگا ہے۔ اس پر رحم اور ہمدردی کا مرہم لگایا جائے۔ اور کوشش
کی جائے کہ وہ زخم پھر ہرا نہ ہونے پائے۔ یہ وقت ہے کہ جب گورنمنٹ کو اپنے
ہر ایک فعل پر بخوبی غور کر لینا چاہئے۔ عقلمند سمجھتے ہیں کہ ایسے مواقع پر معمولی

کمزوریاں بھی بہت بڑے نقصان کا باعث ہوا کرتی ہیں۔ مدبری اس کا نام نہیں۔ کہ اپنی طاقت اور دولت کے زعم میں وہ طرز عمل اختیار کر لیا جائے جس کے لئے پشیمان ہونا پڑے +

بمب کے ناگوار حادثہ کے بعد اینگلو انڈین حلقہ سے برابر آواز آ رہی ہے۔ کہ تحریر اور تقریر کی آزادی بنا رفساد ہے۔ اور جب تک یہ دونوں قانوناً بند نہ کر دی جائیں گی امن قائم نہیں رہ سکتا۔ جن لوگوں نے ٹھنڈے دل و دماغ سے گذشتہ واقعات پر غور کیا ہے وہ سمجھتے ہیں۔ کہ یہ رائے کہاں تک درست ہے۔ کیا ہم اس رائے کا یہ نتیجہ نکال لیں کہ ابھی ہندستان کے ستاروں میں کچھ الٹ پھیر ہے اور ابھی کچھ اور واقعات ظہور میں آنے والے ہیں؟ ہم ہندوستانی اور ملک کے خیر خواہ ہونے کی حیثیت سے سوائے اس غلط رائے پر افسوس کرنے کے کیا کر سکتے ہیں؟ ہم جانتے ہیں۔ کہ ہماری رائے کی پرواہ نہیں کی جائے گی۔ ہم جانتے ہیں کہ ہماری وفاداری کو بغاوت خیال کیا جائے گا۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہماری آواز نعرہ جنگ سے کم خیال نہ کی جائے گی۔ مگر کیا یہ سب باتیں ہمیں اظہار وفاداری سے باز رکھ سکتی ہیں؟ ہرگز نہیں۔ ہم اپنا فرض بخوبی سمجھتے ہیں ہم سمجھتے ہیں کہ حقیقی وفاداری کیا ہے اور راستی کبھی چھپ نہیں سکتی گورنمنٹ کی نظروں میں ہماری وفاداری اب خواہ کچھ ہی خیال کی جائے مگر وہ وقت آئے گا۔ جب معاملہ اصلی صورت میں نمودار ہو گا۔ اور اُس وقت کھوٹے کھرے کی پہچان کی جا سکے گی۔ ہمیں فرض کی انجام دہی اور بادشاہ کی حقیقی جانثاری خوب معلوم ہے۔ شاہ پرستی اور جانبازی کی مثال ہماری تاریخ میں موجود ہے۔ اور ہمیں کوئی طاقت اظہار راستی سے باز نہیں رکھ سکتی۔

ہم نے اپنی تاریخ میں پڑھا ہے - کہ نازک مزاج شاہی میں تبدیلیاں ہُوا کرتی ہیں - اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے - کہ حقیقی وفادار باغی اور مکار وفادار خیال کئے جاتے ہیں - مگر استقلال اور راستی پر جان دینے والوں کے لئے یہ تبدیلی کوئی اثر نہیں رکھتی - ہم نہیں چاہتے - کہ مزاج کی تبدیلی کے ساتھ ہم خود بھی تبدیل ہو جائیں - اور اس طرح سلطنت کو نقصان پہنچائیں - ہمارا قول اور فعل جان رکھتا ہے اور وہ جان کے ساتھ ہے ◆

دنیا کی کوئی چیز انقلاب زمانہ سے بچ نہیں سکتی - اور تاریخ اس کی شہادت ہے - ایک وہ زمانہ تھا جب لارڈ لٹن نے ہندوستانیوں کو تحریر کی آزادی عطا فرما کر ہندوستانیوں اور اپنی قوم دونوں پر احسان کیا تھا - یا آج وہ زمانہ ہے - کہ تہذیب و ترقی کی اس قدر منزل طے کرنے کے بعد ہماری حاکم قوم کے دل میں پھر پیچھے ہٹنے اور اس آزادی کو ضبط کرنے کی آرزو پیدا ہوئی ہے - کیا کوئی سچا وفادار اس تبدیلی پر خوش ہوگا ؟ کیا آپ پسند کریں گے کہ آپ کی گورنمنٹ مہذب گورنمنٹوں میں ممتاز درجہ رکھے اور وہ تہذیب ترقی کے میدان میں اس قدر پیچھے دھکیل دی جائے ؟ کیا یہ تبدیلی ہماری گورنمنٹ کو مہذب قوموں میں کوئی ممتاز درجہ دلا سکے گی ؟ ہرگز نہیں - یہ تو اس مسئلہ کا ظاہری پہلو تھا - اب دیکھنا ہے کہ کیا یہ افسوسناک تبدیلی کوئی مفید نتائج پیدا کر سکے گی - ہمیں افسوس کے ساتھ اس کا جواب بھی نفی میں دینا پڑے گا - ہمارے قول کی تائید میں گذشتہ واقعات موجود ہیں - اگرچہ ہمارے اینگلو انڈین دوستوں نے جان بوجھ کر اپنی آنکھوں پر نادانی کی پٹی باندھ لی ہے - مگر وہ آگ جو ان واقعات نے ہندوستانیوں کے دلوں میں

پیدا کی ہے اس قدر روشن ہے کہ اس وقت تک جبتک ہمارے دوست جان بوجھ کر اندھے نہ ہو جائیں۔ وہ اس کی روشنی اور گرمی کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اگر کوئی واقعات اور اس کے نتائج کو جانتے ہوئے غلطی کرے تو آپ اسے کیا کہیں گے؟ یہی کہ یا تو اس کی عقل میں کچھ خلل ہے یا اس کی قسمت پلٹا کھانے کو ہے +

ہم ایک مرتبہ پہلے کسی مضمون میں کہہ چکے ہیں۔ کہ تحریر و تقریر کی آزادی جو ہندوستانیوں کو عطا کی گئی وہ اگرچہ گورنمنٹ کی عنایت تھی مگر الغرضی پر مبنی نہ تھی۔ فاتحہ قوم کی حکمت عملی اس میں مخفی تھی اور ہونی چاہیئے۔ ہمیں اس سے کوئی وجہ شکایت نہیں۔ رعایا کے خیالات اور دلی محسوسات کو معلوم کرنے کے لئے اس سے بہتر ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ اور ہم اس آزادی کا عطا فرمانا لارڈ ڈلٹن کی مدبری کا ایک کرشمہ خیال کرتے ہیں۔ اخبارات کی طاقت سلطنت کے انجن کے لئے وہ گھڑی ہے جو سٹیم کا اتار چڑھاؤ بتلاتی ہے۔ اور قابل انجنیر وہی کہا جا سکتا ہے جو اس گھڑی کے مطابق کام کرے۔ اور انجن کو اپنے قابو میں رکھے +

تکلیف کا احساس ہر ایک انسان میں ہونا لازمی ہے۔ خواہ وہ عالم اور خواہ وہ جاہل مطلق ہو۔ اگرچہ تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد ہندوستان میں کم ہے۔ مگر ۹۰ فی صدی یہ جان گئے ہیں کہ اخبارات ان کے لئے چلاتے اور گورنمنٹ کو متوجہ کرتے ہیں اور خواہ یہ آواز اب تک بے اثر ہے مگر ان کی تشفی کے لئے کافی ہے۔ وہ اسی امید میں مگن ہیں کہ وہ وقت آئے گا۔ جب ان کی آواز کی شنوائی ہوگی اور وہ ان تکلیفات سے جو دن بدن بڑھتی جا رہی ہیں نجات پائیں گے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ

بڑی بھاری خدمت ہے۔ جو اخبارات اپنی گورنمنٹ کے لئے انجام دے رہے ہیں۔ ورنہ جاہل لوگوں کا ذرا سی تکلیف پر بگڑ بیٹھنا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ تعلیم یافتہ جماعت کے خیالات معلوم کرنے کا ذریعہ ہندوستانی اخبارات سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ اور اس سے جو کچھ معلوم ہو سکتا ہے وہ ان کے خیالات کا عکس ہے۔ یہ دوسری خدمت ہے۔ جو اخبارات گورنمنٹ کے لئے انجام دے رہے ہیں۔ رعایا کی ضرورتوں اور مطالبوں کو گورنمنٹ کے گوش گذار کرنا سب سے اہم فرض ہے جو اخبارات بجا لا رہے ہیں۔ کیونکہ دنیا میں ضرورت ہی ایک ایسی چیز ہے کہ جب انسان اسے پورا ہوتے نہیں دیکھتا۔ تو بعض اوقات نامناسب حرکتیں بھی کر بیٹھتا ہے۔ یہ خدمات ہیں جن کا صلہ اس قدر عرصہ کے بعد یہ دیا جانے لگا ہے۔ کہ ان کی آواز بند کرنے کی تجاویز پیش کی جا رہی ہیں۔ ؎

یہ دستورِ زباں بندی عجب ہے تیری محفل میں
یہاں تو بات کہنے کو ترستی ہے زباں میری

اگر یہ حماقت ظہور میں آئی۔ تو اس کا کیا نتیجہ ہوگا؟ اگرچہ یہ سب جانتے ہیں۔ مگر ہم بھی چند الفاظ میں اس کا دہرانا ضروری خیال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر یگانہ کو جو اس وقت سب سے زیادہ زبان دراز خیال کیا جاتا ہے ہی لے لیجئے۔ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ اس کی ہزاروں کاپیاں بازار میں آتے ہی فروخت ہو جاتی ہیں۔ اس سے اس بات کا اندازہ تو بخوبی ہو سکتا ہے۔ کہ اس کے خریداروں کے دل بے چین ہیں۔ اور وہ اس کے مضامین پڑھ کر کسی قدر تسکین حاصل کرتے ہیں۔ اب کیا عقلمندی یہ ہو سکتی

ہے۔ کہ یگانتر کو بند کر دیا جائے یا اس کے خریداروں کی دلی بے چینی دور کرنا
مدبری اور دانشمندی ہے۔ یہ ایک سوال ہے جس کا جواب اس مسئلہ کو بخوبی
واضح کر دے گا۔ یہاں ایک یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بے چینی یگانتر ہی کی
پیدا کی ہوئی ہے۔ مگر ایسا کہنا راستی پر خاک ڈالنا ہوگا۔ اور یہ ماننا پڑے گا
کہ راستی دنیا میں کوئی چیز نہیں۔ اور ایسا کہنا سراسر نادانی ہے۔ حقیقت کبھی
چھپ نہیں سکتی۔ بناوٹ کی بنیاد کبھی مضبوط نہیں ہوتی۔ اگر یگانتر کی
تحریریں صرف اشتعال انگیز ہوں اور ان میں ذرا بھی راستی نہ ہو تو یہ ماننا
پڑے گا۔ کہ وہ کبھی اس قدر مقبول نہیں ہو سکتا۔ اس کشمکش کے زمانہ میں
اس بناوٹ کا ظاہر ہو جانا لازمی ہے اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یگانتر
کی تحریریں صرف اشتعال انگیز اور بے چینی کا باعث ہیں۔ تو بھی اس کا علاج
سختی نہیں ہو سکتا۔ اگر گورنمنٹ رحم دلی اور ہمدردی سے لوگوں کے دلوں
کو مسخر کرے تو یگانتر کی آواز بالکل بے اثر ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر اس
آواز کو بند کیا جائے جو ملک میں بے چینی پھیلانے والی ہے۔ تو وہ لوگ
جو موجد بے چینی ہیں کیا خاموش ہو جائیں گے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ ان کی ذات
اور بھی زیادہ خطرناک بن جائے گی۔ اور وہ خفیہ تحریکوں سے لوگوں کو اسی
شور و شغب پر آمادہ کریں گے۔ اس طرح وہ زہر جو ظاہر ہو کر احتیاط کا
باعث ہو سکتا تھا۔ اندر ہی اندر اپنا اثر پھیلائے گا۔ اور زہر جب جگر میں
پیوست ہو جائے۔ تو وہ انسانی طاقت سے علیحدہ نہیں ہو سکتا۔ تحریر
اور تقریر کی آزادی حامیان فساد (اگر ایسے لوگ ملک میں موجود ہیں) کے
منصوبوں کو روشنی میں لاتی ہے اور اس سے واقفیت ہونا ہی فتحمندی
کی دلیل ہے +

ہندوستان کی عظمت و شوکت کے شیدائی اور سوراجیہ کے طالب خوب سمجھتے ہیں - کہ بے چینی ان کی آرزوؤں کی کامیابی کا باعث نہیں ہو سکتی - کیونکہ جب یہ بے چینی ایک ایسی گورنمنٹ کو جو ایک عرصہ سے ہندوستان پر قابض ہے - اور مدبری اور زمانہ شناسی ہیں ممتاز خیال کی جاتی ہے - اس بے چینی کے زمانہ میں باوجود اپنی حکمت عملیوں کے کامیابی سے حکومت نہیں کر سکتی - تو بالکل نیا انتظام کیونکر تسکین بخش ہو سکتا ہے - اس لئے ان کی ہر ایک کوشش امن قایم رکھنے اور سلسلہ اتحاد کو مضبوط کرنے کے لئے ہے - اور جو لوگ اس کے خلاف خیال کرتے ہیں وہ غلطی پر ہیں - اور اس کی صداقت کی دلیل تجربہ ہے +

کون نہیں چاہتا کہ ترقی کرے - کون نہیں چاہتا کہ دنیا میں عزت وقار و آبرو سے زندگی بسر کرے کسے عزت و آبرو کی پرواہ نہیں ہے - جو لوگ ان ضرورتوں سے بے نیاز ہیں وہ زندہ قوموں میں شمار نہیں کئے جا سکتے - کیا گورنمنٹ یہ چاہتی ہے کہ ہندوستانی سلطنت برطانیہ کی رعایا کہلائیں اور مردہ قوموں میں شمار کئے جائیں - ایسا کہنا گورنمنٹ کے نام و ننگ کا دشمن بنتا ہوگا - گورنمنٹ کی عزت و شوکت رعایا کی خوشحالی اور امن سے وابستہ ہے اگر ان میں سے ایک بھی کم ہو جائے تو وہ ایک نہایت ہی نامبارک وقت ہوگا - ہندوستانیوں کے ساتھ جو سلوک غیر ممالک میں کیا جا رہا ہے - کیا وہ اس بات کا نتیجہ نہیں کہ گورنمنٹ خود ہندوستان میں ہم سے ایسا ہی نفرت انگیز سلوک کرتی ہے - جن لوگوں کی گھر میں عزت نہیں کی جاتی وہ باہر کب عزت کی نظر سے دیکھے جا سکتے ہیں - جو ممالک یہ دیکھ رہے ہیں کہ ایک ہندوستانی اخبار نویس کو تو سڈیشن کے جرم میں تین سال قید

سخت کی سزا دی جاتی ہے۔ اور ایک سفید رنگ یوروپ کی آب و ہوا سے پرورش پایا ہوا اخبار نویس موت کے جرم میں چھ مہینہ کی نظر بندی کی سزا کے قابل خیال کیا جاتا ہے۔ کیا وہ ہماری عزت کریں گے؟ کیا اس سلوک پر ہندوستانی غیر ممالک میں عزت کی نظر سے دیکھے جا سکتے ہیں کیا گورنمنٹ ایسے برتاؤ سے اطمینان اور امن کی امید رکھتی ہے؟ کیا ان ہی باتوں کو روشنی میں لانے کا نام سڈیشن ہے؟ کاش گورنمنٹ ہمیں واضح طور پر بتلا دیتی کہ ہم تہذیب وترقی کے اصولوں پر سلطنت کرنا نہیں چاہتے بلکہ ہمیں ہندوستان کے پرانے طریق سلطنت کو رواج دینا منظور ہے۔ آزادی کی برکتیں سمندر پار نہیں ہو سکتیں۔ یوروپ کی حدود آزادی کی برکتوں کو باہر نہیں نکلنے دیتی۔ تو ہم صبر کرتے اور شاید ہم میں اس قدر بے چینی نہ ہوتی۔ کیونکہ ہماری امیدوں کا خون ہو جاتا اور وہ آرزوئیں جو ہماری بے چینی کا باعث ہیں ہم میں پیدا ہی نہ ہوتیں +

خیالات کی رو میں ہم کہاں سے کہاں نکل آئے کہنا تو صرف اس قدر تھا۔ کہ بمبے کا ناگوار حادثہ ملک کی بے چینی کا نتیجہ ہے۔ اور اس بے چینی کی ذمہ وار گورنمنٹ ہے اور اگر اب بھی اس بے چینی کو دور کرنے کی کوشش نہ کی گئی تو مزید خطرناک واقعات کا اندیشہ ہے۔ تحریر اور تقریر کی آزادی کو چھین لینا وہ خوفناک غلطی ہوگی۔ جس کے لئے بہت جلد پشیمان ہونا پڑیگا۔ اور اگر گورنمنٹ اب بھی نہ سنبھلی اور تجربہ سے فائدہ نہ اٹھایا۔ تو یہ اس کی بڑی کمزوری ہوگی +

جو دل دکھتا ہے اس میں ضبط کی طاقت نہیں رہتی۔ تکلیف اور درد مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنی فریاد کی آواز کو بلند کرے۔ کیا مظلوم کی آواز کو

بند کرنا اس کی تکلیف کو کم کر دیتا ہے۔ اور وہ خاموش ہو جاتا ہے۔ نہیں بلکہ اس کی تکلیف اس کی آواز کو اور بلند کرتی ہے۔ اور اگر دکھے ہوئے دلوں کی فریاد کا نام ہی سڈیشن ہے تو یہ یاد رکھنا چاہئے۔ کہ موجودہ طریق اس سڈیشن کو روک نہیں سکتا۔ بلکہ زیادہ کرے گا۔ اور گورنمنٹ زیادہ اُلجھن میں پڑے گی +

مسٹر گلیڈسٹن کا مقولہ جو اس مضمون کے شروع میں درج ہے۔ ہندوستان کی موجودہ حالت پر بالکل صادق ہے۔ اور اس کو پورے طور پر عائد کرنے کے لئے یہ مختصر الفاظ کافی ہوں گے کہ ہماری محبت اور وفاداری کا جواب یورپین حکام کی طرف سے سختی اور نفرت ہے۔ ہماری فریاد سڈیشن خیال کی جاتی ہے۔ ہمارا جرم یورپین کے جرم سے بلحاظ سزا دوگنا سنگین ہے اس صورت میں ہمارا فرض ہے کہ ہم گورنمنٹ کو بتلا دیں کہ غیر ذمہ وار لوگوں میں جو بے چینی ہے اور جو خوفناک جرائم عمل میں آرہے ہیں اس کی وہ خود ذمہ وار ہے +

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ آزادی حاصل کرنے کے لئے بغاوت اور جنگ وجدل لازمی رہی ہے۔ یورپین تاریخ میں اس کی سینکڑوں مثالیں ملیں گی مگر ہندوستانی ایسا کرنا نہیں چاہتے۔ وہ تلوار کے ذریعہ رحمت حاصل کرنا نہیں سیکھے۔ راستی کی جنگ انہوں نے اپنے بزرگوں سے سیکھی ہے اور وہ اسی پر عمل کرنا چاہتے ہیں۔ کاش انہیں مجبور نہ کیا جائے کہ وہ امن میں خلل پیدا کرنے والا طریق جس سے وہ نفرت کرتے ہیں پھر اختیار کریں +

ہندوستان کی تاریخ نے پلٹا کھایا ہے اور ایک عرصہ کے بعد امن نے بدامنی کی صورت اختیار کی ہے۔ ہندوستانیوں کو جنہوں نے جنگ کا نام

تک بھلا دیا تھا۔ ناعاقبت اندیش حکام نے پھر اس وحشیانہ طریق کے لئے مجبور کیا ہے۔ چاروں طرف سڈیشن کا وہم پھیلا ہوا ہے اور وہ سڈیشن کیا ہے۔ اس کی تشریح ہم پیشتر کر چکے ہیں۔ سرحد پر افغانی جنگجو جنگ آزمائی پر آمادہ ہیں۔ گوا نہیں شکست ہو مگر روپیہ اور جانوں کا نقصان ضرور ہے۔ غرض چاروں طرف انقلاب پیدا کرنے والے حالات گھیرے ہوئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ پوری سوچ بچار سے کام لیا جائے اور جو کچھ کیا جائے اس کے ہر پہلو پر غور کر لیا جائے +

رائے ہر شخص رکھتا ہے خواہ وہ رائے غلط ہی کیوں نہ ہو۔ اگرچہ لارڈ سالسبری صاحب فرماتے ہیں کہ ہندوستانی کوئی رائے نہیں رکھتے۔ جس شخص کا رنگ سیاہ ہے سمجھ لو کہ وہ کوئی رائے نہیں رکھتا۔ اس کیلئے یہی کافی ہے کہ وہ ہر ایک بات کے لئے اپنے حکام کا دوزانو ہو کر شکریہ ادا کرے۔ یہی باتیں ہیں جو نفاق اور بغاوت کا بیج بوتی ہیں۔ کہا جائیگا کہ اب لارڈ سالسبری برسر حکومت نہیں بلکہ لبرل پارٹی ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے موجود ہے۔ مگر ذرا غور کرنے پر معلوم ہو گا کہ الفاظ اس قدر تکلیف دہ نہیں ہوا کرتے جتنا کہ ان کا عمل۔ اگر لارڈ سالسبری نے ہندوستانیوں کو دیوانہ یا ناقص العقل قرار دیا تو وہ شاید اس قدر تکلیف دہ اور رنج دہ ثابت نہ ہوا ہو گا جتنا موجودہ طریق۔ امید دلائی جاتی ہے کہ تم اپنی تکالیف کو بیان کرو اور ان کے دور کرنے کی کوشش کی جائے گی مگر عمل میں کیا آتا ہے یہی۔ کہ آپ کی رائے بالکل بجا اور درست مگر مصلحت اس میں ہے کہ تم کو سخت قانون کا پابند رکھا جائے۔ اور یہ تجویز تمہاری اپنی بہتری کے لئے ہے۔ کیا وہ مایوسی جو امید سے پیدا ہوئی ہے۔ سخت صدمہ

پہنچانے والی نہیں ہے۔ یہی طریق ہے۔ جس نے کم عمر بچوں میں بھی جوش پیدا کیا۔ اور وہ مجبور ہوئے۔ کہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر تکلیف دہ حکام کی جان کے دشمن بن جائیں۔ بے چینی نے بنگالیوں کے لئے جان پر کھیل جانا بائیں ہاتھ کا کرتب بنا دیا ہے۔ ان کے دل کس قدر مضبوط ہیں۔ اس کا اندازہ ان کے بیانات سے ہو سکتا ہے۔ ع

رنج سہتے سہتے یہ پتھر کلیجہ ہو گیا

تکلیفوں اور مصیبتوں نے انہیں سنگ دل بنا دیا۔ اور یہی ان کی راستی کا ثبوت ہے۔ بناوٹ کی بنیاد کبھی اس قدر مضبوط نہیں ہوتی۔ اگر انہیں مصیبتوں نے سنگدل نہ بنایا ہوتا۔ تو قانونی شکنجہ ان کے سب بل نکال دیتا۔ جو مصائب سے عاجز آ گئے ہیں۔ وہ اپنی زندگی سے بیزار ہیں۔ اور چاہتے ہیں۔ کہ اس بے عزتی کی زندگی سے نجات پائیں۔ ان مصیبت زدہ لوگوں کی قربانیاں گورنمنٹ کے دامن پر بدنما داغ ہوں گی۔ اور آیندہ بے چینی کا باعث ہوں گی۔ آؤ ہم سب ملکر دعا کریں۔ کہ گورنمنٹ اور اس کے ذمہ دار حکام اپنے طریق سلطنت کو تجربہ کی آنکھ اور تاریخ کی عینک سے دیکھیں۔ اور ایسے طریقے عمل میں لائیں۔ کہ اس کی شوکت و عظمت کو بدستور قایم رکھ سکیں +

انقلاب ہمیشہ قوموں کی ترقی کا باعث ہوئے ہیں۔ خدا کرے۔ کہ ہندوستان کے انقلاب کا انجام بخیر اور حاکم و محکوم اپنی غلطیوں کے لئے پشیمان ہو کر پھر شیر و شکر ہو جائیں +

گذشتہ جلدیں

باوجود احتیاطاً غیر معمولی طور پر زیادہ جلدیں چھپوا لینے کے آزاد کے جنوری۔ فروری اور مارچ ۱۹۰۷ء کی ایک کاپی نہیں بچی۔ اور اہل ملک کی طرف سے برابر اب تک اس کی مانگ چلی آتی ہے۔ کیونکہ احباب مکمل فائل رکھنا چاہتے ہیں۔ اس تجربہ سے فائدہ اُٹھا کر اپریل ۱۹۰۷ء نمبر سے اور بھی زائد کاپیاں چھپوائی گئیں جن کی متعدد جلدیں باقی ہیں۔ جو احباب آزاد کے جنم دن سے اس کا مکمل فائل رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ جلد درخواست کریں ورنہ پھر ہاتھ نہ آئیں گی۔ جنوری۔ فروری اور مارچ ۱۹۰۷ء کے پرچوں کا بھی دوسرا ایڈیشن پانچ سو درخواستوں کے جمع ہو جانے پر تیار کرایا جائے گا*

نو پرچوں کا ست قسم اول عا*

" قسم دوم عہ*

" قسم سوم ۸ر*

محصولڈاک بذمہ خریدار*

نام کتاب	[illegible]	[illegible]	نام کتاب	[illegible]	[illegible]	نام کتاب	[illegible]	[illegible]
کایا پلٹ	عہ	۳ر	تصویر یار	۱۰ر	۱ر	**سوانح عمریاں**		
خورشید و حمیدہ	۸ر	۱ر	پچھی	۸ر	۱ر			
وفا کی دیوی	عہ	۲ر	زہرہ باغ	۸ر	۱ر	شہنشاہ بابر	عہ	۲ر
ماتم کدہ	۸ر	۱ر	فرعون نے راموسیلے	۸ر	۱ر	انجنا کماری	۱۰ر	۱ر
بڑھا حکیم	عہ	۲ر	بنگی زمانہ	۸ر	۱ر	حیات حیدر	۱۲	۱۰ر
خوبصورت بلا	۸ر	۱ر	نازک ادا	۸ر	۱ر	افلاطون	۶ر	۔ر
[illegible]	۸ر	۱ر	سعادت	۸ر	۱ر	تانتیا بھیل	عہ	۲ر
فریب [illegible]	۸ر	۱ر	اسرار دہلی	عہ	۲ر	کرشن جی	عہ	۰۲ر
سحر [illegible]	عہ	۲ر	ملک العزیز و رجنا	عہ	۰۲ر	سوامی دیانند	عہ	۲ر
دروپتی	۶ر	۔ر	روسی اندھیر	عہ	۲ر	رانا سانگا	۱۲	۱۰ر
حسرت	۶ر	۔ر	جنگ ترانسوال	عہ	۳ر	رانا پرتاپ	عہ	۳ر
تنتی [illegible]	۶ر	۔ر				بکرماجیت	۱۲	۱۰ر
انسان [illegible]	۶ر	۔ر	**ڈیٹکٹو ناول**			اکھروجیدھا [illegible]	۸ر	۱ر
بیہودی	۶ر	۔ر	کشور دھر خون	۱۲	۱۰ر	دوست محمد خان	۶ر	۔ر
پرانا چنڈول	عہ	۳ر	اسرار نوسر	۱۲	۱ر	مشاہیر روم	۱۲	۱ر
پرستی	۶ر	۔ر	پاداش جرم	۱۲	۱۰ر	عمر خیام	۱۲	۱۰ر
سچی قربانی	۶ر	۔ر	گم شدہ جواہرات	۶ر	۔ر	اسکندر اعظم	عہ	۲ر
[illegible]	۶ر	۔ر	تصویر جرم	۶ر	۔ر	لال شہباز	۶ر	۔ر
جادوگر	عہ	۰۲ر	اسرار لندن	عہ	۲ر	مہرالنسا	عہ	۳ر
عروسی عبرت	عہ	۲ر	لنگڑا قاتل	۸ر	۱ر	زیب النسا	عہ	۲ر
تحفہ [illegible]	عہ	۲ر	لال کوٹھی	۱۲	۱ر	خواتین اسلام	۱۲	۱۰ر
شباب	۱۲	۱۰ر	بیت پنجاب	۱۲	۱۰ر	حیات سرسید	عہ	۲ر
بدنصیب بیٹا	۸ر	۱ر	عیار قلندر	۱۲	۱۰ر	معاہدہ	۸ر	۱ر
نگاہ ناز	۶ر	۔ر	وصیت	۶ر	۔ر	قطب الدین	عہ	۲ر

گذشتہ جلدیں

باوجود احتیاطاً غیر معمولی طور پر زیادہ جلدیں چھپوا لینے کے آزاد کے جنوری۔ فروری اور مارچ ۱۹۰۷ء کی ایک کاپی نہیں بچی۔ اور اہل ملک کی طرف سے برابر اب تک اس کی مانگ چلی آتی ہے۔ کیونکہ احباب مکمل فائل رکھنا چاہتے ہیں۔ اس تجربہ سے فائدہ اُٹھا کر اپریل ۱۹۰۷ء نمبر سے اور بھی زائد کاپیاں چھپوائی گئیں جن کی متعدد جلدیں باقی ہیں۔ جو احباب آزاد کے جنم دن سے اس کا مکمل فائل رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ جلد درخواست کریں ورنہ پھر ہاتھ نہ آئیں گی۔ جنوری۔ فروری اور مارچ ۱۹۰۷ء کے پرچوں کا بھی دوسرا ایڈیشن پانچ سو درخواستوں کے جمع ہو جانے پر تیار کرایا جائے گا +

نو پرچوں کا سٹ قسم اول عا +

" " قسم دوم عہ +

" " قسم سوم ۸ر +

محصولڈاک بذمہ خریدار +

المشتھر

منیجر آزاد لاہور

ممیرے کا سرمہ

مصدقہ جناب اسسٹنٹ کیمیکل اگزامینر صاحب بہادر گورنمنٹ پنجاب

معزز انگریزوں میڈیکل کالج کے پرفیسروں نامور ڈاکٹروں والیان ریاست اور ولایت کی یونیورسٹی کے سند یافتہ یوروپین ڈاکٹروں نے بعد تجربہ اس سرمہ کی تصدیق فرمائی ہے کہ یہ سرمہ امراض ذیل کیلئے اکسیر ہے ضعف بصارت - تاریکی چشم - دھند - جالا - پڑوال - غبار - پھولا - سبل - سُرخی - ابتدائی موتیابند - پانی جانا - خارش وغیرہ معزز ڈاکٹر اور حکیم بجائے اور ادویہ کے آنکھوں کے مریضوں پر اب اس سرمہ کا استعمال کرتے ہیں چند روز کے بعد بینائی بہت بڑھ جاتی ہے اور عینک کی بھی حاجت نہیں رہتی قیمت فی تولہ جو سال بھر کیلئے کافی ہے مبلغ دو روپے ممیرے کا سرمہ سفید اعلیٰ قسم فی تولہ مبلغ تین روپیہ خالص ممیرہ فی ماشہ مبلغ بیس روپیہ مصری سرمہ فی تولہ ۴ر خرچ ڈاک بذمہ خریدار +

المشتہر پرفیسر میا سنگھ اہلووالیہ مقام بٹالہ ضلع گورداسپور

ان سے بڑھکر اور کیا شہادت ہوسکتی ہے

(۱) میں نے اور میرے بہت سے دوست متعلقین نے ممیرے کا سرمہ جو کہ سردار میا سنگھ اہلووالیہ نے تیار کیا ہے استعمال کیا نہایت مفید پایا آنکھوں کی بیماریوں کیلئے اکسیر کا حکم رکھتا ہے آنکھوں کو تقویت دیتا اور ٹھنڈک رکھتا ہے اور بینائی کی حفاظت کرتا ہے در حقیقت یہ سرمہ بینائی کو قائم رکھنے کیلئے بہت مفید ہے اور زود اثر ہے جبتک کبھی کوئی دوا اس سے بہتر نہیں دیکھی

راقم آنریبل نواب محمد حیات خان بہادر سی ایس آئی ریٹائرڈ ڈیویژنل ڈسٹرکٹ جج قسمت جات لندھر ممبر کونسل گورنر جنرل ہند

(۲) میں نے ممیرے کا سرمہ جو کہ سردار میا سنگھ نے تیار کیا ہے اُن مریضوں پر جنکی آنکھیں بہت کمزور اور بیمار تھیں استعمال کیا مفید پایا میری رائے میں خاص کر اُن مریضوں کیواسطے جنکی آنکھوں سے پانی جاری رہتا ہے دھند اور غبار اور کمزوری نظر ہو تو یہ سرمہ نہایت مفید ہے +

راقم ڈاکٹر مرزا لعل گھوش بی اے بہادر ایل ایم ایس اسسٹنٹ سرجن پرفیسر میڈیکل کالج لاہور حال آنریری گورنر جنرل ہند +

ہزار روپیہ انعام

اگر کوئی ممیرے کے سرمہ کی سندات میں سے جو کہ قریب میں ہزار کے ہیں ایک کو بھی فرضی ثابت کر دے تو اس کو پانچ ہزار روپیہ انعام دیا جائیگا جو لاہور پنجاب بنک میں اسی مطلب کیلئے مارچ ۱۹۰۲ء میں جمع کیا گیا ہے +

آزاد رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل

آزاد

مہتمم بشن سہائے آزاد

نمبر ۶	جون ۱۹۰۸ع	جلد ۳

فہرست مضامین

تصاویر۔ ملکہ الگزنڈرا قیصرہ ہند۔ مکاڈو و ملکہ جاپان

قیمت سالانہ قسم اول ؎ قسم دوم عگ قسم سوم (بلاتصویر) عہ معہ محصولڈاک

بشن سہائے آزاد مالک و ایڈیٹر کے اہتمام سے آزاد پریس لاہور میں چھپکر شائع ہوا

آزاد کی چند خصوصیتیں

۱۔ آزاد اردو میں پہلا رسالہ ہے جو پولٹیکل اور سوشیل معاملات پر آزادی و متانت سے معقول بحث کرتا ہے +

۲۔ آزاد کے قلمی معاونین ہیں ملک کے مستند اور ڈگری یافتہ نوجوان اہل قلم کے علاوہ وہ مستند اہل قلم بھی شامل ہیں جو اردو نہیں جانتے اور اس لئے اُردو دان پبلک ان کی موثر تحریروں سے محروم رہتی ہے لیئے ماہران ملک کے خاص آزاد کیلیئے لکھے ہوئے مضامین کے بامحاورہ ترجمے شایع کیے جاتے ہیں +

۳۔ آزاد کسی خاص فرقہ یا گروہ کی رائے کا پابند نہیں بلکہ ہندو مسلمان اور ہر ایک مذہب کے حقوق کو مدنظر رکھتا اور حق پسندی سے کام لیتا ہے۔ اور ہر طرح اس بات کی سعی کی جاتی ہے کہ ہر مذہب کے ناظرین رسالہ کے مطالع سے دلچسپی رکھیں۔ خوش قسمتی سے آزاد کے قلمی معاونین میں ہندو مسلمان دونوں کی معقول تعداد ہے +

۴۔ آزاد میں جو ہاف ٹون تصاویر دی جاتی ہیں وہ خاص اہتمام سے تیار ہوتی ہیں اور بجائے خود رسالہ کی قیمت کے برابر ہیں +

۵۔ آزاد ہی ایک رسالہ ہے جس کے معاونین کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ہر نمبر میں نئے اہل قلم کے مضامین ہوتے ہیں +

۶۔ آزاد کے مضامین کے ترجمے نہ صرف ہندستان کے سربرآوردہ اخبارات بلکہ امریکہ کے نامی اخبارات میں بھی خاص شوق سے کیئے جاتے ہیں +

۷۔ آزاد کی قیمت نہایت ہی کم ہے کیونکہ جن قیمتوں پر یہ دیا جاتا ہے اس پر اس حجم کی ادنےٰ درجہ کی کتاب بھی نہیں دی جا سکتی +

Mekado & the Queen of Japan.

C. S. P.

احسان وسرپرستی

ان دو الفاظ میں دنیا کی کامیابی کا راز ہے۔ آزاد کو اپنے مقاصد میں جو کامیابی اس قلیل عرصہ میں حاصل ہوئی وہ اہل ملک کے احسان و سرپرستی کی بدولت ہے۔ اسی لئے جب کبھی قدردان اہل ملک ناچیز ایڈیٹر کی کوششوں کی جو اس نے رسالہ کی کامیابی کے لئے کیں داد دیتے ہیں تو اس سے زیادہ معزز احباب اہل قلم کی دماغی کوششوں کی تعریف کرتے ہیں۔ جنہوں نے آزاد کو حقیقت میں کامیاب بنایا ❖

کسی نئے سلسلہ کے آغاز کے وقت تمام مہذب قوموں میں مبارکباد کے تحفے بھیجنے کا دستور ہے اور یہ ہمدردی۔ سرپرستی اور مروت کا بہترین طریقہ خیال کیا جاتا ہے۔ آزاد کی تیسری جلد کا آغاز جولائی نمبر سے ہوگا۔ اس کے سرپرستوں کی طرف سے اگر اس موقعہ پر تحفے بھیجے جائیں تو وہ صرف میری حوصلہ افزائی کا باعث ہونگے بلکہ آزاد کی کامیابی کا ذریعہ بھی۔ اور وہ تحفے بیش قیمت ہیں۔ کیونکہ مالی ضرورتوں کا پورا کرنا ہی سب سے بڑا احسان ہے ❖

آزاد اپنے احباب کی خدمت میں کیا تحفہ پیش کرے گا۔ وہ جولائی نمبر کے ملاحظہ سے معلوم ہوگا۔ خدا کرے کہ میری اور اہل ملک کی کوششیں ملک کے لئے کچھ نتائج پیدا کر سکیں ❖

دعاگو

بشن سہائے آزاد مالک وایڈیٹر

آزاد وردہوں اور مرا مسلک ہے صُلح کُل

آزاد

جلد سوم

جنوری لغایت جون ۱۹۰۸ء

نمبر

بشن سہائے آزاد

آزاد پریس لاہور میں چھپ کر

دفتر آزاد لاہور سے شائع ہوا

فہرست مضامین رسالہ آزاد جلد سوم

جنوری سنہ ۱۹۰۶ء لغایت جون سنہ ۱۹۰۶ء

ہاف ٹون تصاویر

مسٹر گوکھلے پریسیڈنٹ — مسٹر برچیند لال — پنڈت مدن موہن مالویہ — مہاراجہ میسور — مسٹر ہنری کاٹن — مسٹر ولیم ویڈربرن — لالہ گوردھن داس — ماہی — بابو وپن چندر پال — لالہ لاجپت رائے — ملکہ الگزنڈرا — تعلیم ہند — مکاڈو و ملکہ جاپان

قومی تاریخ

از لالہ ہردیال صاحب ایم۔اے

لالہ ہردیال صاحب ابھی ولایت ہی میں تھے۔ کہ میری ناچیز درخواست پر ایک پرائیویٹ خط میں تحریر فرمایا تھا۔ کہ میں لاپرواہی سے چھوٹا سا مضمون لکھ کر بھیجنا نہیں چاہتا ہوں۔ کچھ مطالعہ کے بعد کسی مفید مضمون پر کچھ لکھنے کی کوشش کروں گا۔ ولایت میں تو ایفاء وعدہ کا موقعہ نہ ملا مگر ہندوستان میں آتے ہی آزاد کی سرپرستی کا خیال آیا اور باوجود کثرت مشاغل قلمی اعانت کو اپنا فرض قرار دیا۔ ذیل کا مضمون اس سلسلہ کی قسط اول ہے۔ مضمون کی نسبت ہمیں کسی تمہید کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی کیونکہ وہ خود واضح مطلب ہے۔ ایڈیٹر

قوم کی زندگی کس شے میں ہے۔ کس چیز میں قوم کی روح پنہاں ہے۔ کیا تعویذ ہے جسے قوم اپنی حفاظت کے لئے پہنے رہتی ہے۔ کیا مشک ہے جسے

ایک نیم مردہ قوم کو سنگھانا چاہئے کہ وہ کچھ تو ہوش میں آوے۔ وہ کیا راز ہے جس
میں باقی سب بھید چھپے ہوئے ہیں۔ وہ کیا کنجی ہے جس سے قومی مسئلوں کے
سب تالے کھلتے ہیں۔ علی بابا کو ایک منتر یاد تھا۔ جس سے طرح طرح کے بیش بہا
موتی جواہرات اس کے ہاتھ آئے تھے۔ اُس کے بھائی کو وہ لفظ بھول گئے۔
اور وہ اپنی قسمت کو پیٹتا رہا۔ در دولت نہ کھلا پر نہ کھلا۔ اسی طرح ہم پوچھتے
ہیں۔ قوم کے لئے وہ کیا منتر ہے۔ جس سے من مانی مراد ملتی ہے۔ دھن۔
مان۔ بل۔ سوراج۔ چکرورتی راج سب حاصل ہوتے ہیں +

یہ صاف ظاہر ہے کہ قوم کی زندگی کا بڑا عالمگیر اصول ضرور ہے۔ ورنہ
قوم کے مدبر کس طرح اپنے ہموطنوں کی بہبودی کی کوشش کرسکتے ہیں۔
کس قاعدہ سے وہ کام کرنے میں مدد لیں۔ کس رہنما کی پیروی کریں۔ کس اُستاد
سے سبق سیکھیں۔ اگر کوئی اصول نہیں ہے تو بڑی مایوسی کی جگہ ہے۔ سب
معاملہ اٹکل پچو غیر مقرر رہا۔ کسی تحریک کی برائی بھلائی کو پہچاننا ناممکن ہوگیا۔
قدرت کی اندھیری رات میں انسان جیسے کمزور مسافر کے لئے کوئی قطب
راستہ دکھانے والا نہیں رہا۔ اصول ضرور ہوگا۔ قدرت قانون کی عاشق
ہے۔ "باقاعدہ تحریک" کی شیدا ہے۔ قدرت کو مشرقی ریاستوں کی سی بدانتظامی
پسند نہیں ہے۔ قدرت پھوڑ نہیں ہے۔ مادی دنیا میں ہر شے اٹل قانون
کے مطابق اپنا اثر دکھاتی ہے۔ پھر اخلاقی اور ملکی دنیا میں بھی ضرور کسی نہ کسی
ترکیب کے بموجب کام ہوتا ہوگا۔ اندھا دُھند کارروائی نہ ہوتی ہوگی۔ اگر تمام
اقوام کی ترقی اور اُن کے تنزل سے ہم کوئی اصول نہیں نکال سکتے جس سے
ہم اپنے راستہ سے کانٹے ہٹا سکیں۔ تو اے تاریخ تجھ پر حیف ہے۔ تیرے
میدان جنگ صرف قصائی خانہ اور تیرے انقلاب صرف ہولی کا سوانگ

رہے ہیں۔ افسوس ہے کہ تو نے لکھوکھا معصوم جانیں غارت کیں۔ زمانہ کو
تہ و بالا کیا۔ ایک دم انسان کو چین نہ لینے دیا۔ آج یہاں کھٹ پٹ کرائی۔
کل وہاں شگوفہ کھلایا۔ ہزاروں کو پاؤں تلے رُندوایا۔ سینکڑوں کو دیس نکالا دیا
اے تاریخ اگر اس پر بھی تجھ سے کوئی اصول قومی زندگی کے قایم رکھنے کے لئے
نہیں مل سکتا تو ہم تیرے نام پر ہزار دفعہ تھوکیں تو بجا ہے۔ کیا تو دنیا کی قوموں
کو یہ ناچ یونہی نچا رہی ہے۔ کیا کٹ پتلیوں کا تماشا کر رہی ہے کہ دیوتا یا بھوت
ہماری سیر دیکھیں۔ آہ کیا تو ہمارے خون جگر سے اپنے کھیلنے کے لئے حوض
میں رنگ بھر رہی ہے کہ پچکاریوں میں بھر کر ہمارے اوپر چھوڑے گی۔ ایسے
مذاق سے ہم باز آئے۔ اس دل لگی سے معاف رکھ۔ سچ بتا۔ کہ قومی زندگی کا
کوئی عالمگیر اصول ہے یا نہیں جو ہم کو معلوم ہو سکتا ہے۔ جس طرح کٹھ اُپ
نشد میں لکھا ہے کہ "نچی کیتا" نے یم سے پوچھا تھا۔ کہ مجھے انسان کی موت کا راز
بتاؤ۔ مجھے ہاتھی۔ گھوڑے۔ سونا۔ چاندی درکار نہیں۔ اسی طرح اے تاریخ
اے جہان کی انترجامی دیوی۔ اے دنیا کی ناٹک کی سوتردھار۔ ہم تجھ سے
پوچھتے ہیں۔ کہ کیا قومی زندگی کا کوئی اصول ہے۔ اگر ہے تو ہم حاضر ہیں۔ صحرا
نوردی سے ہم نہیں ڈرتے۔ پہاڑوں کی گپھا سے حذر نہیں کرتے۔ جو تپ تو
کہے ہم کریں گے۔ اگر پیریس پہنچنا ہو تو وم زدن میں جا دھمکیں گے۔ اگر سمندر
کی تہ میں تجربہ کرنا ہو تو قسم کھاتے ہیں کہ پانی کے کیڑے بنکر رہیں گے۔ کیونکہ
ہم اس امرت کی تلاش میں ہیں۔ آج ہندوستان قومی زندگی کا گر ڈھونڈھتا ہے
جانکنی کی حالت ہے۔ دھرم اور قوم پر ہر طرف سے حملہ ہو رہے ہیں آس پاس
کی قومیں کہتی ہیں۔ کہ اس میں اب کیا رکھا ہے۔ رام نام لو اور تیاری کرو۔
مورخین کی رائے ہے کہ اب آگے اس سے کچھ نہیں بنے گا۔ (شیلے۔ توسیع

سلطنت برطانیہ) ایسی حالت میں ہم اس روح جیون بوٹی لینے کو کمر ہمت باندھ کر چلے ہیں۔ جس سے ہماری قوم پھر زندہ ہو۔ ہنومان جی نے ایک لچھمن جی کے لئے پہاڑ اُلٹ ڈالے۔ ہم کیا اپنے ہند دبچوں کے لئے ۔ جن میں سے ایک ایک رام لچھمن کی تصویر ہے۔ ساری زمین کو تہ و بالا نہ کردیں گے۔ کہ ان کی بربادی کے جو سامان نظر آتے ہیں اُن کا دفعیہ ہوا۔ اب تو ایسی ہمت دکھائیں گے۔ کہ ہنومان جی بھی منہ دیکھتے رہ جائیں +

دنیا کی تاریخ کے مطالعہ سے کیا اصول دریافت ہوئے ہیں جنہیں مشرق اور مغرب کے علما نے اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے۔ قومی ترقی کے قوانین زمانہ ماضی کے احوال میں چھپے ہوئے ہیں۔ مرنے والے مرگئے مگر ہم کو زندہ رہنے کی ترکیب بتا گئے ہیں۔ جو کچھ بنی نوع انسان نے کیا ہے اُس داستان کا حرف حرف ہمارے لئے پاک اور مقدس ہے۔ کیونکہ اُس سے قومی اور ملکی تحریک کو کامیابی کے ساتھ چلانے کی تدبیر سیکھتے ہیں۔ دنیا کی تاریخ کیا ہے سمندر ہے جس میں بے شمار جواہر موجود ہیں جنہیں غواص عاقل نکالتے ہیں اور اپنی معشوقہ قوم کے حضور میں پیش کرتے ہیں۔ اُن خیالات اور اصولوں کو قوم بڑی احتیاط سے رکھتی ہے۔ اُن کی اس طرح حفاظت کرتی ہے۔ جیسے سانپ خزانہ پر بیٹھتا ہے۔ فلسفہ دان علما سوچ بچار کے بعد جو گیان تاریخ سے حاصل کرتے ہیں۔ اُن سے قوم کی مکتی ہوتی ہے۔ اس گیان کی قدر نہ کرنے والے ناش ہوتے ہیں۔ اُس کو سر آنکھوں پر رکھنے والے اس لوک میں بھی اور پرلوک میں بھی اپنے منورتھوں کو پاتے ہیں +

ہندوستان کے لئے تاریخ دنیا کیا پیغام لاتی ہے۔ جو قومیں چل بسی ہیں اُنھوں نے بھیشم پتامہ کی طرح بستر مرگ سے ہمارے لئے کیا سندیسا چھوڑا

ہے۔ جن قوموں کی آج سب طرف چلتی ہے۔ اُن کی مثال سے ہم کو کیا نصیحت ملتی ہے۔ ناظرین قومی ترقی کے ایک موٹے اصول کا بیان اس موقع پر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ تمام پہلوؤں پر غور کرنا محال ہے۔ دریا کو کوزہ میں کیونکر بند کروں۔ پس اس برہم گیان کا ایک حصہ آج ہدیۂ ناظرین ہے۔

قومی زندگی کا ایک بڑا اصول قومی تاریخ کا زندہ رکھنا ہے +

بعض دقیانوسی پنڈت یوں کہتے ہیں کہ واہ واہ۔ کیا بات بنائی ہے کچھ ٹھکانے کی تو کہی ہوتی۔ جپ نہیں بتایا۔ تپ نہیں سکھایا۔ شرادھ۔ کرم پاٹھ وغیرہ کچھ اچھی ترکیب سے سمجھائے ہوتے۔ جس سے قوم کو فائدہ ہو۔ یہ کیا واہیات۔ لغو اصول نکالا ہے۔ یہ بھی کوئی اصول ہے۔ اس میں کیا خوبی ہے یہ کونسا نکتہ ہے۔ فلسفہ نہیں۔ ویدانت سوتر نہیں۔ یوگ ابھیاس نہیں سرود رشن سنگرہ نہیں۔ یہ تاریخ کس جانور کا نام ہے۔ یہ ماضی بعید کی گردان کس مرض کی دوا ہے۔ یہ مرگھٹ کی سیر کس بیماری کے لئے مفید ہے۔ تاریخ کیا ہے۔ یہی کہ فلاں مرا۔ فلاں پیدا ہوا۔ خیر اب مردوں کا کیا رونا۔ سیاپے کی میعاد مقرر ہے۔ یہ قومی سیاپہ کو ہمیشہ قایم رکھنے کی صلاح کیا معنے رکھتی ہے۔ واہ یہ کیا بھاٹ کا کام ہے جس میں ایشور گیان نہیں۔ آتما کا نام نہیں ست است کا بچار نہیں۔ یہ تھا۔ وہ تھا۔ ہم تھے۔ تم تھے۔ اس بے سود تذکرہ سے قومی ترقی کب ہو سکتی ہے۔ اس مشورہ سے تو لاش کی سی بُو آتی ہے عالی دماغ۔ حق پسند آدمی اس کو کبھی گوارا نہ کریں گے کہ مردوں کی قبریں اُکھاڑا کریں۔ یہ تو قومی موت کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ قومی زندگی کی شکل تو دکھائی نہیں دیتی۔ آدمی پنچھی ہے۔ آج آیا۔ کل چلا گیا۔ دس دن جوں توں کر کے

بتا گیا۔ کھا گیا۔ کھلا گیا۔ دے گیا۔ لے گیا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ لیکھا ڈیوڑھا
برابر ہوا۔ اخیر میں ایک مٹھی راکھ بنکر گنگا جی کی شرن میں آگیا۔ تاریخ ایسے
ایسے ہی نوچندی کے میلہ کے تماشائیوں کے کاروبار کی داستان ہے
تاریخ صرف ایک بڑا بھاری روزنامچہ پولیس اور تجارتی بہی کھاتے اور
کمیٹی کے رجسٹر اموات و پیدائش اور تیرتھوں کے پنڈوں کی پوتھی کا مجموعہ
ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا وقعت ہے۔ تاریخ سے کچھ صداقت نہیں
ملتی۔ کوئی مطلب نہیں بر آتا۔ کوئی سدھانت ثابت نہیں ہوتا۔
پھر مفت کی سردردی کیوں کی جاوے۔ ہزاروں راجہ ہوئے ہیں۔ لاکھوں
اور ہوں گے۔ ہر ایک کے عہد کے واقعات کا احوال پڑھتے پڑھتے عقل
چکر میں آجاوے اور کچھ ہاتھ نہ لگے۔ کوئی بھی فلسفہ کا اصول معلوم نہ ہو۔
برہم جیو کی ماہیت روح کے ماخذ اور اُس کے مستقبل کا حال۔ انسانی دماغ
کی طاقتوں کا بیان۔ اِن میں سے کون سا مسئلہ تاریخ حل کر سکتی ہے۔ تاریخ
تو بھاٹوں وغیرہ کی روزی کا ذریعہ ہے۔ بچوں کے دل بہلانے کا کھلونا ہے
رات کو لوری کے بدلے تاریخ کی ایک کہانی سنا دی۔ کہ بچہ اچھی طرح سو
جاوے۔ الف لیلہ نہ پڑھی تاریخ ہند پڑھ لی۔ مگر قوم کے رہبروں کو۔
عاقلوں کو۔ پنڈت گیانیوں کو اپنی لیاقت اس فضول علم میں ضائع نہیں
کرنی چاہیئے۔ فلسفہ پڑھیں۔ کھٹ شاستر پڑھیں۔ ویاکرن گھوٹیں تو ایک
بات ہے۔ مگر تاریخ سے نہ آتما کی صفائی ہوتی ہے نہ پرماتما ملتا ہے۔ یہ کسی
ارتھ کی نہیں ہے +

چنانچہ ہمارے پنڈت آج تک تاریخ کی طرف سے غافل ہیں۔ کوئی
شاعر ہے۔ کوئی ویاکرن جانتا ہے۔ کوئی منطق پڑھ کر بال کی کھال نکالتا

ہے۔ کوئی جوتش سے گرہن کا وقت بتا سکتا ہے۔ مگر تاریخ کے عالم کہاں ہیں۔ پنڈتوں کو تو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا ہے۔ کہ مسلمانوں کو اس ملک میں آئے ہوئے کتنا عرصہ ہؤا۔ یا سکندر اعظم کب ستلج سے اپنا سا منہ لے کر واپس گیا تھا۔ قومی تاریخ کے سلسلہ سے وہ بے خبر ہوتے ہیں۔ انہیں اس سے کیا مطلب کہ کون واقعہ کب ہؤا۔ یا ہؤا بھی کہ نہ ہؤا۔ اُن کو دوسری قوموں کی تاریخ تو الگ رہی۔ اُن کی ہستی کا بھی علم نہیں ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے پرانے زمانہ میں کن کن اقوام سے ہمارا تعلق تھا۔ اس مسئلہ پر وہ کچھ رائے نہیں دے سکتے ہیں۔ افسوس کا مقام ہے کہ ایک قدیم قوم کے علمار کو اُس کی تاریخ سے واقفیت نہ ہو۔ کاشی جی میں۔ ندیا میں سب طرح کی ودیا کا پرچار ہے۔ شاستر۔ وید۔ ویاکرن سب کی عزت ہے۔ مگر ایک بچاری تاریخ کی شکل سے پنڈت بیزار ہیں۔ اس مضمون پر نہ کوئی مستند گرنتھ ہیں نہ سُوتر رچے گئے ہیں۔ نہ مباحثہ ہوتے ہیں۔ نہ ٹیکا لکھی جاتی ہے +

جب ہم مطالعۂ تاریخ کو قومی زندگی کا اصول قرار دیتے ہیں تو پنڈتوں کی اس حالت کو دیکھ کر ہم کو یہ کہانی یاد آتی ہے۔ کہ ایک چوبے صاحب بھوجن کھانے ججمان کے گھر گئے۔ لڑکا بھی ساتھ تھا۔ اُس سے پوچھا کہ نیوتا جیمنے کا کیا قاعدہ ہے۔ اُس نے کہا کہ آدھا پیٹ کھانا چاہیئے۔ چوتھائی پیٹ پانی کے لیئے اور باقی جگہ ہوا کے دیئے رکھنی ضروری ہے۔ تب چوبے جی نے کہا۔ تم ابھی بچہ ہو۔ عقل کے کچے ہو۔ دیکھو بھوجن کا اصول یہ ہے کہ پورا پیٹ کھانے سے بھر لو۔ پانی کی خاصیت ہے کہ اِدھر اُدھر سے خوراک کے بیچ میں اپنا راستہ نکال ہی لیتا ہے۔ اور ہوا کا کیا ہے آئی آگئی۔ نہ آئی نہ سہی۔ اسی طرح پنڈت منطق اور انشاپردازی کے لٹو ہوتے ہیں مگر

قومی تاریخ کی پرواہ نہیں کرتے۔ جس کے بغیر نہ منطق چلیگا نہ کبت لکھے جائیں گے۔ ع

کوڑی کو تو خوب سمبھالا لعل رتن کیوں چھوڑ دیا

قومی تاریخ کا زندہ رکھنا قومی زندگی کا اعلےٰ اصول ہے۔ اس مسئلہ کے ثبوت میں مندرجہ ذیل خیالات پیش کرتا ہوں +

(۱)۔ ہر قوم کی قسمت اُس کے گنوں پر منحصر ہے۔ ہر قوم اپنی تقدیر کی خود مالک ہے۔ اگر کسی قوم پر برے دن پڑیں۔ اگر اُس کا دھن دولت۔ عزت آبرو۔ راج پاٹ۔ دھرم کرم سب خاک میں مل جاوے۔ تو اُس وقت اے میرے دوستو اُس قوم کا کیا فرض ہے۔ کیا اُس کے لئے فاتحوں کو گالیاں دینی کافی ہیں۔ کیا فاتحوں کی بدی۔ وعدہ خلافی۔ لالچ یا مکاری کو ثابت کر دینے سے اُس قوم کا بھلا ہو جائے گا۔ کیا فاتحوں کی مذمت اُس کے ادبار کا پورا علاج ہو گا۔ کیا لفاظی۔ فقرہ بازی۔ شیخی نمود کام دیں گی۔ کیا فصاحت اور لطافت سخن اُس کا بیڑا پار لگا دیں گی۔ کیا فاتحوں کی پالیسی (طرز عمل) پر کتابیں لکھنے اور اُن کو دنیا بھر کا دغاباز اور چالباز قرار دینے سے ہی اس گری ہوئی قوم کی موکش ہو جاوے گی۔ نہیں ہرگز نہیں۔ جب کوئی قوم اپنے دیس میں دُکھ پاتی ہے۔ جب اُس کی کنواریاں فاتحوں کی لونڈیاں اور اُس کے نوجوان اُن کے غلام بنائے جاتے ہیں۔ جب اُس کا ان اُس کے بچوں کے پیٹ نہیں پڑتا۔ اور وہ بھوک میں تراہ تراہ کرتے ہیں۔ جب اُسکے دھرم کا ناش ہوتا ہے اور اُس کے راجا اور پروہت فاتحوں کی اردلی میں نوکر رکھے جاتے ہیں۔ جب اُس کی عورتوں کی عزت فاتحوں کی نظر بد سے نہیں بچ سکتی۔ اور وہ ایسے دیس میں رہنے سے موت کو بہتر سمجھ کر زہر کا گھونٹ

پی کر چل بسنی ہیں۔ جب کسی قوم کی ایسی ذلت ورسوائی ہوتی ہے تو اُسے لازم ہے۔ کہ اپنے گریبان میں مُنہ ڈالے۔ اپنے اوصاف کا معائنہ کرے اپنے اخلاق کی جانچ پرتال کرے۔ اور معلوم کرے کہ وہ کیا عیب ہیں۔ جن کی وجہ سے اُس کی ایسی گت ہوئی ہے۔ کیونکہ جب تک کوئی قوم جو تعداد کے لحاظ سے معقول حیثیت رکھتی ہو۔ لالچ۔ کاہلی۔ خودغرضی۔ نفس پرستی اور بزدلی میں گرفتار نہ ہو۔ اُس پر تمام دنیا کی قومیں ملکر چڑھ آئیں۔ تو فتح نہیں پاسکتیں۔ ایسی قوم کو چاہیئے۔ کہ اُن اندرونی دشمنوں کا مقابلہ کرے۔ جو اُس کی زندگی کو گھن کی طرح کھا رہے ہیں۔ تب وہ بیرونی مخالفوں کے سامنے کھڑی رہ سکے گی۔ جس نے من جیتا اُس نے جگ جیتا اور ایسی قوم کے اُدّھار کے لئے نقاروں اور مصنفوں۔ وکیلوں۔ بیرسٹروں اور ڈیلیگیٹوں کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی سادھو سنتوں کی جنہوں نے اپنی اندریوں پر قابو پایا ہو۔ کیونکہ قوم علم اللسان کی ناواقفیت یا قانون کی طرف غفلت کی وجہ سے نہیں گری۔ بلکہ اُن اوصاف کے نہ ہونے سے جو آزاد اقوام میں پائے جاتے ہیں۔ پس اگر کوئی مفتوح قوم پوچھے کہ میری ذلت کا سبب کسن قوم ہے تو جواب دو کہ تم خود ہو۔ تم خود ہو۔ فاتح قوم کسی مفتوح قوم کی شکست کا باعث شاذونادر ہی ہوتی ہے۔ کیا گدھ جو لاش سے بوٹیاں نوچ نوچ کر اپنی ضیافت کرتا ہے۔ اُس شخص کی موت کا سبب ہوتا ہے۔ مرتا تو آدمی بیماری یا حادثہ سے ہے۔ گدھ تو صرف اس بات کو سب پر ظاہر کرتا ہے کہ یہاں لاش پڑی ہے۔ وہ نشان ہے سبب نہیں ہے۔ نتیجہ ہے موجب نہیں ہے +

قومی تاریخ اُن اوصاف کو زندہ رکھتی ہے۔ جن پر قومی ہستی کا دارومدار

ہے۔ چراغ ہی سے چراغ جلتا ہے۔ مہاپرشوں کی مثال ہی ہم کو اُن کی تقلید کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ اس واسطے جس قوم کی کوئی تاریخ نہ ہو اُس کی ترقی کے واسطے ضروری ہے کہ وہ کسی اور قوم کے ساتھ ایسا تعلق پیدا کرے کہ اُس کے بزرگوں کو وہ اپنا سمجھنے لگے۔ یا ایسا مذہب اختیار کرے جس سے کسی قوم کی تاریخ اُس کے لئے جوش دلانیوالی بن جاوے۔ مثلاً افریقہ کے حبشی خود بخود ذراسی بھی ترقی کرنے کے ناقابل ہیں۔ کیونکہ اُن کے پاس کوئی معراج نہیں ہے۔ کوئی نام نہیں ہے جو اُن کو پراوپکار۔ بہادری۔ سچائی سکھاوے۔ اِن حبشیوں کی ترقی آج کل مذہب اسلام کے ذریعہ سے ہو رہی ہے۔ جب وہ اہل اسلام کے انبیاؤں اور اولیاؤں کی سوانح عمری پڑھتے ہیں۔ اور اُن کے افعال کی تعریف کرتے ہیں۔ تو وہ تہذیب کے اصولوں سے واقف ہوتے ہیں۔ اگر اِس طرح کسی مہذب قوم کی تاریخ سے اپنا رشتہ قایم نہ کریں۔ اور اُس کی جوت سے اپنی جوت روشن نہ کریں تو وہ قیامت تک جہالت اور کمزوری کے شکار رہیں۔ پس تاریخ ہی سب گنوں کی داتا ہے۔ تاریخ سب مذہبوں کا مجموعہ ہے۔ تاریخ کے ذریعہ سے ہم مہاتما بُدھ۔ سری شنکر اچاریہ۔ گرو نانک وغیرہ تمام مذہبی اور اخلاقی رہبروں کے جیون چرتر سے سبق سیکھ سکتے ہیں۔ تاریخ کی مٹھی میں سب مذہبوں کی تلقین ہے۔ تاریخ سے بچکر کوئی کہاں جائے گا۔ یہ تو ہاتھی ہے جس کے پاؤں میں سب کا پاؤں ہے +

تاریخ ہم کو یاد دلاتی ہے۔ کہ ہمارا فرض کیا ہے۔ دنیا کے جھگڑوں میں پھنس کر جب ہم اعلےٰ خیالات کو بھولنے لگتے ہیں۔ تو بزرگوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ کہ خبردار۔ ہماری آن رکھنا۔ ہمارا کام جاری رکھنا۔

سپوت رہنا۔ جس طرح ہم نے قوم اور دھرم کے لئے کوشش کی اسی طرح کرتے رہنا۔ ایسا نہ ہو کہ ہمارا جتن یونہی ضایع جاوے۔ یہ سنکھ قوم کو ہر وقت جگاتا رہتا ہے۔ تاریخ قومی تنزل کی اندھیری رات میں چوکیدار رہتی ہے۔ کہ سوتا مت۔ اپنے مال کی حفاظت کرو۔ یہ اصول کبھی نہیں بھولنا چاہیئے۔ کہ اخلاقی ترقی کا سرچشمہ انسان ہوتا ہے۔ جیتا جاگتا پانچ فٹ کا کوئی آدمی ہی قوم کو سدھاتا ہے۔ کتابیں۔ مسئلہ۔ رسمیں۔ ظاہری ٹیپ ٹاپ۔ کہاوتیں۔ فلسفہ کی باریکیاں۔ یہ سب اُس آدمی کے نوکر ہیں۔ اُس کے مالک نہیں۔ کتابیں صرف ردی کا ڈھیر ہیں۔ اگر ایک آدمی اُن کے مطابق زندگی بسر کر کے نہیں دکھلاتا۔ بھجن۔ پرارتھنا۔ سنسکار کے طریقہ۔ تعلیم کا بندوبست۔ نیم اور اُپ نیم۔ سبھا سماج۔ مٹھ اور ٹول۔ اخبار۔ یہ سب ذریعہ بے سود ہیں۔ اگر کوئی آدمی ہمارے سامنے مثال کے طور پر نہ ہو۔ یہ سب مصالح تو تیل بتی کی طرح ہے۔ ایک آدمی کی زندگی ہی آگ ہے۔ جس سے روشنی پھیلتی ہے۔ یہ سارا سامان برات کی آرایش ہے۔ نوشہ تو وہ مہاپرش ہے۔ جس کے ہر فعل سے ہزار سبق ملتے ہیں۔ جس کی ہر بات جادو کا اثر رکھتی تھی۔ جس کا نام وقت اگر گھس گھس کر بھی مٹاوے تو لوح تاریخ سے نہیں مٹیگا۔ جس کی تصویر ہر دل میں رہیگی۔ خواہ لوگ اور سب کچھ بھول جاویں اخلاقی ترقی پر ملکی۔ دنیوی اور ہر طرح کی ترقی کا دار و مدار ہے۔ اگر قوم کے آدمی لالچی۔ بزدل اور خود غرض ہیں۔ تو وہ قوم ضرور برباد ہوگی۔ خواہ ہر گاؤں میں پارلیمنٹ (راج سبھا) بن جاوے۔ اور دنیا بھر کے حقوق اُن کو عطا کئے جاویں۔ اگر قوم کا اخلاق درست ہے تو ہر حالت میں وہ خوش رہیگی۔ خواہ کوئی بھی سبھا یا سماج یا جلسہ نہ ہوتے ہوں۔ پس تاریخ سے ہم اُن مہاتماؤں

کے بچن سنتے ہیں جن کی زندگی کی یاد کے بغیر موٹی موٹی کتابیں خواہ وہ کتنی ہی قدیم کیوں نہ ہوں۔ دقیق مسئلہ جو نارو جی کی سمجھ میں بھی نہ آویں۔ بیٹھے بھجن جن کو سنتے سنتے لوگ وجد میں آجاویں۔ بڑی کانفرنسیں (سبھائیں) جن میں بھارت ورش کا ہر خاندان تک پرتی ندھی (ایلچی) بھیجدے۔ کالج جن کی چھت آسمان سے باتیں کرتی ہو۔ تقریریں جن کو سنتے سرسوتی بھی اُتر آوے۔ اخبار جن کی اشاعت ہر گاؤں میں ہووے یہ سب چیزیں کسی قوم کو نہیں اُٹھا سکتیں۔ تاریخ آدمیوں سے ہماری واقفیت کراتی ہے۔ اور اس وجہ سے سب سے بڑی اُستاد ہے۔ تاریخ سنتوں کی سمادھ ہے۔ صرف سمادھ خاموش ہوتی ہے۔ تاریخ اُن کی ہر بات کا راگ گاتی ہے۔ سمادھ شکل دکھاتی ہے مگر تاریخ ہر قول اور فعل۔ ہر عادت اور خصلت پر روشنی ڈالتی ہے +

پس قومی اخلاق پر قومی ہستی منحصر ہے۔ قومی اخلاق اُن آدمیوں کی زندگی کے سہارے ہے۔ جنہوں نے دھرم اور سچ کا پالن کیا۔ تاریخ اُن مہاتماؤں کے جیون چرتر کا نام ہے۔ اس لئے تاریخ پر قومی ہستی منحصر ہے دو بڑے اصول جن سے یہ صداقت پایۂ ثبوت تک پہنچتی ہے ہمیں یاد رکھنے ضروری ہیں۔ اول **قومی اخلاق کی اہمیت** چھوٹی قومیں جن کے پاس نہ دھن ہو نہ ہتھیار۔ صرف اخلاق میں اعلےٰ ہونے کی وجہ سے بڑی قوموں کی دولت اور طاقت چھین سکتی ہیں۔ اخلاق ہی آدمیوں کے جیون کو سپھل کرتا ہے۔ اور ہماری انسانی طاقتوں کے نشوونما کا موقع دیتا ہے۔ جس قوم کے پاس آج اوصاف موجود نہیں ہیں مگر قلعہ ہیں۔ مندر ہیں۔ خزانہ ہیں۔ توپیں ہیں۔ تو سمجھ لو کہ وہ قوم اُس مکان کی طرح ہے جو کھوکھلی بنیادوں پر کھڑا ہے۔

وہ وقت جلد آوے گا جب اُس کے قلعوں میں دوسری قوم رہیگی۔ اُس کے مندر گرائے جائیں گے۔ اور اُن کی اینٹوں میں اُس کے بچے چُنے جائیں گے۔ اُس کے خزانے لوٹے جائیں گے اور اُس کے دشمنوں کو مالا مال کریں گے۔ اُس کی توپیں اُس ہی کی بربادی کے لئے کام میں لائی جائیں گی۔ اور اُسکے گھروں کی طرف اُن کے منہ کئے جاویں گے۔ برخلاف اس کے اگر قوم میں اچھے گن ہیں تو وہ نہ صرف اپنی حفاظت کر سکے گی بلکہ دوسروں کو مدد بھی دیگی اُس کی طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھ سکیگا۔ اُس کے سر کا بال تک بیکا نہ ہوگا۔ اُس کی سرخ روئی ہوگی۔ اُس کے کھیت ہرے بھرے رہیں گے اور اُس کے حاسدوں کا منہ کالا ہوگا +

دوئم۔ اخلاقی ترقی کے لئے زندگی کی مثال کی ضرورت۔

اخلاق تو کرنے کی بدیا ہے۔ کہنے کی تو بات ہی نہیں ہے۔ جرمنی کے مشہور شاعر گیٹی نے کہا ہے کہ تمہاری روزمرہ کی زندگی نہایت سبق آموز کتاب سے زیادہ سبق سکھا سکتی ہے۔ ہر شخص کا برتاؤ ایسا ہونا چاہیئے کہ وہ خود شاستر مجسم ہو پراوپکار پر وپاکھیان دینے کی اُسے ضرورت نہ رہے۔ کیونکہ اُس کی شکل ہی ہزار تقریروں کا اثر رکھتی ہو۔ لالچ کے خلاف اُسے اُپدیش دینا نہ پڑے۔ مشہور ہے کہ ایک شاعر کا ایک شاگرد روز اُسے دق کرتا کہ آپ نے یہ اصلاح کس کتاب کی سند سے کی ہے۔ وہ اصلاح کس قاعدے کے مطابق ہے۔ ایک دن اُستاد جھلا گیا اور کہا ارے ہم شعر کہتے کہتے خود کتاب بن گئے ہیں۔ تو یہ کیا پوچھتا رہتا ہے۔ اسی طرح وہی آدمی قوم کو دوبارہ ترقی کی راہ پر ڈال سکتے ہیں جن سے اگر پوچھا جاوے کہ یہ بات آپ کس مسئلہ کی رُو سے کرتے ہیں۔ پراوپکار کس سدھانت سے کرنا ضروری ہے تو وہ کہہ سکیں۔ کہ بھئی ہم خود مسئلہ اور سدھانت ہیں۔

ہماری زندگی ہی ہماری تلقین کا ثبوت ہے۔ زیادہ کیا کہیں۔ صرف کتاب موقع پر کام نہ آوے گی۔ منتر وقت پر دھوکا دے گا۔ پرارتھنا کیا خبر ہے سنی جاوے یا نہ سنی جاوے۔ تعویذ مشکل میں ٹوٹ کر گر پڑے گا۔ شلوک اور رچائیں دل کو ڈھارس نہ دیں گے۔ یہ سب اُس وقت کارگر ہوں گی جب کسی مہا پرش کی تصویر آنکھوں میں پھرتی ہو۔ جس نے اُن آزمایشوں کا مقابلہ کیا ہو جن کا ہمیں سامنا کرنا ہے۔ اُس کی مدد ہی ہماری نجات کا باعث ہوگی +

چنانچہ مسٹر کہ مہا پرش پوجا کو ہی کارلائل انگریزی مصنف تمام ترقی کا سبب بتاتا ہے۔ اُس کی رائے میں دنیا کی تاریخ صرف بڑے آدمیوں کی کرامات کا اظہار ہے +

(۳)۔ قومی تاریخ سے اپنے رواجوں۔ دستوروں اور قومی سنسکاروں کی قدر ہوتی ہے۔ ہر قوم کی ہستی اخلاق کے علاوہ اُن رواجوں پر منحصر ہے جن کو وہ مانتی ہے۔ یہ رواج بھی اخلاق کو قایم رکھنے کی غرض سے چلائے جاتے ہیں۔ اور اکثر بزرگوں کی یادگار قایم کرنیکا ذریعہ ہوتے ہیں۔ ہر قوم کی الگ چال ڈھال ہوتی ہے۔ آدمی آدمی انتر ہے کوئی ہیرا ہے کوئی پتھر ہے۔ ہر قوم کی زبان۔ طرز رہایش۔ تہوار۔ میلے تماشہ۔ دستور شادی وغمی وغیرہ جدا جدا ہیں۔ اُس کے گذشتہ تجربہ کا نتیجہ ہیں یہ خصوصیات اُسکے ملک اور اُس کی ضروریات کے مطابق ہوتی ہیں۔ اُس کی قومی حیثیت کو ظاہر کرتی ہیں۔ اسی طرح ہر قوم۔ ہندو۔ مسلمان۔ انگریز۔ فرانسیسی۔ الگ پہچانی جاتی ہے۔ اُس کی زندگی کا ہر پہلو یہ دکھاتا ہے کہ اُس کے خاص اوصاف ہیں اور خاص فرائض اور خاص طاقتیں ہیں۔ پس قومی خصوصیات کا قایم رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً پوشاک ہی کو لیجیے۔ یوں تو

کپڑے پہننے کا بڑا مقصد گرمی سردی سے بچنا اور شرم حیا کو قایم رکھنا ہے۔مگر جب کوئی قوم ایک خاص پوشاک اختیار کر لیتی ہے تو ایک تیسرا مطلب بھی ہو جاتا ہے۔ وہ پوشاک اس قوم کے اتفاق کا نشان ہو جاتی ہے۔اور اُسے دوسروں سے الگ کرتی ہے۔ ہر قوم کے لئے اُس کے دستور اور اُس کی سماج کا ڈھانچا سیپی کی طرح ہے۔جس میں اُس کے اوصاف اور خیالات کا موتی چھپا رہتا ہے۔جب موتی سیپی کی پناہ سے نکلا تو غیروں کے ہاتھ بک گیا۔ یا یوں کہو کہ قوم کے رواجوں کا چوکٹ اُس کے دل و دماغ کے آئینہ کو رونق دیتا ہے۔تاکہ وہ تاریخ دنیا کی نمائش میں دیوار پر اچھی جگہ رکھے جانے کے قابل ہو۔ قوم اگر سپاہی ہے تو اُسکی سنستھائیں (یعنی مستقل قومی خصوصیات مثلاً زبان۔تہوار وغیرہ) اور اُس کے سنسکار خود آہنی ہیں۔جو دشمنوں کے تیروں سے بچاتے ہیں۔ اگر قوم ہیرا ہے تو سنستھا ئیں انگوٹھی ہیں۔جس میں وہ اپنی آب و تاب بازارِ دنیا کے جوہریوں کو دکھاتا ہے +

قومی تاریخ سے ہم کو پتہ لگتا ہے۔کہ ہمارے رواجوں اور سنستھاؤں کی کیا اصلیت ہے۔کس غرض سے اُن کو قایم کیا گیا تھا۔اُن میں کیا خوبیاں ہیں اُن سے قوم کے اتفاق اور اخلاق کو کس طرح مدد ملتی ہے۔جن رواجوں کے فوائد سے ہم بے خبر ہیں۔اُن کے لئے ہمارے دل میں عزت نہیں ہو سکتی۔اُن کو جارہی ہم بیہودہ اور بیمعنی سمجھنے لگینگے۔ان سے نفرت کرنے لگینگے اس طرح ہماری روزمرہ کی زندگی وبال ہو جائے گی۔کیونکہ ہم کو اپنی قومی روش سے اُلفت نہ رہیگی۔ پھر ہم کو اپنے دستور اور قواعد پنجرہ کی تیلیاں دکھائی دینے لگیں گی۔جن سے ہم سر پٹکتے پٹکتے گھایل ہو جائیں گے +

(۴)۔ قومی تاریخ اتفاق کا ذریعہ ہے +

آج کل ایکے کا بڑا غل ہے۔ کوّوں کی سی کائیں کائیں سب طرف ہو رہی
ہے۔ شاید یہ امید ہے کہ کوّوں کا ایکا بھی اُن کی طرح شور مچانے سے ہو جائیگا
کوئی کچھ تجویز پیش کرتا ہے۔ کوئی کچھ تدبیر بتلاتا ہے۔ اصل میں قومی تاریخ ہی
اتفاق کی بڑی سبیل ہے۔ کیونکہ قوم کے کارناموں اور سنستھاؤں میں سب کا
حصہ ہے۔ سب کو وہ جان سے پیارے ہیں۔ آج کچھ ہی جھگڑے قضیے ہوں
تھوک بندیاں ہوں مگر تہوار کے دن سب تفرقات بھول جاتے ہیں۔
بزرگوں کا نام لے کر سب گلے ملتے ہیں۔ اور قومی عروج کی دل ربا کہانیاں
سن کر سنا کر خوشی سے پھولے نہیں سماتے ہیں۔ قومی بزرگ کا نام ہمیشہ
قوم کے سب فرقوں کو عزیز رہتا ہے۔ دراصل میں دیکھو تو قومی تاریخ ہی
قومی حیثیت کا نشان ہے۔ قوم میں ہر شے بدلتی رہتی ہے۔ زمانہ سب
دستوروں کو کچھ کا کچھ کر دکھاتا ہے۔ پوشاک۔ خوراک۔ زبان سب باتوں
میں تھوڑی تھوڑی تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ مذہب میں انقلاب واقع ہو جاتا
ہے۔ انگلستان آج روم کے نام سے بیزار ہے۔ کئی سو برس پہلے روم
کے مذہب کا پیرو تھا۔ آج انگریز کرسیوں پر بیٹھتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا فرش پر
آلتی پالتی مار کر بیٹھتے تھے۔ اب انگریز تجارت اور صنعت و حرفت سے روزی
کماتے ہیں۔ سارا دیش ایک بھٹی بنا ہوا ہے۔ زمانہ گذشتہ میں کھیتی سے
پیٹ بھرتے تھے۔ سارا ملک مرغزار تھا۔ الغرض اگر انگریزوں کے بزرگ
اب واپس آویں تو اپنی اولاد کو پہچان بھی نہ سکیں۔ پس وہ کیا چیز ہے جس سے
یہ خیال بنا رہتا ہے کہ ہم ایک قوم ہیں اور سدا سے رہے ہیں۔ قومی طاقت
اور عزت کو بڑھانا ہمارا فرض ہے۔ صرف قومی تاریخ سے یہ جذبہ قایم رہتا
ہے۔ قوم کی چند روزہ سنستھاؤں میں تاریخ اٹل سنستھا ہے۔ قوم کے اور دستور

اور خصوصیات طوطا چشم ہیں۔ آج باعثِ ترقی ہیں۔ کل وہی نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔ ایک وقت قوم کو فتح دلاتے ہیں۔ دوسرے موقع پر اُس کو نیچا دکھاتے ہیں مگر قومی تاریخ وہ چیز ہے۔ کہ ہمیشہ قیمت رکھتی ہے۔ یہ کبھی قوم کو کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ ہمیشہ اخلاق اور اتفاق سکھاتی رہتی ہے۔ پس ہم دیکھتے ہیں کہ قوم کی تمام باتیں پلٹتی رہتی ہیں۔ بلکہ زمانہ مجبور کرتا ہے کہ قوم اُن کو بدلتی رہے۔ مگر قومی تاریخ اِن سب دستوروں کے موتیوں کو جنہیں قوم نے کسی زمانہ میں عزیز رکھا ہو۔ ایک لڑی میں پرو کر وہ ہار بناتی ہے جس کا پہننا ہر بچہ کا حق اور فرض ہے۔ اور جس سے قوم کی علمی اور اخلاقی ثروت کا پتہ لگتا ہے +

پس قومی تاریخ ہی قوم کے افراد کو ملا سکتی ہے۔ کیونکہ بزرگوں سے کس کو دشمنی ہے۔ آپس میں کتنا ہی لڑیں شرادھ کے دن تو سب رشتہ دار جمع ہو ہی جاتے ہیں۔ قومی تاریخ یہ یاد دلاتی رہتی ہے۔ کہ تم اصل میں وہی ہو جو پہلے ایسا ایسا کرتے رہے۔ تمہارا ماخذ وہی ہے۔ تم پر یہ یہ بیتی ہے۔ تم نے یہ یہ کام کئے ہیں۔ یہ سب باتیں قوم کے ہر آدمی پر صادق آتی ہیں۔ وہ اپنے حسب نسب۔ اپنے مذہب۔ اپنے رواجوں اور دستوروں سے انکار نہیں کر سکتا پس جس قوم کی تاریخ زندہ ہے وہ کبھی اندرونی جھگڑوں سے تباہ نہیں ہو سکتی +

اس لئے مہذب اقوام اپنی تاریخ کے زندہ رکھنے کو اپنا مذہب سمجھتی ہیں۔ بزرگوں کی یادگار قایم کرنے کو فرض اول خیال کرتی ہیں۔ مفصلہ ذیل طریقوں سے تاریخ کا علم پھیلایا جاتا ہے +

(۱)۔ تہوار۔ جو دن قوم کی تاریخ میں مبارک ہیں۔ اُن کے آنے پر خوشی

منانا قومی تاریخ سکھانے کا آسان ذریعہ ہے۔ چنانچہ امریکہ اور فرانس میں آزادی کی تحریک کی کامیابی کی یادگاریں جولائی میں تہوار منایا جاتا ہے۔ انگلستان میں اب ایک نیا تہوار امپائر ڈے (روز سلطنت) قائم کرنے کی صلاح ہے جو وکٹوریا کی پیدایش کے دن منایا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بچوں کو سلطنت برطانیہ کی طرف اپنے فرائض کا خیال رہے +

(۲) شہروں۔ بازاروں اور دیگر مقامات کا نام بزرگوں کے نام پر رکھنا +

یہ دستور تمام دنیا میں پایا جاتا ہے۔ پیرس میں تمام شہر میں نپولین کا نام پایا جاتا ہے۔ اُس کی فتوحات کی تاریخ ہر گلی کوچہ کی دیوار پر لکھی ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ جن تاریخوں پر کوئی مشہور قومی واقعہ ہوا ہے۔ اُن کو بھی کسی جگہ کا نام بنا دیا ہے۔ مثلاً ایک گلی اور اسٹیشن کا نام "۴ ستمبر" ہے۔ اول اول میں حیران ہو گیا کہ یہ کیا ماجرہ ہے یہ ۴ ستمبر کیا شے ہے۔ مگر معلوم ہوا۔ کہ اسی طرح ۱۴ جولائی وغیرہ نام بھی ہیں۔ لندن میں ٹرافالگر چوک واٹرلو اسٹیشن انگلستان کی بحری اور بری طاقت کی یادگاریں ہیں۔ فرانس کے بعض جہاز فرانس کے علما کے نام پر ہیں +

(۳) خاص طور پر مورتی یا مکان بنانا +

مورتی ہمیشہ سے بزرگوں کی یادگار قایم کرنیکا اچھا طریقہ چلا آیا ہے۔ چنانچہ لندن اور پیرس مورتیوں سے بڑے مندر بن رہے ہیں۔ پیرس میں لُوور عجائب خانہ کی چھت پر سینکڑوں بُت برابر برابر لگائے گئے ہیں۔ گویا وہ پتھر کی شکلیں اپنے بچوں کے کاروبار کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہیں۔ لندن میں ہر قدم پر کسی نہ کسی مہاپُرش کی مورتی نظر آتی ہے۔ گویا ہر گلی میں قومی عزت کا چوکیدار کھڑا ہے۔ البرٹ کی یادگار میں ایک عظیم الشان مکان بنایا گیا ہے اور نپولین

کا مقبرہ پیرس میں ایک قابل دید چیز ہے +

(۴)۔ بچوں کے نام رکھنا +

قوم اپنے مکانوں اور بازاروں کو بزرگوں کے نام سے پاک کرتی ہے۔ توکیا اپنے پیارے بچوں کو جو اُس کی سب سے بڑی دولت ہیں۔ اس برکت سے محروم رکھ سکتی ہے۔ ہر قوم اپنے بچوں کو وہ نام دیتی ہے جن کا زندہ رکھنا اُس کا فرض ہے۔ گویا ہمارے بچے پیدا ہوتے ہی قومی تاریخ میں حصہ لینے والے بن جاتے ہیں۔ اور گو ابھی تتلانا بھی نہیں سیکھا توبھی خاموشی سے قومی عظمت کا اظہار کرتے ہیں۔ کیوں نہ ہو۔ تاریخ ان ہی کی تو میراث ہے۔ جو کچھ بزرگوں نے کمایا تھا۔ اور جو کچھ ہم نے حاصل کیا ہے سب انہی کے لئے ہے۔ اور کس کے لئے ہے؟

(۵)۔ مدرسوں میں تعلیم +

ہر مہذب قوم بچوں کو مدرسوں میں اپنی تاریخ سکھاتی ہے اور اُس کو دلچسپ بناتی ہے۔ بزرگوں کی تصویریں اُس میں درج کرتی ہے۔ حب وطن سکھانیوالی نظمیں پڑھائی جاتی ہیں +

(۶)۔ شعرا کا کلام +

جب کوئی شاعر قلم لے کر بیٹھتا ہے تو وہ اکثر بزرگوں کی داستان سناتا ہے۔ قومی تاریخ کے بے شمار دلکش نظارہ۔ قومی سورماؤں کے کارنامے۔ قومی ہستی اور ترقی کے لئے جدوجہد کی روایتیں۔ یہ سب اُس کی آنکھوں میں پھرتی ہیں۔ اور اُس کی زبان کو قوت گویائی عطا کرتی ہیں۔ ؎

بیٹھے تنورِ طبع کو جب گرم کر کے میر کچھ شیرمال سامنے کچھ نان کچھ پنیر

قومی تاریخ کے سینکڑوں افسانوں میں سے کوئی ولولہ انگیز کہانی کہہ ڈالتا ہے۔ اور قوم کو ہمیشہ کے لئے اپنا عاشق بنا جاتا ہے +

(۷)۔ علم تاریخ کے فاضلوں کی مدد +

ہر یونیورسٹی (دارالعلوم) میں کئی پروفیسر (استاد) ہوتے ہیں۔ جو تاریخ کے مطالعہ میں مصروف رہتے ہیں۔ اور قوم کو اپنی معلومات سے فائدہ پہنچاتے ہیں۔ وہ دن رات محنت کرتے ہیں اور قومی تاریخ کے متعلق جستجو و تفتیش میں سرگرداں رہتے ہیں +

اس موقع پر عام اصولوں پر بحث کی گئی ہے۔ پھر کبھی اس بات پر غور کروں گا کہ ہندوستان میں ان اصولوں سے ہم کس طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور کن طریقوں سے قومی تاریخ کی مدد لے کر قومی اخلاق اور اتفاق کو ترقی دے سکتے ہیں +

اردو ریلوے گائڈ یا انڈین ریلویز ٹائم ٹیبل۔ نولکشور پریس لکھنو کے جس قدر احسانات اردو زبان پر ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔ حال میں ریلوے ٹائم ٹیبل جس کی ضرورت کل اردو دان اصحاب میں جو انگریزی سے ناآشنا تھے محسوس ہو رہی تھی با ہوار شائع کرنے کا انتظام کیا ہے۔ یہ ایک ایسی کمی پوری کی گئی ہے جس سے بہت سے سادہ لوح پرانے ڈھنگ کے آدمی ریلوے ملازمین کے ہتھکنڈوں سے بچ گئے۔ گاڑیوں کے اوقات۔ کرایہ۔ ریلوے قواعد۔ قابل دید مقامات۔ غرض مسافر کے لئے جن چیزوں کی واقفیت ضروری ہے وہ سب اس میں درج ہے۔ ضخامت ۱۴۲ صفحہ۔ لکھائی چھپائی نہایت عمدہ۔ ہر ایک ایسے شخص کے پاس جو انگریزی نہیں جانتا اس ریلوے گائڈ کا ہونا ضروری ہے۔ قیمت فی کاپی کل ۲/ جو نہایت ہی کم ہے۔ نولکشور پریس لکھنؤ کے پتہ سے دستیاب ہو سکتی ہے +

شکایتِ زمانہ

از منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی

آہ دشواریِ منزل کبھی ایسی تو نہ تھی مانعِ قطعِ مراحل کبھی ایسی تو نہ تھی
ہر قدم پہ تپشِ دل کبھی ایسی تو نہ تھی غرقِ کشتی لبِ ساحل کبھی ایسی تو نہ تھی
سخت یا رب مری مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی

تیرے حملے سے نہیں ہند میں کوئی مصئوں چلگیا ٹیکے کلیجوں پہ چھری تیرا فسوں
ٹائی کالر پہ جسے دیکھئے اب ہے مفتوں یوں تو خلقت تھی تری لیلیٔ فیشن کی مجنوں
دھوم ظالم اپنی محمل کبھی ایسی تو نہ تھی

پیشتر اس سے نہ تھی اہلِ قلم پر بیداد کہ ترے دور میں تھے اے ستمِ دوراں آزاد
چیختے تھے نہ پڑے قیدِ جفا میں ناشاد یوں اسیروں سے نہ تھا خانۂ زنداں آباد
خلق پابندِ سلاسل کبھی ایسی تو نہ تھی

چھین لی غیروں نے آ کر تیری میراث جدی تیری تقدیر میں اوروں کی غلامی تھی ہی
بہ گئی سندھ میں بہا کر تجھے یورپ کی ندی گرچہ بھارت تری حالت تھی بہت ان سے ردی
ہاں مگر رحم کے قابل کبھی ایسی تو نہ تھی

خانہ جنگی کا ترا کیمپ بنا تھا نہ شکار تجھ پہ ہنس ہنس کے نہ آوازے تھے کستے اغیار
بھائی بھائی میں حریفانہ نہ تھی یوں تکرار کانگرس میں تھی نہ تیرے ہال میں جوتی پیزار
فتنہ ساماں تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

ہند والوں کو نہ تھا خون کا چسکا پہلے تیری چتون نہ نشانہ تھی قضا کا پہلے
ڈالتی تھی نہ جوانوں پہ یہ ڈورا پہلے تھی نہ یہ فتنہ گری ادا میں رعنا پہلے

آنکھ ظالم! تیری قاتل کبھی ایسی تو نہ تھی

محو تھی یوں نہ غمِ حسرتِ بے سود میں تو
تھی نہ لپٹی ہوئی اندوہ غمِ آلود میں تو
کب سرگرم طلب تھی رہ بہبود میں تو
سب سے پیچھے تھی نہ یوں جادہ مقصود میں تو

قوم! کھوٹی تیری منزل کبھی ایسی تو نہ تھی

یہ مشینیں یہ کلیں اور یہ برقی آلے
تیری صنعت نے تھے سانچے میں ہزاروں ڈھالے
تو نے تھے ہفت سماوات کے کھولے تالے
معجزے تجھ کو دکھاتے ہیں جو یورپ والے

ان کرشموں کی تو قائل کبھی ایسی تو نہ تھی

ساری قوموں سے جدا تھا تیری رفتار کا ڈھنگ
بحر و بر قطع ہزاروں کئے بے فرسخ و سنگ
پاشنہ تھا تیری شدید غربت کا نہ لنگ
ہمقدم صرصرِ صحرا سے تھی دیوارِ فرنگ

رہگذر میں تیرے حائل کبھی ایسی تو نہ تھی

گرہ دھرم۔ ہندوستان میں نجات کا راستہ عموماً تارک الدنیا ہو جانا خیال کیا جاتا ہے۔ یہ ایک عام خیال پھیلا ہوا ہے کہ دنیا وہ پھندا ہے جس کی الجھن سے نکلنا دشوار ہے اور مذہب کے متعلق اپنے فرائض کا پورا کرنا دنیا میں مشکل ہے۔ اس خیال کو رد کرنے کے لئے پنڈت شیوناتھ شاستری ایم۔اے برہم سماج کے مشہور اپدیشک نے ایک کتاب بنگالی زبان میں گرہ دھرم (فرائض خانہ داری) کے نام سے لکھی تھی جس کا اردو ترجمہ اردو کے نامور محسن اور لاہور برہم سماج کے سرگرم اپدیشک شردھے پرکاش دیوجی نے کیا ہے۔ کتاب اگرچہ مختصر ہے اور ضخامت چھوٹی تقطیع کے ۱۱۲ صفحہ ہیں مگر حق تو یہ ہے کہ دریا کو کوزہ میں بند کیا ہے۔ گرہست کے ہر ایک فرض کو نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے اور نہایت اچھا مشورہ دیا ہے۔ حتّٰے کہ پالتو جانوروں تک کے متعلق فرائض بتلائے ہیں۔ شردھے جی نے اردو زبان پر اس تصنیف سے بڑا احسان کیا ہے۔ ہمارا اپنا خیال ہے کہ ہر ایک دنیا دار کے لئے اس کا پڑھ لینا مفید ہے قیمت ۵ ر مصنف سے لاہور کے پتہ سے مل سکتی ہے۔ چھپائی نہایت پاکیزہ +

کانگرس کا آنے والا زمانہ

از منشی رام دیال ودیارتھی مختار عدالت

سنبھلنے دے مجھے او ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

پچھلے سال کی اہم مصیبت کے بعد جو اُمنگیں سورت کانگرس سے وابستہ تھیں۔ ان کی حسرت ناک تباہی کی یادگار کے بعد اب اگر کوئی اُمنگ ہوسکتی ہے۔ تو یہ کہ "کانگرس کا آنے والا زمانہ بہتر ہو" لیکن اس فقرے سے بدن میں سنسناہٹ پڑ جاتی ہے۔ کہ "کانگرس کا آنے والا زمانہ کیا ہونا چاہیئے" بڑا مشکل مسئلہ ہے۔ جس کے حل کرنے کے لئے عالی دماغ مدبروں کی توجہ کی ضرورت ہے۔ مگر وائے ناکامی! کہ امسال پانچ مہینہ گذر جانے پر بھی یہ خبر نہیں ہے۔ کہ کانگرس کی آیندہ شکل کیا ہوگی۔ پولٹیکل ہمہ دانی کے دعویدار ذاتی و پارٹی بندی کے اختلافات میں محو ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کانگرس مرگئی۔ لیکن نہیں اُنھوں نے غور نہیں کیا۔ اختلافات اور لڑائی زندگی کی علامات ہیں۔ قبر میں سے اُٹھ کر مردے لڑنے اور اختلاف کرنے نہیں آتے۔ پہلے ایک کانگرس تھی اب دو نظر آتی ہیں۔ البتہ "ایک سے جب دو ہوئے تب لطف یکتائی نہیں"۔ اب اگر غور کرنے کے قابل اہم مسئلہ ہے۔ تو یہ کہ آیا دونوں فریق کے لئے ملکر کام کرنا زیادہ مفید اور ملک کے لئے زیادہ بہتر ہے یا الگ الگ کام کرنا۔ عام مسئلہ کے بموجب ایک اور ایک الگ الگ دو اور ملکر گیارہ ہوتے ہیں۔ اس لئے عام اصول

کے بموجب بھی ملکر کام کرنا مفید ہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی الگ الگ کام
کرنے میں جو خرابیاں دونوں فریق کے واسطے حائل ہو سکتی ہیں۔ نظر انداز
نہیں ہونی چاہئیں۔ اول یہ کہ پولیٹکل کام مثل مذہبی یا سوشیل سوسائیٹیوں
کے نہیں ہوتا ہے خصوصاً ہماری موجودہ پالٹیکس کا کام اس قسم کا ہے۔ جو
فی الحال موجودہ گورنمنٹ پر اثر ڈالکر حقوق حاصل کرتا ہے۔ خواہ مانگ کر۔
خواہ دباؤ سے۔ اس لئے جس قدر کثیر تعداد پبلک کی ہم آواز ہوگی۔ وہ آواز
زبردست اور بااثر ہوگی۔ اب تک ہی حکام کو یہ بہانہ تھا۔ کہ مسلمانوں کا
بڑا گروہ کانگرس کا ساتھی نہیں ہے۔ اور اس لئے کانگرس کی خواہشات
تمام ملک کی خواہشات نہیں ہیں۔ اور اب تو یہ بہانہ اور مضبوط ہوگا۔ کہ
ہر ایک پارٹی کی خواہشات تمام ملک کی خواہشات نہیں کہلائیں گی۔ بلکہ
ایک تہائی حصہ کی خواہشات شمار ہوں گی۔ ایسی صورت میں نہ تو ماڈریٹ
اور نہ ایکسٹریمسٹ دونوں میں سے کسی کی آواز بھی کوئی وقعت رکھ سکے گی۔
ماڈریٹ اگر یہ سمجھیں کہ گورنمنٹ کی نظر دیکھتے ہوئے متواتر مانگنے سے چند
جزوی نمایشی رعایات حاصل کریں گے۔ تو اس خیال کو آیندہ تجربہ غلط ثابت
کرے گا۔ دوسرے یہ کہ دونوں فریق کے الگ الگ کام کرنے میں یہ بھی
اندیشہ ہے کہ زیادہ اختلافات نہ بڑھ جائیں۔ جس سے کوئی اور نقصان دہ
کشمکش پیدا ہو جائے۔ دنیا میں سینکڑوں بے اثر واقعات ہوتے ہیں۔
لیکن جن واقعات پر اور جن اشخاص کے افعال پر ایک عالم کی نظر ہے۔
اور جن کی تواریخ میں یادگار رہیگی۔ وہ افعال بڑے غور کے ساتھ عمل
میں آنے چاہئیں۔ سورت کا واقعہ ہونے کو تو ہو گیا۔ لیکن اب زمانہ کا
نامہربان ہاتھ یا کوئی دنیوی طاقت اس کے مٹانے میں قاصر ہے۔ آیندہ

ہم کوئی شرمناک یادگار قایم کر کے یہ دھبہ نہ لیں۔ کہ ہندوستان کے تعلیم یافتہ اس قدر تنگ خیال ہیں کہ مشترکہ مقاصد کے لئے کام کرنے میں اختلاف رائے رکھتے ہوئے خندہ پیشانی سے ملکر کام نہیں کر سکتے۔ اور اگر واقعی ہمارے لیڈران نے ابھی جذبات پر اس قدر تھوڑا قابو بھی نہیں پایا۔ تو ہمارے لئے یہی بہتر ہے۔ کہ بجائے کسی قسم کے محبت ملکی کا غل مچانے کے چپ ہو کر شرم سے نیچی گردن ڈال لیں۔ اور گھروں میں بیٹھ جائیں۔ تاکہ زمانہ کا سیلاب آئے اور ہم کو تباہ کرتا ہوا چلا جائے۔ اور ہمارے لیڈروں کے افعال کی شرمناک یادگار چھوڑ جائے +

اب جبکہ ایکسٹریمسٹ اور ان کے ذمہ وار لیڈر مسٹر تلک شروع سے اس آرزو کے اظہار میں تامل نہیں کرتے۔ کہ ؎

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو سو ہو
کاش کہ تم میرے لئے ہوتے

اور اس خواہش میں بیتاب ہوئے جاتے ہیں۔ کہ بھائی آکر سینہ سے لپٹ جائیں۔ ؎

بھائی ہمارے آئیں تو ہم سب گلے لگائیں
آنکھوں کا فرش راہ میں انکی سبھی بچھائیں

خصوصاً بنگالیوں نے اختلافات مٹا کر پچھلی پراونشل کانفرنس میں وسعت خیالی کا ثبوت دیا ہے۔ ایسی حالت میں اگر ماڈریٹ تامل کریں گے تو وہ سورت سے زیادہ ایک اور شرمناک واقع کی بنیاد رکھیں گے۔ اور اس عمدہ موقع کو ہاتھ سے کھو دیں گے +

لیکن اس حالت میں ایک اہم سوال حل ہونے سے رہ جاتا ہے۔ کہ

جو دونوں فریق کے اصحاب کے سینوں میں پیچ و تاب کھائیگا - یعنی دونوں فریق میں صلح کس طرح سے ہو - جبکہ دونوں کے اصول میں زمین و آسمان کا فرق ہے ؟

بے شک یہ اہم مسئلہ ہے - جو مدبر اور عالی دماغوں کے حل کرنے کے قابل ہے - لیکن ہر شخص کا خیال قابل توجہ اس خیال سے ہونا چاہیئے - کہ ایک چھوٹے سے چھوٹا قطرہ بھی بڑے سے بڑے سمندر کے سکون میں تبدیلی پیدا کرنے کی طاقت رکھتا ہے - اسی خیال کو لیکر میں اپنے ٹوٹے پھوٹے پریشان خیالات ظاہر کرنے کی جرأت کر رہا ہوں +

میرے خیال میں یہ مُسلمہ ہے

کہ مقصد دونوں فریق کا قریب قریب ایک ہے - اور میں سمجھتا ہوں - کہ یہی ایک وجہ ہے - کہ جس سے ہمارے دلوں میں ملنے کے لئے وسعت خیالی سے زبردست حرکت ہونی چاہیئے - صرف طریقہ حصول مقصد میں فرق ہے - لیکن ایکسٹریمسٹ کے اصول طریقہ حصول مقصد ایسے کٹ کھنے نہیں ہیں - کہ جن سے ماڈریٹ کو یہ لازم آئے کہ وہ الگ رہیں - اور بغیر اس کے ان کی سلامتی میں کوئی فرق پڑتا ہے - قطع نظر اس کے اگر اس طرح اختلاف رائے پر علیحدگی کی گئی - تو آیندہ اگر ماڈریٹ میں اختلاف رائے ہوا - جو کہ اس وقت عام رائے کی لہر کا اندازہ کرتے ہوئے بہت ممکن ہے - تو کیا پھر ماڈریٹ میں سے بھی دو پارٹیاں ہوں گی - اور اس طرح تھوڑے تھوڑے آدمیوں کی پارٹیاں ہوتی چلی جائیں گی - یا اگر چند آدمی ذاتی اختلاف کی وجہ سے کسی شخص کے ساتھ ملکر کام نہیں کر سکتے - تو کیا اُن کا ڈھائی چاول الگ رہنا ملک کے اپنے فوائد کیلئے بھی بہتر نتیجہ ہو سکتا ہے ؟ کیونکہ ذاتی اختلافات کہاں نہیں

ہیں۔ پنجاب میں لالہ لاجپت رائے و لالہ ہرکشن لال صوبہ متحدہ میں آنریبل مدن موہن مالوی و آنریبل لالہ سری رام۔ بنگال میں مسٹر سریندر و ناتھ بینرجی و مسٹر موتی لال گھوش کے تعلقات کشیدہ ہیں۔ یہ تو نامور آدمیوں کے اختلافات ہیں۔ لیکن ان سے نیچے اتریئے تو اور مل سکتے ہیں۔ غرض اختلافات ذاتی و اختلافات اصولی دونوں ہمیشہ رہیں گے۔ مقامی لوگوں میں ایک کی افزائی عزت و مرتبہ پر دوسرے کو رشک ہو کر اختلافات ہونا لازم ہیں۔ اور جبتک جذبات انسانی موجود ہیں آیندہ بھی اُن کو کوئی روک نہیں سکتا ہے۔ اور جذبۂ رشک جو حسد تک نہ پہنچے اور اس سے مشترکہ فوائد کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کی جائے۔ بُرا بھی نہیں ہے۔ میرے خیال میں اختلافات ہوتے ہوئے بھی وسیع خیال اصحاب ملکر کام کر سکتے ہیں۔ لیکن اس وقت جبکہ قواعد ایسے جامع اور مکمل بنائے جاویں۔ جن میں اصول ذیل کا لحاظ رکھا جاوے +

(۱)۔ ہر صورتوں میں اور ہر ایک شخص پر خواہ وہ کسی اصول اور کسی خیال کا ہو۔ خواہ کیسے ہی ذاتی تعصبات کسی شخص میں ہوں۔ قواعد یکساں اثر کر سکیں +

(۲)۔ ہر ایک معاملہ میں عام رائے کا لحاظ کثرت رائے پر مدنظر رہے بجائے اس کے کہ چند بارسوخ اشخاص کی رائے کو فوق رہے +

(۳)۔ ہر شخص کو صفات مقررہ کے ساتھ ترقی کا موقع مل سکے +

سورت میں جو جھگڑا ہوا اس کی تمام لیکن مختصر وجہ یہ ہے۔ کہ امتحان کے وقت قواعد سخت ناکمل ثابت ہوئے۔ جن کی وجہ سے چند اشخاص نے نامناسب کاروائیاں کیں۔ وجہ اس کی بظاہر یہ ہے۔ کہ قواعد میں مندرجہ بالا اصول کا لحاظ سختی کے ساتھ نہیں رکھا گیا۔ اس کی مثالیں مندرجہ ذیل

ہیں +

(۱)۔ اصولاً تو پریسیڈنٹ کانگرس تمام ملک کا لیڈر تسلیم کیا جاوے۔ لیکن اس کو منتخب کرنے کا اختیار ایک شہر کے صرف چند اشخاص کو حاصل ہو اور پھر بطور نمایش اس کا انتخاب عام جلسہ میں بھی ہو۔ اور وہ اس وقت باضابطہ پریسیڈنٹ شمار کیا جاوے۔ لیکن یہ حیرت انگیز تماشا تھا۔ کہ جب تک جلسہ میں پریسیڈنٹ کا باقاعدہ انتخاب ہو۔ اُس وقت تک جلسہ کس پریسیڈنٹ کی صدارت میں رہتا تھا؟ اور بصورت نزاع کس کا حکم قابل پابندی تھا۔ اس قاعدے کے نقائص ہیں سورت کے واقعہ کی بنیاد بہت کچھ مخفی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے۔ کہ پریسیڈنٹ عام رائے سے منتخب کیا جائے۔ اور وہ ایسا ہونا چاہیئے۔ جس نے ایک عرصہ تک خدمت ملک کی ہو اور اُس وقت جس سے سینئر خادم ملک دوسرا نہ ہو +

(۲)۔ رزولیوشن یوں تو عام رائے ملک کا اظہار کریں۔ اور صرف ایک شخص کو اُن کے مرتب کرنے کا اختیار حاصل ہو۔ ورنہ چاہیئے۔ کہ ایک جلسہ کانگرس ہونے کے بعد دوسرے جلسہ کانگرس کے لئے ملک کی رائے اس بارے میں سال بھر تک کانگرس کے کارکناں کے پاس موصول ہوتی رہیں۔ کہ کون سے رزولیوشن مرتب اور پیش ہونے چاہئیں؟ کیونکہ درحل تو رزولیوشن کا درست مرتب ہونا ہی پیش ہونے سے پہلے ضروری ہے۔ پیش ہونیکے بعد جلسہ عام میں بہت کم آدمی ایسے ہوتے ہیں۔ جو صحیح رائے رزولیوشن کے ناقص یا مفید ہونے کے بارے میں ظاہر کرسکیں۔ اس لئے وہ عام رائے سے مرتب و پیش ہونے چاہئیں۔ کیونکہ رزولیوشن ہی عام اصول اور روح رواں ہوتے ہیں +

(۳)۔ کانگرس پنڈال میں ایک چبوترہ بنایا جاتا ہے۔ اور اس پر چند آدمی آپس میں ہی فیصلہ کر کے کہ وہ زیادہ باعزت ہیں۔ بیٹھتے ہیں۔ قومی جلسوں میں ایک شخص کا دوسرے پر مرجح ہونا سخت نامناسب فعل ہے۔ قومی جلسوں میں سوائے پریسیڈنٹ یا اور عہدہ دار تنہا سب کے باقی تمام اشخاص ایک حیثیت میں ہونے چاہئیں۔ کیونکہ ممکن ہے۔ کہ ایک شخص دوسرے شخص سے اپنے تئیں کسی حالت میں کم باعزت نہ سمجھتا ہو۔ لیکن کانگرس میں آکر اس کو مجبوراً ایسا ہونا پڑتا ہے۔ شاید یہ کہا جاوے۔ کہ یہ نہایت ہی چھوٹی اور ایسی باتیں ہیں۔ جو تنگ خیالی کی حد تک پہنچتی ہیں۔ لیکن قدرت کی جانب سے جب تک انسانی جذبات موجود ہیں۔ ایسے جذبات کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے ضروری ہے۔ کہ قواعد ایسے طرز پر مرتب کئے جائیں جن میں ہر قسم کے نقص کے فیصلہ کرنے کی طاقت اختلاف رائے کی صورت میں ایسی عمدگی سے حاصل ہو۔ کہ وہی نقص اگر معترض میں ہوتا تو مثل شخص ناقص کے وہ فیصلہ اُس کے لئے موزوں ہوتا +

(۴)۔ اب تک اُن لوگوں کی مناسب توقیر کرنے میں کانگرس کی جانب سے بخل سے کام لیا گیا۔ جو کسی وجہ سے واقعی حکام کے موردِ عتاب ہوئے ہیں۔ لیکن یہ امر مدنظر رہنا چاہیئے کہ پالٹیکس میں کام کرنے والے عموماً حکام کے موردِ عتاب ہوتے ہیں۔ خصوصاً اس ملک میں جہاں گورنمنٹ اور رعایا کے فوائد جداگانہ متصور ہوتے ہیں۔ ملک کی حقیقی بہتری چاہنے والوں پر ناممکن ہے۔ کہ حکام کا عتاب نہ رہے۔ اس لئے حوصلہ افزائی اور قومیت پیدا کرنے کے لئے کانگرس سے اُن کی ہر قسم کی امداد و عزت ہونی چاہیئے تاکہ آئندہ کام کرنے والوں کو حوصلہ ہو۔ اور وہ سمجھیں کہ اگر حکام دشمن ہیں

تو ملک ہمارا ساتھی ہے۔ اور اب ملک کے اس جذبہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جو کہ قوم کی خدمت تکالیف اٹھا کر کرنے والے ایثار نفس فنا فی القوم اصحاب کی عزت وہردلعزیزی کے بارے میں روز افزوں ہے۔ اور بلاشبہ آیندہ ملک صرف انہیں اشخاص کی عزت کے لئے تیار ہوگا۔ جو ملک کی خدمت میں عزیز سے عزیز شے قربان کرنے میں دریغ نہیں کریں گے۔ اور جن کا مذہب خدمت ملک ہو۔ جن کی دولت۔ عزت۔ خدمت ملک ہو جو ملک کی محبت میں سختی کے وقت اپنے ضمیر اور اصول کو نہ بدلیں۔ ملک کی خدمت میں دنیاوی حشمت ومراتب پر لات ماردیں۔ گو سب سے بڑے ماڈریٹ ڈاکٹر راش بہاری گھوش ایسے آدمیوں کو عقلمندوں میں شمار نہیں کرتے۔ اور اپنے پریسیڈنشل اسپیچ میں اس طرح گوہر افشاں ہیں +

> گو ایک شہید اپنی قربانی اور تکلیف کی وجہ سے ہر دلعزیز ہو جائے۔ مگر ہمیشہ عقلمندوں میں شمار نہیں ہوتا۔ اس کی مثال کے لوگ تعریف بہت کرتے ہیں۔ مگر اس کی پیروی نہیں کرتے۔ نئی پارٹی ملک کے لئے جیل سے ہو آنے اور تکلیف اٹھانے پر ناز کرتی ہے۔ مگر یہ ملک کے واسطے مفید نہیں +

بہرحال ان الفاظ پر بلا کوئی مزید حاشیہ چڑھائے یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اصول اور انصاف اور پبلک رائے ڈاکٹر صاحب سے متفق نہیں ہو سکتی اور اب ملک کو بیرسٹران وججان ہائیکورٹ وممبران کونسل وایل ایل ڈی ڈگری پائے ہوؤں کی محض اس وجہ سے کہ وہ دنیاوی حیثیت میں اس قدر ممتاز ہیں۔ اتنی ضرورت نہیں ہے۔ جس قدر کہ سچے خدمت ملک کرنے والوں

کی ہے +

(۵) - کسی خاص قسم کا اصول چند اشخاص کی جانب سے اُن کی رائے کے مطابق قرار دیا جاتا ہے - کہ ان کے قبول کرنے پر کانگرس کی شرکت ہو سکے گی - صریحاً ضمیر فروشی کی ہدایت و پبلک رائے کو کچلتا ہے - جو ناواجب ہے +

قواعد کے جدید طرز پر عمل ہونے کی وجوہات ذیل سے بھی ضروری ہیں +

(۱) - اب پالٹیکس کے کام کی بساط وہ نہیں رہی جو بیس سال قبل تھی - ع

زمانہ بساطِ کہن در نوشت

اور اب سے قبل بیس سال جو قواعد اور اصول قرار پا چکے ہیں وہ فرسودہ اور قابلِ ترمیم ہیں - اب تک کانگرس تین روز کا ساتھیٹر ہو کر اور چند تقریریں سنا کر پالٹیکس کا کام ختم ہو جاتا تھا - اور سال بھر تک خواہ ملک میں کوئی پولٹیکل مصیبت نازل ہو - حکام کیسی ہی بے ضابطگیاں کریں کوئی طریقہ ان کے روکنے کے لئے اثر ڈالنے کا نہیں تھا - جیسا کہ پچھلے سال ہوا - کہ لالہ لاجپت رائے کے بارے میں ایک میٹنگ بمبئی میں کی گئی - لیکن وہ بے قاعدہ تھی - جو اشخاص شریک ہوئے اُن کو کن معنوں میں پبلک قایم مقام کہا جا سکتا ہے جبکہ کسی وقت پبلک نے اُن کو اپنا قایم مقام تسلیم نہیں کیا - ایسی صورت میں کیا اثر ہو سکتا ہے - اب تک سال بھر کی مصیبت کانگرس میں رو دی جاتی ہے - اور گذشتہ آنچہ گذشت پر عمل رہتا ہے - وقت پر کوئی تدبیر اسکے دفعیہ کی نہیں ہوتی - لیکن کانگرس میں رونا بمثل اس کے ہے - کہ کشتے کہ

بعد از جنگ باید آید بر کلہ خود باید زد +

(۲)۔ اب چند سال سے کبھی کبھی پراونشل کانفرنس خواب سے بیدار ہو کر سال دو سال میں چند تقریریں جنہیں سوائے الفاظی کے اعلےٰ نمونہ کے اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کر کر پالیٹکس کا کام ختم کر دیتی ہیں۔ لیکن اب ضرورت یہ ہے۔ کہ صوبہ کی ضروریات کے مطابق پراونشل کانگریس سال بھر تک کام کرتی رہے۔ کیونکہ ہر جگہ اور ہر ضلع میں حکام معمولی طور سے زیادتیاں و بے ضابطگیاں کرتے رہتے ہیں۔ اور چھوٹے چھوٹے اضلاع میں تو پولٹیکل اشخاص کی مثل ڈاکوؤں کے نگرانی رہتی ہے۔ اور وہ ہر قسم کی زیادتیوں کا شکار ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اب تک پولٹیکس کا چرچا بڑے بڑے شہروں سے نکلکر عوام تک نہیں پہنچا۔ اصل پولٹیکل کام یہ نہیں ہے۔ کہ چند تقریریں ہو جائیں بلکہ یہ کہ ہر شخص جو ناواجب وخلاف انصاف زیادتی حکام کی جانب سے کی جائے اُس کے روکنے کا انسداد کیا جائے۔ جب تک ہر شخص کی مصیبت میں اس قسم کی کوششیں نہ ہوں گی۔ پولٹیکل اثر ملک میں نہیں بڑھ سکتا۔ یہ کام پراونشل کانفرنس ہی کر سکتی ہے۔ جن میں ہر شخص تھوڑے صرفہ سے ہی ہر شخص اپنا دُکھڑا رو سکتا ہے +

ان سب مقاصد کے لئے اصول ہائے مندرجہ بالا مدنظر رکھ کر قواعد مرتب ہونے چاہئیں۔ اس مختصر مضمون میں مکمل قواعد بنانے کی نہ تو گنجایش ہے۔ اور نہ میری لیاقت اسکیلئے موزوں ہے۔ اس کے لئے لایق تعلیم یافتہ تجربہ کار مدبران کی توجہ درکار ہے۔ لیکن میں اپنے خیال کے مطابق ایک اصولی ڈھانچہ پیش کرتا ہوں۔ جن پر قواعد مکمل کئے جا سکتے ہیں +

(۱)۔ ڈسٹرکٹ پولٹیکل ایسوسی ایشن جہاں کہیں ممکن ہو بنائی جاویں +

(۲)۔ ہر صوبہ میں ایک پراونشل نیشنل کانگریس ہو۔ جو صوبہ کی ضروریات کو پوری کرتی رہے +

جن صوبوں میں پولیٹیکل حس ابھی کم ہے وہاں بالفعل دو صوبہ ملا کر ایک پراونشل کانگرس مانی جا سکتی ہے +

(۳)۔ ایک عام انڈیا نیشنل کانگرس ہو جو تمام ملک کی بڑی پولیٹیکل ضروریات پوری کرے +

پراونشل کانفرنسوں کا ضابطہ

(۱)۔ زرچندہ مقررہ (جو کہ تجویز کیا جائے) ادا کرنے پر ہر شخص ممبر ہو سکے۔ بجز اس کے کہ کسی شخص کو بلحاظ لیاقت و خدمت ملک ادائے چندہ سے بری کرنا کثرت رائے ممبران کمیٹی انتظامیہ پراونشل سے مناسب تجویز کیا جاوے +

(۲)۔ ہر ایک پراونشل کانگرس کے ممبران کی ترتیب ڈویژنوں کے لحاظ سے کی جاوے +

(۳)۔ ہر ایک پراونشل کانگریس میں ایک کمیٹی انتظامیہ ہو +

(۴)۔ ہر ایک ڈویژن کے کل ممبران میں سے ۲۰ فی صدی ممبر پراونشل کانگرس کمیٹی انتظامیہ کے ممبر مقرر کئے جائیں۔ جو اس ڈویژن کی جانب سے قائم مقام متصور ہوں گے۔ ایسے ممبر کثرت رائے ممبران ڈویژن سے منتخب ہوں گے۔ لیکن کوئی ایسا ممبر کمیٹی انتظامیہ کا ممبر نہ منتخب کیا جا سکے گا۔ جو کم از کم دو سال تک پراونشل کانگریس کا ممبر نہ رہا ہو +

(۵)۔ کمیٹی انتظامیہ کے ممبران میں سے ممبران کی کثرت رائے سے

ایک ممبر پریسیڈنٹ اور ایک وائس پریسیڈنٹ اور ایک سیکرٹری انتظامیہ کمیٹی کے منتخب کئے جائیں گے۔ لیکن شرط یہ ہے۔ کہ پریسیڈنٹ ایسا ممبر نہ ہوسکیگا جو کم از کم تین سال تک کمیٹی انتظامیہ کا ممبر نہ رہا ہو۔ اور کوئی ایسا ممبر جو کم از کم دو سال تک انتظامیہ کمیٹی کا ممبر نہ رہا ہو۔ سکرٹری یا وائس پریسیڈنٹ نہ منتخب ہوسکیگا۔ اور ایسے پریسیڈنٹ و وائس پریسیڈنٹ و سیکرٹری سال بھر کے لئے منصور ہونگے۔ اور ہر سال جدید انتخاب کیا جائیگا +

فرائض

(۱)۔ پریسیڈنٹ یا سیکرٹری کی تحریک پر یا دو ممبران کمیٹی انتظامیہ کی تحریک پر کمیٹی انتظامیہ کا جلسہ کیا جاسکیگا۔ اور صوبہ میں اگر کوئی بات خلاف ضابطہ اس قسم کی ہے۔ جس پر توجہ دلانا ضروری ہے۔ تو ممبران کی کثرت رائے سے رزولیوشن پاس کر کے حکام کو توجہ دلائی جاوے۔ اور اگر زیادہ اہم معاملہ ہو۔ تو کانگرس کو تحریک کی جاوے۔ اور ایسا حسب ضرورت موقعہ سال بھر تک ہوتے رہنا چاہیئے +

(۲)۔ کمیٹی انتظامیہ دیگر امور بھی متعلق انتظام دینے صوبہ کے رائے زنی کر کے حسب ضرورت حکام کو توجہ دلاتی رہے گی +

(۳)۔ پراونشل نیشنل کانگریس کا سال میں ایک مرتبہ عام جلسہ کیا جائیگا۔ جس میں ضروری امور طے کئے جاویں گے۔ اور سال کے صوبہ کے پولیٹکل واقعات پر رائے زنی کی جاوے گی +

(۴)۔ جلسہ عام پراونشل کانگرس میں صرف ممبران مستحق رائے دینے

کے ہوں گے +

(۵)۔ ہر ممبر پراونشل کانگرس کو یہ اختیار ہوگا۔ کہ وہ اپنی رائے اس امر کے متعلق بھیجے۔ کہ اس کی رائے میں کانگرس میں کس مضمون کے رزولیوشن پیش کئے جائیں +

(۶)۔ ایسی رائے پر انتظامیہ کمیٹی میں غور کیا جاوے۔ اور کمیٹی کثرت رائے سے یہ طے کرے کہ کس مضمون کے رزولیوشن کانگرس میں پیش ہونے چاہئیں۔ اور اس طرح طے کرنے کے بعد کم از کم ایک ماہ پہلے ہر پراونشل کمیٹی سے کانگرس کی انتظامیہ کمیٹی کے پاس رائے بھیج دی جاوے +

(۷)۔ ہر جلسہ انتظامیہ کمیٹی پراونشل کانگرس یا جلسہ عام پراونشل کانگرس میں پریسیڈنٹ انتظامیہ کمیٹی یا درصورت عدم موجودگی وائس پریسیڈنٹ پریسیڈنٹ متصور کیا جائے گا +

انڈیا نیشنل کانگرس کا ضابطہ

(۱)۔ ہر ایک پراونشل کانگرس کی کمیٹی انتظامیہ سے سات اشخاص کانگرس کی کمیٹی انتظامیہ کے لئے ممبر منتخب کئے جائیں گے۔ ان میں تین ممبر پریسیڈنٹ و وائس پریسیڈنٹ و سیکرٹری پراونشل کمیٹی انتظامیہ ہونگے اور باقی چار ممبر کثرت رائے ممبران کمیٹی انتظامیہ پراونشل کانگرس سے منتخب کئے جائیں گے۔ لیکن یہ ایسے اشخاص ہونے چاہئیں۔ جو کم از کم تین سال تک پراونشل کانگرس کی کمیٹی انتظامیہ کے ممبر رہے ہوں +

(۲)۔ انڈیا نیشنل کانگرس کی کمیٹی انتظامیہ اپنے ممبران کی کثرت رائے

سے اپنے ممبران میں سے پریسیڈنٹ - وائس پریسیڈنٹ - سیکرٹری - جوائینٹ سیکرٹری بشرائط ذیل منتخب کرے گی +

پریسیڈنٹ ایسا ممبر منتخب ہوگا - جو کم از کم پانچ سال تک کسی پراونشل کانگرس کا پریسیڈنٹ رہا ہو +

وائس پریسیڈنٹ ایسا ممبر منتخب ہوگا جو کم از کم تین سال تک کسی پراونشل کانگرس کا پریسیڈنٹ یا چار سال تک وائس پریسیڈنٹ رہا ہو +

سیکرٹری ایسا ممبر منتخب ہوگا - جو کم از کم تین سال تک کسی پراونشل کانگریس کا پریسیڈنٹ یا وائس پریسیڈنٹ یا سیکرٹری رہا ہو +

جائینٹ سیکرٹری - ایسا ممبر منتخب ہونا چاہیئے جو کم از کم دو سال تک کسی پراونشل کانگریس کا سیکرٹری یا کم از کم ایک سال تک پریسیڈنٹ یا وائس پریسیڈنٹ رہا ہو +

ایسے عہدہ داران سال بھر کے لئے متصور ہوں گے - اور ہر سال جدید انتخاب ہوگا +

فرائض

(۱) کمیٹی انتظامیہ انڈیا نیشنل کانگرس کا جلسہ کسی پراونشل کانگرس کے پریسیڈنٹ کی تحریک پر یا پریسیڈنٹ یا سیکرٹری انڈیا نیشنل کانگرس کی تحریک پر ہوسکیگا - اور اس کے ذریعہ سے ملک کی کسی پولیٹیکل ضرورت پر جو اس وقت گورنمنٹ میں درپیش ہو - کثرت رائے ممبران سے رزولیوشن پاس کرکے گورنمنٹ کو توجہ دلائی جائے گی - اور ایسا وقتاً فوقتاً حسب ضرورت ہوسکتا ہے +

(۲)۔ کمیٹی انتظامیہ انڈیا نیشنل کانگرس ان ارائے پر جو ہر ایک پراونشل کانگرس سے رزولیوشن کے بارے میں موصول ہوئی ہیں۔ غور کرے گی۔ اور کثرت رائے ممبران سے یہ طے کرے گی۔ کہ کون کون سے رزولیوشن کس صورت سے پیش ہونے ضروری ہیں۔ اور ان رزولیوشنوں کو جلسۂ کانگرس میں پیش کیا جائے گا +

(۳)۔ ہر سال انڈیا نیشنل کانگرس کا ایک عام جلسہ جیسا کہ اب تک ہوتا رہا ہے ہوا کرے گا۔ اس کے ڈیلی گیٹ فیس مقررہ دیکر صرف وہ اشخاص ہوسکیں گے۔ جو کہ پراونشل کانگرس کے ممبر ہیں +

(۴)۔ جو اشخاص کسی پراونشل کانگرس کے ممبر نہیں ہیں وہ صرف بطور وزیٹر جلسہ کانگرس میں شریک ہوسکیں گے +

(۵)۔ ہر جلسہ عام نیشنل کانگرس میں یا جلسہ انتظامیہ کمیٹی نیشنل کانگرس میں انتظامیہ کمیٹی نیشنل کانگرس کا پریسیڈنٹ یا درصورت غیر حاضری وائیس پریسیڈنٹ پریسیڈنٹ جلسہ متصور ہوگا +

(۶)۔ جلسہ عام انڈیا نیشنل کانگرس میں صرف ڈیلی گیٹ رائے دینے کے مجاز ہوں گے۔ اور کسی صوبہ کی بابت اگر کوئی خاص مسئلہ یا رزولیوشن پیش ہو۔ تو صرف اُس صوبہ کے ڈیلیگیٹ رائے ظاہر کرنے کے مجاز ہیں +

ضابطہ ہائے عام

(۱)۔ ہر جگہ جہاں رائے دینے کی ضرورت ہے۔ پریسیڈنٹ یا وائیس پریسیڈنٹ کی چار اور سیکرٹریان جوائنٹ سیکرٹری کی دو رائیں منصو

کی جائیں گی +

(۷)۔کسی جلسہ میں کوئی تمیز کسی قسم کے اصحاب کے بیٹھنے میں نہ کی جائیگی سوائے اس کے کہ پریسیڈنٹ یا سیکرٹری یا لیکچرار کے لئے ایک پلیٹ فارم اونچا بنایا جائے گا ۔ اور ایک قسم کے اصحاب ایک طرف بطریق خیال بٹھائے جائیں گے +

(ا)۔سابق پریسیڈنٹان کانگریس ایک طرف پلیٹ فارم سے ملے ہوئے +

(ب)۔تمام عہدہ داران پراونشل کانفرنس وممبران کمیٹی انتظامیہ انڈیا نیشنل کانگرس پلیٹ فارم سے ملے ہوئے دوسری جانب +

(ج)۔تمام ممبران کمیٹی انتظامیہ صوبہ دار الگ الگ درجوں میں +

(د)۔معمولی ڈیلیگیٹ ایک جانب صوبہ دار الگ الگ درجوں میں +

(ہ)۔وزیٹر ایک جانب صوبہ دار الگ الگ درجوں میں +

جو قواعد میں نے پیش کئے ہیں یہ نامکمل ضرور ہیں۔ اور ان میں ابھی لایق اصحاب کی رائے سے ترمیم کی گنجائش ہے۔ لیکن یہ بطور اصول بیان کئے گئے ہیں ۔ غالباً موڈریٹ وایکسٹریمسٹ کو بلحاظ اختلاف اصول کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا دو بڑے اہم مسئلہ یعنی ہر شخص کو خدمت ملک سے ترقی اور مناسب اعزاز و ترتیب رزولیوشن جو پچھلی ساری تباہی کا موجب ہیں ۔ ان قواعد کی رو سے غالباً زیادہ صاف ہوتے ہیں ۔ رزولیوشن کے بارے میں ان قواعد کی رو سے ہر ایک شخص کو اپنی رائے دینے کا حق ہو گا۔ لیکن وہ پاس ہوں گے ۔ بہت چھان بین کے بعد اسی طرح پریسیڈنٹ کانگرس ایسا نہ ہوگا۔ جو صرف ایک مرتبہ کانگرس آنے سے ہو سکے۔ بلکہ کم از کم

دس سال تک قابل اعتبار پبلک خدمت کرنے کے بعد منتخب ہو سکیگا ۔
ان قواعد کی رو سے عام راے کا بھی غالباً بہت لحاظ ہوگا ۔ اور ذاتی اختلافات
عام راے کے سامنے خرابی نہ ڈال سکیں گے ۔ میں ان تمام اصحاب کی خدمت
میں جن کے سینہ میں ایک ہمدرد ملک دل ہے ۔ اپیل کرتا ہوں ۔ کہ وہ محبت
ملکی کے خیال سے ان تجاویز میں بعد اپنی ترمیم و ایزادی کے جوان کی راے
میں ضروری ہے ۔ ملک میں بغرض راے زنی پیش کریں ۔ تاکہ ملک میں پھر
بجائے نا اتفاقی کی ڈراونی آگ کے اتفاق کی صاف شفاف دلفریب روشنی
نظر آئے ۔ مگر آہ مایوسی! واے ناکامی!! ؎

یہ کہاں ہے اپنی قسمت
جو ہو اُن کو مجھ سے الفت

کاش! یہ ترانہ خوش گوار کانوں میں آئے ۔ ؎

پھر بہار آتی ہے تجھ میں اے گلستاں غم نہ کھا
وہ چلی آتی ہے فوجِ عندلیباں غم نہ کھا

آج کی تصویریں ایک خصوصیت لیے ہوئے ہیں ۔ ایک طرف اشیائی جلال اور دوسری طرف یوروپین اقبال کی تصویر ہے ۔ ملکہ الگزنڈرا قیصرہ ہند خوبصورتی اور عقلمندی میں دنیا کی سب عورتوں میں ممتاز خیال کی جاتی ہیں ملکہ جاپان ان مبارک ماؤں میں سے ہیں جن کی اولاد اپنے ملک اپنے خاندان کی عزت بڑھاتی ہے اور آیندہ آنیوالی نسلوں کے لیئے کامیابی کی شاہ راہ بناتی ہے ۔ ملکہ الگزنڈرا قیصرہ ہند نہایت رحم دل ہیں اور ہندوستانی معاملات سے خاص دلچسپی رکھتی ہیں خدا کرے کہ ہمیشہ ان کے سایۂ عاطفت میں رہیں اور ان کے دل میں اپنی ہندوستانی رعایا کی محبت دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرے ۔ ملکہ جاپان ہماری مردہ امیدوں میں روح پھونکنے کے لیے عرصہ تک زندہ رہیں اور خدا ہمیں توفیق دے کہ ہم ان کے سپوتوں کے نقش قدم پر چلیں +

آؤ ہم بھی آج ہو لیں نوحہ خوانِ کانگرس

از منشی محمدؐ علی اکبر صاحب اکبر

لٹ گئی ہائے بہارِ بوستانِ کانگرس
سر کو اپنے پیٹتے ہیں باغبانِ کانگرس

آہ جن آنکھوں سے دیکھی تھی بہارِ جاں فزا
انقلابِ بد نے دکھلائی خزانِ کانگرس

یوں نہ ہو ویراں کسی کا دست پروردہ چمن
یا الٰہی جیسے اُجڑا گلستانِ کانگرس

اب نہیں آتی صدائے بلبلانِ خوشنوا
ہاں مگر کانوں میں آتی ہے فغانِ کانگرس

کیوں نہ پہلو میں تڑپ اُٹھے جگر سیماب وار
چٹکیاں رہ رہ کے لیتی ہے فغانِ کانگرس

فرطِ غم سے لوٹتے ہیں خاک پر طفلانِ اشک
دکھ بھری سن لیتے ہیں جب داستانِ کانگرس

ہم صفیرانِ چمن مل جل کے اب ماتم کریں
آہ ویراں ہو گیا ہے بوستانِ کانگرس

اور کچھ باقی نہ تھا کیا انقلابِ روزگار
کیا فقط مدِ نظر تھا امتحانِ کانگرس

آفریں صد آفریں اے آسمانِ کج سرشت
خاک میں دم میں ملا دی عز و شانِ کانگرس

آہ اے بختِ زبوں اے طالعِ واژوں ترا
سرنگوں ہو خاک پر ہائے نشانِ کانگرس

آہ اے نفسانیت اے بغضِ طبعِ ناپسند
یوں ہوا اظہارِ عداوت دشمنانِ کانگرس

مہرباں خنجر بکف ہوں انقلابِ روزگار
آستینیں اپنی چڑھائیں دوستانِ کانگرس

کیا تظلم ہے کہ ہو لے جرمِ خونِ آرزو
کیا غضب کی بات ہے قرباں ہو جانِ کانگرس

وائے ناکامی کہ دم میں انجمن ہو منتشر
ہائے دن دہاڑے لٹے یوں کاروانِ کانگرس

خدمتِ دیرینہ پر بھی کچھ نہ کی ہائے نظر
سارے احسان بھول بیٹھے دوستانِ کانگرس

اس سے بڑھ کر کوئی بھی احسان فراموشی نہیں
کام لیکر لوٹا دیں ہاتھوں سے خوانِ کانگرس

نام کو باقی نہیں حبِ وطن ایثارِ نفس
سنگساری کرتے ہیں اب گلفشانِ کانگرس

تفرقہ اندازیاں ہونے لگیں جب نرم و گرم
چل نہیں سکتا زمانہ میں فخانِ کانگرس

دل ہیں تھا مسکن گزیں ملکی ترقی کا خیال
قوم کا نغمہ تھا ہر دم بر زبانِ کانگرس

خیر خواہانہ طلب ہوتے تھے سب ملکی حقوق
قوم پہ ہر لحظہ تھی قربان جانِ کانگرس

بیکسوں کی داد اور فریاد کی شنوائی تھی
درفشاں تھی ہند پر ہر وقت کانِ کانگرس

آہ ایسی انجمن برباد ہو افسوس ہے
آہ! ہو ویران ایسا گلستانِ کانگرس

تفرقہ اندازیاں ہیں خام کاری کی دلیل
راستی پر آئیں اب بھی دشمنانِ کانگرس

آتے تھے کس شان سے صاحب کمالوں کے قدم
ہوتے تھے علمائے فضلا مہمانِ کانگرس

اب بھی گر کرتے نہیں انجام پر اکبر نظر
دیکھ لینا روئیں گے پھر دشمنانِ کانگرس

رباعیات

قابو میں ہمیشہ رکھو پیارو دل کو
ہر طرح کی سعی سے سدھارو دل کو
جانیں گے کہ اکسیر بنائی شاکر
تم صورتِ سیماب جو مارو دل کو

جینے کا وہی تجھ کو مزا دیتا ہے
جس شے کی ضرورت ہو خدا دیتا ہے
دے عشر تو اپنے مال کا اے شاکر
یہ بھی نہیں دیتا ہے تو کیا دیتا ہے

دل کہتا ہے حاصل ہو ہر نوع کمال
اور چرخ یہ کہتا ہے دکھاؤں گا زوال
آفت میں پڑے جان نہ کیونکر شاکر
ما درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال

جو لوگ خدا سے ہو گئے ہیں گمراہ
کرتے ہیں ہر اک کام میں اپنے وہ گناہ
انسان سے ابلیس بنے جاتے ہیں
لاحول ولا قوۃ الا باللہ

کیا بات ہے کیوں سہتے ہو مغموم و حزیں
دیرینہ مرض جاتے ہی جائے گا کہیں
تم اپنا کیے جاؤ علاج اے شاکر
کس واسطے کہتے ہو کہ لیں ادویہ میں

ہماری اخلاقی پستی کا قومیت پر اثر

از منشی نواب رائے صاحب

آج کل کسی اخبار یا رسالے کو اُٹھا کر پڑھنے لگئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا قومیت کا ایک جوش اُمڈ پڑا ہے۔ جس کے مقابل ذات اور غرض اور نفس سبھی سرتسلیم خم کئے ہوئے ہیں۔ لیکن جب عالمِ اخبار سے نکلکر ذرا عملی دنیا کی ہوا کھائیے۔ تو کچھ اور ہی کیفیت نظر آتی ہے۔ ہر فرد بشر باستثنا معدودے چند۔ اپنی اپنی غرض میں متوالا۔ خود غرضی کے نشہ میں مخمور اور اصول راستی سے بے خبر نظر آتا ہے۔ کوئی کسی کی پروا نہیں کرتا۔ اپنے نج کے دھندوں سے کسی کو فرصت نہیں۔ بابو ربیندر وناتھ ٹگور نے پبنا کنفرنس کی تقریر صدارت میں خوب فرمایا تھا:۔

”ہماری قوم کے پیش نگاہ نہ تو زندگی کا کوئی بیغرضانہ معیار۔ اور نہ ایثار کی کوئی زندہ پرجوش مثال موجود ہے۔ ہم میں امر واجب یا غیر واجب کے متعلق کوئی اخلاقی پابندی نہیں پائی جاتی“+

اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ زندگی کا بیغرضانہ معیار ہمارے ملک سے مفقود ہو گیا۔ اور ایثار کی زندہ مثالیں یا تو بہت شاذ نظر آتی ہیں۔ یا نظر بھی آتی ہیں تو ہمارے ہموطن اُن سے کوئی مفید سبق نہیں حاصل کر سکتے۔ ہم خود غرضی۔ مادہ پرستی اور دنیا خواہی کے کیچڑ میں ایسے لت پت ہو گئے ہیں۔ ہمارے دل مکروہات دنیوی سے ایسے پُر ہو رہے ہیں کہ اُن میں ایثار اور بے غرضی کی کوئی بات نہیں سما سکتی۔ خفیف ذاتی فوائد کے لیے ہم

اپنے بھائیوں کے گلے گھونٹتے ہیں۔ اور چھوٹی چھوٹی ترقیوں کے لیے قوم کو خاک برابر بھی نہیں سمجھتے۔ ان شب و روز کی دنیا پرستیوں نے ہمارے دلوں کو ایسا پست کر دیا ہے۔ کہ اُن میں اعلےٰ اور رفیع خیالات کا گذر نہیں ہو سکتا۔ اور اس اخلاقی پستی کے میدان میں وہی فرقہ جسے تعلیم یافتہ کہا جاتا ہے سب سے آگے بڑھا ہوا ہے۔ عدالت میں جائیے۔ وہاں کے جتنے اہلکار اور عملے ہیں سب آپ کے بھائی بند ہیں۔ اُن میں سے اکثر تعلیم یافتہ اور یونیورسٹی کی ڈگریوں کے نامزدہ ہیں۔ کتنے ہی ایسے ہیں جو اخبار اور کتب کے مطالعہ میں ہمیشہ سرگرم رہتے ہیں۔ مگر تاوقتیکہ آپ گرہ کے پورے نہ ہوں وہاں آپ کی شنوائی نہیں ہو سکتی۔ کوئی آپ کی بات نہیں پوچھتا۔ آپ کو گھُرکیاں دی جاتی ہیں۔ اور محض اس جرم پر کہ آپ گانٹھ کے پورے نہیں ہیں۔ آپ دھکیل کر باہر نکال دیئے جاتے ہیں۔ ہر چہار طرف رشوت خورانی اور رشوت ستانی کا ہنگامہ گرم ہے۔ یہ بابو صاحب جنہیں آپ فلٹ کی ٹوپی لگائے۔ آنکھوں پر عینک جڑے۔ ہونٹوں پر پان کی سرخی جھلکائے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ ایک ہی پرکالۂ آتش ہیں۔ چور اُس وقت چوری کرتا ہے۔ جب وہ افلاس اور فاقہ مستیوں سے تنگ آجاتا ہے۔ خونی اُس وقت خون کرتا ہے جب اُس کے دل میں اپنے دشمن یا رقیب کو پامال کرنیکا انسانی جذبہ اور مردانہ جوش موج زن ہونے لگتا ہے۔ مگر یہ بابو صاحب۔ یہ چکنی صورت والے۔ فلٹ کی ٹوپی والے۔ بادامی بوٹ والے بابو صاحب چوری کرتے ہیں مگر افلاس سے نہیں۔ خون کرتے ہیں مگر مردانہ جوش سے نہیں۔ اُن کی چوری کمینہ پن۔ خالص کمینہ پن سے ہوتی ہے۔ اور ارتکاب خون نفس پرستی۔ صریح نفس پرستی سے ہے +

ان بابو صاحبوں میں سے بہتیرے ایسے ہیں جو شام کے وقت آپ کو بندے ماترم اور ایڈوکیٹ پڑھتے دکھائی دیں گے۔ جو آپ سے ملکی مسایل پر سرگرمی سے مباحثہ کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ بلکہ اگر آپ چاہیں تو وہ مسائل حقیقت و معرفت پر بھی بڑی بیبا کی اور آزادی سے رائے زنی کر سکتے ہیں۔ بہتیرے ایسے ہیں جنہیں آپ شام سویرے گنگا جی میں اشنان کرتے دیکھیں گے۔ جن کی صورت پاک آپ کو مندروں اور ٹھاکر دواروں میں نظر آئے گی۔ جو سادھو سنتوں کے ست سنگ کے دل دادہ اور نور حقیقت کے متلاشی ہیں۔ جو جماہی لیتے وقت شیوا شیوا اور نہاتے وقت نارائن نارائن! اچیتے ہیں۔ مگر ان بابو صاحبوں کو ذرا بھی خبر نہیں ہے۔ کہ یہ اشنان اور دھیان اور پوجا پاٹ اور اخبار بینی اور حب الوطنی کی لمبی چوڑی تقریریں سب خاک میں مل جاتی ہیں۔ جب وہ کسی غریب کا گلا دبا کر اُس سے ناجائز رقم وصول کر لیتے ہیں +

خبیث النفس بڈھوں کا جو رعایا کا خون جگر چوسنے کے عادی ہو گئے ہیں براہ اصلاح پر آنا غیر ممکن در محال ہے۔ مدت العمر کی سیہ کاریوں نے ان میں انسانیت اور قومیت کا کوئی جزو باقی نہیں رکھا۔ ایسے عملے جب تک جمراج کے دربار میں نہ جائیں گے وہ اپنی دل آزاریوں سے باز نہ آئیں گے۔ مگر افسوس تو یہ ہے۔ اور رونا تو اس کا ہے کہ ہماری نئی روشنی کے تعلیم یافتہ نوجوان جو اکثر قوم اور قومیت کے چرچے کرتے رہتے ہیں وہ بھی انہیں بڈھوں کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ اور یہ اُمید کہ جب کچہریاں اور عدالتیں پرانے رشوت خواروں سے خالی ہو جائیں گی۔ تو وہ اس رسم قبیح کا انسداد ہو جائیگا پوری ہوتی نہیں نظر آتی۔ بلکہ پُرانے حضرات تو بسا اوقات چھوٹی

چھوٹی چھوٹی رقموں پر قناعت کرتے تھے۔ مگر یہ نئے لوگ بالخصوص بڑی رقمیں لیتے ہیں۔ کیونکہ اُن کی عینک اور بائیسکل اور بادامی بوٹ اور لیونڈر اور سگریٹ وغیرہ ضروریات کے مصارف کا انتظام ہونا لازمی اور لابدی ہے +

اور پھر اگر بابو صاحب اور افسر صاحب لیتے ہیں تو بُرا کیا کرتے ہیں۔ جب دینے والے دینے میں ایسے سرگرم ہوں تو لینے والوں کا سرگرم ہونا بالکل جائز اور برحق ہے۔ دینے والے دیں ہی نہ تو لینے والے لیں کیونکر۔ جب بابو صاحب جانتے ہیں۔ کہ آپ دو چار بار کے کہنے میں ایک خاص رقم اُن کے دست مبارک میں رکھ دیں گے۔ اور اُس رقم سے جو آپ کا خون جگر ہے اُن کی فلٹ کیپ اور بادامی بوٹ اور "آلوڈی روز" اور "مینلا سگار" کا دام نکل آئے گا۔ تو وہ کیوں نہ آپ کو دبائیں۔ آپ ضرورت سے زیادہ سیدھے ہیں تو ہمارے بابو صاحب قبلہ آپ کے سیدھے پن سے کیوں نہ فائدہ اُٹھائیں یہاں بابو صاحب کی خطا نہیں۔ خطا آپ کے سیدھے پن کی ہے۔ روایت ہے کہ بکرا ایک بار برہما کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور فریاد کی کہ مہاراج! میں نے کیا قصور کیا ہے۔ کہ جسے دیکھئے میری گردن پر چھری پھیرنے کو تیار رہے۔ مہاراج نے جواب دیا۔ بیٹا تمہاری صورت ہی کچھ ایسی واقع ہوئی ہے۔ کہ میرا خود جی چاہتا ہے تمہیں چٹ کر جاؤں۔ وہی اخلاقی پستی۔ وہی خود غرضی وہی ہوس طبعی جو بابو صاحب کو لینے کی تحریک کرتی ہے آپ کو بھی دینے کی تحریک کرتی ہے۔ آپ نے خود ناجائز رقمیں دے دے کر بابو صاحب کو ایسی رقموں کے لینے کی عادت ڈال دی۔ پھر اگر اب بابو صاحب ممدوح آپ کو دباتے ہیں۔ تو آپ کیوں روتے اور بلبلاتے ہیں۔ اپنے کئے کا مزہ چکھئے۔

اوراپنی کرتوت کا خمیازہ اٹھایئے +

یہ ہے ہماری اخلاقی پستی! اس کا جلوہ ریل گاڑیوں میں خوب نظر آتا ہے۔ اگر اتفاق سے کمرہ میں کوئی بابو صاحب رونق افروز ہوگئے تو گویا سارا کمرہ اُن کی موروثی جائداد ہے۔ اب کوئی غیر شخص اُس میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ اگر کوئی گھس بیٹھ کر چلا آیا۔ تو بابو صاحب اُس کا خون چوسنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ اور اُن کا بس چلے تو وہیں اس غریب پر نالش داغ دیں۔ بابو صاحب ٹانگیں پھیلا کر سوئیں گے۔ مگر کیا مجال کہ کسی کے لئے جگہ خالی کریں۔ اور اگر وہ شخص اُجڈ دہقانی ہے۔ تب تو اور بھی مصیبت کا سامنا ہے۔ بابو صاحب کو سوجھ نہیں پڑتا۔ کہ یہ رولڈ گولڈ کی عینک۔ اور یہ رشلین لیدر کا بوٹ۔ اور یہ خوبصورت رنگیں ٹرنک انہیں گنواروں کی گاڑھی کمائی کی طفیل ہے۔ ہم انہیں کا دیا کھاتے ہیں۔ اور انہیں سے ایسا برتاؤ! بابو صاحب کی قومیت اخباروں اور رسالوں تک محدود ہے اس سے آگے نہیں بڑھتی۔ پیارے بابو جی۔ آپ نے بھی وہی کرایہ ریلوے کمپنی کے نذر کیا ہے جو اس گنوار دہقانی نے پھر آپ کیوں ٹانگ پھیلا کر سوتے ہیں۔ اور گنوار بجائے پٹری کے بیچ کے تختہ پر بیٹھتا ہے۔ کیا اسی طرح اخوت اور قومیت کا جوش پیدا کیا جائیگا۔ ہندوستان کی نجات آپ کے ہاتھوں میں نہیں ہے۔ وہ انہیں دہقانوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اگر آپ میں کچھ بھی محبت قومی ہے۔ تو ان بھائیوں کے دلوں میں جگہ پانے کے ایسے موقعے ہاتھ سے نہ جانے دیجئے۔ آپ کو اُن سے اور کسی موقع پر ملنے کی فرصت نہیں۔ یہی دو ایک موقعے مل سکتے ہیں۔ مگر دربار عدالت میں تو آپ جونک کی طرح خون چوستے نظر آتے ہیں۔ اور ریل گاڑیوں میں فرعون

بے سامان۔ گھر پر اور لکچر ہال میں آپ قوم قوم چلاتے ہیں۔ مگر گاڑی کے دروازہ پر اپنے ہمقوموں کی صورت دیکھتے ہی آپ کفن پھاڑ کر چیخ اُٹھتے ہیں آگے جاؤ! آگے جاؤ! یہاں جگہ نہیں ہے۔ سبحان اللہ۔ کیا قومی ہمدردی ہے۔ سوامی رام تیرتھ اور سوامی وویکا نند جیسے مہاتما آپ کو یہی سمجھاتے سمجھاتے داخل جنت ہو گئے۔ کہ اپنے نادار۔ اپنے دہقانی ہمقوموں کے ساتھ سچا برادرانہ برتاؤ کیجئے۔ جب تک آپ یہ طرز عمل اختیار کریں گے آپ ہمیشہ کمزور بنے رہیں گے۔ مگر ہم کچھ ایسے خفیف الحس ہو رہے ہیں۔ اور ہوائے دنیا کے ایسے غلام کہ ہماری سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی وائے برحال ما *

ہمارے تعلیم یافتہ ابنائے وطن کا تو یہ حال ہے۔ اب زمیندار صاحبان کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھئے۔ ان میں جو بڑے بڑے تعلقہ دار ہیں۔ اُنہوں نے تو بالعموم انگریزی روش اختیار کر لی ہے۔ اور عیش کے بندے بن بیٹھے ہیں بنگلہ ہے۔ ہارمونیم۔ کتے وغیرہ۔ وہ خاصے صاحب بہادر ہیں۔ بشیر۔ کوٹ پتلون اور ٹوپ سے بھی شوق کرتے ہیں۔ ان کا کام ہے ہفتہ میں دو تین بار افسر ضلع کے سلام کو جانا۔ اور بس۔ سوائے اس کے اُنہیں اور کسی بات کی سدھ نہیں۔ اور جو چھوٹے چھوٹے آنے پایوں کے زمیندار ہیں۔ وہ شب و روز اُسی دھن میں رہتے ہیں کہ کس کاشتکار پر اضافہ لگان کی نالش کروں۔ اس سے بحث نہیں کہ کاشتکار دینے قابل ہے یا نہیں۔ نالش کر دی جاتی ہے۔ اور غریب کا گھر لٹ جاتا ہے۔ ہزاروں کسان جو پہلے فارغ البالی سے گذران کرتے تھے۔ انہیں اضافہ لگان کی نالشوں کے پائمال ہو کر آج تیلی گھروں میں زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔ اور

جنھوں نے وضعداری کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ اور ابھی تک اپنے دھندوں میں لگے ہوئے ہیں۔ اُن کی حالت ناگفتہ بہ ہو رہی ہے۔ نہ پیٹ کو روٹی ہے اور نہ تن کو کپڑا۔ مگر زمیندار صاحب ہیں۔ کہ اضافہ لگان کی نالش داغتے چلے جاتے ہیں۔ بڑے زمیندار صاحب اگر اپنی اسامیوں کے دوست نہیں ہیں تو دشمن بھی نہیں ہیں۔ بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے مختاروں کے ہتھکنڈہ سے رعایا کو بچاتے ہیں۔ مگر یہ آنے پایوں کے زمیندار نہ صرف رعایا کے دوست ہیں۔ بلکہ اُن کے دشمن ہیں۔ اسی بداندیشی پر اسی گلا گھونٹنے پر اُن کی روٹیاں چلتی ہیں۔ قانون میں اچھے اچھے بیرسٹروں کو مات کرنیوالے سویرا ہوا اور آپ پوجا پاٹ کرکے عدالت کی طرف دوڑے۔ دن بھر وہاں کی خاک چھانی۔ اہلکاروں کی خوشامد۔ وکلا کی منت سماجت۔ اور اردلی کے چپڑاسیوں کی خاطر و مدارات میں دن گذرا۔ شام کو گھر آئے۔ دو چار نالشیں اور تیار کیں۔ اور سویرے پھر وہی دھندا ؛

ہم نے اپنی پست اخلاقی کی چند مثالیں بطور نمونہ کے پیش کی ہیں۔ اُنکی فہرست بیحد اضافہ کی گنجائش رکھتی ہے۔ ہماری قوم پامال ہے۔ اور اُس کی پامالی کے سبھی اسباب ہماری پست اخلاقیوں سے منسوب کئے جا سکتے ہیں۔ ہم علم میں۔ جرأت میں۔ ذہانت میں دنیا کی کسی قوم سے دیگر نہیں ہیں۔ ہمارے سکھ۔ پنجابی۔ مرہٹے۔ پٹھان۔ راجپوت ہموطن دنیا کی کسی قوم کے سپاہیوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ہم کو جن علمی صیغوں میں وہی آسانیاں حاصل ہیں جو انگریزوں کو ہیں۔ اُن میں ہم انگریزوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ لیکن ہم میں ایک بہت بڑا نقص ہے۔ اخلاقی پستی یعنی خودغرضی۔ جو ہماری تمام قومی خوبیوں پر پردہ ڈالدیتی ہے۔ ہم میں ایسے بہت کم لوگ ہیں جن کے دل میں قوم کا خیال بھی

کبھی پیدا ہوتا ہو۔ جن کی کائنات اُنہیں تک محدود ہے جن کے دل میں ذات سے زیادہ اعلےٰ کوئی جذبہ نہیں پیدا ہوتا۔ اس وقت ملک میں قحط کا زور شور ہے۔ ہزاروں بھائی بھوکوں مر رہے ہیں۔ سرکار نے جا بجا امدادی کام کھول رکھے ہیں۔ مگر شاید کل امداد کا نصف روپیہ بھی مشکل سے غربا کے شکم میں جاتا ہوگا۔ وہی خودغرضی اور کمینہ خو لوگ جن کے تعلق یہ کام کیا گیا ہے۔ اس خیرات کو مال غنیمت سمجھ کر دونوں ہاتھوں سے اپنا گھر بھرتے ہیں اور جو سال دوسروں کے لئے افلاس وحیرانی کا سال ہے اُن کے لئے فارغ البالی اور خوشحالی کا ہے اس سے بڑھ کر نفسانیت اور کمینہ پن کی مثال خیال میں بھی نہیں آسکتی۔ فی الواقع اگرچہ ہم گلے پھاڑ پھاڑ کر رفارم کا غل مچا رہے ہیں۔ وہ اصلی رفارم جس کے معنے ہیں قوم کی اخلاقی حالت کا سدھرنا ابھی ہم سے کوسوں دور ہے۔ ہم خود اپنے میں کوئی اصلاح نہیں دیکھتے۔ ہمارا دل جیسا سیاہ تھا ویسا ہی سیاہ ہے۔ ازدواج بیوگان اور چھوت بچار مٹانے ہی کا نام رفارم نہیں ہے۔ رفارم کے معنے بہت وسیع ہیں۔ اور جب تک ہم میں رفارم اپنے وسیع معنے میں نہ پیدا ہوگا۔ ہم یوں ہی مفلس۔ ذلیل اور پامال قوم بنے رہیں گے +

تاخیر اشاعت کا مرض نہایت ہی تکلیف دہ ہے جسے ہم نہایت افسوس کیساتھ محسوس کرتے ہیں گذشتہ ایام کی سخت کوششوں سے یہ ناگوار سلسلہ منقطع ہوا تھا مگر پھر چند ایسے اتفاقات نے جو غیر متوقع تھے اور جن سے باوجود سخت کوشش کے ہم بچ نہ سکے پھر چند دن کی دیر کردی۔ ہم کوشش کررہے ہیں کہ جلد سے جلد اس ناگوار سلسلہ کا خاتمہ ہو جائے اور اگر ہمارے احباب نے ہمارا ساتھ دیا اور جلد بد دل ہو کر ہماری کوششوں میں الجھن پیدا نہ کردی تو ہمیں یقین ہے کہ جولائی نمبر عین وقت پر شائع ہوگا اور آئندہ باقاعدہ اشاعت کا کافی انتظام ہو جائیگا +

مجلس احباب میں تقیہ

از حضرت ضامن کنتوری

شب کو پھر فکر میں پایا جو ضامن کو غریق ۔ اس سے یوں کہنے لگا ایک اس کا یارِ ہم طریق
اس گھڑی کس سوچ میں بیٹھا ہے تو اے مہرباں ۔ تیری صورت سے سراسر ہے پریشانی عیاں
چاند سا چہرہ ترا افکار سے ہے پُر شکن ۔ یا شبِ مہتاب میں ہے آبِ دریا موج زن
موجِ دریا کو کہیں گر فی المثل دستِ دعا ۔ ہے تری چینِ جبیں انگشتِ حسرت برملا
اُس کی لہروں سے ہے ظاہر گر پریشاں خاطری ۔ اس سے بڑھ کر بیکلی پیدا ہے صورت سے تری
کیا ہوا کس بات سے پہنچا تجھے اتنا ملال ۔ اے سدا خوش رہنے والے اس قدر کیوں ہے نڈھال
خوش دلی وہ کیا ہوئی تیری وہ جودت کیا ہوئی ۔ وہ ظرافت وہ لطافت وہ بشاشت کیا ہوئی
کیا ہوئیں وہ صحبتیں احباب سارے کیا ہوئے ۔ وہ لگاوٹ وہ ہنسیوں سے اشارے کیا ہوئے
کیا وہی تو ہے کہ جو تھا رونقِ بزمِ سخن ۔ ماہ تھا تو رشکِ انجم تھے سارے اہلِ انجمن
تو وہی ہے رونقِ محفل کو ہنسا دیتا تھا جو ۔ اپنا کیسا دوسروں کا غم بھلا دیتا تھا جو
کچھ تو کہہ للہ کیا حالت ہے یہ اے مہرباں ۔ آہ بر لب چشم پُر نم دل مکدر سر گراں
سُن کے یہ تقریر ساری ہنس کے وہ کہنے لگا ۔ تو مرا ہمدرد ہے اب تجھ سے کہنا ہی پڑا
میں بھی ہوں گلزارِ ہستی ہی کا آخر ایک پھول ۔ خندہ زن گاہے کبھی غنچہ کی صورت دل ملول
ہاں مگر احباب میں کرتا نہیں اظہارِ غم ۔ تاکہ اُن کا بارِ خاطر ہو نہ اپنا بارِ غم
عالمِ تنہائیِ شب کو غنیمت جان کر ۔ آ کے بیٹھا ہوں کہ مکروہات سے ہو کچھ حذر
یادِ عیشِ رفتہ اور اندوہِ حسرت ہائے حال ۔ قعرِ دریائے فراموشی میں ان سب کو ڈال
صبح سے پھر آنیوالی پھر تڑپنا چاہیے ۔ مجلسِ احباب میں پھر مجھ کو ہنسنا چاہیے

فریاد

از منشی بدرالدین صاحب سہسوانی

قمری مہینہ کی تیرھویں تاریخ تھی۔ رات کے دس بجے ہوں گے۔ کہ میں اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ چاند کے ہلکے ہلکے نور نے تمام عالم کو روشن کر رکھا تھا۔ بے فکری کا زمانہ۔ رات کا سنسان وقت۔ تنہائی کا موقع اور پھر چاندنی کا چھٹکا ہونا۔ سرد مگر خوش گوار ہوا کا چلنا اور گلاب اور چنبیلی کی جو بھینی بھینی خوشبو سب ایسی باتیں تھیں کہ جن کا جادو مجھ پر چل گیا۔ اور میں سو گیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ میں ایک باغ میں ہوں جو نہایت سرسبز و شاداب ہے۔ ہر قسم کے بار آور شجر موجود اور رنگ برنگ کے پھول شگفتہ۔ ہر ایک پتہ اور پنکھڑی سے مسرت ٹپک رہی ہے۔ کلیاں خوشی سے کھلی جاتی ہیں۔ خوبصورت پرند ایک پیڑ سے دوسرے پیڑ پر اُڑ اُڑ کر اپنی سریلی آوازوں میں گا رہے ہیں۔ چاروں طرف نہریں اور جھرنے جاری ہیں۔ پانی کی ہر ایک چادر کا گرنا قسم قسم کی راگنیاں پیدا کر رہا ہے جو نہایت ہی خوش گوار معلوم ہوتی ہیں۔ غرض خدا نے اپنے کل قدرتی کرشموں کو ایک جا کر رکھا تھا۔ جب میں اس باغ انبساط کی سیر کر رہا تھا تو میں نے مختلف عمر کے مرد اور عورتوں کو نہایت شاندار لباس زیب تن کئے ہوئے سیر کناں پایا۔ کہیں ناسمجھ بچے فکر سے پاک رنگ رلیاں مچا رہے تھے۔ اور کہیں جوان مرد اور عورتیں ساتھ ساتھ ٹہل رہے تھے۔ کہیں خاوند اپنی بیوی کے ساتھ تو کہیں بہن اپنے بھائی کے ساتھ غرض ہر طبقہ کے مرد اور عورتیں اُس باغ

کا لطف اٹھا رہے تھے۔ اگرچہ ہر ایک چہرہ سے بشاشی ظاہر ہو رہی تھی مگر اس مسرت میں بھی تفکر اُن کے چہروں سے عیاں تھا اور اس کے ساتھ رہنے میں بھی ایک خود غرضی کا پہلو موجود تھا۔ جب ہم آگے بڑھے چلے گئے تو درختوں کے ایک کنج میں ایک نوجوان عورت کو دیکھا جو نہایت خوبصورت تھی مگر اُس کا چہرہ زرد تھا۔ نرگسی آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے۔ کاکلیں پریشان تھیں آنکھوں سے آنسو مچل مچل کر رخساروں پر لوٹ رہے تھے میں حیران ہوا۔ کہ اے خدا جہاں دنیا کی تمام لذتیں موجود ہوں۔ جہاں ہر شخص خوشی اور مسرت میں ڈوبا ہوا ہو۔ یہ کون مصیبت کی ماری ہے۔ کہ جو سب چیزوں سے کنارہ کش ہو کر اس تنہا گوشہ میں گریہ و زاری کر رہی ہے۔ اور جس کی طرف سے سب غافل نظر آتے ہیں۔ اول تو میں متحیر کھڑا رہا۔ اور اُس کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا۔ مگر اُس کو سوائے رونے کے کچھ کام نہ تھا۔ آخر کار جرأت کر کے بڑھا۔ اور اُس سے دریافت کیا۔ کہ اے مظلوم تو کون ہے جو ان لذات کو چھوڑ کر جو تیرے اردگرد موجود ہیں۔ اس تنہا گوشہ میں آہ و بکا میں مصروف ہے۔ پہلے تو وہ جھجکی اور مجھ کو حیرت سے دیکھنے لگی۔ مگر پھر اپنے کو سنبھال کر اُس نے کہا۔ ایک مدت سے ہمدردانہ الفاظ میرے کان تک نہیں پہنچے تھے۔ اور چونکہ تم نے اسی زمانہ میں جبکہ مجھ مصیبت زدہ کا کوئی بھی مددگار نہیں ایسی ہمدردی سے میرے حال کا استفسار کیا ہے۔ اس لئے ایسی ہمدردی سے اپنا حال بیان کر دینے میں مجھے کوئی بھی پس و پیش نہیں۔ جس باغ کو تم دیکھ رہے ہو یہ باغ دنیا ہے اور یہ تمام چیزیں جو تمہارے دل کو لبھا رہی ہیں لذات دنیا ہیں۔ یہ دنیا کے متوالے ہیں جو ایک دوسرے کی حالت سے بے خبر اپنے اپنے آرام اور خواہشات کے حاصل کرنے میں مصروف ہیں۔ اور میں بدبخت و بدنصیب بیوہ

ہوں اور اس مصیبت میں گرفتار ہوں۔ جب تک میرا خاوند زندہ تھا اُس وقت تک میں بھی ایسی ہی خوش تھی اور اپنے پیارے سرتاج کے ساتھ اس باغ میں نہایت فرحاں وشاداں سیر کیا کرتی تھی۔ مگر جب سے وہ تاج میرے سر سے گر گیا۔ اور زیر خاک ہو گیا اُس وقت سے میرے اقبال نے بھی میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ ماں۔ باپ۔ بھائی۔ بہن۔ رشتہ دار کوئی بھی میرا غمخوار نہیں۔ اور بے یار و مددگار ہیں اس گوشہ میں اس اجیرن زندگی کے دن پورے کرنے کے لئے بسر کرتی ہوں۔ غم ہی ایک ایسی چیز ہے جو مجھ کو تسلی دے سکتا ہے۔ اُس کی گھٹائیں اُٹھ اُٹھ کر دماغ تک چھا جاتی ہیں۔ اور پھر آنکھوں سے آنسو برسانے لگتی ہیں۔ اور یہی آنسو مجھ کو ابر کرم کا کام دیتے ہیں۔ اور اب صرف موت کا انتظار ہے۔ ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیئے

یہ دنیا کے ستوائے رسومات کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں اور ہم بیچاری بیواؤں کی آرزوؤں کا خون کرکے اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ اُس دنیوی تاج میں کہ جس کو وہ "ننگ و ناموس" کہتے ہیں۔ ایک اور قیمتی موتی زیادہ ہوا۔ حالانکہ اگر غور کریں تو وہی موتی جو اُس وقت اُن کو سب سے زیادہ چمکتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اُن کے تاج کو داغدار بنائے ہوئے ہے۔ اور یہ وہ دھبہ ہے کہ جو حشر تک نہیں مٹ سکتا۔ مگر اُنہیں یاد رہے۔ ؎

قریب ہے یار روز محشر چھپیگا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہیگی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

اتنے میں آنکھ کھل گئی۔ نہ تو باغ ہی تھا اور نہ وہ جوانانِ چمن۔ مگر اُس سوگوار عورت کی صورت آنکھوں کے سامنے پھر رہی تھی۔ اُس کی پردرد تقریر کا اثر دل پر موجود تھا۔ اور جوں جوں میں اُس پر غور کرتا تھا دل اور بیٹھا جاتا تھا ✤

اگرچہ ہم دیکھتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں۔ اور ہم محسوس کرتے ہیں۔ کہ عقد بیوگان کا مسئلہ کس قدر توجہ کے قابل ہے اور اُس پر عمل کرنے کی کس قدر ضرورت ہے۔ مگر افسوس کہ ہم رسومات کی زنجیروں میں ایسے جکڑے ہوئے ہیں۔ اور اس قدر سیاہ باطن ہوگئے ہیں۔ کہ ایک نیک کام کو جسکی ضرورت کو بھی ہم محسوس کرتے ہوں انجام نہیں دے سکتے۔ ہم دوسروں کے خون میں ہاتھ آلودہ کرکے سرخ رو بننا چاہتے ہیں۔ اُن کی تمام آرزوؤں کو خاک میں ملا دیتے ہیں۔ اُن کی تمام زندگی کو تباہ و برباد کرتے ہیں۔ اور انہی کی نہیں بلکہ اُن کے ساتھ اوروں کی زندگی کو بھی تلخ کر دیتے ہیں۔ وہ خود اگرچہ زندہ رہتے ہیں مگر اُن کی وہ زندگی موت سے بدتر ہوتی ہے۔ کیونکہ اُن کی زندگی کا چراغ تمام قسم کی باد مخالف کو برداشت کرنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اور وہ رفتہ رفتہ گل ہو جاتا ہے ✤

محبانِ وطن۔ سردار اجیت سنگھ کی ایام جلا وطنی کی تصنیف ایک نہایت ہی قابل قدر مجموعہ ہے سردار صاحب نے دنیا کے کل نامور محبانِ وطن۔ کے قابل یادگار واقعات قلمبند کئے ہیں اور دکھایا ہے کہ ان فنافی الملک لوگوں کو کن مشکلات و مصائب کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اور اُنہوں نے اپنے مشن میں کیونکر کامیابی حاصل کی۔ اردو میں اس قسم کی کتابوں کی بڑی کمی ہے اور اس قسم کی تصانیف ضرور قدر کی نگاہوں سے دیکھی جانی چاہیئے۔ ہم خوش ہیں۔ کہ ملک نے حسب توقع قدردانی فرمائی اور تھوڑے ہی عرصہ میں سردار صاحب کو اپنی تصنیف کا دوسرا ایڈیشن شایع کرنا پڑا۔ قیمت ۵ر سردار صاحب کے لاہور کے پتہ سے یا بندے ماترم بک ایجنسی لاہور سے دستیاب ہو سکتی ہے ✤

بارانِ رحمت

از منشی وناٹک پرشاد طالب بنارسی

ہمیں ایک عرصہ کے بعد اپنے دوست طالب کا کلام زینت اوراق آزاد کرنیکا موقعہ ملا ہے آپکی خاموشی ہم اور ناظرین آزاد نہایت بیچینی سے محسوس کر رہے تھے اپریل نمبر میں آپکے ایک نئے ناٹک لیل و نہار کے ریویو نے ناظرین کے دلوں میں حضرت طالب کی یاد تازہ کر دی اور تقاضے کے خطوط آنے شروع ہوئے ! ادھر ملک میں خشک سالی کی پکار تھی اور ہندوستانیوں کی آنکھیں آسمان پر لگی تھیں ادھر گلشن آزاد میں طالب کا انتظار تھا اور باغ سخن کے اس عندلیب کی خوش الحانی کے انتظار میں ناظرین ہمہ تن گوش بن رہے تھے - اُدھر قدرت نے غریب ہندوستانیوں پر رحم کھایا اور بارانِ رحمت بھیجی - ادھر حضرت طالب آزاد کے لئے باران رحمت بنکر آئے ادھر ملک خوش حال - ادھر ہم اور ناظرین شادان - ہم نہایت شکریہ کے ساتھ اپنے دوست کا عطیہ ناظرین کی نذر کرتے ہیں - ایڈیٹر

سرسبز ہو گیا چمنِ روزگار آج	ہے گلشن جہاں پہ غضب کا نکھار آج
پھرتی ہے اہتمام میں بادِ بہار آج	سورج مکھی چمن میں ہے آئینہ وار آج
ابرِ مطیر دہر میں ہے رشحہ کار آج	نالے ندی تمام ہوئے آبدار آج
کہتا ہے توبہ توڑ کے پرہیزگار آج	زاہد بھی ہو تو آکے بنے بادہ خوار آج
بادل برس رہے ہیں سر سبزہ زار آج	گل آچکی بغیر مے خوش گوار آج
چھائی ہیں مفلسی میں گھٹائیں اُٹھا ہے ل	اے مے فروش دے مے گلگوں اُدھار آج
چاروں طرف بلند ہوئی ہے صدائے رعد	پیہم پیالے مے کے ملیں نین چار آج

جامِ صحت ہے لالۂ حمرا کے ہاتھ میں
اچھی ہوئی ہے نرگسِ بیمار ونزار آج

چہرے پہ آسماں کے نہیں گرد کا نشاں
سینے میں ارض کے نہیں نامِ غبار آج

قدرت نے ہر جوانِ چمن کے گلے میں ایک
ڈالا ہے دستِ غیب سے پھولوں کا ہار آج

ہر شاخ جھوم جھوم کے ملتی ہے کیا گلے
کیا عیش ہو رہا ہے خوشی پر نثار آج

بادِ صبا صفائی پہ مائل ہے اس قدر
باقی نہیں ہے شیشۂ دل میں غبار آج

گلشن میں انتظامِ چمن کے لئے نسیم
آئی ہوا کے گھوڑے پہ ہو کر سوار آج

رنج و ملال و فکر و تردد جہان میں
ناچار ہو رہے ہیں خوشی سے یہ چار آج

ٹھیرا ہے چرخ دیکھنے شادابیٔ چمن
ہر بیقرار دل کو ہے حاصل قرار آج

راحت ہے زخمِ دل کی جراحت بنی ہوئی
غم ہو گیا ہے دامِ طرب کا شکار آج

کیا مور ناچتے ہیں خوشی سے اچھل اچھل
بادل گرج کے گاتے ہیں کیسا ملار آج

فوارہ بار بار اچھلتا ہے شوق سے
بحرِ عطائے حق نے کیا ہے ابھار آج

ہے آج سوکھے دھان میں پانی پڑا ہوا
کھیتی ہری ہے ہند کی اے کردگار آج

ہل چل رہا ہے خوب گنویں گانوں میں تمام
ہل چل میں زینہار نہ ہونگے گنوار آج

سیراب کر رہی ہے طراوت زمین کو
تر ہے سحاب سے جگرِ خاکسار آج

آبِ حیات چشمۂ ابرِ سیاہ سے
ظلمات کا نمونہ بنا مرغزار آج

قحطِ گراں پہ سو گھڑے پانی کے پڑ گئے
ارزاں ہوئی جو رحمتِ پروردگار آج

بارے نگاہ مہر سے بارِ تعال کی
ہر بار پر ہے بارِ کرم بار بار آج

آنکھوں میں بس رہی ہے چمن کی شگفتگی
تارِ نظر بنا ہے گلستاں میں خار آج

دامانِ گل کی پنجۂ گلچیں سے خیر ہو
لاکھوں دعائیں مانگ رہی ہے ہزار آج

دائم سوادِ ہند پہ ابرِ طرب رہے
ہے یہ دعائے طالبِ سینہ فگار آج

جنت

ماں اور بچہ کا مکالمہ

از منشی پتمبر پرشاد اختر

سنا تھا تجھ سے کچھ جنت کا احوال — جہاں ہے مجمعِ طفلانِ خوش حال
بتا وہ وادیئے دلکش راسی دم — نہ روئیں اور نہ ڈھونڈیں جس کو پھر ہم
وہاں ہے کیا؟ جہاں تاریخ کے گل — شگفتہ رہتے ہیں ہر وقت بالکل
جہاں جگنو سدا شاخِ حنا پر — چمکتے رات بھر ہیں مثل اختر
کہا ماں نے کہ یہ مجکو یقیں ہے — نہیں ہے واں میرے بچے نہیں ہے

فلک فرسا جہاں ہیں نخلِ خرما — کھجوریں دھوپ میں پکتی ہیں صدہا
جزیروں میں ہے یا بحرِ رواں میں — بیاباں میں ہے یا وہ گلستاں میں
چہکتے ہیں جہاں شاخوں پہ بلبل — مہکتے ہیں ہزاروں لالہ و گل
کہا ماں نے کہ یہ مجکو یقیں ہے — نہیں وہ میرے بچے واں نہیں ہے

کسی اقلیم دیریں میں نہاں ہے — کہ بحرِ بیکراں جاری جہاں ہے
چمکتے ہیں جہاں یاقوتِ احمر — دمکتے کان میں ہیں لعلِ انور
گہر ہیں ساحلِ مرجاں پہ تاباں — وہیں پر کیا وہ جنت بھی ہے اے ماں
کہا ماں نے کہ یہ مجکو یقیں ہے — نہیں وہ میرے بچے واں نہیں ہے

نہ دیکھا آنکھوں نے اُس کا نظارا — نہ کانوں نے سنا نغمہ وہاں کا
دکھا سکتا نہیں خواب اُس کا نقشا — نہ بارِ غم نہ دخلِ مرگ اُس جا
مبرا ہے خزاں سے اُس کا گلزار — لحد سے دور ہے وہ چرخ کے پار
بہشت آنجا کہ آزارے نباشد — کسے را با کسے کارے نباشد

[illegible]

از منشی ہری رام صاحب

میں کیا ہوں - ایک شگفتہ گل پھولوں کا ننھا بچہ - باغ کی رونق - سبزے کی شادابی - میں ابھی پیدا ہوا - گہری نیند سے بیدار ہوا - علی الصباح گجر دم - جبکہ ابھی تاروں کی چھاؤں تھی - چاند دھندلی دھندلی شعاعیں ڈال رہا تھا - پرندے چہک رہے تھے تو بستیوں میں کسان جاگے - پہاڑوں کی چوٹیوں پر ننھے ننھے پرند جاگے - پھولوں کی کلیوں میں سوئے ہوئے ننھے ننھے کیڑے جاگے جنگل میں رہنے والے بدمست جاگے - دریا کے کنارے مچھوے جاگے - اکھاڑوں میں جانیوالے پہلوان جاگے - سڑک کے کنارے سفر کرنے والے مسافر جاگے - دوکانوں میں دوکان دار جاگے - سب جاگے اور ساتھ ہی میں بھی جاگ اٹھا - سبز نقاب سے سر نکالا - نیچر نے مجھے ہری ہری پتیوں میں ڈھانپ دیا - کانٹے میری حفاظت کے لئے بنا دیئے - سہانی سہانی سرسراتی ہوئی ہوا مجھے تھپکنے لگی - میں پیدا ہوتے ہی کھل کھلا کر ہنسنے لگا - میرے پڑوسی میری سبز سبز پتیوں - سرخ سرخ کلیوں پر فریفتہ ہو گئے - اور مجھے لپک لپک کر چومنے لگے - چھاتی سے لگانے لگے - پیار کرنے لگے - کچھ وہ بڑھے اور کچھ میں بڑھا - انہوں نے بوسہ دینے کے لئے منہ کھولا - اور میں نے شرماتے ہوئے اپنا سر ان کی جھولی میں ڈال دیا - میں بچپن کے نشے میں مخمور تھا - میری گلابی رنگت - میری البیلی باتیں میری دلکش

ادائیں سب کو بھاتی تھیں۔ میرا حسن۔ میری ادا۔ میرے جوبن۔ میرے ناز پر سب لٹو تھے۔ مجھے پیدا ہوئے ابھی گھنٹہ ہی گذرا ہوگا۔ کہ رات کے جھلملاتے ہوئے ستارے چھپ گئے۔ پو پھٹ گئی اور باد سحری چلنے لگی۔ بار بار میری طرف جھکتی تھی۔ قدم بڑھاتی تھی۔ مجھے چھاتی سے لگاتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے پرندے راگنیاں گانے لگے اور میرا دل بہلانے لگے۔ اتنے میں سورج نکل آیا۔ اس کی پہلی ہی کرن مجھ پر پڑی تھی۔ معلوم نہیں اس میں کیا اثر تھا۔ میں چمکا۔ ذرا پھیل گیا۔ میں پھڑکا۔ اُس وقت میں جوانی کے نشہ میں چور اور جوبن کے نشہ میں مخمور تھا۔ میں معذور تھا۔ اپنی جوانی۔ اپنے جوبن۔ اپنی خوبصورتی پر نازاں تھا۔ اُدھر گلوں کا یہ حال تھا۔ کہ مجھ سے پل بھر بھی جدا نہ ہوتے تھے۔ مجھے جبراً گود میں گھسیٹتے تھے۔ ایک میں تھا اور ہزاروں میرے فدائی۔ لاکھوں میرے ناز بردار۔ میں نہایت ہی تنگ ہوا لیکن جی میں خوش تھا۔ اپنی اتنی عزت دیکھ کر جامے میں نہ سماتا تھا۔ ہر وقت یہی گھمنڈ رہتا تھا۔ کہ مجھ جیسا کوئی نہیں۔ اور واقعی میری گلابی رنگت اور سبز مخمل کے لباس سے کوئی بھی مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ میں اپنی جوانی کے نشہ میں سرشار ہی تھا کہ ایک سخت ہوا کا جھونکا چلا۔ جھونکا تھا۔ کہ ایک آگ کا شعلہ۔ اس نے میرے جوبن کو جلا دیا۔ میری جوانی کو خاک میں ملا دیا۔ میرا حسن کافور ہوگیا۔ میں اب صد سالہ بوڑھا تھا۔ میری کمر جھک گئی۔ اب یہی جی چاہتا تھا۔ کہ زمین پر لیٹ جاؤں اور آرام پاؤں۔ لیکن ہائے اتنی طاقت کہاں کہ ایک جست بھرتا اور سبز بستر پر جا لیٹتا۔ ایک وہ بھی وقت تھا۔ کہ میری طاقت۔ میرے جوبن کا کوئی اندازہ نہ تھا اور ایک یہ وقت ہے کہ سرک بھی نہیں سکتا۔ اس وقت میری آنکھیں

آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں۔ اور میں اپنی گذشتہ عمر کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ صبح کی تجلیاں۔ شفق کی جھلکیاں۔ پرندوں کا گانا۔ بلبل کا چہچہانا۔ فاختہ کا لوریاں سنانا۔ بادِ سحری کا تھپکیاں دے دے کر سلانا۔ یہ تمام نظارہ میری آنکھوں کے سامنے پھر رہا تھا لیکن سوائے رونے اور چلانے کے اور کیا ہو سکتا تھا۔ اب میں جس پر نگاہ ڈالتا تھا وہی بیگانہ تھا۔ وہی بزرگ گل جن کی گودیوں میں میں پلا تھا۔ اب نفرت بھری نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ سورج خوب چمک رہا تھا۔ گرمی سے سارا جہان خاموش تھا۔ ہوا خاموش۔ پرند خاموش۔ چرند خاموش۔ انسان خاموش۔ حیوان خاموش۔ صرف میں ہی بدبخت بسترِ مرگ پر کراہ رہا تھا۔ گرمی لمحہ لمحہ بڑھتی جاتی تھی۔ غضب کی دھوپ پڑ رہی تھی۔ ہر چیز گرم تھی۔ ہوا گرم۔ زمین گرم۔ آسمان گرم۔ غرضیکہ سب کچھ گرم ہی گرم تھا۔ ایک میرا جسم موت کے خوف سے سرد تھا۔ خویش و اقارب کی جدائی ستاتی تھی۔ اور یہی خیال تھا کہ اب جان نکلی۔ اب جان نکلی۔ اتنے میں ایک آدمی کا ادھر گذر ہوا۔ آدمی کیا تھا موت نے یہ شکل اختیار کر لی تھی۔ وہ میری طرف جھپٹا اور گھنے کو ٹھیلے کا بہانہ۔ مجھ میں کیا باقی تھا۔ ہاتھ کے پڑتے ہی میں فنا ہو گیا۔ میں ہری ہری ٹہنیوں پر جو کہ میرا آرام دہ مسکن تھا حسرت بھری نگاہیں ڈالتا تھا۔ سبز سبز لہلہاتے ہوئے گھاس۔ چلاتی ہوئی بلبل سے یہی کہتا تھا۔ ؎

اب تو جاتے ہیں میکدہ سے میر

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

مجھے اس جان کنی کی حالت میں پرانی رفیق بلبل یاد آ گئی۔ اس نے

بھی مجھے دیکھا۔ میں نے بھی اسے دیکھا۔ اور میری طرف جھپٹی اور میں اس کی طرف جھپٹا۔ اُس نے فوراً مجھے چھاتی سے لگا لیا۔ اور میں اُس کی چھاتی سے لپٹ گیا۔ مجھے روتے ہوئے اور چلاتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگی۔ اسے غمناک گل روتے کیوں ہو۔ جائے غم نیست۔ خوش ہو۔ آ تیری زندگی رفاہ عام کے کام آئی۔ اور بعد مرگ بھی کام آوے گی۔ اس نے کہا دیکھ بچپن میں تیری بھینی بھینی خوشبو سے لوگوں کے دماغ معطر ہوئے جوانی میں تیری دلکش رنگت پر سب فریفتہ تھے۔ تیری ننھی ننھی پنکھڑیاں سب کو بھاتی تھیں۔ پھر تیرے جیسا خوش نصیب کون۔ میں نے خوشی سے سر ہلایا۔ میرے دوست کے ان جادو بھرے الفاظ نے میرے غم کا قلع قمع کر دیا۔ اور اب میں نے خوشی خوشی جان دے دی۔ میری پنکھڑیاں بکھر گئیں۔ اور میں جھومتا جھامتا فرش پر لیٹ گیا۔ ہوا کی ایک لہر آئی۔ مَیں بالکل سوکھ گیا۔ دوسری لہر آئی اور میں اپنے وطن کی خاک میں خاک ہو گیا +

پس میں پیدا ہوتے بھی ہنستا تھا اور مرتے وقت بھی ہنسا۔ کیونکہ میں نے ہر وقت اپنی جان نیکی کے کاموں میں صرف کی تھی۔ اور یہی باعث میری بشاشت کا تھا۔ آیئے ناظرین۔ اس گل کی کہانی کے نیچے کیا کچھ نہاں ہے۔ ہم کو شگفتہ گل کا حال پڑھ کر اپنی زندگی کا خیال آ گیا۔ در اصل ہماری زندگی "شگفتہ گل" کی زندگی کے عین مشابہ ہے۔ ہم بھی گل کی طرح پیدا ہوتے ہیں۔ اس گل کی طرح بے مہر زمانہ کی گود میں کھیلتے ہیں۔ وقت پر جوان ہوتے ہی پھر بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ اور آخر کار ایک دن ہمارا نازنین جسم مشت بھر خاک ہو جاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ ہماری

زندگی "شگفتہ گل" کی طرح بشاش نہیں ہوتی۔ اور اس میں ہمارا ہی قصور ہے۔ ہم اپنی ناسمجھی سے اپنی زندگی کو خوار کر رہے ہیں۔ اگر ہم بھی نیکی کریں نیکیوں کا بیج بوئیں۔ بچپن سے لیکر آخری لمحہ تک کسی کا دل نہ دکھائیں۔ اس چند روزہ زندگی میں بد افعال سے بچیں۔ تو ہم بھی خوشی خوشی سے زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ اور مرتے وقت ہماری روح شانتی سے ہمارے جسم سے پرواز کر جائے گی +

پس پھر "ہم" میں اور "شگفتہ گل" میں کچھ بھی فرق نہ ہوگا۔ واقعی وہ بڑا ہی خوش نصیب ہے۔ جس کی زندگی "شگفتہ گل" کی زندگی کی طرح بسر ہوتی ہے +

آؤ ناظرین ہم سب اپنی زندگیوں کو "شگفتہ گل" کی زندگی کی طرح بنانے کی کوشش کریں +

ڈاکخانہ کی شکایات نے ہمارا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ سرپرستان آزاد الگ شاکی ہیں اور ہم الگ پریشان۔ کوئی مہینہ خالی نہیں جاتا جب بیس پچیس شکائتیں آزاد کے نہ پہنچنے کی نہ آتی ہوں۔ روانگی کے وقت بڑی احتیاط سے کام لیا جاتا ہے اور کئی مرتبہ پڑتال کرنے کے بعد ڈاک روانہ ہوتی ہے مگر ڈاکخانہ کے حضرات مفت خوری سے باز نہیں آتے ہم سوائے اسکے کیا کر سکتے ہیں کہ خود نقصان اٹھائیں اور گم شدہ پرچہ دوبارہ روانہ کر دیں مگر یہ جب ہی ہو سکتا ہے جب وقت پر اطلاع دی جائے۔ ڈاکخانہ سے شکایات کا سلسلہ جاری رہنا چاہئے کبھی نہ کبھی تو شنوائی ہوگی۔ ہم برابر شکایت کر رہے ہیں۔ جن احباب کو پرچے نہ پہنچیں۔ انہی بھی چاہئے۔ کہ اس کی اطلاع فوراً ڈاکخانہ کو دیں۔ تاکہ تحقیقات کی جائے +

اِستقبالِ مصیبت

از منشی وجاہت حسین صاحب وجاہت ایڈیٹر اصلاح سخن

وہ بھی ایک زمانہ تھا جب ہندوستان میں علمی مجلسوں کا چرچا تھا۔
اہل کمال جمع ہوتے تھے اور علم دوست حضرات ایک دوسرے کے خیالات
سے مستفید ہوتے اور ان کے کمال کی داد دیتے تھے۔ ایسی مجالس کا وجود
ملک کے لئے نہایت مفید تھا۔ خصوصاً نومشق نوجوانوں کے لئے یہ جلسے
حوصلہ افزائی کا باعث ہوتے تھے اور ترقی کا شوق ان کے دلوں میں پیدا
ہوتا تھا۔ انگریزی تعلیم و تہذیب نے ان علمی مجلسوں کی کایا پلٹ دی ہندوستانی
زبانوں کی بے قدری نے ان مجلسوں پر بالکل انگریزی رنگ چڑھا دیا۔ اب
انگریزی طریق کی مجلسیں موجود ہیں جن کے بانی اگرچہ ہندوستانی ہیں اور کبھی کبھی
ہندوستان کے متعلق کسی مضمون کی باری بھی آجاتی ہے مگر ان کے نام انگریز
مصنفوں کے نام پر رکھے جاتے ہیں۔ شیلے سوسائٹی کے نام سے ایک
کلب بنانے کا خیال کچھ دن ہوئے ہمارے ایک دوست کے دل میں پیدا
ہوا تھا۔ منروالوج کے نام سے ایک کلب امرتسر میں موجود ہے شکسپیر
کے نام سے بھی ایک انجمن تھی خدا جانے اب وہ ہے یا نہیں غرض
اب علمی جلسوں نے بالکل انگریزیت اختیار کر لی ہے۔ اور ہندوستانی
اہل کمال کے نام زندہ رکھنا غیر ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ زمانہ کا رخ
بدلا اور ہندوستان میں بھی کچھ جان آئی اور اسے بھی اپنے لٹریچر
اپنے مصنفوں اور اپنے اہل کمال کی قدردانی اور ان کے نام زندہ

رکھنے کا خیال پیدا ہوا - چنانچہ پروفیسر دل محمد ایم-اے کی کوششوں
کی بدولت لاہور میں مولانا محمد حسین آزاد کے نام پر ایک کلب آزاد کلب
کے نام سے قائم ہوا ہے - پنڈت رام بھج دت چودھری مالک اخبار ہندوستان
ہر سال ایک علمی جلسہ کرتے ہیں جس میں شعرا نے باکمال اور اہل الرائے
جمع ہوکر اپنے اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں - یہ کوشش ایک نہایت
مبارک کوشش ہے اور ایسی بہت سی مجلسوں کی ضرورت ہے - ۲۷ر
جون کو سارسوت سمیلن کا دوسرا سالانہ جلسہ پنڈت رام بھج دت صاحب
کی کوٹھی پر منعقد ہوا - بہت سے اہل کمال جمع تھے - اور اہل سخن کو انکے
کلام کی داد مل رہی تھی - ہمارے دوست منشی وجاہت حسین صاحب
نے ذیل کی نظم پڑھی جو نہایت مقبول ہوئی اور ہم نے اُسے آزاد کیلئے
مانگ لیا - "استقبال مصیبت" اِن دنوں ایک نہایت ہی ضروری مضمون
ہے - اور ہمارے دوست نے اہل ملک کو ایک نہایت ہی اچھا مشورہ
دیا ہے - ایڈیٹر

مصیبت کی کہانی سر بسر تحریر کیسی ہے
بیان درد حسرت ہے مری تقریر کیسی ہے

پھنسا ہو جو مصیبت میں کوئی اُس سے ذرا پوچھے
یہ کیسی سخت آفت ہے کڑی زنجیر کیسی ہے

نہیں ہوتا مصیبت میں کوئی ساتھی نہیں ہوتا
یہ کیسا انقلاب اس میں ہے یہ تغییر کیسی ہے

جو اپنے ہیں وہ بنجاتے ہیں بیگانے مصیبت میں
بُرے ایام کی سچ ہے بُری تاثیر کیسی ہے

مصیبت کے بھی چہرے مختلف تاثیر رکھتے ہیں
کوئی تلوار کیسی ہے کوئی شمشیر کیسی ہے

وہ ہے شخصی مصیبت جو ہو نازل شخص واحد پر
سمجھ لیجے کہ اُس کو فکر دامن گیر کیسی ہے

مصیبت خانداں کی سارے کنبے کی مصیبت ہے
بیاں ہوتی نہیں ہے درد یہ تقریر کیسی ہے

اب اس سے آگے بڑھکر درجہ ہے قومی مصیبت کا
جو ہو محبوس غم اس قوم کی تقدیر کیسی ہے

مگر جو سب سے بڑھ چڑھ کر ہے وہ ملکی مصیبت ہے ، بیاں ہوتی نہیں جو درد یہ تقریر کیسی ہے

خصوصاً یہ ہمارا ملک مرجع ہے مصائب کا ، یہاں سب آفتوں کی ملک اور جاگیر کیسی ہے

کبھی طاعون اور ہیضہ کبھی ہے قحط کا دورہ ، بجائے خود مصیبت ہیں سی ہر تصویر کیسی ہے

مبدل کیوں نہیں ہوتی مصیبت اپنی راحت سے ، بتا گردش تری اے آسمان پیر کیسی ہے

مصیبت پھر مصیبت ہے وہ کچھ ملکی ہو یا بھاری ، چھری کیسی ہے برچھی کیسی ہے شمشیر کیسی ہے

اگر چاہیں تو ہم ہر اک بلا کو ٹال سکتے ہیں ، بتا دوں اب تمہیں وہ کارگر تدبیر کیسی ہے

پڑے جب ملک پر آفت تو ہم سب ایک ہو جائیں ، حصار امن ہے مضبوط یہ تعمیر کیسی ہے

مسلماں اور ہندو کی خصوصیت ہو کچھ بھی ، یہ اہل ملک کے برتاؤ میں تزویر کیسی ہے

نہیں ہوتا نہیں ہوتا اجالا ہند میں اس سے ، ضیائے آفتاب علم عالمگیر کیسی ہے

مسلماں وہ مسلماں ہیں ہندو اب وہ ہندو ہیں ، نگاہ غور سے دیکھو تو یہ تغییر کیسی ہے

کسی کا کوئی بھی پرساں نہیں ہے اس زمانہ میں ، ہر اک کو اپنی اپنی فکر دامن گیر کیسی ہے

مسلماں اور ہندو متفق ہو جائیں آپس میں ، مصائب رفع کر دینے کی یہ تدبیر کیسی ہے

حرم اور دیر کے جھگڑوں سے مطلب کیا غرض اس سے ، وہاں پتھر ہے کیسا اور یہاں تصویر کیسی ہے

عبادت کی جگہ دونوں ہیں مسجد ہو کہ مندر ہو ، کوئی تعمیر کیسی ہے کوئی تعمیر کیسی ہے

بڑھا دی ہے مصیبت اور بھی نااتفاقی نے ، یہ ہے خود فالتو مد اس میں پھر توفیر کیسی ہے

ہمارے ملک اور باشندگان ملک کی حالت ، ہمارے واسطے اب باعث تشہیر کیسی ہے

مصیبت گو مصیبت ہے نہیں کچھ اسمیں شک لیکن ، تمہاری آزمایش کی یہ اک تدبیر کیسی ہے

مصیبت سے تمہارا امتحاں منظور ہے اس کو ، یہ کیسی ہے جفائے آسمان پیر کیسی ہے

رضا و صبر کو وہ جانچتا ہے جانچ لینے دو ، خدا کا حکم ہے بس اور یہ تعزیر کیسی ہے

نہ گھبراؤ نہ گھبراؤ جو پابند سلاسل ہو ، برا سے سمجھو نہ تم کچھ بھی یہ دار و گیر کیسی ہے

سنو مجھ سے سناتا ہوں تمہیں تفصیل میں اسکی ، یہ بیڑی ہتکڑی کیسی ہے یہ زنجیر کیسی ہے

یہ آزادی کا زیور ہے یہ تمغہ ہے رہائی کا
ذرا سوچو کہ اس لوہے میں یہ تاثیر کیسی ہے

نہ آئیگا یقیں لوگوں کو میری بات کا شاید
کہینگے سب کہ یہ اُلجھی ہوئی تقریر کیسی ہے

میں اُس گُتھی کو بھی دیکھو ابھی سلجھائے دیتا ہوں
زباں میرے دہن میں ناخن تدبیر کیسی ہے

مصیبت اور کوئی اس سے بڑھکر ہو نہیں سکتی
ضرر ہو جان کا جس میں وہ ٹیڑھی کھیر کیسی ہے

مگر ہے جان جس کا نام جس کو روح کہتے ہیں
فنا ہوتی نہیں ہے اس میں یہ تاثیر کیسی ہے

فقط یہ جسم فانی ہے یہی اک دن فنا ہوگا
تمہیں اس کیلئے پھر فکر دامنگیر کیسی ہے

مصیبت سہ کے اپنی جان کو صدمہ نہ پہنچاؤ
یہ اطمینان حاصل کر نیکی تدبیر کیسی ہے

غضب ہے روح گر ایذا اٹھائے جسم میں ہوکر
ستم ہے قہر ہے آفت ہے یہ تغیر کیسی ہے

بشر کی کچھ نہیں ہستی فقط دم کا دمامہ ہے
ہوا پر جس کی ہو بنیاد وہ تعمیر کیسی ہے

مسافر منزلِ ہستی کا ہے تو یاد رکھ انساں
بھلا فکر قیام اس میں تجھے رہگیر کیسی ہے

مصیبت پیش خیمہ ہے جہاں میں عیش و راحت کا
جو سہ لیتے ہیں اس کو اُن کی پھر توقیر کیسی ہے

ضیا بڑھ جاتی ہے جب شمع کٹواتی ہے سر اپنا
بتا تیری جفا کاری پہ اے گلگیر کیسی ہے

قلم ہو کر شجر کی شاخ بھی بڑھ جاتی ہے دیکھو
مصیبت کے اُٹھا لینے کی یہ تاثیر کیسی ہے

مصیبت ہے مگر ہے اسکے بعد امید راحت کی
یہ ظلمت ہے مگر ظلمت میں بھی تنویر کیسی ہے

اِسی کے دم سے کٹ جاتے ہیں دن رنج و مصیبت کے
یہ صبر و حلم و استقلال کی شمشیر کیسی ہے

وجاہت اسکا استقبال کرنا چاہئے ہم کو
زمانے میں مصیبت باعثِ توقیر کیسی ہے

انقلاب ہستی

نہ سمجھا عمر گذری اس دلِ مضطر کو سمجھاتے
پگھلکر موم ہو جاتا اگر پتھر کو سمجھاتے

ہندوستان کے سٹیج پر جو ٹریجیڈی آج کل ہو رہی ہے اس کا ہر ایک سین نہایت دردناک اور سنسنی پیدا کر دینے والا ہے۔ ہر ایک کیرکٹر انقلاب دنیا کی تصویر ہے اور ہر ایک نیا سین نئے خیالات پیدا کرنے والا ہے۔ اضطراب کی تصویریں اِدھر اُدھر پھرتی دکھائی دیتی ہیں اور دلوں پر ایک نہایت گہرا اثر پیدا کرتی ہیں۔ مضطرب دل پتھر کے بن رہے ہیں۔ مصائب نے انہیں بالکل سرد کر دیا ہے۔ اور یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ اِس انقلاب خیز تماشہ کا نتیجہ کیا ہوگا ؟

تاریخ ہمیں بتلاتی ہے کہ جب سے دنیا کی ہستی ہے انقلاب اس کے ساتھ رہا ہے اور اس لئے یہ امید طاقت پکڑتی جاتی ہے کہ دنیا کے انتظام میں کوئی خلل نہیں آسکتا۔ انقلاب کی رو آئی ہے۔ اور اپنا ضروری فرض انجام دیکر چلدے گی اس لئے ہمیں اس تبدیلی سے بددل نہ ہونا چاہیئے۔ اور قدرت کے ہر ایک کام کو نہایت اطمینان سے دیکھنا چاہیئے۔ کاش وہ وقت آئے جب یہ ٹریجیڈی خوشی و مسرت میں تبدیل ہو جائے اور ہم دیکھیں کہ ہندوستان کی سٹیج کے گورے اور کالے ایکٹر جنہیں ہم نے دست و گریباں دیکھا تھا۔ گلے ملکر آئیں اور اس بربادکن انقلاب کے ٹل جانے پر نہایت دلکش سروں میں یہ مبارکباد کا گانا گائیں۔ ع

بڑا مزا اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے یا جنگ ہو کر

واقعات پر غور کرنے سے معلوم ہوگا۔ کہ یہ خوفناک قلعہ جس میں سے ہر وقت بمب کی دہشتناک آوازیں اور سقانون کی گولیوں کی دل ہلا دینے والی صدا آتی ہے۔ چند غلط فہمیوں اور بعض فتنہ پردازوں کی غلط بیانیوں کی بودی زمین پر قایم ہے جس کی بنیادیں ہلا دینے کے لئے سچائی اور حق شناسی کا سیلاب کافی ہے۔ مگر دیکھنا ہے کہ ان غلط فہمیوں یا غلط بیانیوں کا باعث کیا ہے کیونکہ یہ معلوم ہو جانے پر ہمیں اس بودی زمین کو ہلا دینے میں آسانی ہو گی +

ابھی بہت عرصہ نہیں گذرا کہ اخبار نویسی سب سے آسان کام خیال کیا جاتا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ باوجود ناقدردانی ملک میں اخبارات کی تعداد بڑھتی گئی۔ چھوٹے چھوٹے مقامات میں جہاں چھپائی کی آسانیاں نہیں تھیں گرد و نواح کے مطابع سے مدد لیکر اخبارات جاری کئے گئے۔ ادھر اخبار نویسی اس طرح ترقی کر رہی تھی۔ ادھر ملک میں قومی جذبہ اور باہمی تکالیف کا احساس بڑھتا جاتا تھا۔ تعلیم حقوق شناسی میں مدد دے رہی تھی۔ غرض بہت سے طریقوں اور بہت سے محبان ملک کی کوششوں سے ہم اس درجہ پر پہنچے کہ ہم اخبارات کی خدمات کی قدر کر سکیں اور جو لوگ ملک کے لئے خدمت کر رہے ہیں۔ ان کی خدمات کی قدر کرتے ہوئے ان کی حوصلہ افزائی کا باعث ہوں ہماری اس قسم کی کوششیں ایک حد تک ہماری بہتری کا باعث بھی ہوئیں۔ ہمارا علمی مذاق ترقی کر گیا۔ اور آج ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ہم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ایک وقت بھوکا رہنا گوارا کرتے ہیں۔ مگر یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ وہ اخبار یا کوئی ایسی کتاب نہ پڑھیں جس میں

ان کی قومی اور ملکی بیداری کے متعلق بحث کی گئی ہو۔ فرائض انسانی جسے ہندوستانی ایک عرصہ کے لئے بھول گئے تھے اب بخوبی سمجھے جانے لگے ہیں اور اب یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے لئے وہ وقت ہے کہ قومی طاقت ان کے مردہ دلوں میں پیدا ہو گئی ہے۔ اگر ضرورت ہے تو اس امر کی کہ اس طاقت کی پوری احتیاط سے نشو و نما کی جائے۔ اور اس طاقت کا جائز استعمال کیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو نتیجہ کیا ہو گا؟ یہی کہ ایک عرصہ کے بعد ہم پھر بالکل مردہ ہو جائیں گے۔ اور یہ موت شاید ہماری تباہی کا باعث ہو۔ غرض موجودہ جد و جہد ہمارے لئے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اور ایسے مشکل سوال کے حل کرنے کے لئے جلد بازی۔ جوش کا کام نہیں۔ زندگی کوئی ایسی چیز نہیں جو آسانی سے حاصل ہو سکے۔ اس زندگی کے لئے ہمارے محبان وطن نے لاکھوں جتن کئے ہیں تکلیفیں اُٹھائی ہیں اپنا عیش و آرام حرام کیا ہے۔ اور استقلال کے ساتھ برسوں کی کوشش سے کہیں یہ دن نصیب ہوا ہے۔ ضروری ہے۔ کہ اس زندگی کے قایم رکھنے کے لئے جو اتنی تکلیفوں۔ کوششوں اور قربانیوں سے حاصل کی گئی ہے۔ قربانیوں اور استقلال کی ضرورت ہو۔ اس لئے ہمیں نہایت غور سے سوچنے کی ضرورت ہے کہ اس زندگی کو قایم رکھنے کے لئے ہمیں کیسی قربانیوں کی ضرورت ہو گی ؟

قربانی کے نام پر ہمارے پرجوش محبان وطن چونکیں گے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ اس کے لئے تیار ہیں مگر قربانی کیا ہے یہ معلوم کرنا ضروری ہو گا۔ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ہزاروں سال سے تمام دنیا میں قربانی کا رواج ہے۔ مختلف اقوام میں قربانی کے مختلف طریقے رائج ہیں اور ہر ایک قوم ان کو

لئے بجائے خود ذریعہ نجات خیال کرتی ہے۔ اس لئے اگر یہ خیال کر لیا جائے تو کچھ تعجب کی بات نہیں۔ کہ قومی قربانیوں کے طریقے بھی اعتقاد اور خیال کے مطابق مختلف ہوں گے مگر مختلف قومیں مذہب کی دوڑ میں خواہ کچھ ہی طریقہ اختیار کریں کیونکہ ان کو نجات کے اعتقاد بھی اختلاف رکھتے ہیں مگر ملکی ترقی کی دوڑ اور منزل مقصود سب کے لئے ایک ہے اور اس لئے ان کی قربانی کا طریقہ بھی ایک ہی ہونا زیادہ موزوں اور مفید معلوم ہوتا ہے۔ جب ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ ہماری قربانی کا طریقہ ایک ہونا چاہئے تو یہ سوال قدرتاً دل میں پیدا ہوتا ہے۔ کہ وہ طریقہ ایسا ہونا چاہئے جسے کل قومیں اتفاق کریں۔ اور اس طریقہ کے انتخاب کے لئے تاریخ سے بہتر رہبر نظر نہیں آتا۔ زندہ قوموں کی تاریخ ہمارے لئے قربانی کا بہترین طریقہ منتخب کر سکے گی +

ہندوستان خواہ اب کسی حالت میں ہو مگر ان ممالک میں سے ضرور ہے جو اپنی تاریخ پر نازاں ہیں جن کی تاریخ اخلاقی اسباق کا مخزن ہے۔ جس کی تاریخ میں وہ واقعات موجود ہیں جن سے فائدہ اٹھا کر اور ممالک نے ترقی کی ہے۔ اس لئے ہمارے لئے ہماری اپنی تاریخ سے بڑھ کر رہبر نہ ملیگا۔ وہ شخص جو ہمالہ کی چوٹی پر کھڑا ہو کر ہندوستان کی چاروں طرف نظر ڈالتا ہے کیا دیکھتا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین کے چپہ چپہ پر اوراق تاریخ پریشاں ہیں۔ تاریخ کے جواہر اس طرح بکھرے ہوئے ہیں کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ یہ وہ خزانہ ہے کہ غیر ممالک کے سیاح اور مورخین آئے اور مالامال ہو کر چلے گئے۔ انہیں اپنے کتب خانوں۔ عجائب خانوں کی زینت بنایا۔ اور اہل نظر نے ان جواہرات کے نور سے اپنے ملک کو نہال کر دیا

بہادروں کے خون کا ایک ایک قطرہ جو ہندوستان کی قومی عمارات کے کھنڈروں میں سے چمک رہا ہے - آفتاب کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرتا ہے مگر حیرت ہے کہ ہم انہیں نہیں دیکھ سکتے - ہماری آنکھیں ان کے نور سے محروم ہیں ۔ ؎

گر نہ بیند روز روشن شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

اگر یہ قصور ہے تو کس کا ؟ ہمیں ماننا پڑیگا کہ ہمارا - ہماری تاریخ - ہماری قومی زندگی کی غذا تھا - اور اگر ہم اس کی طرف سے غافل نہ ہوتے تو ہماری ہرگز یہ حالت نہ ہوتی جس کے لئے ہم دنیا کی نظروں میں حقیر ہیں مغربی فلاسفروں کی رائے ہے کہ اگر ہندوستانی ترقی کرنا چاہتے ہیں تو ان کے لیئے ضروری ہے کہ اپنے تاریخی جوہروں کی چھان بین کریں - اس خزانے کی قدر کریں اور انہیں اپنا قومی زیور بنائیں - ہم خیالات کی رو میں کہاں سے کہاں نکل آئے - تاریخ کے سمندر میں ہم نے غوطہ تو اس لیئے لگایا تھا کہ اس میں سے اصول قربانی کا موتی ڈھونڈ کر لائیں مگر ہمیں اس سمندر کی گہرائی میں پہنچتے ہوئے ایک عرصہ لگ گیا - اس غوطہ زنی سے جو اصول ہمیں حاصل ہوا وہ یہ ہے کہ قومی قربانی کے لئے بہترین چیز ایثار نفس ہے - ذاتیات کو قربان کر دینا سب سے بڑی قربانی ہے - ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے بزرگوں نے سچائی اور حق پرستی کی حمایت میں خود کو فنا کر دیا - اور یہی وجہ ہے کہ اگرچہ زمانہ کے نامہربان ہاتھوں نے ان کے فانی وجود کو نہ رکھا - مگر جب تک دنیا قائم ہے ان کے نام آسمان شہرت کا آفتاب بنکر چمکیں گے اور ان لوگوں کے لئے جو راستی

کی راہ پر چلنا چاہتے ہیں مشکلات کو آسان اور کامیابی کے اندھیرے استوں
کو روشن بنائیں گے +

قانون اور اصول کی پابندی کا سبق ہمیں قدرت سے ملتا ہے - اگر
قانون قدرت قایم نہ رہے اس میں کوئی تبدیلی ہو تو دنیا کی کیا حالت ہو گی؟
اس سوال کے مفصل جواب کے لئے تو ایک دفتر چاہئے مگر مختصر الفاظ میں یہ
کہنا کافی ہو گا کہ قانون قدرت کی تبدیلی ہماری ہستی میں بھی تبدیلی پیدا
کرنے والی ہو گی یا یوں کہئے کہ اگر قانون قدرت تبدیل ہو جائے تو حضرت
انسان وہ انسان نہ ہوں گے جو اب ہیں - پس یہ لازمی ہوا کہ ہمارا ہر ایک
کام کسی قانون کے تابع ہونا چاہئے - اور اس قانون کی پابندی ہمارا
فرض اول +

اخبارات کا فرض نہایت نازک ہے اور اس لئے اس فرض کو بجالانے
کے لئے ایک زبردست قانون کی ضرورت ہے مگر وہ قانون کیسا ہونا چاہئے ؟
کیا وہ قانون ایسا ہو گا جس میں رنگ یا قومیت کی تمیز ہو ؟ کیا وہ قانون ایسا
ہو گا جس میں ضرورت کے مطابق نہیں نہیں اپنی غرض کے مطابق تبدیلی
کر لی جائے ؟ کیا وہ قانون ایسا ہو گا جس میں تعصب کا کچھ دخل ہو ؟ غور کرنے
پر معلوم ہو گا کہ ایسا قانون ہماری ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتا - اور اگر
اخبارات ایسے قانون کے تابع ہوں گے تو ان کی ہستی خطرے میں ہے - وہ
اپنے فرض کو راستی کے اصول پر انجام نہیں دے سکتے - اور جس کام کی بنا راستی
نہیں ہے وہ کبھی دیر تک کامیابی سے نہیں چلایا جا سکتا +

ہندوستان میں اخبار نویسی ابھی بچپن کی حالت میں ہے - اور بچہ کے
دل کو حکما نے ایک صاف تختی بتلایا ہے جس پر جو نشان چاہیں بنایا جا سکتا ہے

اب تک اس بچہ کی نشو و نما کے لئے آسانیاں تھیں۔ کھلی آب و ہوا میں پرورش پاتا تھا۔ گورنمنٹ کی سرپرستی تھی مگر اب وہ حالت نہیں رہی۔ قانون کی مضبوط زنجیروں نے ان ننھے ننھے ہاتھوں کو جکڑ لیا ہے اور اب وقت ہے کہ ہم ان کڑی زنجیروں میں استقلال ہمت اور عقلمندی سے دن گذاریں۔ اور اس دن کے منتظر رہیں جب ہماری فاتح قوم کو ہماری وفاداری اور سچائی کا یقین ہو جائے۔ سوائے اس کے ہمیں اور کوئی تدبیر نہیں سوجھتی مگر دیکھنا یہ ہے۔ کہ کیا ہمارے اخبارات اس سخت قید کو برداشت کر سکتے ہیں کیا وہ اس زندان میں زندہ رہ سکیں گے؟ جواب نہایت مایوس کرنے والا ہوگا کیونکہ نیا قانون جو سختیاں اس ننھی سی جان پر کیا چاہتا ہے وہ اس سے برداشت نہیں ہو سکتیں +

سڈیشن کے لفظ کی تعریف نہایت مشکل ہے۔ اور جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے۔ کہ سڈیشن کیا ہے۔ کوئی اس سے بچ کیونکر سکتا ہے۔ دفعہ ۱۲۴ الف اور ۱۵۳ الف ایسی جامع دفعات ہیں۔ کہ ان سے بچ نکلنا ہندوستانی اخبار نویسوں کے لئے جو ذرا بھی سچائی اور حق گوئی سے کام لیتے ہیں آسان نہیں۔ حالانکہ وہی باتیں جو ایک ہندوستانی اخبار نویس کو دفعہ ۱۲۴-الف اور ۱۵۳-الف کی زد میں لا سکتی ہیں۔ ایک انگلو انڈین اخبار پر کوئی اثر نہیں رکھتیں وہ سمجھتا ہے۔ کہ اس کی کوئی تحریر ان دفعات کی گرفت میں نہیں آتی۔ جب قانون کی یہ حالت ہو تو کیا وہ حقیقی بہتری کا جس کا بہانہ کیا جاتا ہے باعث ہو سکتا ہے؟ انگلو انڈین اخبارات جو حملے ہندوستانیوں پر کرتے ہیں۔ جو بے عزتی کے الفاظ وہ ان فلاکت زدہ لوگوں کیلئے استعمال کرتے ہیں ان کے لئے سڈیشن نہیں مگر ایک ہندوستانی اخبار نویس کی تحریر

ہیں سڈیشن کہے جاتے ہیں۔ پاونیر اخبارات کے نئے قانون کو بھی ہندوستانیوں
کی آواز بند کرنے کے لئے کافی نہیں سمجھتا۔ جس روز کال اور سوراجیہ کے
ایڈیٹر کو سزا ہونیوالی تھی۔ تو پاونیر لکھتا ہے۔ کہ یہ مجسٹریٹوں کی پالیسی غلط ہے
کہ وہ مقدمات سڈیشن میں خود ہی سزا دے دیا کرتے ہیں اور مجرم کو سشن سپرد
نہیں کرتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملزم بہت جلد جیلخانہ کی سزا کاٹکر جو عموماً
اُس کی نیک چلنی سے کم ہو جاتی ہے باہر چلا آتا ہے اور اُس کے باہر آنے پر
اُس کے دوست اُس کی عزت میں جلسے منعقد کرتے ہیں ان کے اخبارات
کو شہرت ہوتی ہے لہذا سزا سے عبرت نہیں ہوتی۔ پس مغویانہ الزام میں
سزایافتہ مجرمان کو ایسی سزائیں دینی چاہئیں۔ کہ وہ جلد جیلخانہ سے واپس
نہ آویں۔ اور جب آئیں تو لوگ اُن کو بالکل بھول جائیں اور نئے
معلوم ہوں +

اینگلو انڈین اخبارات کی یہ حالت ہے پاونیر صاحب کی رائے میں
سب ہندوستانی اخبار نویسوں کو پھانسی دے دینا چاہئے۔ کیونکہ آنکھ
پھوٹی پڑ گئی۔ کیا یہ فقرات دل دکھانیوالے نہیں۔ کیا ایسی زہریلی رائے
منافرت باہمی کا باعث نہ ہوگی۔ کیا یہ الفاظ ہندوستانیوں کے دلوں میں
محبت کا بیج بوئیں گے۔ یہ سب کچھ درست مگر وہ اس لئے سڈیشن نہیں
ہیں کہ وہ ان لوگوں کی طرف سے ہیں جو سڈیشن بنانے والے ہیں یا یوں
کہئے کہ جو لفظ سڈیشن کی جس طرح چاہیں تشریح کرسکتے ہیں۔ جب یہ حالت
ہے تو قانون کی آڑ لینا فضول ہے۔

روز کے نامہ و پیغام کہاں تک ہونگے
صاف کہدیجئے ملنا ہمیں منظور نہیں

روز نئے قانون بنا کر خود کو اُلجھن میں ڈالنا اور رعایا کو واویلا مچانے اور غیر ممالک کو مذاق اُڑانے کا موقعہ دینا عقلمندی نہیں۔ چند الفاظ اس سارے قضیے کو پاک کرنے کے لئے کافی ہیں +

"ہم بادشاہ وقت ہیں۔ رعایا کی قسمت کے مالک ہیں۔ رعایا کا ہم پر کوئی حق نہیں۔ انہیں جو کچھ دیا جاتا ہے وہ ہمارا رحم اور بخشش ہے" +

یہ الفاظ ظاہراً ساری بےچینی کو دور کر دیں گے۔ مقدمہ بازی کی ضرورت نہ ہوگی۔ ہندوستانی اخبارات بھی دنیا کی اور فانی چیزوں کی طرح مر جائیں گے اور شاید ان کی ایسی موت بہ نسبت روز کی جان کنی سے اچھی ہوگی۔ بس پھر کیا ہے میدان صاف ہوگا۔ انگلو انڈین اخبارات کو دل لگی کے لئے کوئی رکاوٹ نہ ہوگی اور گورنمنٹ بھی اطمینان سے حکومت کر سکے گی۔ رہی یہ بات کہ ہم اور ہماری گورنمنٹ موجودہ تہذیب سے دور پھینک دیئے جائیں گے۔ یہ ایک بالکل معمولی چیز ہے جسے سلطنت کی سی گراں بہا دولت کے لئے قربان کیا جا سکتا ہے +

قانون امن اور انتظام کرنے کے لئے بنائے جاتے ہیں مگر ہمارا تجربہ ہمیں بتلا رہا ہے۔ کہ قانون اپنے منشا کو پورا نہیں کر رہے کیونکہ وہ ایسے ہاتھوں میں ہیں جو یا تو قانون کی منشا نہیں جانتے یا دیدہ و دانستہ تجاہل عارفانہ کرتے ہیں۔ اخبارات کے نئے قانون میں بھی یہی خطرہ مخفی ہے۔ کہ وہ ان حکام کے ہاتھ میں جو رعایا کی دل آزاری کو اپنے لئے ایک مشغلہ خیال کرتے ہیں۔ ایک اور خطرناک ہتھیار ہو گیا اور وہ جب چاہیں کسی اخبار نویس کی آبرو ریزی کر سکتے ہیں۔ حکام کا مقابلہ ہندوستان میں گویا جانے لگا ہے اور اس سے زیادہ بدنصیبی کا دن ہندوستان کیلئے نہیں ہو سکتا +

پریس کی آزادی جسے برکت سمجھا جاتا ہے اب چھن رہی ہے - اور یہ بات بجائے خود تعجب خیز اور افسوسناک ہے - کہ اس وقت جب اور قومیں تہذیب و ترقی کی دوڑ میں اپنی پوری طاقت سے دوڑی جا رہی ہیں - غریب ہندوستان کو جس نے میدان ترقی میں ابھی قدم ہی رکھا ہے - پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی جا رہی ہے - وہ خوشنما منزل مقصود جس کی تمنا ہمارے حوصلوں کو بڑھاتی ہے - ہم سے چھپائی جاتی ہے اور یہ کوشش کس کی طرف سے ہے - ایک ایسی گورنمنٹ کی طرف سے جو تہذیب کی حامی اور ترقی کی رازدان خیال کی جاتی ہے - ہماری گورنمنٹ کے مزاج میں یہ تبدیلی حیرت سے دیکھی جائے گی - مگر یہ تعجب بیجا ہے کیونکہ جب بنگالی ایسی قوم جو بزدل کہی جاتی تھی - جنگ کے لئے آمادہ ہو سکتی ہے تو یہ ذرا بھی تعجب خیز بات نہیں - کہ گورنمنٹ انگلشیہ جس سے رحم اور بخشش کی امیدیں تھیں قہر اور سختی کے تیر برسانے لگے - سخت ناانصافی ہوگی - کہ موجودہ جبر و تشدد کی ذمہ وار سراسر گورنمنٹ ہے - اس میں شک نہیں کہ موجودہ بے چینی گورنمنٹ کی اپنی پیدا کی ہوئی بے چینی ہے - مگر یہ کہنا بھی غلط نہیں کہ موجودہ مشکلات کو بڑھانے اور گورنمنٹ کو قابل نفرت طریقے اختیار کرنے پر آمادہ کرنیکے کسی قدر ذمہ وار ہم بھی ہیں - ملک میں اخبارات کا ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو گورنمنٹ کی ہر ایک بجا اور بیجا بات پر نکتہ چینی کرنے ہی کو اخبار نویسی خیال کئے ہوئے تھے اور انہی کی بدولت ملک کی برائے نام آزادی کو جو نہایت کشمکش سے زندہ تھی، نقصان اُٹھانا پڑا ہے - یہ طریق ایسا ہی قابل تعریف ہے جیسا گورنمنٹ کا سخت قانون +

ملک کی موجودہ حالت ایسی ہے کہ وہ جس راستے پر چلایا جائے آسانی سے لگے ہی

اختیار کریگا۔ بس اس وقت ہماری ذراسی غلطی بہت بڑے نقصان کا باعث ہوگی۔ اگر ہم اس وقت گمراہ کئے گئے تو ہماری ترقی کی منزل ہم سے کوسوں دور ہوجائیگی اور پھر راہ راست پر آنے کے لیئے بہت سے دقت اور مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ مگران اخبارات کی تحریروں کو روکنے ان کی آواز کو بند کرنے کے لئے سخت قانون اور گرفتاریاں ہرگز مفید نہیں ہوسکتے۔ یہ طریق ان لوگوں کے دلوں میں بھی جو گورنمنٹ پر باوجود اس جبر وسختی کے بھروسہ رکھتے ہیں بدظنی پیدا کریگا۔ اور سلطنت میں روز بروز مشکلات بڑھتی جائیں گی۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ سخت قانون محض ان اخبارات کے لئے ہیں جو اپنے غلط مشورے سے ملک کو گمراہ کرتے ہیں۔ اخبارات کی اس جائز آزادی کو جو عطا کی گئی ہے مطلق نقصان نہیں پہنچیگا کیونکہ اول تو جن حکام کے ہاتھ میں یہ قانون دیا گیا ہے ان کی طرف سے ملک کو پیشتر ہی شکایت ہے کہ وہ قانون کا جائز استعمال نہیں کرتے دوسرے ایسے اخبارات کے لئے جو قانون پیشتر موجود تھا وہ کافی سے زیادہ تھا اور اس لئے کسی اور قانون کی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ قانون کی امداد کے علاوہ سب سے آسان طریقہ جو زیادہ بااثر اور مفید ہوگا؟ گورنمنٹ کے لئے ایک اور بھی موجود ہے جس سے ایسے اخبارات جو ناجائز نکتہ چینی سے بےچینی پھیلاتے ہیں خود بخود اجل طبعی سے مرجائیں گے۔ اور وہ ان اخبارات کی تحریروں اور خیالات کو اپنے طرز عمل سے غلط ثابت کرنا ہے۔ اگر وہ اخبارات گورنمنٹ کو ظالم وجابر بتلاتے ہیں تو گورنمنٹ رحم اور ہمدردی سے اسے غلط ثابت کرسکتی ہے۔ اگر وہ گورنمنٹ انگلشیہ کے عہد حکومت کو ہندوستان کے لئے مصائب اور تکالیف کا زمانہ بتلاتے ہیں تو گورنمنٹ طرز سلطنت اور بخششوں سے اسے ایک باامن عہد ثابت کرسکتی ہے۔ یہ طریق نہایت پسندیدہ اور گورنمنٹ کے لئے بھی اس میں آسانیاں ہیں مرع

لطف کن لطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش

اگر گورنمنٹ رحم اور ہمدردی سے کام لے اور ان شکایات پر غور کرے جو ہندوستانیوں کو اس کے خلاف ہیں تو ان اخبارات کی آواز کا جو بیجا نکتہ چینی کرتے ہیں کچھ اثر نہ ہوگا وہ خود بخود کمزور ہو جائے گی۔ اور ہندوستانی ایسی یا وہ گوئی سے زیادہ کچھ خیال نہ کریں گے سچائی کے مقابلہ میں غلط بیانی بھی زیادہ نہیں رہ سکتی اور نفرت محبت نہیں بڑھ سکتی۔ یہ قانون قدرت ہے ٹل نہیں سکتا +

ہم نے ابھی کہا تھا کہ ہماری تاریخ سے جو سبق ہمیں ملیگا وہ ہماری ساری مشکلات کو آسان کر دیگا اور راہ کامیابی کیلئے ایک روشن چراغ ثابت ہوگا۔ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جن قوموں نے ترقی کی وہ راستی کے اصول پر قائم رہیں اور وہ بادشاہ دیر تک حکومت کر سکا جو رعایا کو خوش رکھ سکا۔ جب کبھی کسی سلطنت میں زوال آیا تو اس کا باعث ہمیشہ بادشاہ اور رعایا کے تعلقات میں کشیدگی تھی خواہ وہ بادشاہ کی غفلت یا ظلم سے پیدا ہوئی ہو پس سلطنت کی بنیاد کو مستحکم بنانے کے لئے محبت باہمی نہایت ضروری چیز ہے۔ محبت کے لئے محبت کی ضرورت ہے یہ ممکن ہے کہ گورنمنٹ ہم سے محبت کرے اور ہم اس سے نفرت۔ اگر یہ حالت چند غلط فہمیوں کی بدولت پیدا ہو بھی جائے تو کبھی دیر تک قائم نہیں رہ سکتی ضروری ہے کہ اس محبت کا احساس ہم میں پیدا ہو اور ہم اپنے مربی اور محسن کو پہچانیں۔ برخلاف اسکے ہم سے نفرت کی جائے اور ہم محبت کریں ہم سے ہمدردی نہ کیجائے اور ہم وفادار رہوں بالکل ناممکن ہے جو لوگ اس کا بہانہ کرتے ہیں وہ سراسر جھوٹے اور فریبی ہیں اور یہ کہنا ذرا بھی غلط نہیں کہ ایسے زمانہ سازوں کی وفاداری اور محبت حق پرست مخالفوں کی نفرت اور غصہ سے زیادہ خطرناک ہے +

گورنمنٹ کی طرف سے جو آزادی رعایا کو عطا کی جاتی ہے ضروری ہے کہ اس میں سلطنت کی بہتری کا کوئی راز مخفی ہو اور ایسی آزادی کا عطا کرنا مدبری اور سلطنت کی قابلیت

ہے اسی اصول پر اخبارات کی آزادی عطا کی گئی تھی۔ اخبارات جہاں اپنے ملک اور اپنے ہم قوم بھائیوں کی خدمت کرتے ہیں وہاں گورنمنٹ اور سلطنت کے ایک ضروری منشا کو بھی پورا کرتے ہیں جو کام ان کے ذریعہ سے پورا ہو رہا ہے اگر وہ کسی وجہ سے بند ہو گیا تو یہ ضروری ہے کہ انتظام سلطنت میں کوئی خلل واقع ہو اس لئے اخبارات کی آزادی کو خطرے میں ڈالنا سلطنت کے ایک ضروری اصول کو خطرے میں ڈالنا ہوگا۔
اخبارات ہمیں رعایا کے دلی خیالات کا پتہ دیتے ہیں۔ رعایا کو جو گورنمنٹ کی طرف سے شکایات ہیں وہ صاف الفاظ میں بیان کی جاتی ہیں اور موقعہ دیا جاتا ہے کہ ان سے واقف ہو کر ان کی تلافی کی تدبیر کی جائے۔ اگر اس آواز کو بند کر دیا گیا یا جبر و سختی سے ظاہراً بند ہو گئی تو خفیہ سوسائٹیاں پیدا ہونگی اور سلطنت میں خطرناک مشکلات پیدا کریں گی۔ جیسا کہ بنگال میں تجربہ ہوا ہے۔ ان سوسائٹیوں کا وجود ملکی بہبودی اور استحکام سلطنت دونوں کے لئے نقصان دہ ثابت ہوگا۔ بنگال میں جو واقعات پیش آئے ان سے کوئی حقیقی بہی خواہ سلطنت ہمدردی نہیں رکھ سکتا۔ اور بے گناہ خواتین کی ہلاکت کا ہر ایک شخص کو افسوس ہے مگر اس بات سے شاید کسی کو انکار نہ ہوگا کہ یہ افسوسناک واقعات حضرت کرزن اور فلر صاحب کی ناعاقبت اندیشیوں کی بدولت پیش آئے اگر وہ بنگالیوں کی رائے کو بے رحمی سے نہ کچلتے اگر کرزن اپنی عقل کے زعم میں تقسیم بنگال کی سی غلطی نہ کرتے اور فلر سودیشی کی مخالفت میں بے گناہوں کے سر نہ کچلتے تو ہمیں یہ افسوسناک حادثات نہ دیکھنے پڑتے جنہوں نے گورنمنٹ اور رعایا کے تعلقات کو زیادہ کشیدہ بنا دیا۔ حاکم و محکوم میں نفرت بڑھا دی اور ہندوستان ایسی امن سرزمین کو جو کشت و خون سے توبہ کر چکی تھی میدان کارزار بنا دیا۔
جو کچھ ہو چکا اب واپس نہیں ہو سکتا۔ جو تیر ناعاقبت اندیشی کے کمان سے نکل کر محبت باہمی کے سینہ میں لگ چکا اب واپس نہیں آسکتا اگر اس کی تلافی ہو سکے

ہے تو صرف اس طرح کہ اس تیر کو شفقت و مروت سے نکالکر ہمدردی اور مراحم خسروانہ کا مرہم اس پر لگایا جائے تاکہ وہ زخم جس کی بیکلی بے چینی پیدا کر رہی ہے بھر آئے اور محبت میں کوئی رخنہ نہ رہے۔ جبر و سختی اس زخم کو اور ہرا کرے گی اور اسے گہرا بنائے گی۔ تقسیم بنگال میں غلطی تھی اور اخبارات کی آزادی کو ضبط کرنا دوسری غلطی ہوگی۔ زمانہ بتلائیگا کہ وہ نہایت خطرناک غلطی ہے۔ اگر ہمدردی اور مروت سے کام لیا گیا تو مخالف اخبارات بھی بندہ بیدام ہو جائیں گے اور وہ قلم جن سے آتشی حروف نکل رہے ہیں تحسین و تعریف کا آب حیات برسائیں گے۔ مخالف کو موافق بنانے۔ دشمن کو دوست بنانے کے لئے صرف محبت ہی ایک ایسی دوا ہے جو اکسیر ثابت ہو سکتی ہے +

ہم نے مضمون کے شروع میں کہا تھا کہ موجودہ بےچینی کو دور کرنے اور رشتہ محبت کو مضبوط بنانے اور قومی زندگی کو قایم رکھنے کے لئے قربانیوں کی ضرورت ہے اور وہ قربانی ایثار نفس ہے۔ وہ ایثار نفس کیا ہے یہی کہ ہم ایک دوسرے کی غلطیوں کو بھول جائیں۔ گذشتہ را صلواة و آیندہ را احتیاط کے مبارک اصول کو عمل میں لاکر آیندہ زمانہ کو ایک نہایت با امن اور مبارک زمانہ ثابت کریں۔ یہ وقت فی الفتادہ نکتہ چینی کرنیکا نہیں کیونکہ یہ طریقہ ہمارے راستہ میں زیادہ الجھن پیدا کریگا۔ یہ وقت ایک دوسرے کی غلطیوں کو بھول جانے اور گلے ملنے کا ہے۔ رعایا اور گورنمنٹ دونوں کو غصہ کی قربانی دینا موجودہ بےچینی کو دور کرنے کے لئے ضروری ہے۔ آؤ ہم سب دعا کریں کہ ہماری آرزوئیں بر آئیں اور ہم سب شیر و شکر ہو کر مبارکباد کی لے میں وہی دل خوش کن راگ جس کی ہم نے شروع میں آرزو کی تھی۔ گائیں ۔ ع

بڑا مزا اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

گذشتہ جلدیں

باوجود احتیاطاً غیر معمولی طور پر زیادہ جلدیں چھپوا لینے کے آزاد کے جنوری۔ فروری اور مارچ ۱۹۰۶ء کی ایک کاپی نہیں بچی۔ اور اہل ملک کی طرف سے برابر اب تک اس کی مانگ چلی آتی ہے کیونکہ احباب مکمل فائل رکھنا چاہتے ہیں۔ اس تجربہ سے فائدہ اٹھا کر اپریل ۱۹۰۶ء نمبر سے اور بھی زائد کاپیاں چھپوائی گئیں جن کی متعدد جلدیں باقی ہیں۔ جو احباب آزاد کے جنم دن سے اس کا مکمل فائل رکھنا چاہتے ہیں وہ جلد درخواست کریں ورنہ پھر ہاتھ نہ آئیں گی۔ جنوری۔ فروری اور مارچ ۱۹۰۶ء کے پرچوں کا بھی دوسرا ایڈیشن پانچ سو درخواستوں کے جمع ہو جانے پر تیار کرایا جائے گا +

نو پرچوں کا سٹ قسم اول عا +

" " قسم دوم عہ +

" " قسم سوم عہ +

محصولڈاک بذمہ خریدار +

المشتہر

منیجر آزاد لاہور

تاجروں کو مژدہ!

نرخ نامہ اجرت طبع اشتہار آزاد لاہور

اگرچہ جو اجرت اشتہار اب تک سوداگر صاحبان سے چارج کی جاتی رہی ہے وہ زیادہ نہ تھی۔ لیکن بعض تاجروں کے اصرار سے اس میں مناسب تخفیف کے ساتھ نرخ نامہ پیش کر کے عرض کرتے ہیں کہ اب حمایت کی درخواست نہ کریں یہ حد درجہ کی رعایت ہے +

جگہ	سالانہ	ششماہی	سہ ماہی
صفحہ	سے (۳۰)	معہ (۱۷)	لعہ (۹)
نصف صفحہ	معہ (۱۷)	لعہ (۹)	صہ (۵)
چوتھائی صفحہ	لعہ (۹)	صہ (۵)	سے (۳)

متفرق بحساب دو آنہ فی سطر فی اشاعت کے حساب سے درج ہوں گے +

نوٹ ۱۔ سرورق پر اشتہار دینے کی صورت میں دس فیصدی زیادہ اجرت لیجائیگی +

نوٹ ۲۔ ریپر (لفافہ کی پشت جس میں آزاد بند ہو کر روانہ ہوتا ہے) سالانہ ششماہی۔ سہ ماہی بالترتیب عنہ۔ عہ۱۲ اور معہ روپیہ +

مینجر رسالہ آزاد لاہور

دھوکے سے بچو
صاحبان! ہمارے پاس قریباً اڑھائی ہزار سارٹیفکیٹ اُن ہارمونیم ماسٹروں و پروفیسروں کے موجود ہیں جنہوں نے ہمارے باجوں طبلوں کو نہایت ہی پسند کیا ہے اور دوسرے کارخانوں پر ترجیح دی ہے کوئی ایسا ملک یا شہر نہیں جس میں ہمارے کارخانہ نے شہرت نہ پائی ہو واضح ہو کہ اُن باجوں اور طبلوں کی خوبیاں ہم کاغذ پر نہیں کھلا سکتے اور نہ ہی اُن کی پوری پوری کیفیت بیان کر سکتے ہیں بلکہ اصلی رنگت اور خوبصورتی دیکھنے ہی سے معلوم ہو سکتی ہے امید ہے کہ ہمارے کارخانہ کے ساختہ ہارمونیم باجوں و طبلوں کا ملاحظہ فرماوینگے اور ہماری حوصلہ افزائی کرینگے
ہارمونیم گائڈ جس سے بہت جلد بلا استاد خود ہی بجا سیکھ سکتے ہیں قیمت ۱۲ر +
فروخت ہو گئیں فروخت ہو گئیں فروخت ہو گئیں
اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔
یہ راسکوپ سسٹم واچ جو کہ چند دنوں میں سینکڑوں ہی فروخت ہو گئی یہ گھڑیاں گھوڑے پر چڑھنے سے دھوپ میں رکھنے سے زمین پر گرنے سے کبھی نہیں بگڑتیں۔ اُن کا ٹائم ریلوے ریگولیٹنگ واچ کے مطابق ہے۔
زیادہ تعریف فضول ہے۔ ۳ ماہ کے لئے بہت تھوڑی سی رکھی گئی ہے
صرف عہ +
المشتہر
سنت سنگھ سادھو سنگھ ہارمونیم اینڈ واچ مرچنٹ گمٹی بازار
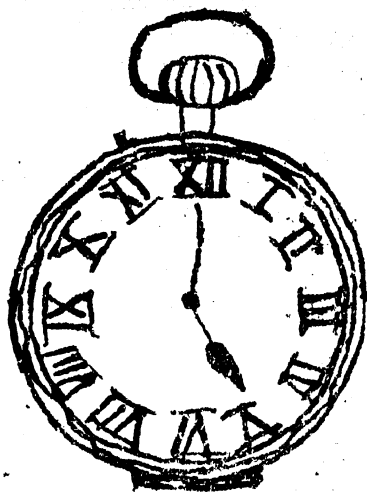
پولٹیکل لٹریچر

ہندوستان میں آثار بیداری کیساتھ یہ ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ ایسا پولٹیکل لٹریچر جو ملک میں صحیح جذبات اور جائز خواہشات پیدا کرنیوالا ہو ملک کے روبرو پیش کیا جائے۔ بہی خواہان ملک محسوس کر رہے ہیں کہ محض اسی لٹریچر کی کمی ہے۔ کہ بعض اوقات ناتجربہ کار اور منزل سیاست کی دشواریوں سے ناواقف لوگ ملک کیلئے مصائب لاتے اور ہندوستان کی ترقی میں زیادہ الجھن ڈالدیتے ہیں۔ آزاد کی اشاعت کا سب سے بڑا منشا یہی ہے مگر اس کیساتھ ساتھ ہم سمجھتے ہیں کہ ملک کو اس قسم کی تصانیف کی ذاتی لائبریری کی ضرورت ہے انگریزی میں تو ایسی بہت سی کتابیں ملینگی مگر اردو علم ادب ابھی تک ان سے محروم ہے اس اہم ضرورت کو محسوس کرکے ہم نے ایسی تصنیفات جو بامذاق محبان وطن کی الماریوں کی زینت اور ان کی خدمت میں باریاب ہونیکے لائق ہوں اردو میں شائع کرنیکا ارادہ کیا ہے اس سلسلہ میں انگریزی تصانیف کے تراجم کے علاوہ ملک کے نامور زمانہ شناس اہل قلم کی تصانیف بھی شائع کی جائیں گی اور ان کی اشاعت کا انتظام اچھے کاغذات اور خوبصورتی کے ساتھ ہوگا۔ اس سلسلہ کا آغاز مشہور حامی ہند سر ہنری کوٹن کی لاجواب تصنیف

نیو انڈیا

کے ترجمہ سے ہوگا۔ اور آیندہ سہ ماہی کم از کم سو صفحہ کی ایسی ہی تصنیف ملک کے روبرو پیش کی جائیگی مگر اس سلسلہ کی کامیابی کے لئے پانچ سو ایسے محبان وطن کی ضرورت ہے جو اس سلسلہ کی مستقل خریداری منظور کریں ہم پیشگی قیمت نہیں مانگتے۔ صرف عہ بذریعہ منی آرڈر بھیجکر نام درج کرا لیجئے اور ہر ایک تصنیف آپ کی خدمت میں بصیغہ ویلیو پی ایبل بھیجدی جائیں گی یہ کوشش کی جائے گی کہ سال کی چاروں تصانیف کی قیمت کسی صورت میں للعہ سے زیادہ نہ ہو اس ارادہ کی کماحقہ تکمیل کیلئے محبان وطن کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے +

بشن سہائے آزاد مالک و ایڈیٹر

بندے ماترم ہندوستاں ہمارا ہندوستاں کے ہم ہیں ہندوستاں ہمارا بندے ماترم

سُوراجیہ

قیمت سالانہ عاؔ معہ محصول ڈاک — نمونہ کا پرچہ مفت

مہاشے شانتی نرائن کی پرزور قلم سے ہر سنیچر کو پریاگ (الہ آباد) سے نکلتا ہے +

دنیا کیا کہتی ہے

سوراجیہ سودیشی اور بائیکاٹ سوراجیہ کی اغراض ہیں اور وہ اپنی اغراض کی خوبی سے بھارا ہے۔ سوراجیہ ہر پہلو سے سرپرستی اور حوصلہ افزائی کے قابل ہے (آریہ گزٹ لاہور) +

یہ پرچہ ملک اور قوم کیلئے بہت کچھ مفید ثابت ہوگا بشرطیکہ ملک و قوم بھی اس کی قدر افزائی کرے۔ سوشیل و پولیٹکل معاملات پر نہایت آزادی سے بحث کرنا اس کا فرض ہے (سیمانی اخبار بنارس) +

اہل پنجاب ہمارے دوست کے زور قلم سے اچھی طرح واقف ہیں اس لئے کسی مزید تعریف کی ضرورت نہیں (آزاد لاہور) +

اخبار بظاہر ہونہار ہے اور ملکی مذاق پر نظر کرتے ہوئے اس کی کامیابی بھی یقینی ہے (اصلاح سخن لاہور) +

مضامین بردست اور خیالات آزاد ہیں پولیٹکل مسائل پر مناسب و معقول بحث ہوتی ہے (وندے ماترم امرتسر) +

صوبجات متحدہ میں اس سے بہتر اور کوئی دوسرا اردو پرچہ اس وقت موجود نہیں (زمانہ کانپور)

…بات میں دیسی اخباروں کی عام رائے کے قومی بنانے میں ہم کو سوراجیہ سے …ہندوستانی لکھنؤ) +

آزاد کا کانگرس نمبر

اپنی خوبیوں کے لئے کافی شہرت حاصل کرچکا ہے اس کی

صرف بیس کاپیاں

باقی ہیں۔ حالانکہ ایک ہزار زاید چھپوائی گئی تھیں۔ جو صرف نئے خریداروں کو مفت دی جائیں گی +

کانگرس نمبر مفت

حاصل کرنا خوش نصیبی ہے۔ اور اس سے محروم رہنا اپنے دماغ سے ظلم کرنا ہے۔ جلدی کیجئے تاکہ مایوس نہ ہونا پڑے +

المشتہر

منیجر آزاد لاہور

ایجنٹوں کی ضرورت

آزاد کے لئے ہر شہر میں بارسوخ ایجنٹوں کی ضرورت ہے جو خوش سلیقہ، اشاعت میں مدد دے سکیں۔ اور تاجروں کے اشتہارات حاصل کرسکیں کمیشن معقول شرائط کے لئے خط و کتابت کیجئے +

منیجر آزاد لاہور